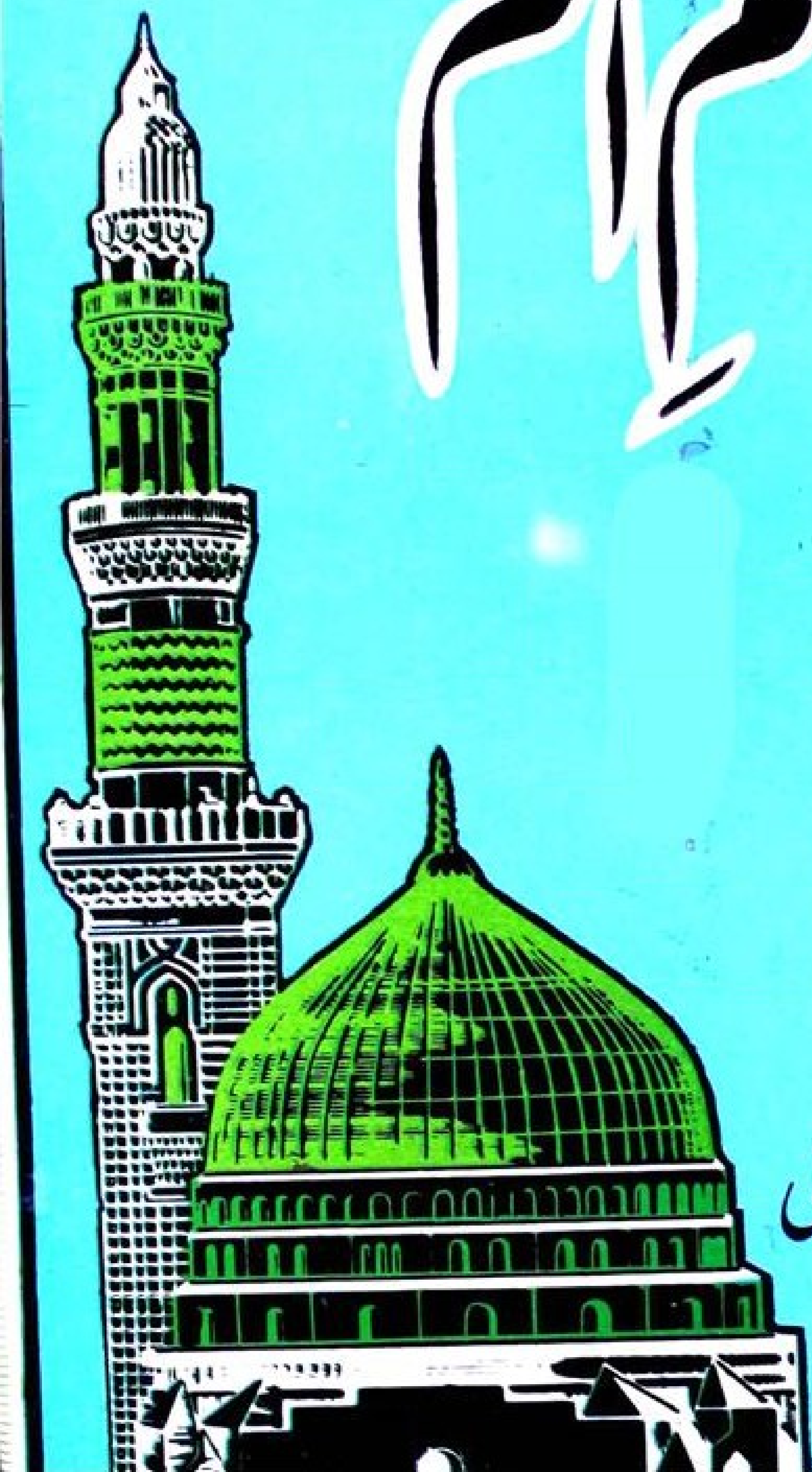
صلی اللہ علیہ وسلم

# معلمِ اعظم

[illegible] نوری خلیق



ادارہ اشاعتِ مصطفائی، دہلی

# معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم

صلی اللہ علیہ وسلم

# معلمِ اعظم

منوّرہ نوری خلیق

ادارہ اشاعتِ مصطفائی، دہلی

MOALLIM-E-AZAM

BY

M. NOORI KHALIQUE

1993

سن اشاعت ۱۹۹۳ء

قیمت سو روپے

مطبع عفیف پرنٹرس لال کنواں دہلی ۶

ادارہ اشاعتِ مصطفائی

۳۱۰۸ گلی عزیز الدین وکیل کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی ۶

ان قارئین کے نام جو

حیاتِ طیّبہ

کو مشعلِ راہ بنا سکیں

بسم الله الرحمن الرحيم

# فہرستِ مضامین

# عرضِ ناشر

خدائے عزّ و جل کا لاکھ لاکھ احسان و کرم ہے کہ میں نے جس کام کا آغاز کیا تھا، وہ تکمیل کو پہنچا۔ یقیناً یہ امر میرے لیے باعثِ سعادت ہے۔

سرورِ کائنات، قبلۂ حاجات، فخرِ موجودات حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ طیّبہ پر یوں تو اب تک بہت وقیع اور معتبر کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن اس کتاب کی یہ انفرادیت ہے کہ اسے ایک خاتون نے لکھا ہے۔ "منوّر نوری خلیق یقیناً برِّ صغیر پاک و ہند کی وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے حضورِ پُر نور کی سیرت پر قلم اٹھا کر اپنی بخشش کا سامان کیا ہے۔

منوّرہ نوری خلیق میری ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامے "دوشیزہ" میں تاریخی کہانیاں لکھ رہی ہیں۔ ان تاریخی کہانیوں کا پس منظر عموماً تاریخ اسلام ہی رہا ہے۔ انھیں تاریخِ اسلام پر مثبت اندازِ فکر کی کہانیاں لکھتے ہوئے ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ دنیا کا کوئی خطّہ ایسا نہیں جہاں

ان کے پڑھنے والے موجود نہ ہوں اور جہاں سے ان کی تحریروں کی پسندیدگی کے خطوط نہ ملتے ہوں۔ انھوں نے یہ مقبولیت حاصل کرنے کے لیے تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے جس کا اظہار ان کی ہر تحریر سے ہوتا ہے۔ تاریخ اور خصوصاً تاریخ اسلام ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ انھوں نے اس کے سوا کچھ نہیں لکھا یہ کتاب معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے تیرہ سالہ مطالعے، غور و فکر اور جستجو و شوق کا حاصل ہے۔ انھوں نے حضورِ اکرمؐ کی سیرت کے ہر پہلو، ہر گوشے کا احاطہ کیا ہے اور اس کے ساتھ پورا انصاف برتا ہے۔ ان کی جہد و کاوش اور ان کے اندازِ فکر کا علم آپ کو کتاب کا پہلا حصّہ پڑھ کر ہو جائے گا۔

کتاب تین حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں مصنّفہ نے سیرتِ طیبہ پر جو کام ہو چکا ہے اس کا جائزہ لیا ہے۔ یہ جائزہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک دیانت دار مصنّفہ ہیں۔ کتاب کا دوسرا حصّہ "حیاتِ طیبہ" ہے جو عہدِ آبائے رسولؐ سے شروع ہوتا ہے اور حضورِ اکرمؐ کے دنیا سے رحلت فرما جانے پر ختم ہوتا ہے۔ دراصل کتاب کا یہی حصّہ سب سے زیادہ تفصیلی اور اہم ہے۔ اس حصّے میں مختلف ابواب کے تحت سیرتِ رسولؐ بیان کی گئی ہے۔ کتاب کا تیسرا حصّہ تعلیماتِ اسلام پر مبنی ہے، جسے ہم حاصلِ کلام بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح حضورِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کا مقصد و منشا پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب لکھتے ہوئے مصنّفہ نے جن کتب سے استفادہ کیا ہے ان کے حوالے بھی درج کیے ہیں، لیکن ان کا بنیادی ماخذ قرآن مجید ہے، یعنی وہ کتاب جس سے عظیم و برتر کوئی اور کتاب نہیں!

سہام پبلی کیشنز کی جانب سے یہ ہماری پہلی پیشکش ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری یہ کاوش آپ کے ذوقِ مطالعہ پر پوری اترے گی۔ ان شاء اللہ ہم آئندہ بھی علمی، ادبی اور اہم نوعیت کی کتب شائع کرتے رہیں گے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس پہلی کوشش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ (آمین)

رخسانہ سہام مرزا

حصّۂ اوّل

تمہید

# ابتدائیہ

حیاتِ مقدس پر تحقیق کا اس قدر کام ہو چکا ہے کہ اب کسی بھی محنت کو تحقیق نہیں کہا جا سکتا اور حقیقت میں اب تحقیق کی پہلی سی دشواری بھی باقی نہیں رہی۔ خدا غریقِ رحمت کرے ہمارے اُن اسلاف کو جنھوں نے برسوں سفر اور علم کی صعوبتیں برداشت کر کے ہمارے لیے یہ کام آسان کر دیا۔ اب یہ کام کتب سے لیا جانے لگا ہے۔ دنیا کے کسی بھی انسان پر اتنا نہیں لکھا گیا جتنا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذاتِ اقدس پر لکھا گیا ہے بلکہ دیگر اقوام نے خود اپنے انبیاءؑ پر اتنی چھان بین نہیں کی۔ آج چودہ صدیاں گزر گئیں مگر یہ ذکر مسلسل کیا جا رہا ہے اور مسلسل کیا جاتا رہے گا۔

دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کو چھوڑ کر خود اردو ایسی زبان میں سیرت پر لکھی گئی کُتب کی تعداد ہزاروں تک پہنچ رہی ہے۔ ان میں تراجم بھی ہیں، تحقیقی کُتب بھی۔ رحمت اللعالمینؐ اور سیرت النبیؐ ایسی ضخیم تصانیف بھی ہیں اور مختصر کتابچے بھی۔ عادات و اخلاق اور معمولاتِ زندگی پر تحریریں بھی ہیں اور مذہبی جذبات تخلیق کرنے والے میلاد و ذکرِ معجزات اور صلوٰۃ و سلام بھی۔ الغرض اس مقدس و مطہر موضوع پر علم کا اتنا ذخیرہ ہے کہ ایک انسان اگر اس راہ میں تمام عمر بھی صرف کر دے تو اس کی ادنیٰ سی تعداد ہی سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔

سیرت کے اصل ذرائع اور سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ماخذ قرآنِ کریم اور

احادیثِ مبارک ہیں۔ دراصل اس فن کی ابتدا انھی سے کی گئی تھی، لیکن عجیب بات ہے کہ سیرت کے سب سے اہم ماخذ قرآن نے جس انداز سے جابجا آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا تذکرہ کیا ہے اس سے پوری حیاتِ مبارک سامنے آجاتی ہے (خاندانی شرافت و نجابت، اسمِ مبارک، ابتدائی زندگی، ماحول، یتیمی، جوانی، وحی، اعلانِ نبوت، دشواریاں، کفر کی ہولناک عداوتیں، دشمنوں سے مقابلے، ہجرت، غزوات و سرایا، نجی زندگی، ازواجِ مطہرات کے ساتھ معاملات، نکاح کی حکمتیں اور جلیل القدر کا مبارک بیان۔ غرض کہ حیاتِ مقدس کو قرآن پاک سے اخذ کرنے کے بعد کہیں اور بھٹکنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی) لیکن شروع میں سیرت کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا گیا، وہ صرف غزوات پر مبنی تھا۔ المغازی پہلی تصنیف تھی جس کے بعد کے تمام مورخین نے اسی سے استفادہ کیا اور یہی سبب تھا کہ دیگر اقوام جب پہلی بار حضور صلعم کی حیاتِ مقدس سے واقف ہوئیں تو غزوات ہی کے ذریعے سے ہوئیں۔ پھر المغازی کے انداز نے باقاعدہ ایک فن کی صورت اختیار کر لی۔ سب اسی انداز پر لکھنے لگے اور لوگوں نے سمجھا کہ قرآن محض خدا کے احکام کا مجموعہ ہے جو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے ذریعے دنیا تک پہنچے اور انھی کو نافذ کرنے کے لیے غزوات و سرایا عمل میں آئے۔ اسی تصور کی بنا پر بعد کے لوگ اسلام کی روح تک نہ پہنچ پائے۔ بلاشبہ مخالفین کی بھی کمی نہ تھی، لیکن اصل تبلیغ اور اشاعتِ دین سے غفلت برت کر خود مسلمانوں نے بھی دینِ حق کے ساتھ کچھ کم دشمنی نہیں کی۔ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ ہر منصب، ہر طبقے، ہر شعبے اور ہر حیثیت کا آدمی دین اور حیاتِ مقدس سے واقف ہوتا اور جو جہاں ہوتا، عملی طور پر تبلیغ کا فرض ادا کرتا لیکن ہوا یہ کہ اس فرض کی ادائیگی کا ذمے دار صرف ایک طبقہ رہ گیا جو طبقۂ علماء کہلاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُن سے بھی علم تو چلا گیا، بس وضع قطع باقی رہ گئی۔ انھوں نے صرف نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ پر نصیحتیں کیں اور یوں نتیجتاً اسلام کے نام سے فقط ایک بات سمجھی جانے لگی کہ یہ پابندیاں عائد کر دینے والا ایک مذہب ہے جو عیش و عشرت اور دیگر تمام علوم کی نفی کرتا ہے۔ اس مذہب میں خدا کے احکام کی پیروی کرنا ثواب اور نہ کرنا سخت عذاب کا باعث

ہے۔ اسی بنا پر اس میں زندگی کا تصور نہ سمویا جا سکا اور سمجھا جانے لگا کہ کامیاب زندگی گزارنے کا بہترین اصول انسانیت ہے۔ ایسا سمجھنے اور کہنے والے یہ بھول گئے کہ انسانیت بھی تو مذہب ہی سے آتی ہے۔ معاشرے میں رہنے اور اجتماعی زندگی گزارنے کے بہترین اصول دین ہی کے عطا کردہ ہیں لہٰذا دینِ اسلام طرزِ حیات ہے، طریقۂ زندگی ہے اور زندگی کی بہت بڑی بلکہ سب سے بڑی ضرورت ہے جس نے انسان کی ضرورتوں کی تکمیل کو عبادت اور عبادت کو انسان کی ضرورت بنا دیا۔

۱۹۷۰ء کا واقعہ ہے کہ ایک محفل میں مذہب اور زندگی کی بات چلی تو ایک صاحب نے کہا: "مذہب کو ایک نجی سا معاملہ ہے۔ عام زندگی میں ہمیں زمانے کا ساتھ دینا چاہیے ورنہ ہم بہت پیچھے رہ جائیں گے۔"

کہنے والے ایک سند یافتہ تھے اور محفل میں اکثریت ان سے متفق تھی لہٰذا میں اتنا ہی کہہ کر رہ گئی کہ زمانے کا ساتھ ہم مذہب کے سہارے ہی دے سکتے ہیں کیوں کہ اس کے اصول جن میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں، نہ صرف جدید سے جدید دَور کا ساتھ دے سکتے ہیں بلکہ ہر زمانے کی ضرورت پوری کر سکتے ہیں۔

اس وقت کوئی بھی مجھ سے متفق نہیں تھا۔ میں بی۔ اے کی طالبہ تھی اور یہ محفل استادوں کی تھی جہاں ایک کے سوا سبھی مذہب کو قدامت پرستی سمجھتے تھے۔ میں ان سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی کیوں کہ یہ اُن کا نہیں، ان کی سوچ کا تصور تھا۔ وہ دین اور زندگی کو جدا جدا سمجھ رہے تھے اور انھیں سمجھایا بھی یہی گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ ہمارے معاشرے میں جہاں صرف ڈگری پر نظر رکھ کر اولاد کو تعلیم دلائی جاتی ہے، وہاں علم کی یہ باریکیاں اُن کی سمجھ میں آ بھی کیسے سکتی ہیں! درخشاں مستقبل کی خواہش کے پسِ پردہ یہ بات دھندلا جاتی ہے کہ انھیں ایک اچھا انسان بھی بنانا ہے اور اچھا انسان بنانے کے لیے جو کامل ترین نمونہ موجود ہے، اس سے واقفیت ضروری ہے۔ یہی تصور کافی عرصے مجھے پریشان کرتا رہا۔ اس پریشانی کا سبب صرف یہی نہ تھا کہ میں نے ایک غلط تصور کو محسوس کیا تھا بلکہ میں اسے مٹا دینا چاہتی تھی اور یہ کام آسان نہ

تھا۔ تاریخ سے دلچسپی تو مجھے ہمیشہ سے تھی ہی لیکن اب اس شوق نے جنون کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لوگ شوق کے لیے وقت نکالتے ہیں لیکن میں دیگر تمام امور کے لیے اپنے شوق سے وقت نکالتی تھی اور اس وقت میں صرف اس مقصد سے پڑھا کرتی تھی کہ اندازہ کر سکوں کہ میری سوچ صحیح ہے یا غلط؟ میری سوچ تھی کہ مذہب کے مطابق زندگی گزار کر ہی انسان نے ہر میدان میں عزت و کامیابی پائی ہے ورنہ ذلت و خواری اس کا مقدر ہو گئی، بالکل اسی طرح جیسے اپنے مرکز اور اپنے دائرے سے ہٹ جانے والے اجرامِ فلکی کہ جو بھٹکا، فنا کے دبیز پردے کے پیچھے چھپ گیا۔ میرے خیال میں یہ مذہب سے دوری کا نتیجہ ہے کہ جس قوم نے صدیوں پیشتر چاند پر جانے کا پہلا منصوبہ بنایا تھا (اور یہ ہارون الرشید نے بنایا تھا) آج علم کے میدان میں وہی سب سے پیچھے ہے۔ بہرکیف رسولِ مقبول صلعم کی حیاتِ مقدس کے مطالعے ہی نے مجھے اس موضوع پر لکھنے کا شوق دلایا۔ میں نے اندازہ کیا کہ یہی وہ مقدس ترین ہستی ہے جس کا کوئی فعل، کوئی قول، کوئی مشورہ، کوئی فیصلہ مصلحت سے خالی نہیں۔ ہر ساعت حکمت ہی حکمت نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ جو باتیں اور جو باریکیاں اس وقت صحابۂ کرام بھی نہ سمجھ پاتے تھے، بہت بعد میں اُنھی میں بھلائی اور خیر کے سامان نظر آتے تھے۔

لکھنے کا شوق پیدا ہوا تو میں نے واقعات جمع کیے اور ۱۹۷۲ء میں یہ کام شروع کیا، لیکن اس وقت مجھ پر شدید خوف طاری تھا۔ میرے سامنے محققین و مورخین کی ایک طویل فہرست تھی اس لیے کہ دو چار سو نے نہیں بلکہ ہزاروں نے حضورؐ کی حیاتِ مقدس پر کام کیا ہے، لیکن اُن میں مجھے صرف مرد حضرات ہی نظر آئے۔ میں نے سوچا، کیا یہ دشوار کام عورت بھی کر سکتی ہے؟

وہ کام جس کے لیے پوری ایک جماعت تیار ہوتی ہے، حیاتِ مقدس کے ایک ایک واقعے کی تصدیق اور ایک ایک حدیث کی تلاش کے لیے مدتیں درکار ہوتی ہیں، کیا میں تنہا یہ کام کر سکوں گی؟ لیکن میں نے سوچا کہ اگر میں یہ

کام نہ کرسکی تو اس میں عمر تو صَرف کرسکتی ہوں اور پھر میرا مقصد تو ایک عظیم ترین ہستی کی زندگی کو سامنے رکھ کر صرف یہ واضح کرنا تھا کہ یہی دِین بنی نوعِ انسان کی ضرورتوں کی تکمیل کرسکتا ہے اور اُسی عظیم ترین انسان کی زندگی لائقِ تقلید ہے۔

پھر میں نے اس کام کا باقاعدہ آغاز کیا اور جوں جوں مطالعہ کرتی گئی، اس موضوع کی لامحدود وسعت کا اندازہ ہوتا گیا۔ میں نے بار بار کم علمی کے احساس سے لکھنے کا کام چھوڑا اور جہاں سے بھی جس قدر کُتب مہیا ہو سکیں، ان کا مطالعہ کیا۔ اس طرح لکھنے کی رفتار بہت سست رہی۔ اس دوران میں کئی بار ہمت ٹوٹی اور کئی بار بندھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے تو ایک ناقابلِ عبور میدان کو عبور کرنے کی کوشش کی ہے، محنت کے خیال سے نہیں بلکہ موضوع کے خیال سے! آپ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) کی حیاتِ طیّبہ کے مختلف پہلو سامنے آئے تو میں فیصلہ نہ کرسکی کہ کس روپ میں اس ہستی کو زیادہ کامیاب تصوّر کیا جائے! میں جب بھی آپ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) کے بارے میں کچھ پڑھتی تھی تو میرے ذہن میں ایک اولوالعزم پیغمبر کا تصوّر بندھ جاتا تھا۔ وہ نبیؐ جس پر نبوّت تمام ہونے والی تھی جس نے مخالفتیں برداشت کیں، تکلیفیں اٹھائیں لیکن اپنی قوم کو بھلائی اور خیر کی طرف بُلاتا رہا کیوں کہ وہ انسانوں سے محبّت کرتا تھا... لیکن جب میں نے اس ہستی پر خود لکھنے کا ارادہ کیا اور باقاعدہ مطالعہ شروع کیا تو اس ہستی کے سینکڑوں روپ دیکھے اور ہر روپ اس قدر باعمل تھا کہ مجھے عمل کے معنی سمجھ آگیا۔ دنیا نے بڑے بڑے دلیر پیدا کیے ہیں لیکن کیا کوئی ایسا جنرل پیدا کیا ہے جو ایک جنگ سے واپس آکر اپنی جوان بیٹی کو مٹی دیتا ہے اور دوسرے علاقے کی طرف بڑھ جاتا ہے؟ فرض شناسی اور دلیری کی یہ مثال ہمیں جنگِ بدر سے واپس آنے والی اس ہستی کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ جوان بیٹی حضرت رقیہؓ کو دفن کیا جا رہا ہے اور یہاں سے اللہ کے نبیؐ کو بنو قینقاع کی طرف جانا ہے۔ پابندیٔ عہد کی اس سے بڑی کوئی مثال مل سکتی ہے جو صلحِ حدیبیہ کی شرائط کے بعد عمل میں آئی؟ پھر ہم مکّے کے اس عظیم فاتح کو دیکھتے ہیں، امنِ عامہ کا اعلان سنتے ہیں تو اس عظمت کو دیکھ کر سر جھک جاتا ہے۔ یہ وہ دربار ہے

جہاں انسان آدابِ زندگی سیکھتا ہے۔ میں جس قدر پڑھتی جاتی تھی لکھنے سے اتنی ہی خوف زدہ ہوتی جاتی تھی کہ کہیں مجھ سے کوئی لغزش نہ ہو جائے، چوک نہ ہو جائے۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ دیگر اقوام نے اپنی الہامی کتُب کی اس قدر حفاظت نہیں کی جتنی مسلمانوں نے حیاتِ مقدّس کے ہر واقعے کی حفاظت کی ہے۔ میرے نزدیک اس ہستی کے بارے میں مکمّل تحقیق کیے بغیر ایک لفظ بھی کہنا ناقابلِ معافی جرم ہے۔ مستزاد یہ کہ حیاتِ مقدّس کے بے شمار پہلو ہیں اور ہر پہلو اس قدر جامع و عمیق ہے کہ ان میں سے کسی ایک کا احاطہ کر لینا بھی بے حد دشوار ہے لہٰذا مجھے بار بار عزم کرنا پڑا، خاص طور پر ایسے میں کہ میری زندگی میں کچھ اور بھی مصروفیات آتی گئیں۔ سب سے پہلے میری تعلیمی مصروفیات تھیں، پھر بیماریاں بھی مجھے جلد گھیر لیتی ہیں۔ اسی دوران میں میری شادی ہو گئی، لیکن میری خوش نصیبی ہے کہ میرے شوہر (ڈاکٹر سیّد محمّد خلیق) نہ صرف یہ کہ حافظِ قرآن ہیں بلکہ (قلیل عرصے ہی سہی) سیّد سلیمان ندوی کے شاگرد بھی رہ چکے ہیں۔ ایسے میں مجھے ان سے بھی حوصلہ ملا۔ انھوں نے میری رہنمائی بھی کی اور مدد بھی۔ سعودی عرب آنے کے بعد میرا سب سے بڑا مسئلہ کتابوں کا تھا۔ اس کے لیے مجھے اپنے بڑے بھائی (محترم جناب معین الدّین احمد صدّیقی) کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے مجھے پاکستان سے کتُب مہیّا کیں۔ اس طرح میں اس کام کو جاری رکھ سکی، لیکن کتاب پر "ختم شد" لکھ دینے سے کام مکمّل نہیں ہو جاتا۔ کبھی کبھی تو تکمیل کے بعد ہی ابتدا ہوتی ہے۔

آج اس کتاب کو قلم بند کرتے ہوئے مجھے شدید خواہش ہو رہی ہے کہ لکھنے کا کام مکمّل ہونے کے بعد میں اس ہستی پر باقاعدہ مطالعہ شروع کردوں، قرآن کی روشنی میں اس ہستی کو دیکھوں جس کے اخلاق کی گواہی خود اللہ نے دی، خود خدا نے جس کے عمل کو بہترین نمونہ قرار دیا جس کے عظیم عمل کو (بنی نوعِ انسان پر) خالقِ کائنات نے احسان سے تعبیر کیا اور جس نے خدا کے ہر حکم کو عملی جامہ پہنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا اور ثابت کردیا کہ ملائک کو آدمؑ کے سامنے سجدے کا حکم غلط نہ تھا۔ یہی وہ جلیل القدر مخلوق ہے جو

واقعی تسخیرِ کائنات کا عظیم کام سرانجام دے سکتی ہے اور اس مخلوق کی تمام تر عظمتوں کا سبب ایک ہستی ہے جس کی تعریف و ستائش کی گئی، مگر حق ادا نہ ہوا۔ جس کی مدح و ثنا کی جائے گی، مگر حق ادا نہ ہوگا۔ ذاتِ باری کے بعد وہی عظیم ترین ہیں، وہی بزرگ ترین اور وہی اعلیٰ ترین انسان ہیں۔

بڑے آدمیوں کی سوانحِ حیات پڑھنا اور ان پر قلم اٹھانا اور بات ہے اور عظیم انسانوں کی سوانحِ حیات کا مطالعہ کرنا اور ان پر لکھنا اور بات۔ ہر آدمی بڑا آدمی بن سکتا ہے، لیکن ہر انسان عظیم انسان نہیں بن سکتا، نہ ہر منصب کوشش و محنت کا نتیجہ ہوتا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کچھ مناصب و مراتب خداوندِ عالم کی بخشش و فیاضی ہوتے ہیں اور ان کا کوئی خاص مقصد ہوتا ہے۔ نبوّت و رسالت بھی وہ منصب ہے جسے فیاضِ عالم کی دین یا پھر آدمؑ کی گم کردہ راہ اولاد پر قسّامِ ازل کی عنایت و مہربانی کہا جا سکتا ہے کہ جب بھی امورِ دینوی میں خرابی پیدا ہوئی، اللہ کی جانب سے اپنے بندوں کے لیے ایک سفارت آگئی اور ان کے دُنیوی و اُخروی معاملات کو درست و صاف کر کے انھیں ان تمام بُرائیوں سے نجات دے گئی جو ان کے لیے دائمی خرابی کا سبب بن جانے والی ہوں۔ اسی سفارت کو قرآن کی اصطلاح میں نبوّت و رسالت کہا جاتا ہے اور اسی سفیرِ الٰہی کو جو خدا کی جانب سے انسانوں کے لیے بھلائی اور خیر کا پیغام لاتا ہے، نبی اور رسول کہتے ہیں۔

نبوّت و رسالت کا سلسلہ ابتدائے آفرینش سے جاری ہے۔ شاید خالقِ کائنات کے نزدیک انسان کے لیے سب سے مقدّس اور پسندیدہ کام انسان کی اصلاح ہے یا شاید یہی کائنات کی واحد مخلوق ہے جو اپنے افعال و اقوال میں آزاد ہے اور اسی کی گمراہی کے امکانات دوسروں سے زیادہ ہیں لہٰذا ہدایت بھی اسی کے لیے ضروری ہے چنانچہ حیاتیاتی وجود کے ساتھ ہی خالقِ کائنات نے رہنمائی اور ہدایت کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ پھر انسانیت ہمیشہ ہی اپنی تکمیل کے لیے اس کی محتاج رہی۔

عام طور پر رُشد و ہدایت کا کام قول و عمل سے کیا جاتا ہے۔ پند و نصائح اور درس و تدریس ہی اس کا ذریعہ ہیں۔ لیکن یہی خدمت جب نبی کے سپرد کی جاتی ہے تو وہ احکامِ الٰہی کو مسلسل اپنے عمل کے ذریعے دنیا پر آشکار کرتا ہے۔ ایسے میں وہ خود عمل و اخلاق کا پیکر بن جاتا ہے۔ اس کا ادنیٰ سا قول اور معمولی سا فعل بھی علم و ہدایت کا درجہ رکھتا ہے۔ مراحلِ زیست میں جب بھی ضرورت پیش آتی ہے تو دنیا کے سامنے اسی سفیرِ الٰہی کے قول و فعل کو نمونہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خالقِ کائنات کی جانب سے اس مُشتِ خاک کو تمام مخلوقات میں اشرف ترین ہونے کا جو شرف حاصل ہوا، اس کا سبب صرف یہی منصب تھا۔

ارشادِ ربانی ہوا: اِنّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیفَہ میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں

فرشتوں نے عرض کیا۔ "پروردگار! کیا آپ زمین پر ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتے ہیں جو خرابیاں پیدا کرے۔ جب کہ ہم آپ کی تعریف و ستائش کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں!"

ارشاد ہوا۔ "میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

تو یہ تھی انسان کی ابتدا جس کی جنّ و ملائک نے مخالفت کی، لیکن اس مخلوق کی حیثیت کیا تھی، یہ تو خالق ہی جانتا تھا۔ نطق و عمل سے آراستہ اس نفس کو، ایک عظیم ترین صنّاع کی صنعت سے زمانے کو روشناس کرانا تھا، ایک عظیم ذمّے داری ادا کرنا تھی اور اس کے لیے ایک خاص مقام اور مرتبے کی ضرورت تھی جس کی اہمیّت و عظمت کا اظہار بھی ضروری تھا لہٰذا حکم دیا گیا۔ "اسے سجدہ کرو!"

گویا کہ انسان کو تسخیر کی قوّت عطا کرنے سے قبل ہی کائنات کی ہر شَے کو مسخّر ہو جانے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ بے شک روئے سخن تو جنّ و ملائک کی جانب تھا، لیکن جھک جانے کا حکم تمام کائنات کے لیے تھا۔ یہ کیسا حکم تھا؟ جنّ و ملائک چونک گئے۔ نوری مخلوق ملائک جو نہ صرف اطاعت و بندگی

کرنے والے تھے، سجدہ ریز ہو گئے مگر جنّہ میں سے ایک اڑ گیا۔ غرور میں آ گیا۔ "آتشیں وجود تو میرا ہے، پھر یہ خاکی پُتلا لائق سجدہ کیوں ہے؟" یہ محض اعتراض ہی نہ تھا بلکہ مالکِ حقیقی کے رُو بہ رُو نافرمانی کی ابتدا تھی، انسان سے دشمنی کا آغاز تھا جو ہر چند کہ اس وقت انسان پر اثر نہ ڈال سکی کیوں کہ خدا نے اسے عقلِ سلیم بھی بخشی، قول وعمل کی آزادی دی اور تمام مخلوقات پر برتری بھی، لیکن یہی اوّلین نافرمانی انسان کے ساتھ طویل رقابت کی شکل اختیار کر گئی۔ عرض کیا: "میں تیرے بندوں کے معاملات میں رخنہ اندازی کر کے ان سے اپنی پیروی کراؤں گا، انھیں خواہشات اور آرزوؤں کے جال میں پھانس کر گمراہ کروں گا۔"

ارشاد ہوا: "جو نافرمانی میں تیرا ساتھ دیں گے، تیرے ہی ساتھی ٹھہرائے جائیں گے اور تمھارے پروردگار کی قسم ہم روزِ قیامت، ان سب نافرمانوں کو جمع کریں گے اور شیطانوں کو بھی، پھر ان سے جہنّم کو بھر دیں گے۔ ہاں جو تیرا ساتھ نہ دیں گے مستحقِ انعام ہوں گے۔"

یوں انسان نے بارِ خلافت کے ساتھ زمین پر قدم رکھا۔ وہ نائب تھا، مالک نہیں اور نائب کے ذاتی اختیارات تو کچھ بھی نہیں ہوتے۔ وہ تو بس مالک کے منشا و مرضی پر چلتا ہے۔ اس کا اپنی مرضی چلانا یا مالک کے سوا کسی اور کی اطاعت کرنا غدّاری اور بغاوت ہوتی ہے جسے اسلامی اصطلاح میں "شرک" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اب اس نائب کو بھی اپنے مالک و خالق کی بندگی کرنا اور اس کی ہدایات پر خود عمل کر کے دوسروں سے بندگی کرانا تھا جس کے لیے اسے عقلِ سلیم اور قوّتِ عمل بخشی گئی تھی اور اعتماد و عمل کی راہوں میں انتخاب و فیصلے کی صلاحیت ودیعت کی گئی تھی۔ اسی کے ساتھ اسے اپنے اس ازلی دشمن سے محتاط بھی رہنا تھا جس نے اس کی خلافت کو چیلنج کیا تھا اور تب سے ہر دم تاک میں تھا۔ اس طرح یہ سفر بڑا صبر آزما تھا۔ قدم قدم پر ضرورتیں آشکار ہوتی گئیں، آرزوئیں ساتھ چلتی گئیں اور انسان ان کی تکمیل کے لیے راہیں ڈھونڈتا گیا۔ بہت بڑا منصب تھا، بہت اہم فرض تھا اور لامحدود ذمّے داریاں تھیں۔ گویا کہ ایک مشتِ خاکی کو جیا تیانی

وجود بخشنے کے بعد خالقِ کائنات نے تکمیلِ کائنات کا کام سونپ دیا تھا اور یہی وہ فرض تھا جو اسے ادا کرنا تھا، یہی وہ ذمّے داریاں تھیں جن سے عہدہ برآ ہونا تھا۔

انسانی ذہن نے صدیوں انسان اور کائنات کی ابتدا پر غور کیا جس کا نتیجہ قیاس آرائیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کبھی سوچا کہ انسان کی ابتدا شرک اور تاریکی سے ہوئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس نے ترقّی کی اور اپنی سمجھ کے مطابق معبود ڈھونڈ لیے۔ پھر انسان نے خود ہی اپنے علم کے زور پر دعویٰ کیا کہ اس کی ابتدائی شکل بندر تھی جسے تدریجی ارتقا کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدّن نے موجودہ شکل دی اور علم نے اسے زندگی اور عبادت کے آداب سکھا دیے، لیکن یہ سب دعوے اور قیاس کم فہمی کا سبب ہیں۔ لوگ علم و حقیقت کی اساس پر نہیں، قیاس و گمان کے سہارے دعوے کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے، مگر قرآن کریم نے شروع دن سے ہی حقیقت بتا دی اور لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کہہ کر ان سب بے بنیاد گمانوں کی تردید کر دی۔ گویا کہ اس اشرف المخلوقات ہستی کی ابتدا نہ تاریکی سے تھی نہ شکلِ حیوانی سے بلکہ یہ انسان ہمیشہ سے عظیم تھا، حسین تھا۔ یوں اس سرزمین پر خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا کے مطابق ایک مرد اور ایک عورت نے زندگی کا آغاز کیا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ نفوس بڑھتے گئے اور ان کی وسعت کے ساتھ ہی احکامِ خداوندی بھی ملتے گئے۔ یہ بھی قدرت کا اصول ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کو جس شے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، قدرت اسے خود ہی مہیا کر دیتی ہے لہٰذا کرۂ ارض پر انسان کے لیے بے بہا نعمتوں کے ساتھ ساتھ اس نے سب سے زیادہ جس چیز کا اہتمام کیا، وہ اصلاح و ہدایت تھی۔ یعنی ایک معبودِ حقیقی کے احکام کی بجا آوری کے ساتھ اس کی تمام مخلوق کی بھلائی اور خیر کے کام: یہ ایک بہترین طریقِ حیات تھا۔ یہی راہ راست تھی اور یہی دین۔ نسلِ آدمؑ مدّتوں اس راہ پر چلتی اور اس دین پر قائم رہی۔ پھر انسان گھروں، خاندانوں، قبیلوں اور قوموں میں تقسیم ہوتا گیا اور جب، جس قوم کو جہاں بھی ہدایت کی ضرورت پیش آتی گئی،

قدرت الٰہی میں سے ان کی اصلاح کے لیے ہادی و معلّم روانہ کرتی گئی۔ ابتدا سے آج تک دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس میں خداوندِ عالم کی جانب سے اس کی اصلاح و ہدایت کے لیے کوئی تنبیہہ کرنے والا نہ آیا ہو۔ یہ سب رہبر و رہنما اپنا اپنا فرض ادا کرتے اور اپنی قوموں کو خیر کی تعلیم دیتے رہے۔ ان سب کی تعلیمات کا بنیادی اصول وحدانیت ہی تھا یعنی خدا ایک ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ گویا کہ ہر قوم اور ہر نفس کے لیے پہلا حکم یہی تھا کہ خالق کے سوا کوئی طاقت نہیں۔ ہر ہادی کی جانب سے اپنی قوم کے لیے یہی ہدایت تھی۔ ہاں اگر فرق تھا تو اتنا کہ کسی نے توحید کے اعلان کے ساتھ حلم و تحمّل کا درس دیا، کسی نے صلح و آشتی کے گُر سمجھائے، کسی نے شریعت کے قوانین بخشے، کسی نے اخلاق کی تعلیم دی، کسی نے گوشہ نشینی پر زور دیا اور کسی کے پاس دعاؤں کا بے بہا خزانہ تھا جس سے اس کی قوم نے تسکین پائی۔ الغرض یکے بعد دیگرے یہ سب آتے گئے اور ہدایات کا فرض ادا کرتے گئے، لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد اُن میں سے ہر قوم زندگی کی بے پناہ ضروریات کے سامنے ان کے دیئے ہوئے درس کو ناکافی جان کر ان میں ایجاد و اختراع کرتی گئی۔ ہر چند کہ انھیں اپنا طریق زندگی (دین) بھی عزیز تھا اور رہنما بھی لیکن زندگی کی وسعتوں کے سامنے یہ طریقِ زندگی محدود نظر آتا۔ جن کے پاس اخلاق تھا، وہ قانون طلب کرتے۔ جن کے پاس قانون تھا وہ اخلاق کی ضرورت محسوس کرتے۔ اس کیفیت میں ان کی تمام ہدایات انھیں خود ہی غیر ضروری نظر آنے لگتیں جو تکمیل و اتمام سے مجبور تھیں۔ اسی کشمکش میں مبتلا ہو کر تمام اقوام نے اپنے اوہام و قیاسات، تصوراتی فلسفوں اور اپنے وضع کردہ فقہی قوانین کو کلامِ الٰہی سے خلط ملط کر کے اپنی ضروریات و خواہشات کے مطابق ڈھال لیا اور پھر اپنی ہی آیندہ نسلوں کے سامنے اس طرح پیش کیا جیسے وہی کلامِ الٰہی ہے چنانچہ آج جب ہم ان تمام انبیاء کی مقدس زندگی اور ان کے لائے ہوئے الہامی دین کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی موجودہ خصوصیات حقیقت سے بعید تر نظر آتی ہیں۔ قرآنِ پاک نے جس عیسائیت کا تذکرہ کیا ہے، وہ تو خود اسلام کا ایک حصّہ ہے، لیکن آج اس کی موجودہ شکل کچھ اور ہی نظر آتی ہے۔ یہی حال

یہودیت کا بھی ہے کہ اس قوم نے خود کو دین کے مطابق نہیں بلکہ دین کو اپنی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا اور اصل تعلیمات بھول گئے۔ الغرض ہر مذہب اور ہر قوم میں نبیؑ کے رخصت ہو جانے کے بعد علمائے دین نے اس کی تعلیمات کو فروغ دینے کی بجائے مذہبی پیشہ وروں تک محدود کر دیا۔ پھر مذہب کے علم بردار ان احکام کو عبادت گاہوں تک ہی محدود رکھتے رہے اور خلائقِ عالم کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دیتے۔ یہ چیز عقیدے اور عمل میں زبردست بُعد لاتی رہی۔ وہ سمجھتے کہ مذہب صرف عبادت گاہوں تک محدود رہنے والی چیز ہے، عام زندگی میں سب من مانی کے لیے آزاد ہیں۔ اس طرح نہ وہ دین سے واقف ہوتے نہ اپنے نبیؑ کے حالات سے! نتیجہ یہ کہ آج انبیاءؑ میں ایسے خال خال ہی ہیں جن کی زندگی کے مفصّل حالات سے دنیا واقف ہے۔ جنابِ مسیحؑ کی تینتیس ۳۳ سالہ حیاتِ مقدس کے صرف تین برس دنیا کے سامنے ہیں۔ باقی کے لیے خود ان اقوام کی اپنی تاریخ خاموش ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی زندگی مکمل طور پر دنیا کی نظروں سے پنہاں نہیں ہے لیکن جب ایک محقق ان کی تعلیمات (توراۃ) کے تین صدی بعد کے زمانے کو دیکھتا ہے تو حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ نبیؑ کی حیات کے تین سو برس گزر جانے کے بعد جو تعلیم سامنے آئی، اس کی صداقت پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے علاوہ بھی دیگر انبیاءؑ کی زندگی کا بس وہی ایک شعبہ سامنے آتا ہے، یعنی قوم سے بحث و تکرار، ان کا ردّ و اقرار اور چند معجزے جو اُس دَور کی ضرورت تھے۔ اسی طرح سے آگے نظر ڈالیے تو فارس، ہندوستان، چین اور متعدد دیگر اقوام کے مصلحین اور رہنماؤں کی لائی ہوئی تعلیمات و ہدایات آج محض دلچسپ قصّوں سے زیادہ نہیں ہیں اور اگر ہیں تو تصاویر اور مجسّموں میں اس طرح گم ہیں کہ خود یہ اقوام بھی ان سے برگشتہ و بیزار نظر آتی ہیں، لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ ان اقوام میں ان کے معلّمین رشد و ہدایت کا صحیح فرض ادا نہ کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب تعلیمات ابدی اور عالم گیر نہ تھیں لہٰذا دیرپا ثابت نہ ہو سکیں اور اپنے اپنے وقت میں کچھ علاقوں تک محدود رہ کر ایجاد و اختراع کی نذر ہو گئیں کیوں کہ خالقِ کائنات کا منشا یہی

تھا کہ انسان مختلف اوقات میں مختلف انداز سے ہدایت پانے کے بعد خود کو ایک عالم گیر تعلیم کے لیے تیار کرلے، گویا خلاقِ عالم نے ایک مکمل، جامع اور ہمہ گیر کتاب عطا کرنے سے قبل متعدد صحیفوں اور کتابوں کے ذریعے انسان کو اس کے لیے تیار کیا تھا۔ اسی آخری سفارت کے لیے آنے والا وہ عظیم انسان تھا جسے تمام انبیاءؑ و رسلؑ اور مصلحین و معلّمین کی تعلیمات کی تکمیل کرنا تھی۔ دراصل اس سفیرِ الٰہی کی تشریف آوری کے لیے اس ایوان کا اہتمام کیا گیا تھا، اسی کے لیے اس مُشتِ خاک کو مخلوقات میں افضل ترین اور مسجودِ ملائک قرار دیا گیا تھا، اسی عظیم اور بلند مرتبہ مُعلّم کو بنی نوعِ انسان کی اصلاح و ہدایت کے لیے وہ درس دینا تھا جو ابد تک کے لیے آخری اور لائقِ عمل تھا اور جس نے اس کے دُنیوی و اخروی تمام مسائل کو حل کرکے اسے بہتری اور نجات کا اصل راستہ دِکھایا اور یہی وہ ہستی تھی جس کی آمد کی خبر اپنے اپنے وقت میں ہر پیغمبر نے دی۔

خلیلؑ اللہ نے اللہ کے حضور عرض کیا: "اے پروردگار، ان (آلِ اسمٰعیل) میں ایک پیغمبر مبعوث فرما جو تیری آیات پڑھ پڑھ کر انھیں سنائے اور کتاب و حکمت انھیں سکھائے اور (ان کے دلوں کو شرک سے) پاک کردے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔"

جنابِ مسیحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا: "اے بنی اسرائیل! میں تمھارے پاس خدا کا بھیجا ہوا رسولؑ ہوں جو کتاب مجھ سے پہلے آچکی ہے (تورات) اس کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک پیغمبرﷺ جو میرے بعد آئیں گے، اُن کا نام "احمدؐ" ہوگا، میں تمھیں ان کی خوش خبری سناتا ہوں۔"

قدرت انسان کو جس قدر بلند مرتبہ عطا فرماتی ہے۔ اسے اتنے ہی صبر آزما حالات سے گزرنا پڑتا ہے، اتنی ہی جدّوجہد کرنا پڑتی ہے۔ بنی نوعِ انبیاءؑ کے حالات کا مطالعہ کرکے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ قبولِ وحی کی استعداد اور مکمل تیاری کے لیے انھیں ایک طویل عرصے تک عملِ صالح اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان پاکیزہ اوصاف کے مالک ہوتے

ہیں جو معاشرے میں انھیں نمایاں مقام عطا کر دیتے ہیں۔ اخلاق و کردار کا حسن اور فضائل عوام الناس کو اس کی طرف مائل کر دیتے ہیں اور سیرت کی یہی خوبیاں ہوتی ہیں جو اس کے اردگرد کے تمام ماحول کو تجربات و آزمائش کے بعد مجبور کر دیتی ہیں کہ اسے راست باز اور صالح تسلیم کر لیں۔ نبوت کے فرائض کی ادائیگی کا وقت تو بہت بعد میں آتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابتدا ہی سے ان میں اور دیگر انسانوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ سیرت و کردار کا فرق، فکر و اظہار کا فرق، ظاہر اور باطن کا فرق اور علم و عمل کا فرق۔ الغرض بشر ہونے کے باوجود وہ بشر سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ کوئی بڑے سے بڑا معلّم اور حکیم اپنی قوم کو جو نصیحت کرتا ہے، زبانی یا تحریری ہوتی ہے۔ وہ خود اس پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتا، لیکن ایک نبیؑ جب اپنی قوم کو کوئی نصیحت کرتا ہے تو اس پر پہلے خود عمل کرتا ہے اور یہ فرق دراصل عمل کا نہیں بلکہ علم کا ہوتا ہے۔ کسی بھی معلّم یا دانش ور کے علم کا مخزن انسانی علم و تجربات ہی ہوتے ہیں جنھیں وہ طویل عرصے انسانوں میں رہنے سہنے، انھیں سمجھنے اور پرکھنے کے بعد سیکھتا ہے۔ اس کا علم کبھی کتابی ہوتا ہے اور کبھی اکتسابی۔ وہ جو کچھ حاصل کرتا ہے، انھی ذریعوں سے، پھر اسی کو تجربات و علم کا نام دے کر آیندہ نسلوں کی ہدایت کا ذریعہ بنا لیتا ہے، لیکن ایک نبیؑ کے علم کا مخزن تعلیم ربّانی، وحی اور الہام ہوتا ہے اسی لیے ہدایت سے قبل عمل کرنا اس پر لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی ہم عظیم انسانوں کی زندگی اور انبیاءؑ کی حیاتِ مقدّس کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان دونوں کی تعلیمات اور مخزنِ تعلیمات کے فرق بڑے نمایاں طور پر واضح نظر آتے ہیں۔

سقراط، افلاطون، ارسطو، فارابی اور ابنِ سینا ایسے دانش ور ہیں جنھوں نے خدا کو فہم و عقل سے جاننے کی کوشش کی اور اپنے اقوال و اعمال کو اپنے اپنے علوم کا ذریعہ بنا کر قوم میں ان کا پرچار کیا۔ ان سب کی تمام تر دعوت و حکمت عقل و دانش کی بنیاد پر تھی، لیکن نوحؑ و ابراہیمؑ، موسیٰؑ و عیسیٰؑ، داؤدؑ و سلیمانؑ اور یعقوبؑ و یوسفؑ نے عقل سے نہیں، خدا کو عقیدے سے جانا اور الہامی

کیفیات سے سمجھا اور اپنی تمام تر کاوشوں کو خداوندِ عالم کے حکم کے تابع فرماں کرکے خود کو مخلوق کی بھلائی کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی تمام تر دعوت خالق کی اطاعت پر قائم تھی۔ یہی سبب ہے کہ آج صدیاں گزر جانے کے باوجود ان ہدایات کی مصلحتیں اور حکمتیں انسان پر آشکار ہو رہی ہیں۔ کسی زمانے میں شراب کو حرام کہنا دقیانوسی سمجھا جاتا تھا، مگر آج بڑی بڑی ترقی یافتہ اقوام ایسی انجمنیں بنا رہی ہیں جو شراب کے نقصانات کا پرچار کرکے انسان کو اس کی تباہی سے بچانے کی کاوشیں کر رہی ہیں۔ دراصل یہ تعلیم اور مخزنِ تعلیم کا فرق ہے کہ انسانوں پر ان دو کی ہدایات کے اثرات بھی اتنے ہی مختلف انداز میں ظاہر ہوئے۔ ایک دانش ور یا حکیم کی تعلیم قول و عمل کی اصلاح کر سکتی ہے اور کر دیتی ہے، لیکن نبیؐ کی تعلیم و تلقین ایک عقیدے کی حیثیت سے سیرت و کردار میں ظاہر ہوتی ہے۔ تو یہی قلب و روح میں ایمان و عقیدہ پھونک دینے اور عملِ صالح کو نافذ کر دینے کا عظیم کام معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور چونکہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بنی نوعِ انسان کی اصلاح کے لیے آنے والے آخری نبیؐ تھے جن پر نبوت و رسالت کا سلسلہ تمام ہونے والا تھا اور مذاہبِ عالم کے صحیفوں میں سب سے مکمل صحیفہ نازل ہونا تھا، لہٰذا انھوں نے اس کی تشریح بھی (قول و عمل سے) سب سے بہتر کی اور نبوت و رسالت کی حقیقت اور اس منصب کی لازمی شرط کو سب سے احسن طریقے پر دنیا کے سامنے پیش کیا اور سمجھا دیا کہ یہ دینی ہی نہیں بلکہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

یہی دینِ اسلام ہے، لیکن یہ دین پہلی بار نہیں آیا تھا بلکہ اسلام اور اس کی تاریخ کا آغاز تو آدمؑ ہی سے ہو گیا تھا۔ جب دنیا کے اولین انسان نے اس زمین پر آکر "لا الٰہ اللہ" کہا تو سمجھیے اس دین کا آغاز اسی دن ہو گیا تھا۔ پھر وقت گزرتا رہا، خدا کی جانب سے اپنے بندوں کے لیے سفارت آتی اور اس اعلان کو دہراتی رہی کہ اللہ کے سوا کوئی طاقت نہیں اور اللہ ہی عبادت کے قابل ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ ٥

(ترجمہ۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے اور مرو تو مسلمان ہی مرو)

یہ ہدایت مسلسل ملتی رہی اور انسان دو جماعتوں میں تقسیم ہوتے گئے۔

اَنعمتَ علیہِم

مغضوبِ علیہِم

گویا صرف ہدایت پانے والے ہی نہیں بلکہ اس سے انکار کرنے والے بھی! اور ان دو کے انجام بھی واضح کر دیے گئے تھے۔ ایک جانب اطاعت کرنے والی جماعت کی کامرانیاں اور کامیابیاں تھیں اور دوسری طرف حق سے منکر، سرکش و گمراہ جماعت کی محرومیاں، مفصل بتائی جا رہی تھیں۔ اطاعت کرنے والے مسلمین اور انکار کرنے والے "منکرین" ٹھہرائے گئے۔ یہی وہ لوگ تھے جو شیطان کی پیروی کر رہے تھے اور یہ محرومیاں ان کی بداعمالی کی پاداش تھیں۔ قانونِ الٰہی کے مطابق دونوں جماعتوں کے لیے جزا اور سزا کا ایک دن مقرر کر دیا گیا تھا، جب ہر نفس کو اپنے اپنے اعمال کا حساب دینا تھا۔

الغرض انسان کی رُشد و ہدایت کا سلسلہ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہوا اور وَرَضِیتُ لَکُمُ الاِسلَامَ دِیناً کہہ کر کسی بھی اور دین پر پابندی لگا دی، گویا اسلام کو انسان کے لیے طریقۂ حیات (دین) کے طور پہ پسند کر لیا گیا اور یہ بھی وضاحت کر دی گئی کہ دنیا کا ہر دین اسی کی دعوت دیتا ہے، یعنی دنیا کا پہلا دین بھی وہی ہے، آخری بھی وہی اور ہر دین وہی ہے اس کے ساتھ ہی، وَمَن یَبتَغِ غَیرَ الاِسلَامِ دِیناً فَلَن یُقبَلَ مِنہُ کہہ کر بجز اس (طریقۂ زندگی کے) کے کوئی بھی دوسرا طریقہ قبول نہ کرنے کا اعلان فرما دیا۔ اس طرح اوّل سے آخر تک ہر مذہب کا بنیادی اصول اسلام ہے اور ہر مذہب میں ایمان لانے والوں کی تاریخ اسلام کی تاریخ ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ جسے آج ہم اسلام کی تاریخ کہتے ہیں، وہ دراصل مسلمان قوم کی تاریخ ہے جس کی ابتدا اُسی عظیم ہستی سے ہوئی جو کُل عالم کے لیے ہدایت بنا کر بھیجی گئی تھی۔

معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم ایک نبیؐ تھے، ایک رسولؐ تھے اور انسانوں کو ہدایت دینے کا یہ فرض ایک نبیؐ کا فرض تھا، کسی دانشور یا حکیم کا نہیں اور نہ ہی کسی مقنن کا۔ مقنن تو قانون وضع کرتا ہے جو جرائم کی روک تھام کے لیے اجتماعی طور پہ نافذ

کیے جاتے ہیں جس کے بعد لوگ سزا کے خیال سے جرائم کا ارتکاب کرتے ہوئے ڈرتے ہیں، لیکن یہ کیسا قانون تھا جو اجتماع پر نہیں بلکہ قلب و ذہن پر لگ گیا تھا! پھر لوگوں نے خوف زدہ ہو کر نہیں بلکہ خالق کی محبت سے جرم و گناہ ترک کر دیے تھے۔
یہ فیاضِ عالم کی ہدایات کا روحانی اثر تھا یا تلقین کی کرامات جس نے بندوں کو خالق سے خوف زدہ کرنے کی بجائے ان کے دلوں کو اس کی محبت سے بھر دیا، دُور لے جانے کی بجائے قریب تر کر دیا تھا کہ خدا کے اوصاف محبت کے متقاضی ہیں نہ کہ خوف و ہراس کے۔ تب انسان کو پہلی بار احساس ہوا کہ خالقِ کائنات تو بخشنے والا مہربان ہے، جاننے والا اور سننے والا ہے اور صرف وہی ہے جو بنا مانگے عطا کرتا ہے۔ الغرض عبد اور معبود کے درمیان محبت کا رشتہ جُڑ گیا، دُوریاں مٹ گئیں، فاصلے تمام ہو گئے۔ اب بندگی و اطاعت بہ مجبوری نہیں بلکہ بہ سبب محبت کی جانے لگی۔ مایوسی کی جگہ امید اور وحشت کی جگہ محبت نے لے لی تو انسان نے اپنے خالق کے احکام کی بجا آوری کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دی۔
یہ اندازِ ہدایت بڑا انوکھا اور پُرکشش تھا جس نے معلّمین میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو "معلّمِ اعظم" کا مقام بخش دیا کیوں کہ صرف آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی وہ معلّم ہیں جنھوں نے نصیحت و ہدایت سے قبل خود عمل کیا، اپنے ہر قول، ہر فعل کو خدائی احکام کے سانچے میں ڈھالا اور پھر بنی نوعِ انسان کی اصلاح کا آغاز ایک بدوی قوم سے کیا، وہ بدوی قوم جو لاتعداد برائیوں میں مبتلا اور اندرونی و بیرونی خطرات میں گھری ہوئی تھی! ان کے ہر گھر کا معبود اور ہر قبیلے کا سردار جدا جدا تھا۔ ان کا ذریعۂ معاش ہی غارت گری تھا۔ ان کے افراد تجارت کم اور جنگ و جدل زیادہ کرتے تھے اور محض اپنی روزی کمانے کے لیے یا اپنی برتری جتانے کے لیے برسوں ایک جنگ کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ وہ مخالفت اور انتقام میں حد سے گزر جانے والے تھے اور محض اسی سبب ان میں اضطراب و بے امنی عام تھی۔ ان کی اکثریت علم سے بے بہرہ صرف اسلاف کے طریقوں پر فخر و ناز کرتی اور تقلیدِ آباء پر مُصر تھی۔ ان میں انسانیت کا فقدان اس قدر تھا کہ اپنی ہی اولاد کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ ایسی قوم کو مہذب بنانا دشوار ہی نہیں ناممکن کام تھا اور ان کی

اصلاح و ہدایت کے لیے یقیناً انسانی تدبیر و کاوش بیکار تھی۔

یہ کام کس طرح ہوا؟

کفر و ضلالت کی تاریکیاں کیسے مٹیں؟

یہ نجاست آلودہ قوم کیسے ایک پاکیزہ معاشرے میں ڈھلی؟

یہ سب جان کر آج کا انسان متعجب و متحیر ہو کر اس عظیم انقلاب کو معجزے سے تعبیر کرتا ہے۔ واقعی چند برس کے اندر اندر تہذیب سے ناآشنا قوم کو شعور و فہم عطا کرنا، اخلاق و ذوق بخش دینا ایک معجزہ ہی تھا جس کے بعد وہ ایک متمدن معاشرے میں تبدیل ہو کر اقوامِ عالم کی رہنمائی کے قابل بن گئی۔

یہ اصلاح و ہدایت بنی نوعِ انسان کی بہتری اور خیر کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے اور خود خالقِ کائنات نے اس بات کی گواہی دی "اسوۂ حسنہ سے بہتر کوئی نمونہ نہیں"۔ سیرتِ پاک حیاتِ انسانی کے ہر لمحہ و ہر ساعت، ہر دور اور ہر مقام کے لیے نمونہ ہی نہیں، رہنما بھی ہے۔ ان کی تعلیم کی وسعت بحر و بر پر محیط ہے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ معلّم ہیں جن کی تعلیم حروف و تحریر کی محتاج نہ تھی بلکہ زبانِ مبارک سے ادا ہو جانے والا ہر لفظ قلب میں اتر جاتا اور روح میں بس جاتا تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ داعی تھے جن کا دعویٰ حق کی جانب سے تھا اور حق تھا اور اسی تعلق کے سبب خداوندِ عالم نے خود کو "ربّ العالمین" اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو "رحمت اللعالمین" کہا کیوں کہ یہی وہ ذاتِ اقدس تھی جو کل عالمین کے لیے رحمت بنی۔ جو ایمان لائے، دنیا اور آخرت میں انعام کے مستحق ٹھہرے اور جو منکر ہوئے، شفقت اور دعاؤں سے وہ بھی محروم نہ رہے۔ یہ رحمت ہی تھی کہ مکے کے گلی کوچوں میں اور طائف کے بازاروں میں اذیتیں برداشت کرنے کے بعد بھی دعائیں دیں، دُکھ دینے والوں کی بھلائی چاہی۔ یہ جذبہ انسانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ فیضانِ رحم وحوش و طیور کے لیے بھی عام تھا۔ رحمت اللعالمین کے یہی معنی نہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سراپا رحمت تھے بلکہ حقیقت یہ تھی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خالقِ کائنات کے خزانۂ رحمت کی مکمل و مجسّم صورت تھے۔ فیاضِ عالم نے اپنے خزانے سے ہر نعمت کو کسی نہ کسی صورت میں ڈھال کر انسان کے سامنے پیش کیا، اسے کوئی نہ کوئی نام بخشا تاکہ انسان

اِن نعمتوں سے روشناس ہو سکے۔ تو خزانۂ رحمت و محبّت کے لیے اُس نے جس ہستی کو منتخب فرمایا، وہ آپ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) کی ذاتِ اقدس تھی جو عالمین کے لیے سراپا محبّت وعنایت تھی۔ ارض و سما، خلا و فضا، حیوانات، نباتات و جمادات الغرض کہ ہر جگہ یہ جذبہ کارفرما ہے اور یہی وہ صفت تھی کہ اِنّمآ اَنَا بشرٌ کہنے کے باوجود جس نے آپ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) کو بشریّت سے بہت بلند کر دیا کہ بشر ہونا ہی انسانیّت کے لیے باعثِ فخر و افتخار ہے۔ وہ تو بشر بھی ہیں بشیر بھی، خازن بھی ہیں اور خزانہ دار بھی کیوں کہ وہ محمدؐ ہیں جن کی حمد کی گئی، اس طرح کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے اپنے علم و رسائی کے مطابق الٰہی کا ثنا گستر ہے، قطرہ قطرہ مدّاح ہے۔ وہ ذکرُ للعالمین (قرآن پاک) کے امین ہیں۔ قرآن مجید الٰہی کو بخشا گیا جو خالق کے جملہ احکام کا مجموعہ ہے جس کے ہر حکم کو بہ صورتِ عمل مخلوق کے سامنے پیش کر کے اسے مالکِ حقیقی سے روشناس کرانا تھا۔

یہ تو اصلاح و تعلیم کا آغاز تھا، مگر آپ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) کی حیاتِ مقدّس کا مقصد تو نسلِ آدمؑ کو سواء السبیل سے روشناس کرانا تھا اور اس مقصد کی گواہی خود قرآن کریم نے اس طرح سے دی "(اے محمدؐ) کہہ دیجیے کہ میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا رسولؐ ہوں جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔"

یہ آیاتِ قرآنی تمام انسانیّت کے لیے اُن کے ہادی اور رسولؐ ہونے کی گواہی دیتی ہیں اور خدا کی وحدانیت اور مالک ہونے کا اعلان کرتی ہیں، یعنی خدا نے مجھے تم سب کی طرف بھیجا ہے جو ملک السّمٰوات والارض ہے اور جب ایک ہی خالق و حاکم کی حکمرانی و فرماں روائی ہے تو اس کی خدائی کے لیے پیغام بھی ایک ہی ہونا چاہیے لہٰذا آپ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) کو کُل عالم کی اصلاح و ہدایت کا کام سونپا جو قطعاً آسان نہ تھا۔ خالقِ کائنات نے اپنی مخلوقِ اعلیٰ کے لیے زندگی کے کچھ اصول وضع فرمائے تھے جو حکمت و ہدایت کا سرچشمہ تھے، زندہ جاوید تھے اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کی بہتری کے لیے ضروری تھے، لیکن انھیں محض اس مخلوق کے سامنے سنا دینے سے اس کا فرض ادا نہ ہوتا تھا بلکہ ہر اصول پر کاربند ہو کر، ہر حکم پر عمل پیرا ہو کر اور خود کو ایک نمونہ بنا کر ہدایت کا یہ عظیم کام سرانجام

دینا تھا۔ بہ الفاظِ دگر ایک فرد کو تنہا، بغیر کسی ہتھیار اور بغیر کسی فوج کے فتوحات کا کام کرنا تھا، فتوحات علاقوں کی نہیں قلوب کی! اور دلوں کو تسخیر کر لینا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ رُشد و ہدایت کا یہ کام بڑا مشکل اور صبر آزما تھا، خاص طور پر اس وقت جب کہ انسان نہ صرف بگڑا ہوا تھا بلکہ اپنی راہ سے بھٹکا ہوا بھی تھا اور انسانیت کے مقام سے گر چکا تھا۔ ویسے بھی یہ بہت بڑی حقیقت ہے کہ کسی بھی مخلوق کی تہذیب کا کام اتنا دشوار نہیں جتنا کہ انسان کی کیوں کہ یہی وہ واحد مخلوق ہے جو یقین کرنے اور قبول کرنے کے لیے قول سے زیادہ عمل کی طلب گار ہوتی ہے۔ اس کام کو معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس طرح تکمیل تک پہنچایا کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ یہ تعلیم ظاہری بھی تھی اور معنوی بھی! حکمت و دانائی بھی تھی اور دانش بھی! اور اس کے ساتھ عمل کا مفہوم بھی شامل تھا۔ اسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے خداوندِ عالم نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے اس طرزِ عمل کو احسان سے تعبیر کیا ہے: ارشادِ ربّانی ہے۔

"خدا نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا کہ ان میں سے انھی کے درمیان ایک رسول ﷺ کو مبعوث کیا جو انھیں خدا کی آیات پڑھ پڑھ کر سناتا اور پاک کرتا ہے اور خدا کی کتاب و حکمت کی باتیں بتاتا ہے ورنہ پہلے تو یہ لوگ صریحاً گمراہی میں تھے!"

اب جس گمراہی و ضلالت کی گواہی خود قرآن نے دی ہو، وہ کیا ہو گی، اس کا اندازہ تاریخ سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہی وہ زمانہ تھا جب دنیا اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں بھلائی اور خیر کا کوئی تصوّر باقی نہ رہا تھا، زندگی کے تمام شعبے فساد سے پُر اور مجموعی خیر سے محروم تھے۔ ایسے میں انھیں ایک ہمہ گیر اصلاح اور انقلاب کی ضرورت تھی۔ انسان ایک رہبر و مصلح کا متلاشی تھا۔ تب قادرِ مطلق نے اسی تباہ حال انسان کو گمراہی سے نکالنے کے لیے اس نجات دہندہ کو بھیجا جس نے آدمؑ کی گم کردہ راہ اولاد کو صراطِ مستقیم سے آشنا کیا اور وہ درس دیا جو قیامت تک اس کی فلاح و بہبود کے لیے آخری اور جملہ برائیوں کو ختم کر دینے والا تھا۔ اسی نے دنیا میں امن و امان قائم کر کے پھر اس بھٹکے ہوئے انسان کو احکامِ خداوندی کی بجا آوری کے قابل بنا دیا۔ یہی انقلاب تھا جس سے ایک نیا معاشرہ وجود میں آیا اور یہ غیر مختتم جنگ کے جال میں محصور اور انسانی خون سے پیاس بجھانے والے غارت گر لوگ

تہذیب واخلاق، ایثار و قربانی کا اعلیٰ نمونہ بن گئے اور نا اتفاقی کے شکار منتشر نفوس اس تعلیم کے اثر سے ایک جسم و جاں کے مانند ہو گئے۔ پھر دشمنی کی جگہ دوستی نے لے لی۔ بُغض و حسد جاں نثاری میں بدل گئے اور طبقوں میں بٹے ہوئے انسان ایک صف میں آ گئے۔ اب ان کی غرض اپنی ذات کا فائدہ نہیں بلکہ دوسروں کی خدمت تھی۔ یہی حسین انقلاب، اسلام ہے۔

اسی کے بعد انسان نے یہ جانا کہ اس عظیم صنعت کا کوئی صنّاع ضرور ہے۔ ہر ذی روح کا کوئی خالق اور ہر شے کا رب ہے، جس کے سامنے ان سب کو جواب دینا ہے لہٰذا ان میں سے کسی کی آزادی اور کسی کے حقوق کو پامال نہیں کیا جا سکتا۔ عجیب بات تھی کہ اسی عقیدۂ توحید نے ایک جانب تمام استحصالی قوتوں کا خاتمہ کر کے انسان کو غلامی سے نجات دے دی تو دوسری جانب (اسی عقیدۂ توحید نے) اسے ایک رب کے سامنے جھکا کر فکر و غم اور اندیشوں سے بے نیاز کر دیا۔

"لا اِلٰہ" یہ وہ الفاظ انسان کو فطرت کے عین مطابق آزادی کا مژدہ سناتے ہیں، وہ آزادی، وہ خود مختاری، وہ بڑائی جسے ازل سے انسان نے اپنے لیے پسند کیا، اللہ کا نائب ہونے اور مخلوقات میں افضل ترین ہونے کے ناتے جس پر وہ اپنا حق سمجھتا ہے، وہ آزادی جس کے حاصل کرنے کے بعد اس کے تمام حقوق محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ان دو الفاظ کو ادا کرتے ہی، لگتا ہے کہ ہر قید سے نجات پا کر ایک آزاد فضا میں سانس لے رہا ہے۔

کیسی حسین آزادی ہے!

کیسی سکون بخش نجات ہے!

انسان کی فطری طلب اور ازلی خواہش کہ اس پر کوئی مسلّط نہ ہو، کوئی حاوی نہ ہو، وہ آزاد ہو، آج پوری ہو گئی۔

لا اِلٰہ ابھی وہ اس سکون بخش احساس سے مسرور ہو رہا ہے اس مژدۂ جانفزا کو دُہرا رہا ہے کہ ارشاد ہوتا ہے۔ "اِلَّا اللّٰہ"

تب فوری طور پر محسوس ہوتا ہے کہ کوئی نگہبان و محافظ موجود ہے، یعنی متعدد آقاؤں اور لا محدود طاغوتی طاقتوں سے نجات ہے، لیکن مت بھولو کہ ایک آقا

اور ایک مالک موجود ہے جو نگہبان اور پاسبان ہے اور اس مالک کی موجودگی انسان کی خود مختاری پر کوئی اثر نہیں ڈالتی، عظمت و سربلندی کو پامال نہیں کرتی، اُس کے حقوق سلب نہیں کرتی۔ وہ کوئی استحصالی قوّت نہیں، ہاں توی ضرور ہے جو بھٹک جانے سے روک دیتی ہے، گویا عقیدۂ توحید نے انسان کو باطل کی تمام قوتوں سے نجات دینے کے بعد اس کے لیے ایک راہ متعیّن کر دی۔

یعنی کہ آزادی و خود مختاری تو ہے، لیکن کچھ حدود میں رہ کر۔

ہر عیش و آرام پر تمھارا حق ہے، لیکن کسبِ حلال اور محنت کے بعد۔

تمھیں اس کائنات کی ہر شئے پر کُلّی اختیار ہے، لیکن دوسروں کو محروم کر کے نہیں۔

یہاں ہر نعمت، ہر تعیّش تمھارے لیے ہے، لیکن ان پر دوسروں کا بھی وہی حق ہے جو تمھارا کیوں کہ جس مالکِ حقیقی نے تمھیں انسان پیدا کیا ہے اور تمام استحصالی طاقتوں سے نجات دے کر آزادی بخشی ہے، وہ دوسروں کا بھی اللہ اور رب ہے۔ اس نے ان سب کو وہی حقوق بخشے ہیں جو تمھیں لہٰذا تم کبھی بھی ان کے حقوق پامال نہیں کر سکتے اور خوب جان لو کہ اب کوئی فرعون اپنی خود ساختہ خدائی کے دربار نہیں سجا سکتا، نہ اسلاف کے بت معبودیت کی علامت بن سکتے ہیں کیوں کہ حق و باطل کی حقیقت آشکار ہو چکی۔ یہ بات واضح ہو چکی کہ اللہ کسی کا محتاج نہیں، اس کا نمائندہ اور پیامبر نبیؐ ہے، یعنی محمدؐ رسول اللہ۔

اس نبیؐ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور نبیؐ کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے۔

اس طرح یہ مختصر سا کلمہ (لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ) ایک جانب خدا کی وحدانیت اور لامحدود قوّت کا اعلان کر کے رسولؐ کے مقام و حیثیت کی وضاحت کرتا ہے اور دوسری جانب انسان کے لیے ایک راستہ متعیّن کر دیتا ہے۔

یہ قانون گویا قانونِ الٰہی ہے جو ازل سے ابد تک انسان کو کچھ ضروری اور مناسب پابندیوں میں رکھ کر آزادی عطا کرتا ہے۔

پھر یہ وضاحت بھی کر دی گئی کہ اس قانون کی خلاف ورزی کرو گے تو انجام جانتے ہو! وہ یہ کہ تمھیں اس پوری زندگی کا حساب اسی مالکِ حقیقی کو دینا ہے

جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جس نے تمھیں جمع کرنے کا ایک دن مقرر کیا ہے جب تمھیں لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔

"فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ" تو یہ ہے وہ آزادی جو اسلام نے انسان کو عطا کی۔ جس نے ہر بڑائی اور خود مختاری عطا کرنے کے ساتھ اسے خطرات سے بے نیاز کر دیا اور یہی آزادی دراصل انسان کی فطری طلب و خواہش ہے۔

عصرِ حاضر کا انسان جس دور میں سانس لے رہا ہے، وہاں وہ ہر قسم کی آزادی حاصل ہونے کے باوجود غیر مطمئن ہے۔ مطلوبہ ہر شئے میسر، جذبات کی تسکین کا ہر سامان موجود، لیکن ان سب سے بیزار، کسی شئے کی ہوس اور خوب سے خوب تر کی تلاش، ہر لحہ نئی تبدیلی، ہر ساعت نئی طلب، مستزاد یہ کہ خود سمجھ نہیں پاتا کہ اس کی آرزو کیا ہے!

یہ کیسی گھٹن ہے؟ کیسی قید ہے؟

اس کیفیت کو وہ مختلف نام دیتا ہے اور یہی احساس اُسے پابندیوں کا احساس دلاتا ہے۔ تب وہ "آزادی، آزادی" کی رٹ لگاتا ہے، لیکن پھر وہی عالم پھر وہی حال کہ سب کچھ مل جانے کے باوجود تہی داماں، مضطرب و بے قرار!

وہ خود نہیں جانتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی طلب و خواہش یہی آزادی ہے۔ ایک متعین و محدود خود مختاری جس کی ضمانت صرف توحید نے دی ہے، یعنی دوسروں کے حقوق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے (حقوق) کی حفاظت کرنا!

اپنی عزت اور وقار کے ساتھ ساتھ دوسروں کی آبرو کا احترام کرنا۔

اپنے آرام و آسائش کے حصول کے ساتھ ساتھ دوسروں کے سکون کا خیال کرنا۔

یہی چیز آج مفقود ہے۔

آج کا انسان خود اس تصوراتی زندگی کی آرزو تو کرتا ہے، لیکن دوسروں کے جذبات و احساسات کو سمجھ نہیں پاتا حالانکہ روزمرہ زندگی کے یہ تمام مسائل حل کرنے کے لیے معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے مختصر ترین الفاظ میں بہت بڑا درس دیا ہے آپؐ نے فرمایا "جو اپنی ذات کے لیے پسند کرو، وہی دوسروں کے لیے پسند کرو"

اگر صرف اسی حدیث شریف پر عمل کیا جائے تو معاشرے کے لیے ایک اچھا انسان بننے اور معاشرتی زندگی کی ہر ذمے داری کو خوب صورتی کے ساتھ ادا کرنے کے لیے پھر کسی اور تعلیم کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہی نہیں بلکہ زبانِ مبارک سے نکلا ہوا ہر لفظ، ہر قول اتنا ہی جامع و مکمل ہے کیوں کہ سیرتِ مطہرؐ کا سب سے نمایاں پہلو اخلاق ہی تھا۔ آپؐ نے فرمایا "تم میں بہتر وہ ہیں جن کے اخلاق بہتر ہوں"۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایمان کے لحاظ سے کامل ترین مومن وہ ہے جس کا اخلاق سب سے بہتر ہو"۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سخت گو اور تند مزاج نہ تھے، نرم گو اور خوش کلام تھے اور اسی کی تلقین فرماتے تھے۔ آپؐ نے معاملات میں حسنِ سلوک اور اخلاق کی اس درجہ ہدایت فرمائی ہے کہ اس مختصر سے لفظ اخلاق کی وسعت لامحدود نظر آنے لگتی ہے۔ غور کیا جائے تو اس لفظ (اخلاق) میں بھلائی اور خیر، شفقت و محبت، مہربانی اور احسان، ایثار و قربانی، خوش کلامی و خوش مزاجی، خدمت و اطاعت اور امانت و صداقت الغرض دنیا کا کوئی حسین کام، کوئی حسین جذبہ اور ظاہری و باطنی عمل کی کوئی خوب صورتی اس کے معنی سے باہر نہیں ہے۔ زیست کا کوئی شعبہ ہو، عمر کا کوئی حصہ ہو اور دنیا کا کوئی گوشہ ہو، اسی ایک لفظ کی اجارہ داری نظر آتی ہے۔ صرف اس ایک ہدایت پر عمل کر کے انسان، انسانیت کی معراج تک پہنچ سکتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ معاشرے میں بہترین کردار ادا کر سکتا ہے، دوسروں کو بڑی آسانی سے خوشیوں سے نواز سکتا ہے بلکہ خود بھی اس مقام کو پا سکتا ہے جس کی اسے طلب و جستجو ہے، مگر وہ علم کی نت نئی راہیں تلاش کر کے ہر عروج و ترقی کے باوجود بے سکون ہے، محرومی و ناکامی کا شکار اور احساسِ تنہائی میں مبتلا ہے اور خود ان کیفیات کی وجہ بھی نہیں سمجھ سکتا اور نہیں جانتا کہ یہ انسان، خلیفۃ اللہ اور اشرف المخلوقات ہستی جسے خداوندِ عالم نے اپنا نائب بنا کر کُلّی اختیارات بخشے تھے، آج ہر نعمت پا لینے کے باوجود محروم ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مادی ترقی ہی انسان کا مطلوب و مقصود ہے تو پھر خلاؤں میں پرواز کرنے اور ماہ و مریخ کو روند دینے کا دعوے دار یہ انسان محروم و ناکام کیوں ہے؟

یہ کیسی محرومی ہے؟ کیسی ناکامی ہے؟

ان سوالوں کا ایک ہی جواب ہے، وہ یہ کہ یہ انسان اپنے مقصد سے ہٹ گیا ہے، اپنے رب کو بھول گیا ہے اور اس تعلیم کو بھول گیا ہے جس نے اسے بلند مرتبہ، عزت اور سکون ایسی نعمتوں سے آشنا کیا تھا۔

اسلام ایک عظیم انقلاب ہے جو زندگی کے کسی ایک شعبے کے لیے نہیں بلکہ تمام شعبوں کے لیے ہے اور فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے، اس سے بہتر طریقہ ممکن نہیں۔ یہ حسین طریقۂ زندگی (دین) بنی نوعِ انسان کے لیے نہ صرف مکمل طریقۂ زندگی ہے بلکہ نجات کا پیغام بھی ہے۔ اس کا اوّلین مقصد سلامتی ہے اور اس کی پیروی کرنے والوں کا انجام بھی سلامتی ہے۔ انسان کے لیے یہی طریقۂ حیات (دین) وہ رحمت ہے جس کی حریف دنیا کی کوئی قوم ہو سکی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ ہر چند کہ اس کی مخالفت ہر قوم نے کی اور آج تک کی جا رہی ہے، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ جس قدر مخالفت کی گئی، اسی قدر دنیا نے تہذیب و تمدّن، اخلاق و شائستگی اور عظمت و سربلندی کے اصول اسی دین سے سیکھے اور علم و حکمت کے خزینوں سے جھولیاں بھر لیں۔ وہ عظیم ترین معلّم جس نے دنیا کو قعرِ مذلّت سے نکال کر بامِ عروج تک پہنچا دیا، ایک اُمّی تھا۔ وہ جس نے خود کسی تربیت گاہ سے تربیت حاصل نہیں کی تھی، کسی درس گاہ سے تعلیم نہیں پائی تھی، اس نے علم کے ہر شعبے میں ایک انقلاب بپا کر دیا اور علم و دانش کے ایسے ایسے نکتے بیان کیے جن کے معنی و مطالب آج، علم کے عروج پر پہنچ جانے کے بعد انسان پر منکشف ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

آج چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد انسانی فکر کے لیے یہ بات وجہِ تحیّر ہے کہ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم)، جو نہ طبیب تھے نہ عالم، نہ سپہ سالار تھے نہ حاکم،

نہ معلّم تھے، نہ امام اور نہ منصف تھے نہ مقنّن ، انھوں نے آخر کس طرح ان سب فنون سے زمانے کو آشنا کر دیا؟ کس طرح صحّت اور حفظانِ صحّت کے اصول سمجھا دیے اور یقین دلایا کہ مَا اَنزَلَ اللّٰہُ دَاءً اِلَّا اَنزَلَ لَہُ شِفَاءً (اللہ نے جتنی بیماریاں رکھی ہیں ان کی شفا بھی رکھی ہے) سائنس کی ترقی سے تو آج انسان نے لاعلاج امراض کے علاج دریافت کیے ہیں، لیکن چودہ سو برس قبل یہ بات کیسے کہہ دی گئی تھی؟

انھوں نے کس طرح سے سیاست کو دین کے تابع کر دیا اور سیاست کی بنیاد مکر و فریب سے ہٹا کر توحید و رسالت اور خلافت پر رکھ دی؟

کیسے معیشت و اخلاق کے درمیانی سب فاصلوں کو مٹانے کے لیے انھوں نے اَھُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّکَ سے اس کی مصلحت سمجھا دی اور آخر کس طرح سے قوّت و فقر کو منسلک و مربوط کر دیا؟ وہ ہستی جس نے کہیں سے اصولِ جنگ نہیں سیکھے تھے، اس کی تیار کردہ سپاہ کی برابری دنیا کی بڑی بڑی قومیں نہ کر سکیں۔ اس کی جنگی مصلحتیں قانون بن گئیں اور اس نے جنگ و جدل کو عبادت اور جہاد بنا دیا۔ وہ استاد نہ تھے، لیکن ان کی درس گاہ سے نکلنے والا ہر فرد ہمہ صفت موصوف تھا، بہ یک وقت مسلمان بھی اور سیاست داں بھی، سپہ سالار بھی، منتظم بھی، عالم بھی اور عادل بھی!

آج جب ہم بڑے بڑے معلّمین کی زندگی کو دیکھتے ہیں تو کوئی ایک شاگرد ہی اس کے علم کا امین نظر آتا ہے، لیکن درس گاہِ محمدی کا ہر طالبِ علم اُس عظیم معلّم کا امین ہی نہیں بلکہ اسے حق داروں تک پہنچانے کا ذمّے دار بھی نظر آتا ہے۔ الغرض اس اُمّی انسان نے اولادِ آدمؑ کو خلافتِ ارضی کے معنی سمجھا دیے اور یہ سب کچھ بہت کم وقت میں ہو گیا جس کے بعد معاشرے میں کسی طاغوتی قوّت کی گنجائش باقی نہ رہی۔ ہر فرد کو اس کا حق مل گیا۔ انھی اصولوں پر چل کر قومیں ترقی یافتہ کہلائی جانے لگیں۔ کیا یہ سب انسانی تعلیم تھی؟ کسی صحبت کا نتیجہ یا تجربات کا حاصل تھا؟

نہیں، ہرگز نہیں بلکہ زندگی کے ہر گوشے میں یہی آداب و اندازِ نبوّت و رسالت

کے گواہ تھے ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ بچہ جو پیدائش سے قبل باپ کے سائے سے محروم ہو گیا اور شعور آنے سے قبل ماں کی آغوش سے، پھر ہر تربیت دینے والی ہستی ساتھ چھوڑتی رہی، اس کے بعد اس بچے کے لیے صرف یہی رہ گیا تھا کہ وہ گلّہ بانی کرے اور جوان ہونے کے بعد تجارت میں مصروف ہو جائے، (اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ) اس کی دنیا کس قدر مخصوص و محدود ہو گی! اس الگ تھلگ انسان نے ایک ایسے ماحول میں، جہاں نہ درس گاہیں تھیں نہ تربیت گاہیں، نہ کتب خانے تھے نہ اشاعتِ علم کے ذرائع، بچپن، لڑکپن اور جوانی کی عمر اس طرح گزاری کہ نہ اسے محفلیں پسند تھیں اور نہ داستان گو حضرات کی مجلسیں گوارا۔ یوں تمام عمر اسے لکھنا پڑھنا آیا اور نہ کسی کی صحبت نے اثر ڈالا۔ بگڑتے ہوئے حالات اور گزرتے وقت کے ساتھ سب سے جداگانہ فطرت کے مالک، صلح پسند، بدمعاملگی اور دروغ گوئی سے بچنے اور ضرورت مندوں کی مدد کرنے والے اس سلیم الفطرت انسان کی تنہائی بڑھتی اور غور و فکر کی عادت پختہ سے پختہ تر ہوتی گئی۔ اپنے ماحول سے اس کا تعلق صرف اتنا تھا کہ اس سے معاملہ رکھنے والا ہر نفس علیحدہ علیحدہ اسے اپنا دوست اور خیر خواہ سمجھتا تھا کیوں کہ ہر فرد کے ساتھ اخلاق برتنا اور اس کے دُکھ درد کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرنا اس کی عادت تھی۔

اس طرح زندگی کے چالیس برس گزر جاتے ہیں۔ تب وہ ایک دَم پکار کر سب کو جمع کرتا ہے، ہجوم بن جاتا ہے، محفلوں اور مجلسوں میں گھُستا ہے اور اس دور کی محبوب ترین ہر طاقت کو باطل قرار دے کر ایک اَن دیکھی قوّت کے ازلی اور ابدی ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ اس کی عبادت اور بندگی کا حکم دیتا ہے اور اپنی قوم کو وہ اصول عطا کرتا ہے جن کا تصوّر اس وقت دنیا کے کسی بھی گوشے میں نہیں تھا۔ ان اصولوں پر عمل کرانے کے لیے اُسے جن کٹھن حالات سے گزرنا پڑا، ان کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اُس کا صبر و تحمّل، استقلال اور ناقابلِ برداشت مصائب کے مقابلے میں اپنے مقصد پر ڈٹے رہنا ہی نبوّت و رسالت کی دلیل تھی۔ اس کے بعد کسی اور معجزے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

قرآن کی اصطلاح میں انسان کی عظمت دو چیزوں میں پنہاں ہے، ایمان اور عمل صالح! انھی دو چیزوں کی تشریح معلّم اعظم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے اپنے عمل سے فرمائی۔ ہم انھیں عبادات اور معاملات بھی کہہ سکتے ہیں، حقوق اللّٰہ اور حقوق العباد بھی جملہ احکام کی بنیاد اسی ایمان پر قائم ہے۔ ان کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے

**عبادات** بندے اور خدا کے درمیان احکام اور ان کی تعمیل، یعنی حکم خداوندی کی بجا آوری عبادت ہے اور یہ احکام ہیں، کلمہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد!

**کلمۂ طیّب** (توحید کا اقرار کرنا) ہر باطل قوت سے انکار کر کے خدائے واحد کو اپنا خالق و مالک تسلیم کرنا، انبیاءؑ، رسلؑ، کتب آسمانی، موت اور آخرت پہ ایمان لانا اور زبانی ان سب کا اقرار کرنا۔

الغرض قرآن کریم جن امور کی بنیادی سچائیوں اور صداقتوں کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، یہ کلمۂ طیّب ان سب کا اقرار کرنے اور حق تعالیٰ سے قول باندھنے کے مترادف ہے۔ یہی وہ کلمہ ہے جو انسان کو کفر سے اسلام کی طرف لاتا ہے اور شرک کے تصور کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ یہ کلمۂ طیّب بہ یک وقت سابقہ گناہوں سے توبہ بھی ہے اور آئندہ کے لیے نیا قول اور نیا عزم بھی! جب کوئی انسان اس (کلمۂ طیبہ) کی اساس پر اپنی زندگی کے نظام کی تعمیر شروع کرتا ہے گویا ایک حسین انقلاب سے دوچار ہو جاتا ہے۔ باطل کی ہر قوت سے انکار کر کے صرف ایک طاقت کو تسلیم کرنے کے فوائد احاطۂ تحریر میں نہیں لائے جا سکتے۔ اس کے جسمانی اور روحانی اثرات لاتعداد ہیں۔ اس اقرار کے ساتھ فکر و مزاج میں، سیرت و اخلاق میں، جسم و روح میں، قول و فعل میں، ظاہر و باطن میں، الغرض ہر انداز اور ہر طریقے سے انسان میں انقلاب آ جاتا ہے۔ اسی کلمۂ طیبہ کی تعریف خود قادرِ مطلق نے اس طرح فرمائی ہے "کیا تم غور نہیں کرتے کہ اللّٰہ نے کلمۂ طیبہ کو کس چیز سے تشبیہ دی ہے۔ اس کی مثال اس پاکیزہ درخت کی سی ہے جس کی جڑیں زمین کے اندر گہرائی میں جمی ہوتی ہیں اور اس کی شاخیں آسمان تک پہنچ جاتی ہیں اور وہ (درخت) ہر آن اپنے رب کے حکم سے پھل دے رہا ہے!!"

گویا ظاہر و باطن میں اس کے اثرات بے شمار ہیں۔ یہی نہیں بلکہ غور کیجیے تو اللہ تعالیٰ کے احکام میں ہر رکن اپنی اپنی جگہ مفہوم کے لحاظ سے بہت وسیع ہے اور ان میں حکمت کے بڑے بڑے معنی پوشیدہ ہیں جن کے اثرات عقیدہ و روح کے لیے ہی نہیں بلکہ جسم کے لیے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسلام کے یہ تمام رکن ضروریات بھی ہیں عبادات بھی اور فطری عمل بھی۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد صرف عبادت ہی نہیں بلکہ تعجب ہوتا ہے کہ ان میں حفظانِ صحت اور لا تعداد امراض کے لیے علاج موجود ہیں۔ وہ امراض جن سے نہ اس وقت کا انسان واقف تھا اور نہ آج ان (امراض) کا علاج کسی اور انداز سے ممکن ہے۔

## نماز، جسمانی امراض کا علاج

یوں تو نماز توحید کے اقرار کے بعد سب سے پہلی عبادت ہے اور دنیا میں موجود تمام عبادات کا مجموعہ ہے (یعنی جسمانی، روحانی اور لسانی) لیکن ان تمام باتوں سے قطع نظر جن کی وضاحت کے لیے ایک علیحدہ دفتر درکار ہے۔ مختصراً غور کرنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایسی جن جن ضروریات سے انسان خود بھی نا آشنا تھا، ان کا اہتمام حق تعالیٰ نے خود ہی فرمایا۔ آج بڑی تحقیق کے بعد انسان یہ سمجھ پایا ہے کہ اسے ہمیشہ جس انداز سے کھڑا رہنا اور اپنے تمام امور انجام دینا پڑتے ہیں، اس حالت کے تحت دورانِ خون کو دماغ تک پہنچنے کے لیے زمین کی کشش کے خلاف بہنا پڑتا ہے لہٰذا وہ اعراض و علامات و امراض جو (دماغ کی جانب) خون کی کمی کے سبب پیدا ہو سکتے ہیں ان کا بہترین اور مفید ترین علاج رکوع اور سجدہ ہے۔

علاوہ ازیں بہت سے امراض، خصوصاً نسوانی اعضا کی تنزیل میں جو انسانی اعضاء کے لیے مضر ہوتے ہیں نماز کی ادائیگی میں سر بسجود ہونا ایسے سب امراض کے خاتمے کے لیے مددگار ثابت ہوتا ہے، اسی سے طمانیتِ قلب حاصل ہوتی ہے، اعضا و قلب و ذہن پر ایک سکون سا چھا جاتا ہے جو اضطراب، بے قراری اور بے خوابی ایسے امراض کا سدِّ باب

کر کے طوالت عمر کا سبب بنتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ نماز کے ان ارکان (رکوع اور سجدہ) میں ان بیشتر امراض کا علاج بھی پوشیدہ ہے جن کے لیے آج متعدد قسم کی کسرتیں یا جوگی حضرات کا سر کے بل کھڑا ہونا مفید اور صحت بخش سمجھا جاتا ہے۔ پنج وقتہ نماز میں کئی بار قیام، رکوع اور سجدہ کے دہرانے کے بعد اس قسم کے دوسرے کسی اور علاج کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ جسم اور صحت کے لیے نماز کی اہمیت ہے، لیکن کھڑا ہونا، بندگی کرنا، رکوع کرنا اور سجدے میں جانا، خالقِ کائنات کے آگے عاجزی اور جھک کر اس کی بزرگی اور بڑائی کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے جس کا باقاعدہ حکم ہے۔

"(اے مریم) اپنے رب کے حضور میں کھڑے ہو کر بندگی کر، سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر!"

گویا جسم و روح دونوں کے اعتبار سے مخلوق ہونے اور اطاعت کرنے کی گواہی دینا نماز ہے جس کے بارے میں اس قدر احکام ہیں جن کا شمار مشکل ہے۔ یہی مومن کی معراج ہے، یہی انعام ہے۔ صداقت ہے، راستی ہے، مومن کی علامت ہے، کفر اور اسلام کا سب سے بڑا فرق ہے، لیکن اس وقت میرا مقصد صرف یہ وضاحت کرنا تھا کہ یہی پہلی عبادت بلکہ عبادت کا مجموعہ نماز جسمانی صحت اور امراض کے لیے بھی ضروری ہے۔ اس کے بعد دوسرا نمبر روزے کا ہے۔

## روزہ، جسمانی اور روحانی امراض کا علاج

روزہ ایک فطری عمل ہے۔ مذاہبِ عالم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ روزہ ہر قوم پر فرض کیا گیا جسے اپنے اپنے وقت میں تمام اقوام نے عبادت تصور کیا اور بے شک یہ عبادت ہے، اسلام کی عبادات میں دوسرا رکن! لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ آخر خداوندِ عالم کے لیے بھوکا اور پیاسا رہنا کیسی عبادت ہے؟

اس بات پر ہم جس قدر بھی غور کرتے ہیں (دیگر تمام روحانی فوائد کے علاوہ) یہ بات بڑی اہمیت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ صحت کی بقا اور

حفاظت کے لیے انسان کو کم خوراکی کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ خوراک کی!
اور غور کیجیے تو انسان ہی نہیں بلکہ خدا کی دیگر مخلوقات بھی اس کا اہتمام کرتی ہیں۔ بہت سے جانور بھی چھ چھ ماہ بغیر کچھ کھائے پیے پہاڑوں اور پتھروں کے نیچے روپوش رہتے ہیں۔ محض اس لیے کہ جسم جمع شدہ غذا کو استعمال کر کے معدے کے نظام کو درست رکھ سکے۔ اسی بناپر انسان کے لیے بھی یہ عمل فطری تصور کیا گیا اور چونکہ ابتدا میں انسان خود اپنی اس ضرورت سے واقف نہیں تھا لہٰذا اس کا حکم خود خالقِ کائنات نے دیا اور ارشاد ہوا" جو اس ماہ (رمضان) کو پائے، وہ اس میں روزے رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں تو وہ دوسرے دنوں میں رکھ لے۔ خدا آسانی چاہتا ہے سختی نہیں!"

اس کے معنی یہ ہیں کہ بعض امراض ایسے ہوتے ہیں جن میں معدہ غذا محفوظ رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ علاوہ ازیں دائم المرض لوگوں کے لیے مسکین کو کھانا کھلانے کا حکم ہے، روزے کا نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کو روزے کے ذریعے اپنی عبادت ہی کرانا مقصود ہوتی تو مریضوں یا مجبوروں کے ساتھ یہ رعایت نہ برتی جاتی، لیکن چونکہ عبادت کے ساتھ ساتھ روزہ ایک انسانی ضرورت بھی تھی لہٰذا سال کا ایک خاص مہینا مخصوص کر کے اس ضرورت کو پورا کر دیا گیا اور حکم کی بجا آوری نے ثواب کا اہتمام بھی کر دیا۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ تمام ترقی یافتہ ممالک کے لوگ، جو روزے کے ثواب اور عبادت کے تصور سے متفق نہیں ہوتے، وہ بھی اسے ڈائٹنگ کا نام دے کر اپنی اسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور بار بار کم خوراکی سے عمر کی طوالت کا انتظام اور صحت و تندرستی کی حفاظت کرتے ہیں۔ چونکہ مسلمان کا ہر فعل خداوندِ عالم کی منشا و مرضی کے مطابق ہوتا ہے لہٰذا اس ضرورت کی تکمیل بھی خدا کے منشا کے مطابق ہوئی تو فطری عمل بھی انجام پا گیا اور عبادت کا منشا بھی پورا ہو گیا۔ اس جسمانی ضرورت کے علاوہ روزے کی غرض و غایت تقویٰ ہے، یعنی خود ساختہ خواہشات کے وسیع سلسلے کی روک تھام! اپنی آرزوؤں کو تابو میں رکھنا اور بھوک پیاس کے ذریعے ان لوگوں کی ضروریات و احساسات کا

خیال کرنا جنھیں وہ نعمتیں میسّر نہیں ہیں۔ اس کی جسمانی و روحانی ضرورتوں سے ہٹ کر بھی بڑی اہمیت ہے۔

**زکوٰۃ** مال کے چالیسویں حصّے پر زکوٰۃ فرض ہے۔ اس کی مذہبی حیثیت تو جو ہے وہ اپنی جگہ مسلّم ہے، لیکن اقتصادیات کے مطابق زکوٰۃ سے بہتر کوئی نظام نہیں کیوں کہ دولت کے ذخیرے انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، نہ جمع کرنے والوں کو اور نہ دوسروں کو! لہٰذا اسے محفوظ رکھ لینا بیکار ہے البتہ اسے گردش میں لانا مفید ہے اور پُر سکون زندگی کا راز بھی یہی ہے کہ فیض اٹھاؤ، فیض پہنچاؤ، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں خوش حالی اور فراغت کے آتے ہی ہر بالغ و عاقل مال دار پر اس کے مال کا ایک مخصوص حصّہ زکوٰۃ کے طور پر ادا کرنا فرض قرار دے دیا اور اس کے ساتھ ہی حاجت مند افراد ہی کو اس کا مستحق کر دیا گیا۔ زکوٰۃ نے مسلمانوں میں باہمی طور پر مالی ایثار کا جذبہ پیدا کر کے انھیں ایک دوسرے کا مددگار بنا دیا۔ اس سے اخلاق میں پاکیزگی اور دلوں میں محبت اور اعتماد و احترام کے جذبات پیدا ہوئے۔ تعلقات میں قربت اور احسان مندی نے انھیں آپس میں ایک دوسرے کا خیر خواہ بنا دیا۔ الغرض زکوٰۃ خداوندِ عالم کے حکم کی بجا آوری کے ساتھ دوسروں کی ضروریات کی تکمیل کا بہترین ذریعہ بھی ہے، باہمی یگانگت و قربت کا سبب بھی! مستزاد یہ حکم کہ لینے والے کو اس طرح سے دو کہ اس کی دل آزاری نہ ہو۔ اس نے مُخیّر اور مفلس کے فرق کو مٹا کر انسان کو دولت کے استعمال کا صحیح اور احسن طریقہ سمجھا دیا۔

**حج** اب فطرت اور انسانی ضرورتوں کی روشنی میں حج کی طرف آجائیے تو طوافِ کعبہ بہت بڑی عبادت ہے، اللہ کے گھر کا طواف بندے کے لیے اس سے بڑھ کر شاید ہی کوئی اعزاز ہو، لیکن عبادت کے تصوّر اور مقصد کے علاوہ بھی یہ عمل کائنات کے نظام کے عین مطابق ہے کیوں کہ نظام یہ ہے کہ ہر شئے اپنے مرکز کے گرد گھوم رہی ہے، کبیر اور صغیر ہر شئے! یعنی اجرام فلکی اپنے اپنے مرکز کے گرد چکّر لگا رہے ہیں۔ محض اسی صورت میں ان کی بقا اور کارکردگی کو دوام حاصل ہے۔ جب اور جہاں ان میں سے کوئی ایک بھی اپنے راستے سے

بھٹک جاتا ہے تو اس کی منزل فنا ہے، یعنی مرکز پر رہنا ہی زندگی ہے۔ جہاں یہ نظام اتنے بڑے پیمانے پر کارفرما ہے وہاں اس کا یہ بھی عالم ہے کہ ہر ایٹم کے مرکزہ کی چاروں طرف الیکٹرون چکر لگا رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ کائنات کی ہر شئے گردش میں ہے اور مرکز کا طواف ہی اس کی بقا کے لیے لازم ہے، گویا یہی فطرت ہے اور یہی نظام! اسی نظام میں جب انسان کو حیات بخش دی گئی تو لازمی اسے بھی ایک مرکز کی ضرورت تھی جس کی تکمیل کے لیے خداوندِ عالم نے زمین پر ایک مقدّس گھر کو مسلمانانِ عالم کا مرکز قرار دے کر اس فطری عمل کو پورا کر دیا جس نے ان سب کو ایک عالمی برادری میں منسلک کر دیا۔

## جہاد

اصلاح کے لیے پہلے تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے، یعنی لسانی و عملی طور پر کفّار کے سامنے دینِ حق پیش کرنا! اس راہ میں جس قدر بھی مصائب ہوں، انھیں برداشت کرنا اور اس کے بدلے کوئی محنتانہ وصول نہ کرنا یا قوم سے کوئی امّید نہ رکھنا۔ جب کفر کی قوتیں تبلیغ دین میں سدِّ راہ ہوں، محض حق پرستی کی بدولت دشمن بن جائیں، خدا کے احکام کے مطابق نہ خود زندگی گزاریں اور نہ دوسروں کو اس کا موقع دیں اور خدا کی زمین پر قانون خداوندی کی بجائے جبر و تشدّد کے ساتھ اپنی باطل قوتیں کمزوروں پر نافذ کرنے لگیں تب اس فتنے کو دفع کرنے کے لیے اوّل تبلیغ اور تبلیغ کا ہر انداز آزمانے کے بعد جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ انھی حالات میں جہاد، انسان کی ضرورت بن جاتا ہے۔ اس کے بعد ہی پُر امن معاشرہ قائم ہو سکتا ہے اور قانونِ الٰہی کی پابندی کی جا سکتی ہے، یعنی اصلاحِ معاشرہ کے لیے سختی کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی نرمی کی! اور سزا کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی عفو و درگزر اور معافی کی!

بے شک دین میں جبر نہیں ہے۔ ہر فرد کو آزادی ہے کہ جو چاہے عقیدہ اختیار کرے، لیکن مسلمان کا فرض ہے کہ جہاں رہے، دینِ حق کی دعوت دیتا رہے۔ اپنے قول و عمل سے بھلائی اور خیر کی دعوت دیتا رہے۔ ایسے موقع کے لیے تلوار اٹھانے کا حکم نہیں ہے، یعنی اشاعتِ دین کے لیے تشدّد نہیں بلکہ برائی کے خاتمے کے لیے تشدّد کی ضرورت ہے۔ اسی میں زندگی ہے اور یہی ایمان

ہے۔ برائی کو ناپسند کرنا تو ایمان کی سب سے کم زور علامت ہے۔ ایمان تو یہ ہے کہ برائی کو ناپسند کیا جائے، اس کے خلاف زبانی اور عملی اہتمام کیا جائے اور اسے بزورِ قوت ختم کر دیا جائے۔ بزورِ قوت برائی کو ختم کر دینا ہی ایمان کی سب سے مستحکم علامت ہے۔ پُر امن معاشرہ قائم کرنے کے لیے اس کی اشد ضرورت ہے اور اس ضرورت کو جہاد ہی پورا کر سکتا ہے۔

یہ اسلامی عبادات کا ایک مختصر سا پہلو تھا جو انسان کی ضرورتوں کو پورا کرتی اور مختلف کیفیات میں مددگار و معاون بنتی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تمام عبادات کے انسانوں پر ایسے روحانی و جسمانی اثرات مرتب ہوتے ہیں جو ناقابلِ بیان ہیں۔ ان کی ادائیگی کے بعد جو روحانیت اور تسکین حاصل ہوتی ہے، اسے محسوس اور واضح کرنے کے لیے عمرِ خضر درکار ہے۔ آج جو سکون و راحت اقوامِ عالم کے گمراہ افراد کو کروڑوں ڈالر کی خواب آور گولیوں سے بھی حاصل نہیں، وہ ان فطری عبادات کی ادائیگی میں موجود ہے۔ پُر سکون زندگی، اطمینانِ قلب، آرام دہ نیند اور پُر جوش جدّ و جہد سب انھی کا نتیجہ ہیں۔ یہ تھی عبادات کی بات، اس کے بعد معاملات یا عملِ صالح کا مقام ہے۔

## حقوق العباد

قرآن نے اسی کو (حقوق العباد) بندوں کے ساتھ بندوں کے تعلقات یا معاملات کہا ہے اور انھیں درست رکھنا یا درست طریقے سے ادا کرنا ہی معاشرتی زندگی کہلاتا ہے، مگر قرآنِ کریم کے حوالے سے جب ہم اس زندگی کے بارے میں دیے گئے احکام پر غور کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ایمان اور عمل کا امتزاج ہی "صالح عمل" کہلاتا ہے۔ "آمنوا وعملوا الصّٰلحٰت" ہی کی اہمیت ہے۔ نہ تنہا ایمان قبول کیا جائے گا اور نہ تنہا عمل کی ضرورت ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ بندوں سے تعلقات کی درستی اور ان کے حقوق کی بہ حسن و خوبی ادائیگی کے لیے اس قدر احکام ہیں کہ انھیں ادا کرنا بھی عبادت معلوم ہوتا ہے اور اس حکمت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایمان اور عمل جدا جدا نہیں ہیں۔ جس کے باعث ہی اس طریقۂ حیات (اسلام) نے انسان کی زندگی کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا۔ اہلِ ایمان حضرات کا ہر عمل عبادت ہے۔ حضورؐ

نے فرمایا "میری امت کے لیے روئے زمین کو پاک کر دیا گیا ہے۔"

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کے لیے زمین کو پاک کر کے ہر جگہ عبادت کی اجازت کیوں دے دی جب کہ ہر قوم میں عبادت کے لیے مخصوص مقام اور خاص آداب مقرر ہیں؟ مسلمانوں کے لیے بھی صرف مسجد ہو سکتی تھی جس کے سوا وہ کہیں عبادت نہ کر سکتے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس کے معنی یہی نہیں کہ مسلمان ہر جگہ کھڑے ہو کر نماز ادا کر سکتے ہیں بلکہ اس کے وسیع معنی یہ ہیں کہ مسلمان کا ہر عمل اور ہر فعل اگر خدا کی رضا اور خوشنودی کے لیے ہو تو وہ عبادت ہے۔ سرِ راہ پڑی ہوئی شئے کو ہٹا کر ایک طرف کر دینا نیکی کیوں ہے؟ محض اس لیے کہ وہ کسی اور کو تکلیف دینے کا سبب نہ بن جائے۔ مخلوق کی بہتری کے لیے یہ ادنیٰ سا کام اسی لیے صدقہ قرار دیا گیا۔

اسی طرح ہر مقام اور ہر موقع پر معاشرتی تعلقات درست رکھنا اور آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی اور خیر کے امور انجام دینا عین عبادت ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔ "بے شک جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، ان کی مہمانی کے لیے فردوس کے باغ ہیں۔"

دوسرے موقع پر ایمان اور عمل کی تعریف اس طرح فرمائی گئی۔ "تم میں سے وہ لوگ جو ایمان لائے اور صالح عمل کرتے ہیں، اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ انھیں زمین کا مالک بنائے گا۔"

الغرض کہیں کسی موقع پر بھی ایمان کو عمل سے اور عمل کو ایمان سے جدا نہیں کیا گیا۔ "ایمان لاؤ اور نیک کام کرو۔" جو شخص ایمان لائے، بھلائی اور خیر کے کاموں میں جدّوجہد نہ کرے تو اس کا ایمان بے فیض ہے۔ جو مسلسل کام کرے، لیکن ایمان میں کجی ہو (شرک و کفر) تو اس کا ہر عمل غارت ہے۔ اس کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ بندے اور بندوں کے درمیان باہمی تعلقات کیا ہیں؟ والدین، اہل و عیال بھائی بہن، عزیز و اقربا، ہمسائے اور محلّے والے، قریب والے، دور والے، لونڈی، غلام، دوست، دشمن غرض کہ ہر فرد سے تعلقات کے بارے میں قرآن مجید میں مکمّل طور پر تشریح فرما دی گئی ہے۔ ان رشتوں کے حقوق واضح کر دیے گئے ہیں

جنھیں اگر خدا کی منشا سے ادا کیا جائے تو کوئی محرومی باقی نہ رہے لیکن آج انسان نے ان حقوق کی ادائیگی کے لیے بھی خود اصول وضع کر لیے ہیں۔ اس تہذیب یافتہ دَور میں کسی کی چند ضروریات کو پورا کر دینے کا نام احسان رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں نہ خدا کی خوشنودی کا احساس ہوتا ہے نہ دوسروں کو مطمئن کرنا ہی مقصد ہے۔ مقصد ہے تو محض اس قدر کہ خارجی زندگی میں نام و نمود قائم رہے اور محسنوں میں شمار ہو جائے لہٰذا جس جذبے کے تحت کام کیا جاتا ہے وہی اثرات سامنے آتے ہیں۔ حقوق کی طرف آیئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ تمام ہی باہمی رشتوں میں سب سے اہم رشتہ والدین کا ہے۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ توحید کے بعد سب سے پہلے والدین کے حقوق اور اطاعت کا ذکر آتا ہے کیوں کہ یہی وہ رشتہ ہے جو سب سے زیادہ احسان کرنے والا اور سب سے زیادہ ایثار کرنے والا ہوتا ہے۔ والدین تمام عمر تکلیفیں برداشت کر کے اولاد کو راحت اور آرام بخشتے ہیں، پھر ضعیفی کی عمر اور کم زوری کے زمانے میں انھیں خود اولاد کی توجہ اور سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس موقع کے لیے قرآنِ مجید میں واضح طور پر حکم دیا گیا ہے "اگر والدین میں سے ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کی عمر کو پہنچیں، تب تو ان کے سامنے اُف بھی نہ کرنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے کچھ کہنا تو ادب کے ساتھ کہنا۔"

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس "اُف" کے معنی کیا ہیں؟ کیا صرف (عمر بھر تکلیفیں برداشت کرنے اور احسان کرنے والے) بوڑھے والدین کو اپنے ساتھ رکھ کر انھیں روٹی، کپڑا مہیا کر دینا ہی ان کے ایثار و احسان کا بدل ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں! بلکہ اس آیتِ مبارک کے معنی ہیں کہ عملاً، قولاً انھیں تم سے کوئی مایوسی نہ ہو، کوئی تکلیف نہ ہو۔ دوسرے موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم کی تشریح خود اس طرح فرمائی ہے: "اور محبت سے، خاکساری کا پہلو ان کے آگے جھکائے رکھنا اور ان کے حق میں دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار، جس طرح انھوں نے مجھے بچپن میں پرورش کیا، میرے حال پر رحم کرتے رہے۔ اسی طرح تو بھی ان پر اپنا رحم کرنا۔"

یعنی انسان اپنے عمل سے والدین کے ساتھ بہترین سلوک کرے اور خداوند عالم سے بھی ان کے لیے بہتری کی دعا کرتا رہے۔ آج دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ قوم میں والدین کے لیے ایسا کوئی حکم نظر آتا ہے؟ آج کا انسان خلاؤں میں پرواز کر رہا ہے اور علم کی نت نئی راہیں دریافت کر کے بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، لیکن زندگی کے بنیادی مسائل اور مثبت قدروں کی طرف سے غافل ہے جن پر اسلام زور دیتا ہے۔ انھی مثبت قدروں میں سے ایک قدر والدین کے حقوق کا تعیّن ہے۔ غور طلب بات ہے کہ وہی اقوام جو انقلاب بپا کیے دے رہی ہیں، جن کی ترقی، جن کے علوم دنیا کو بامِ عروج تک لے جا رہے ہیں، انھی میں والدین عضوِ معطل تصوّر کیے جانے لگے ہیں۔ جوں جوں علم بڑھتا جا رہا ہے، جوان اور بوڑھوں کے درمیان خلیج پیدا ہوتی جا رہی ہے اور دو نسلوں کے بیچ میں "جنریشن گیپ" ایک دوسرے کے مسائل سمجھنے میں بہت بڑی رکاوٹ بن رہا ہے۔ اس صورتِ حال کے سدِّ باب کے لیے اسلام سے بہتر کوئی راستہ نہیں۔ صرف یہی ایک طریقۂ زندگی ہے جس نے والدین کا مقام متعیّن کر کے، ان کے حقوق کو سرِ فہرست جگہ دے کر ان کے تمام مسائل کو حل کر دیا۔ پھر یہی نہیں بلکہ انسانی تعلّقات میں ہر رشتے اور ہر تعلق کے حقوق اور فرائض کو واضح کر دیا گیا ہے۔ اولاد کے بارے میں حضورؐ کی حدیث ہے "تم میں بہتر وہ ہے جو اپنی اولاد کو علم دے۔"

یہی نہیں بلکہ دیگر رشتوں، یعنی یتیموں، مسکینوں، مسافر، اہلِ حاجت، ہمسائے، مالی امداد کے مستحق بے کس، لونڈی، غلام الغرض بالترتیب رشتوں سے تعلّقات جنھیں درست رکھنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، انھی میں اجتماعی وانفرادی طور پر فلاح ہے۔ ان سب کے لیے خوش اخلاقی، خوش اطواری، سخاوت اور حُسنِ سلوک کا حکم بار بار دیا گیا ہے، محبّت اور احترام کی ہدایت کی گئی ہے۔ شوہر اور بیوی کا رشتہ ایسا ہے جس پر تمام انسانی تمدّن اور اخلاق کا انحصار ہے۔ یہ دنیا کا اوّلین رشتہ ہے جس سے ہر تعلّق اور ہر رشتے نے جنم لیا ہے۔ یہ وہ تمدّنی، اخلاقی اور قلبی تعلّق ہے جس کا سلسلہ عالم گیر تعلّقات تک جاتا ہے۔ درحقیقت یہی تمدّنِ انسانی کی جڑ ہے۔ ازدواجی تعلّقات کی درستی بنی نوعِ انسان کے تمدّن کی درستی ہے

اور اس تعلق کی خرابی پورے تمدنِ انسانی کی خرابی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "عورت اور مرد ایک دوسرے کا لباس ہیں۔ وہ تمھاری پوشاک ہیں، تم ان کی پوشاک ہو"
اور انسان کے لیے لباس کا مقصد کیا ہوتا ہے، یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ لباس انسان کی شان بھی ہے، پردہ بھی اور ضرورت بھی لہٰذا شوہر اور بیوی کا رشتہ ایک دوسرے کے لیے ایسا ہی ہے۔ مختصر یہ کہ ہر شعبۂ حیات میں اور زیست کے چھوٹے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے بڑے معاملات تک کوئی پہلو بھی ایسا نہیں جس کے لیے ہدایت موجود نہ ہو۔ معاملہ سیاسی ہو، معاشرتی، معاشی، عسکری، مذہبی، اخلاقی یا ازدواجی، سب کے لیے وضاحت کر دی گئی ہے۔ پھر یہ سب معاملات بندے اور خدا کے درمیان ہوں یا بندے اور بندوں کے، اسلام نے سب کو صالح نیّت کے ساتھ ادا کرنے کو عبادت قرار دیا ہے، یعنی کہ مومن کی پوری زندگی ہی ایک عبادت ہے۔ دیگر مذاہب و اقوام میں ایمان اور عمل کو یا دنیوی و دینی معاملات کو جدا جدا تصور کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر مغرب میں یہ تعصب کچھ زیادہ ہی نظر آتا ہے۔ ان کے معاملات اور عبادات نہ صرف یہ کہ جدا جدا ہیں بلکہ وہ سب غیبی حقیقتوں کو بھی دقیانوسی تصوّر کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں مذہب کے نام پر ہر شئے جہالت و تنگ نظری ہے، مذہب کی باتیں کرنا بے عمل لوگوں کا کام ہے۔ وہ غیبی حقیقتیں، جنھیں دراصل انسانی حواس سے پوشیدہ رکھا گیا ہے، انھیں دیکھے بغیر ہی ایمان لے آنا ہدایت پانے والوں کا کام ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں"
غیب سے مراد خدا، ملائکہ، آخرت، عذاب و ثواب، حساب اور شریعت ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ لوگ ان سب سے بے نیاز ہوتے گئے اور کچھ اسے دقیانوسی گردانتے گئے۔ لیکن یہ قصور دراصل ان اقوام کا نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علمِ دین کے نام پر جو چیزیں ان کے سامنے لائی گئیں، وہ اس قدر ہمہ گیر نہ تھیں کہ وہ انھیں طریقۂ زندگی بنا لیتے۔ اس لحاظ سے وہ سب قابلِ معافی اور لائقِ عفو ہیں کہ ان کا اپنا دامن خالی تھا اور فراخ دِلی کے ساتھ دوسروں سے استفادہ کر کے اس کا اعتراف کر لینا ان کی عادت نہ تھی لہٰذا کچھ اپنایا، کچھ چھوڑا اور جو اپنایا، اسے اپنی ضروریات

کے مطابق ڈھال لیا، مگر افسوس اس بات کا ہے کہ گزشتہ دو صدیوں سے یہ خیالات عام ہوتے ہوتے مسلمانوں تک بھی پہنچ گئے اور اپنے دین سے ناواقفیت کے سبب قبول بھی کیے گئے۔ ہاں، بہ بانگِ دہل مذہب کو خود میں رچا بسا لینے کو وہ جہالت تو نہ کہہ سکے، لیکن کم فہمی نے انھیں ایک دوسرے انداز سے اسی فکر کا اظہار کرنے پر اکسایا لہٰذا ان میں بھی عام طور پر یہی سمجھا جانے لگا کہ مذہب ایک نجی سا معاملہ ہے اور یہ کہ اب بیرونی زندگی میں قدم قدم پر مذہب کی رٹ لگانے کا زمانہ نہیں ہے۔ میں سمجھتی ہوں یہ لوگ وہ ہیں جو مذہب سے آشنا ہی نہیں کیوں کہ سوچ کا یہ انداز محض اس بات کی علامت ہے کہ وہ لوگ مذہب کو طریقۂ زندگی کے طور پر نہیں جانتے بلکہ اسے صرف نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج تک محدود تصوّر کرتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ہر انسان اپنے دنیوی معاملات میں بھی ایک خاص جذبہ و فکر اور ایک مخصوص رُوحانی عقیدہ رکھتا ہے جس پر اس کے کل اعمال کا دارومدار ہوتا ہے یہاں تک کہ عبادت کا مدار بھی اس روحانی عقیدے اور فکرِ خاص پر ہوتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے: "تمہارے اعمال کا انحصار تمہاری نیت پر ہے"۔ یعنی معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسی فکر کو، اسی روحانی عقیدے کو "نیّت" سے تعبیر فرمایا ہے اور یہی وہ نیّت ہے جو عام امر کو بھی عبادت کا درجہ بخش دیتی ہے اور اسی میں اگر مَیل آجائے تو عبادت بھی بے مقصد اور دکھاوا ہے۔ یہی نیّت، یہی روحانی عقیدہ اور یہی فکرِ خاص دراصل مالکِ حقیقی کا تصوّر ہے جس کے ساتھ انسان جو فرض بھی ادا کرتا ہے اس میں خود کو اہم نہیں گردانتا بلکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ ہمارا رب ہمیں دیکھ رہا ہے۔ ایسے میں اپنے رب کا قُرب حاصل کرنے کی آرزو میں بندہ کسی معمولی کام کو بھی عظیم مقصد کے لیے سرانجام دیتا ہے اور حقیقت میں یہی جذبۂ عبودیت اسے سکون عطا کر دیتا ہے۔ یہ جذبہ، یہ فکر اور یہ عقیدہ باقی رہے تو آدمی، انسان بن جاتا ہے۔

مقصدِ گفتگو محض اس قدر ہے کہ یہ فطری تعلیم (دین) ہر شعبۂ حیات میں اس طرح جاری وساری ہے جس طرح حیاتیاتی وجود کے اندر خون کی گردش کہ یہ گردش ہی جسم کے ہر حصّے کو زندہ اور متحرک رکھتی ہے۔ ایک طبیب کسی

حصّے پر یہ سوچ کر بندش نہیں باندھ سکتا کہ جسم کے اس حصّے کو دورانِ خون کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ وہ خوب جانتا ہے کہ جہاں بھی خون کی آمدو رفت نہیں ہوگی، وہی حصّہ مفلوج ہو جائے گا اور انسان کو ناکارہ بنا دینے کے لیے کسی ایک حصّے کا بیکار ہو جانا ہی کافی ہے۔ بالکل یہی مثال ایک پورے معاشرے کی ہے۔ کسی بھی شعبۂ زیست میں ذراسی بے احتیاطی ایک بُرائی کو جنم دیتی ہے، پھر یہی بُرائیاں پورے معاشرے کو گھیر لیتی ہیں جس کی مثال آج خود ہمارے سامنے ہے۔ آج جب ہم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں کہ قبل از اسلام دنیا کی حالت کیا تھی اور آج اس سے ہٹ کر کیا ہے تو ہمیں بہت زیادہ فرق نظر نہیں آتا۔ آج کا انسان بھی پہلے کی طرح نفس کی طغیانیوں میں گھِر گیا ہے اور صرف دوسروں سے آگے بڑھ جانے کی آرزو میں دھکم پیل کرتا جارہا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ غلط راہ کا انتخاب کرنے والے کبھی منزل تک نہیں پہنچتے۔ مذہب سے ناسمجھی نے ہر طبقے اور ہر سوسائٹی سے اخلاق کی اعلیٰ اقدار کو چھین لیا ہے اور طبقاتی کشمکش کا مارا آج کا انسان اپنی اجتماعیت کھوکر، اپنا وقار گنوا کر بُری طرح احساسِ تنہائی کا شکار ہو گیا ہے کیوں کہ وہ خود محبّت آفرینی سے ناواقف ہے۔ اس محبّت نے جدا جدا انسانوں کو ایک معاشرہ اور ایک جماعت بنا دیا۔ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ طیبّہ کا یہی سب سے مقدّس پہلو تھا جس نے انسان کے دل سے خالقِ کائنات کا خوف نکال کر اسے چاہت اور اعتمادِ الٰہی دولت سے بھر دیا اور مخلوق سے محبّت کرنا سکھا دیا۔ یہ جذبہ رخصت ہوا تو خدا کی اطاعت اور مخلوق کی فلاح و بہبود کا تصوّر بھی گویا مفقود ہو گیا۔ جو مقصدِ اصل تھا، انسان اس سے ہٹا تو ہر بات بے مقصد اور ہر سعی لاحاصل ہو گئی۔ نتیجہ یہ کہ آج علم کی انتہا کا گُن گانے کے باوجود آدمی علم کے معنی و مطالب سے ناآشنا ہے۔ وہ علم جو انسان کو جینا سکھاتا ہے، جو فکر و عمل کی راہوں کو متعیّن کر کے منزل کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور انسان کو اس کی پہچان کرا کر مالکِ حقیقی تک پہنچا دیتا ہے، چونکہ اس سے آگاہی مفقود ہے لہٰذا آج کا جوان اپنی ذات کے اظہار کے لیے تخریبی کارروائیاں

کرتا نظر آتا ہے اور یہ صورتِ حال ملک و قوم کو تباہی کے کس مقام تک لے آتی ہے، اس کا اسے کچھ بھی اندازہ نہیں ہے۔ یوں جنھیں معمار بننا تھا، وہی پامالی کا سبب بن رہے ہیں، محض اس لیے کہ جس طریقۂ زندگی (دین) کو اپنا کر وہ مقصد حاصل کر سکتے ہیں، ناسمجھی کے سبب وہ خود بھی اس سے برگشتہ ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ دین ہی ہماری زندگی کا حاصل ہے اور یہی ہماری اخلاقی، مذہبی، سیاسی، معاشی اور ذہنی استحکام کا سبب ہے، ہماری عظمت و طاقت ہے۔ محض اسی کے سہارے ہم دنیا کا مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن تہذیبِ جدید میں گویا یہ بات شامل ہوگئی ہے کہ اجتماعی زندگی کے کسی بھی شعبے میں مذہب کی عملاً دخل اندازی ضروری نہیں ہے بلکہ یہ صرف نجی سا معاملہ ہے کہ ہر فرد ذاتی طور پر احکام کی پیروی کرے یا نہ کرے۔ پھر یہ خیالات عام ہوتے گئے اور لوگ یہ بھولتے گئے کہ دینِ فطرت اور اُس کا فلسفہ کیا ہے؟ ایسے میں کسی نے دینِ حق کی بات کی بھی تو اس طرح کہ وہ اسلام کے حقیقی تصوّر سے خالی تھی۔ ہاں تصوّر تھا تو ان عقیدوں کا جو متروک ہو چکے تھے اور جہاں رسم و رواج کے سوا کچھ نہ تھا جس نے مشرکانہ عقائد کو جنم دیا۔ یہ قوم کتنی مدّت میں تباہ رہوا، کن کن تہذیبوں سے مل کر تباہ رہوا، بحث یہ نہیں ہے بلکہ مقصدِ گفتگو صرف اس قدر ہے کہ کروڑہا انسان جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں، کیا وہ واقعی موحّد ہیں؟ کیا انھیں دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں یہ دین رچ بس گیا ہے جس نے صرف ایک خالق کا تصوّر بخشا تھا؟

صرف مذہب کی بات تو نئی نہیں ہے۔ اسلام سے قبل بھی دنیا میں لاتعداد مذاہب تھے اور ان کی پیروی کرنے والے بھی کروڑہا انسان تھے لیکن بعثت کے وقت یہ سب اقوام حقیقت سے بہت دُور ہو چکی تھیں۔ نہ مالکِ حقیقی کا کوئی تصوّر باقی تھا نہ عبودیت کے معنی ہی سے آشنا رہے تھے۔ جگہ جگہ انسان پیکرِ محسوس کا متلاشی تھا اور معبودِ حقیقی کو بُتوں اور مورتیوں میں تلاش کرتا تھا، الہامی مذاہب میں انبیاءؑ کو خالق کا شریک گردانا جاتا تھا اور خود ربِ کعبہ کو ماننے والے رب کے ساتھ ساتھ بُتوں کی پرستش کو بھی لازمی سمجھتے تھے۔ وہ

منتیں مانتے اور بتوں کے حضور قربانیاں دیتے تھے۔ کعبہ اللہ کے اندر بھی تین سو ساٹھ بُت تھے۔ ضلالت کی اسی کیفیت کو قرآن مجید نے وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا۔ کہہ کر شرک سے تعبیر کیا ہے، لیکن آج غور طلب بات یہ ہے کہ کیا بتوں کو پوجنا ان کے نام پر قربانیاں کرنا اور خدا کے ساتھ انھیں طاقت ور ٹھہرانا ہی شرک ہے؟ قبر پرستی، مزاروں پر منتیں ماننا، گلی گلی پیروں، فقیروں کی اجارہ داری اور عوام کا ان کے پاس مطلب براری اور مشکل کشائی کو حاضر ہونا شرک نہیں ہے؟ کیا اپنے نفس کی پوجا کرنا، خواہشات کا تابع ہونا شرک نہیں ہے؟

"لا" کہہ کر جن جن طاقتوں کی قدرت نے نفی فرمائی ہے۔ وہ سب اہم ہو گئی ہیں۔ ہر شعبے میں اپنے حالات کا محاسبہ کرنے کے بعد یہ کہہ دینا غلط محسوس نہیں ہوتا کہ ماضی کے انسان میں اور آج اس ترقی یافتہ دور کے انسان میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے اور فرق ہے تو صرف اتنا کہ وہ ہر شعبے میں برائیوں کے باوجود قابل معافی و قابلِ رحم تھے کیوں کہ وہ ان جملہ برائیوں میں اس لیے ملوث تھے کہ انھیں کوئی قیادت نصیب نہ تھی۔ وہ بے راہ رو اور گمراہ تھے کیوں کہ انھیں صراطِ مستقیم سے آشنا کرنے والا کوئی نہ تھا اور گزشتہ تعلیمات بھول بیٹھے تھے۔ وہ منتشر و متفرق، نام و نمود کے طلب گار اور بغض و حسد کا شکار تھے، محض اسی لیے کہ ان کے سامنے عملِ صالح کی خوب صورت مثال پیش کرنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ اتفاق و اتحاد کی دولت اور باہمی محبت و ایثار کی لذتوں سے ناواقف تھے کہ انھیں اخوت و جاں نثاری اور عفو و درگزر کا درس دینے والا کوئی نہ تھا، لیکن آج کے انسان کو عموماً اور مسلمان کو خصوصاً سب کچھ میسر ہے، قیادت بھی نصیب ہے، صراطِ مستقیم کے لیے رہنما بھی سامنے ہے اور اخوت و جاں نثاری کی ایک دو نہیں ہزاروں مثالیں موجود ہیں، ہاں سب کچھ موجود ہونے کے باوجود ہم پھر اسی مقام پر کھڑے اُسی عمل کو دُہرا رہے ہیں۔ نااتفاقی، فرقہ بندی، بے عملی، بے علمی، علوم اور تحقیق سے بے پروائی، بدعہدی، خود غرضی اور ایسی دوسری بہت سی برائیوں نے ہمیں کم زور کر دیا ہے۔ نتیجہ

یہ کہ ہمیں خود اپنی بھی پہچان نہیں رہی۔ ہر نظام ہمیں قبول ہے، ہر طریقہ ہمیں گوارا ہے اور ہر کام کی ہم نے ایک قیمت مقرّر کر لی ہے۔ جو چاہے ہمیں خرید لے۔ ہم کام کی نوعیّت اور معیار کو نہیں صرف قیمت کو جانچتے ہیں۔ تو یہی وہ حالات ہیں جن کے بعد آج کسی سہارے اور کسی اصلاح کی ضرورت ہے، لیکن اب کوئی نجات دہندہ اور کوئی رہبر نہیں آئے گا کیوں کہ نبوّت کا سلسلہ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم پر تمام ہوا۔ وہ بنی نوعِ انسان کے لیے خدا کی جانب سے آنے والی سفارتوں میں آخری سفارت تھی۔ انھوں نے ایک معلّم، ایک رہبر کی طرح سے دینِ حق کو عملی طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا اور اللہ تعالیٰ نے تمام احکام کو ایک مکمّل طریق زندگی ثابت کیا۔ آج حیاتیاتی زندگی کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں جس کے لیے خالق کے احکام اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا اُسوۂ حسنہ موجود نہ ہو لہٰذا نئے احکام اور نئے طرزِ عمل کی گنجائش تمام ہوئی۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے اپنے بارے میں خود فرمایا "لوگو، یاد رکھو میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور تمھارے بعد کوئی اُمّت نہیں۔"

دوسرے موقع پر فرمایا "خوب جان لو کہ اب رسالت اور نبوّت منقطع ہو چکی ہے لہٰذا میرے بعد نہ کوئی رسول ہوگا نہ کوئی نبی ہوگا۔"

خود خالقِ کائنات نے فرمایا وَلٰكِن رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔

الغرض نبوّت کا سلسلہ تمام ہوا ہاں ہدایت کا سلسلہ باقی ہے اور رہے گا کیوں کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں خداوندِ عالم نے انبیاءؑ کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں انبیائے مؤسّسین اور انبیائے مقلّدین!

مؤسّسین: وہ انبیاءؑ جنھوں نے کسی نئی قوم کی اساس رکھی یا جنھیں کوئی نئی شریعت عطا ہوئی جس کی بنیاد پر کوئی نئی قوم صفحۂ ہستی پر اُبھری۔ ان میں نمایاں طور پر حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور خود معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اسمِ مبارک سامنے آتے ہیں۔

مقلّدین: مقلّدین کی تعریف میں وہ تمام انبیاءؑ آجاتے ہیں جنھوں نے سابقہ انبیاءؑ کی تعلیمات اور صحیفوں کے ذریعے اپنی قوم میں ہدایت کا فرض ادا

کیا۔ یہ بنو اسرائیل کے وہ تمام انبیاءؑ ہیں جو یکے بعد دیگرے سابقہ کی تقلید کرتے رہے اور اب جب کہ نبوت و رسالت کا سلسلہ تمام ہوگیا، معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ ایسے میں رُشد و ہدایت اور دینِ حق کی تبلیغ کا کام ہر مسلمان پر فرض ہوجاتا ہے۔ اسی بات کا حکم آخری خطبے میں اس طرح دیا گیا: "دیکھو جو لوگ موجود ہیں، وہ ان لوگوں کو جو موجود نہیں، اس (تعلیم کی) کی تبلیغ کرتے رہیں۔ ممکن ہے کہ بعض سامعین سے وہ لوگ زیادہ تر اس کلام کو یاد رکھنے والے اور حفاظت کرنے والے ہوں جن پر تبلیغ کی جائے۔"

اس ارشاد کے بموجب اب ہر مسلمان مقلّد اور اصلاح و ہدایت کا ذمے دار ہے اور ہدایت کا سب سے بڑا ذریعہ قرآن کریم ہے جو مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ وہ مقدس کتاب ہے جس نے ہر دَور اور ہر زمانے کے لیے انسان کو احکام دیے، جو زمان و مکاں کی قید سے آزاد، وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ انسان کو ہر دَور کے لیے اخلاق و عمل کی ہدایت دیتے ہیں۔ خداوندِ عالم کے جملہ احکام کا یہ مجموعہ، کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جسے کسی بھی زمانے میں عہدِ رفتہ کی تحریر کہہ کر طاقِ نسیاں میں رکھ دیا جائے بلکہ یہ تو ہر وقت، ہر زمانے اور ہر حالت میں انسان کے لیے ایک رہبر و رہنما ہے اور یہی معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے۔

کسی نے اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ کیا تھا؟"

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جواب دیا: "کیا تم نے قرآن مجید نہیں پڑھا؟ آپ کا اخلاق من وعن قرآن تھا۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم۔"

تو اب یہی اسوۂ حسنہ بنی نوعِ انسان کی ہدایت کا ذریعہ ہے جس کا اصل مقصد ایک پاکیزہ معاشرہ تعمیر کرکے ہر دَور میں انسان کو استحصالی قوتوں سے نجات دلا کر ارضی خلافت کے قابل بنانا ہے۔ ابتدا سے انسان کو شر کی قوت نے پامال کیا جو خود انسانوں کی صورت ہی میں ان پر مسلّط رہی۔ کبھی اس قوت نے نمرود بن کر خدائی کے ٹھاٹ جمائے اور اپنی حدّ و حیثیت سے بڑھ کر بندوں سے

اپنی بندگی کرائی اور کبھی اس نے فرعون کے روپ میں مخلوق کو قلب و ذہن سے خالقِ حقیقی کا تصور مٹا کر اپنی ہیبت پیدا کر دی۔ ایسے میں فرعونوں کے درباروں میں ہامان بھی پیدا ہو جاتے ہیں اور قارون بھی اور وہ اپنے منصب کی حفاظت کرنے کے لیے مجاز کو حقیقت کا رنگ دے کر اسے خوش رکھتے ہیں۔ یہی مجازی رنگ بندوں کو راہِ راست سے بھٹکا کر دُور لے جاتا ہے اور جوں جوں وہ راہ سے دُور ہوتے جاتے ہیں، شر کی قوت مستحکم ہوتی جاتی ہے اور انھیں اپنی کم تری اور پستی کا ہوش کب آتا ہے جب اسی دربار کا قارون ذخیرہ اندوزی کر کے انھیں خوشیوں سے محروم کر دیتا ہے۔ انسان کے استحصال کے لیے یہی شر کی طاقتیں ہیں جنھیں قرآنی اصطلاح میں طاغوتی طاقت کہا گیا ہے۔ تو یہی وہ شر کی طاقتیں ہیں جو انسان کے حقوق کا استحصال کرتی ہیں اور کرتی رہیں گی۔ اسلام نے انھی قوتوں سے اسے نجات دی ہے اور "لا" کہہ کر دراصل انھی کی نفی کی ہے اور اسے ایک آقا و مالک اور نگہبان کے آگے جُھکا دیا ہے۔ یہ کام آسان نہیں تھا بلکہ کسی بھی انسان کے لیے ناممکن تھا، لیکن معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جس صبر و تحمّل، خوش اسلوبی اور استقلال کے ساتھ اسے انجام دیا اس کی مثال نہیں ملتی۔

اس ظلمت کدے میں مالکِ حقیقی سے ناواقف انسان ایک درندہ تھا جس کے حقوق کے لیے کوئی ضابطہ تھا نہ قاعدہ۔ قوّت ان کا قانون، دھوکا اور فریب ان کی سیاست اور ظلم و تشدّد ان کی سیادت تھا۔ ان حالات کو صدیاں بیت گئی تھیں۔ اسی حالت میں رہتے رہتے ان پہ اس قدر جمود طاری تھا کہ اپنے عیوب پر فخر کرتے تھے۔ ایسے میں ایک انسان کے لیے انھیں حقیقت سے آشنا کرانا، باقی تمام چیزوں کو ان کے ذہنوں سے مٹا کر ایک معبودِ حقیقی کی ان دیکھی ذات کے لیے سمجھانا، رہزنی کی جگہ رہبری، دروغ گوئی و کذب کی جگہ صدق و سچّائی اور فریب کی جگہ محبّت و خلوص پیدا کر دینا، دشوار ترین امر تھا۔ تہذیب سے ناآشنا وحشی اقوام میں علم و اخلاق پیدا کر کے امیر و غریب کا فرق مٹانا، فاتح و مفتوح کے امتیاز کو ختم کرنا، عوام و خواص اور آقا و غلام کے درمیانی سب فاصلوں کو

مٹا کر انھیں ایک صف میں لے آنا ناممکن کام تھا، مگر یہ سب کچھ کس طرح اور کتنے وقت میں ہوا، یہ دیکھ کر عقلِ انسانی حیران رہ جاتی ہے، لیکن دراصل یہ تعلق کسی مصلح اور اس کی قوم کا نہ تھا، استاد اور شاگرد کا نہ تھا بلکہ یہ تعلق تو دینِ وحدت کا تھا جو بڑا مضبوط اور مستحکم تھا جس نے جدا جدا انسانوں کو ایک مقدس اور پاکیزہ رشتے میں پرو دیا۔ پھر انھی کو ایک دوسرے کی بھلائی اور خیر کا ذمے دار بنانے کے لیے ارشاد ہوا: "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" یہ کتنا بڑا انقلاب تھا کہ خود خیر اور بھلائی سے محروم انسان جو اپنے عیوب پر ناز کرتے تھے، خالقِ کائنات انھی کو بہترین گروہ قرار دے کر انسانوں کی بھلائی اور نفعِ انسانی کے لیے مخصوص کر دے۔ یہ قرآن کا اعجاز تھا اور معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا عملِ صالح کہ تیئیس سالہ نبوی زندگی کا ہر لمحہ، ہر ساعت اور ہر سانس احکامِ خداوندی کی بجا آوری اور انسانوں کے لیے ان کی تشریح میں گزرا۔ دنیا کے اس عظیم ترین معلم نے خود کو ہر شعبۂ حیات میں قرآن کے عین مطابق ڈھال کر اور مخلوق کو خالق کے احکام سے آگاہ کر کے عملی طور پر ہدایت دی۔ تعلیم اور معلم کا یہ کیسا عجیب تعلق تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن کے ہر حکم کی اور قرآنِ حکیم نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہر عمل کی گواہی دی۔

سنّتِ مصطفوی کیا ہے؟

اس سوال کے جواب کو مورخین اور محدثین نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کرتے ہوئے جس طرح اس کی تفصیل بیان کی ہے، اس نے گویا محاسنِ اخلاق کی وضاحت کر دی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ حضورؐ طریقہ (سنّت) کیا ہے؟

ارشاد ہوا: "معرفت میرا راس المال ہے، عقل میرے دین کی اصل ہے، محبت میری بنیاد ہے، شوق میری سواری، ذکرِ الٰہی میرا انیس، اعتماد میرا خزانہ، حزن میرا رفیق، علم میرا ہتھیار، صبر میرا لباس، رضائے الٰہی میری غنیمت، عجز میرا فخر، زہد میرا خرقہ، یقین میری خوراک، صدق میرا ساتھی، اطاعت میرا

بچاؤ، جہاد میرا خُلق اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔"

دنیا کے اس عظیم ترین معلّم نے قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں کی تشریح ان محدود الفاظ میں فرما دی ہے۔ قرآن نے متعدد جگہوں پر اسی خُلق کی گواہی دی ہے اور اسی کو انسان کے لیے مخصوص فرما دیا گیا ہے۔ یہ چند الفاظ نہیں متعدد ہدایات ہیں، ہر دور اور ہر زمانے کے لیے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے لیے ان اصولوں سے بہتر کوئی اصول نہیں۔ اس تعلیم سے بڑھ کر کوئی تعلیم نہیں۔ اسی کو اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ نے اُسوۂ حسنہ کہا اور یہی تعلیم قرآنِ مجید میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ ان جملوں کی تشریح یہ ہے۔

**۱ اَلمعرفۃُ رَاسُ المالی** (معرفت میری پونجی ہے) راس المال سے مراد رقم، دولت، حیثیت اور کُل جمع پونجی ہے، وہ پونجی جس سے کسی کاروبار کی ابتدا کی جاتی ہے۔ وہ پونجی جس کے بھروسے پر تاجر اپنی تجارت شروع کرتا ہے اور معرفت سے مراد ہے جاننا، سمجھنا، علم رکھنا، شناخت کر لینا، پہچان لینا اور اسی کے لیے ارشادِ ربّانی ہے۔

"وَیُعَلِمکُم الکِتَابَ وَالحِکمَۃَ وَیُعَلِمکُم مَا لَم تَکُونُوا تَعلَمُون"

یہ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی توصیف فرمائی گئی ہے۔ ان کے عرفان اور علم کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہی وہ عرفان و آگاہی ہے جو تمام انبیاءؑ کو عطا کیا گیا۔ یہی آگاہی اور معرفت ہے جو معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو سب سے زیادہ بخشی گئی جس کا اظہار آپؐ نے خود بھی کیا۔ حدیث شریف میں ہے "اَنَا اَعرِفُکُم بِاللہِ وَاَشَدُّکُم لَہٗ خَشیَتاً" (میں تم سب سے بڑھ کر اللہ کا عرفان رکھتا ہوں اور اس کے سامنے سب سے زیادہ خشیّت والا ہوں)

یہی عرفان ہے، یہی معرفت ہے جسے آپ نے اپنی کُل جمع پونجی قرار دیا اور خالقِ کائنات نے اس کی شہادت دیتے ہوئے اسے طلب کرنے کا حکم دیا۔

"رَبِّ زِدنِی عِلماً"

بندے کے مقام اور عظمتِ خالق کی پہچان کے ابتدائی مرحلے کو راس المال کہا گیا جو اَلَّذِینَ آتَینَاھُمُ الکِتَابَ یَعرِفُونَ حق کی شناخت ہے،

خود نفس انسانی کی پہچان ہے جو نبیؐ سے زیادہ کسی کو نہیں ہو سکتی۔

## ۲ اَلعَقلُ اَصلُ دِینی

(عقل میرے دین کی اساس ہے) عقل سلیم ہی نے انسان کو دیگر تمام مخلوقات سے افضل قرار دیا اور جسے علم کے لیے لازم و ملزوم کہا گیا کیوں کہ عقل اور علم کے امتزاج ہی سے بھلائی اور خیر کے کام انجام پاتے ہیں۔ عقل ہی صراطِ مستقیم تک رہنمائی کرتی ہے۔ عاقلوں اور عالموں کو کم عقلوں پر فضیلت ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔ "وَمَا یَعقِلُہَا اِلاَّ العَالِمُونَ"

یہ عقل سلیم ہی ہے جو شب و روز کے الٹ پھیر پر غور کر کے ایک ربِّ قدیر کی لامحدود طاقت، حکمت اور یکتائی کی دلیل پاتی ہے۔ خدا کے وجود اور توحید کو صرف عقل ہی سے پہچانا جاتا ہے کیوں کہ خالقِ کائنات نے خود کو پوشیدہ رکھ کر اپنی نشانیوں کو ظاہر فرمایا ہے اور انھیں عقل والے ہی پہچان سکتے ہیں ورنہ بھلا اس مُشتِ خاک کی قوّت ہی کیا کہ وہ اسرارِ فطرت کا کھوج لگاتا یا ان قوّتوں سے کام لینے کے طریقے جان سکتا جو قدرت نے اسے عطا فرمائے ہیں، لیکن یہ عقل اور صرف عقل تھی جس کے ذریعے آدمؑ نے اپنی خطا کو پہچانا اور عفو کے طریقے پر غور کیا۔ یہ عقل ہی تھی جو خداوندِ عالم نے نوحؑ کو بخشی ورنہ نوعِ انسانی غرق ہو جاتی۔ یہ عقل ہی تھی جس کے ذریعے ابراہیمؑ نے خود ساختہ معبودوں اور معبودِ حقیقی کی پہچان کی اور پھر یہ بھی عقل ہی ہے جس کے ذریعے انسان نصیحت پاتا ہے غرض کہ عقل کے سہارے ہی اخلاقی حِس زندہ رہتی ہے، بُرے بھلے کی تمیز اور حق و باطل کی پہچان ہوتی ہے۔ وَالشَّمسُ تَجرِی لِمُستَقَرٍّ لَّھَا پر غور و فکر کرنے والے کون ہیں۔

وَالقَمَرَ قَدَّرنٰہُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ کَالعُرجُونِ القَدِیمِ کو محسوس کرنے والے کون ہیں؟ یہ سب عقل والے ہی تو ہیں جو زمین سے آسمان تک نظر ڈالتے ہیں تو محض خدا کی وحدانیت اور یکتائی کی بے حد و حساب دلائل کو پانے کے لیے۔ یہی سبب ہے کہ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عقل کو

دین کی اساس کہا اور انسان کو غور و فکر کی ہدایت دی کیوں کہ خدا کی خدائی کی وسعتیں تفکّر کے بعد ہی منکشف ہوتی ہیں ۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ۔ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

اس ہدایت پر عمل کے بعد کوئی بھی نفس ایسا نہیں جو نہ پکارے کہ اے خدا تُو نے یہ سب بیکار پیدا نہیں کیا، مگر یہ اعتراف کرنا صاحبِ عقل لوگوں کا کام ہے۔

## ۳ اَلحُبُّ اَساسی (محبّت میری بنیاد ہے)

خداوندِ عالم نے اپنی عزیز ترین اور عظیم ترین مخلوق انسان کے لیے جو طریقۂ زندگی (دین) پسند کیا، اس کی بنیاد محبّت ایسے جذبے پر رکھی۔ وہ خود بھی محبّت کرنے والا ہے اور محبّت کرنے والوں ہی کو پسند فرماتا ہے۔ وہ رحمٰن ہے اور اس کی اکثر صفات رحم کرنے اور محبّت کرنے کے معنوں میں آئی ہیں۔

مُجِیبَ (جواب دینے والا، قبول کرنے والا)
توّاب (توبہ قبول کرنے والا)
وَہّاب (بہت بخشنے والا)
مُقِیتَ (روزی عطا کرنے والا)
کریم (بخشنے والا، کرم کرنے والا)
وَلی (مالک، آقا، حاکم)
وَدُود (دوستی، محبّت)

یہ تو چند اسمائے مبارک ہیں، لیکن اسمائے حسنیٰ کا شمار ننانوے ہے اور غور طلب بات یہ ہے کہ خداوندِ عالم کے ننانوے ناموں میں سے بیشتر محبّت اور رحمت کے معنوں میں آتے ہیں۔ تو یہ ہے وہ محبّت جس کے لیے معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "وَالحُبُّ اَساسی" سیرتِ طیّبہ کا ہر پہلو اسی محبّت کے مختلف درجے ہیں۔

اوّلین قسم: انسان کی انسان سے محبّت جو ایک فطری چیز ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو انسان سے محبّت کرنے کا حکم دیا ہے ۔ ہاں یہ

محبت اس قدر نہ ہو کہ اسے خدا اور رسولؐ سے بیگانہ کر دے۔ محبت کا اعلیٰ ترین درجہ خالق کی محبت ہے جسے عبودیت کہتے ہیں۔ اسی عبودیت پر کُل اعمال کی بنیاد ہے۔ اسے انسان کے اعمال سے خارج کر دیا جائے تو وہ بغرض کے سوا کچھ نہیں۔ تیرہ سالہ مکی زندگی میں ہر مخالفت، سختی اور مصائب کو برداشت کرنا، مجبوری اور بے چارگی نہیں بلکہ صبر اور استقلال تھا کیوں کہ اس میں عبودیت کا جذبہ شامل تھا۔ کیا طائف کے سفر کی اذیتیں سہنے کے بعد اس وقت کوئی لاچار اور مجبور آدمی اذیتیں دینے والوں کو دُعائیں دے سکتا تھا! لیکن اللہ کی محبت بلکہ محبت کی معراج تھی کہ معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت بھی اہلِ طائف کے لیے بد دعا نہیں کی اور یہی جذبہ ان کے ہر عمل کی اساس رہا ہے۔ ان کی چالیس سالہ غیر نبوی اور تیئیس سالہ نبوت کے بعد کی یعنی کہ تریسٹھ سالہ حیاتِ مقدس کا ہر فعل اور قول اسی جذبۂ محبت کی غمازی کرتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی ہدایت فرمائی۔ لایرحم اللہ من لایرحمُ النّاس (اللہ اس پر رحم نہیں کرتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا)

ایک دوسری جگہ حدیث شریف میں ہے۔ اِرحموا مَن فِی الارضِ یَرحمکمُ مَن فِی السّماءِ (تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا)

رحم کرنے سے مراد یہی جذبۂ محبت ہے جس جذبے کی قرآنِ حکیم میں متعدد الفاظ سے تشریح کی گئی ہے اور واضح طور پر حکم دیا گیا ہے۔ یُحِبُّھُم وَ یُحِبّونَہٗ، سچے بندے اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ ان بندوں سے محبت کرتا ہے۔

محبت ہی فطرت ہے، بھلائی ہے، خیر ہے، تقویٰ ہے، احسان ہے، عدل و انصاف ہے صبر و رضا ہے، صفائی و طہارت ہے اور یہی خصوصیات انسان میں ہیں اسی لیے وہ مالکِ حقیقی کی محبت کا حق دار ہے چنانچہ ارشادِ ربانی ہے قُل اِن کُنتُم تُحِبّونَ اللّٰہ فاتّبِعُونِی یُحبِبکُم اللّٰہ

## ۴ الشوق مرکبی

(شوق میری سواری) شوق سے مراد ہے رغبت، آرزو اور جستجو، یہ شوق ہے جو تمام اعمال کا محرک ہوتا ہے اور شوق باقی نہ رہے تو حیاتِ انسانی معطل اور جامد ہوجاتی ہے اور اسی تعطل اور جمود سے بچانے کے لیے حدیث شریف میں ہدایت دی گئی ہے۔ "جو چیز تجھے نفع دینے والی ہو اس کی رغبت اور حرص پیدا کر۔ اللہ سے مدد چاہا کر اور عاجز ہو کر مت بیٹھ جا۔"

یہی حرص و رغبت، یہی شوق ہے جو حیاتِ انسانی کی بقا اور ارتقا کے لیے لازمی ہے۔ اسی کو معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذریعۂ سفر قرار دیا ہے، مرکب کہا ہے۔ "شوق میرا مرکب ہے"۔ جب انسان اپنے مقصد کی تکمیل کی آرزو کرتا ہے، جب کسی بھی عظیم الشان اور مشکل ترین مشن کی کامیابی کے لیے شوق دل میں جگہ پالیتا ہے تو کوئی مشکل مشکل نہیں رہتی اور نہ ہی سفر کی صعوبتیں انسان کے قدم پکڑتی ہیں۔ اس وقت صرف منزل کی طلب ہوتی ہے اس لیے کہ شوق، جستجو اور طلب کی ابتدا ہے، عمل کا محرک ہے، یہی معطل و مردہ قوم میں زندگی پیدا کرتا ہے، یہی روح میں احساس اور قلب میں سوز پیدا کرتا ہے۔ یہی شوق راہِ عمل میں کامیابی کی ضمانت اور محرک اور بھرپور زندگی کا سبب ہے۔ ؎

شوق کھینچے لیے جاتا ہے جہاں جاتا ہوں

## ۵ ذکرُ اللہ انیسی

(اللہ کا ذکر میرا مونس ہے)

یاایھا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکرا کثیرا۔ (اے ایمان والو، اللہ کا ذکر کیا کرو، کثرت کے ساتھ)

وَاذکُرُوا اللہَ کثیراً لَعَلَّکُم تُفلِحُونَ۔ (اللہ کا ذکر بہت بہت کیا کرو، تم فلاح پاؤ گے)

آیاتِ قرآنی میں یہ احکام مختلف انداز میں بار بار دیے گئے ہیں "ذکر" کے متعدد معنی بھی ہیں اور اسی پر اعمال صالح کی تکمیل بھی ہے اور اسی کو باطنی امراض کا علاج بھی قرار دیا گیا ہے۔

نماز کے لیے حکم ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ۔ (نماز بدکاریوں اور برُے کاموں سے ہٹا دیتی ہے اور اللہ کا ذکر تو بہت بڑھ کر ہے)

ایک اور جگہ کہا گیا۔ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰاکُمْ (تاکہ تم اللہ کی بزرگی یعنی ذکر کرو۔ اس نے تمھیں ہدایت دی)

حج کے بعد: فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ۔ (جب مناسک پورے کر چکو تب اللہ کا ذکر کرو)

الغرض ہر حکم اور ہر عمل کی تکمیل کے بعد اوّل چیز ذکر الٰہی ہے اور یہی ذکر معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا مونس و انیس تھا۔ مخالفین کے اجتماع میں، موافقین کی محفلوں میں، کبھی بہ بانگِ دہل اور کبھی تدبّر کے انداز میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اسی میں مصروف رہتے۔ یہ آپ کی بے پناہ محبّت، جذبۂ عبودیت اور باری تعالیٰ سے انسیت تھی۔ دراصل مونس کے معنی انس رکھنے اور محبّت کرنے والے ہی کے ہیں، یعنی ذکرِ الٰہی مجھے محبوب ہے۔ اپنے اس جذبے کے اظہار کے ساتھ ہی آپ نے ذکرِ الٰہی کی ہدایت بھی فرمائی۔ ارشاد ہوتا ہے "جو لوگ اللہ کا ذکر کرنے کو بیٹھتے ہیں، فرشتے ان کے گرد اگرد آجاتے ہیں۔ رحمت ان پر چھا جاتی ہے۔ سکون ان پر نازل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر اپنے فرشتوں میں کرتا ہے۔"

ایک جگہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک اعرابی کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا "جب تُو دنیا چھوڑے تو تیری زبان ذکرِ الٰہی سے تروتازہ ہو۔"

ذکرِ الٰہی کرنے اور اس پر عمل کے ساتھ ہدایت کرنے میں ایک حکمت یہ بھی پوشیدہ ہے کہ فطرت کے مطابق ہم جس سے محبّت کرتے ہیں، وہ ہم سے محبّت کرتا ہے اور ہم جس انداز میں جس کا ذکر کرتے ہیں، وہ اسی طرح ہمارا بھی ذکر کرتا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے۔ فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ خالقِ حقیقی نے کس محبّت سے فرمایا کہ تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا۔ اس وعدے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس ہستی کا ساتھی ہی ذکرِ الٰہی ہو، وہ ہستی اس ہستی کو کس قدر عزیز ہے

ہو گی لہٰذا معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ فرمان کہ ذکرِ الٰہی میرا انیس ہے، آپ کی بے پناہ چاہت کے ساتھ ساتھ باری تعالیٰ کی محبّت کی غمازی بھی کرتا ہے۔

۶ اَلثِّقۃُ کَنزِی (اعتمادِ الٰہی میرا خزانہ ہے) دراصل اعتماد سے مراد ہے، یقینِ محکم، ایمان، بھروسا اور توکّل الٰہی۔ وہی یقین جو سیّدنا ابراہیمؑ کو تھا۔ یہ ایمان و یقین ہی تھا کہ نار نے ابراہیمؑ کو سلامت رکھا۔ وہ بھی یقین تھا جس نے انھیں نوعمر فرزند اور تنہا بیوی کو بے آب و گیاہ میدان میں چھوڑ آنے کے باوجود مطمئن رکھا۔ الغرض یقینِ محکم انبیاءؑ کی شان ہے اور اس شان کا حق دار بھی معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا تھا! اوّل سے آخر تک ان کی تمام حیات اسی اعتماد سے پُر نظر آتی ہے۔ غارِ ثور میں تین یوم کا قیام اور اس طرح سے کہ جانی دشمنوں کے قدموں کی آواز آپؐ خود سن رہے ہیں، لیکن اس وقت بھی اپنے ساتھی سیّدنا ابوبکر صدیقؓ کو تسلّی دینا "غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے"۔ اعتماد کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے! پھر ہجرت کی شب دشمنوں سے گھرے ہوئے دروازے سے نکل جانا اس اعتماد کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ حفاظت کرنے والا ہے۔ علاوہ ازیں مکّے کی تیرہ سالہ زندگی میں بُت پرستوں کے درمیان رہتے ہوئے ان کے معبودوں کو بہ بانگِ دہل باطل قرار دینا، اسی اعتماد کی علامت تھی۔ یہی اعتماد، یہی یقین تمام غزوات میں کامیابی کی اوّلین شرط تھی اور اسی نے آپ کو دیگر تمام شعبوں میں کامیابی بخشی۔

۷ اَلحُزنُ رَفِیقِی (غم میرا رفیق ہے) "اے نبی! میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت درگزر کرنے والا ہوں، لیکن اس کے ساتھ ہی میرا عذاب بھی نہایت دردناک عذاب ہے۔"

یہی غم یہی حزن معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قلب کو مضطرب رکھتا تھا۔ الحزن کے معنی ہیں غم، فکر، اضطراب، خوف، خشیّت اور اندوہ۔ غم دو قسم کا ہوتا ہے، ایک ذاتی دوسرا کائناتی یا غمِ ذات اور غمِ روزگار۔ غمِ ذات میں انسان صرف اپنی بہتری و بہبود کے لیے سوچتا ہے، لیکن یہی حزن و غم جب نبی کے دل میں ہو تو وہ امّت کے لیے ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا استعمال انبیاءؑ کے لیے ہی ہوا

ہے۔ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم رحمتِ عالم تھے اور ان کا قلب بنی نوعِ انسان کی محبت سے لبریز تھا، ان کا ہر فعل، ہر قول اور ہر ہدایت اسی جذبے کی غماز تھی۔ یہ غم کبھی قلبِ مبارک سے جدا نہ ہوا۔ جوں جوں دینِ حق کی مخالفت بڑھتی، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) انھیں مزید استقلال اور جوش کے ساتھ آخرت کا خوف دلاتے اور خدائے واحد کی عبادت کی ہدایت کرتے اور اکثر دعا کرتے "اے خدا! اگر تو انھیں عذاب دے گا تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں بخش دے گا تو تُو غالب اور حکمت والا ہے۔"

یہ دعا آپ اکثر کرتے اور جب کرتے تو اشک جاری ہو جاتے۔ عام دنوں میں بھی جب کبھی آندھی زور سے چلتی تو آپ پریشان ہو جاتے اور جس کام میں بھی مصروف ہوتے اسے چھوڑ کر قبلہ رخ ہو کر دعا کرتے "خداوندِ عالم! میں تیری بھیجی ہوئی مصیبت سے پناہ مانگتا ہوں۔"

یہ اضطراب دیکھ کر ایک مرتبہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضؓ صدیقہ نے دریافت کیا۔ "یا رسول اللہ! آپ مضطرب کیوں ہو جاتے ہیں؟"

ارشاد ہوا "عائشہ رضؓ! مجھے کیا معلوم کہ قوم ہود کو کیا واقعہ پیش آیا جنھوں نے بادل دیکھ کر کہا تھا کہ یہ تو ہمارے کھیتوں کو سیراب کرنے والا ہے حالانکہ وہ عذابِ الٰہی تھا۔"

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) عذابِ الٰہی سے ہر وقت پناہ مانگتے اور خاص طور سے اس وقت جب جھٹلائے جاتے، منکرین کے حق میں دعائیں کرتے۔

قرآنِ حکیم کی کچھ سورتوں میں قیامت کی خبر دی گئی ہے بلکہ آخری سورتیں تو صرف اسی کے بارے میں ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے "جب واقع ہونے والی واقع ہو جائے، اس کے واقع ہونے میں کچھ جھوٹ نہیں، کسی کو پست کرے کسی کو بلند، جب زمین بھونچال سے لرزنے لگے، پہاڑ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں، پھر غبار ہو کر اُڑنے لگیں اور تم لوگ تین قسم ہو جاؤ۔"

"بے شک فیصلے کا دن مقرر ہے جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم لوگ غول غول آموجود ہو گے اور آسمان کھولا جائے گا (تو اس میں) دروازے ہو جائیں گے

اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ ریت ہو کر رہ جائیں گے۔ بے شک دوزخ گھات میں ہے، یعنی سرکشوں کا وہی ٹھکانا ہے۔ وہ اس میں مدّتوں پڑے رہیں گے۔"

یہی وہ غم تھا جس سے قلبِ مبارک مضطرب رہتا۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اسی عذاب کی سختی سے بچانے کے لیے ہدایت کی سختیاں برداشت کرتے اور فرماتے تھے "لوگو! جو کچھ میں جانتا ہوں، اگر تم جانتے ہوتے تو تم کو ہنسی کم اور رونا زیادہ آتا۔"

اسی غم کی تسلّی کے لیے ارشاد ہوا "اے نبیؐ جو لوگ کفر میں جلدی کرتے ہیں ان کی وجہ سے غمگین نہ ہونا، یہ خدا کا کچھ نقصان نہیں کر سکتے۔"

## ۸ العِلمُ سلاحی (علم میرا ہتھیار ہے)

علم، معرفتِ الٰہی ہے۔ اسی سے ہر شئے کی پہچان کی جاتی ہے اور یہی وہ نعمت ہے جو سب سے پہلے عطا کی جاتی ہے، یعنی سیدنا آدمؑ کو خدا کی جانب سے پہلے علم ہی عطا ہوا۔ ارشادِ ربّانی ہے۔ وَعَلَّمَ آدَمَ الاَسمَاءَ کُلَّھَا۔

یہ علم آدمؑ کے لیے تھا جس میں انسان کی عظمت پوشیدہ کر دی گئی اور "ربِّ زِدنی علما" کی ہدایت سے اس کی اہمیت واضح کی گئی۔ علم، انبیاءؑ کی میراث ہے۔ اسی کی میزان پر اقوال و اعمال وزن کیے جاتے ہیں اور یہی تعمیر اور تخریب کے فرق کو واضح کرتا ہے لہٰذا معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اسی علم کو اپنا ہتھیار کہا ہے اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی نبوی زندگی کی ابتدا اسی ہدایت سے ہوئی۔ اِقرا بِاسمِ رَبِّکَ الَّذِی خَلَقَ۔

یہاں علم کی ہدایت کے فوری بعد خَلَقَ الاِنسَانَ مِن عَلَقٍ کہہ کر انسان پر اس کی حقیقت کو آشکار کیا گیا اور پھر اِقرَا وَرَبُّکَ الاَکرَمُ الَّذِی عَلَّمَ بِالقَلَمِ سے اسے (علم کو) خدا کا سب سے بڑا کرم اور انسان کے لیے سب سے بڑی مہربانی کہا گیا۔ اسی ہتھیار کو ساتھ لے کر معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے سفرِ نبوّت کا آغاز کیا اور تیئیس سالہ نبوی زندگی میں، اسی سے ہر میدان میں فتح پائی۔ یہ علم ہی تھا کہ قیامِ مکّہ کے زمانے میں قریش کا معزز سردار عتبہ

خدمتِ اقدس میں آتا ہے اور مال و دولت، ریاست و حکمرانی اور بڑے سے بڑے خاندان میں شادی کی پیش کش کرتا ہے، صرف اس لیے کہ آپؐ، کفّار کے معبودانِ باطل کو بُرا کہنا چھوڑ دیں۔ اس وقت معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا جواب تھا "میں نہ تو زر و دولت کی آرزو رکھتا ہوں نہ ریاست و حکمرانی کی خواہش بلکہ میں تو ربّ العالمین کا پیغام لے کر آیا ہوں جسے ہر سننے والے کے کان تک پہنچا دینا ہی میرا مقصد ہے۔"

یہ علم کا ہتھیار ہی تھا جس کے سبب ہر جانب سے مخالفت ہو رہی ہے، بدترین دشمن تاک میں ہیں اور مکّے کی گلیاں اور ویران راستے ہیں، تخریبی کارروائیاں کرنے والے جوان معزز سرداروں کی پشت پناہی پر ہر حملے اور ایذا رسانی کو تیار ہیں لیکن اس ماحول میں بھی اللہ کا آخری نبیؐ سرِعام تبلیغ کا فرض ادا کرتا ہے۔ میلوں کی بھیڑ بھاڑ ہوتی یا سنسان مقامات وہ برملا ان کے خود ساختہ بُتوں کو باطل قرار دے کر معبودِ حقیقی کا اعلان کرتا اور غیظ و غضب سے بپھرے ہوئے مسلّح لوگ بھی کچھ نہ کر سکتے۔ یہ علم کا ہتھیار ہی تھا کہ شمشیر و سناں کے بغیر اسلام کی اشاعت اور قلوب کی تسخیر کا عظیم کام انجام پا گیا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ فرمانا کہ علم میرا ہتھیار ہے، نبوّت کی بہترین دلیل ہے کہ ایک اُمّی انسان علم کے بے بہا خزانوں کا مالک ہو جس نے زندگی بھر جو کہا، علم کی بنیاد پر اور جو کیا علم کی بنیاد پر! یہ حدیثِ مبارک اعدائے اسلام کے اس گمراہ کن تشہیر کا جواب بھی ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا۔

## ۹ اَلصَّبْرُ رِدَائِی : (صبر میری چادر ہے)

دریافت کیا گیا "یا رسول اللہؐ! ایمان کیا ہے؟"

ارشاد ہوا۔ اَلصَّبْرُ وَالسَّمَاحَۃ۔ (صبر اور سیر چشمی) اس طرح صبر کا درجہ بہت بلند ہے۔ قرآنِ حکیم نے بار بار اس کی توصیف فرمائی ہے اور اپنے صبر کرنے والے بندوں کو اجرِ عظیم کی خوش خبری دی ہے۔

وَاسْتَعِینُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃ۔

اِصبِرُوا وَصابِرُوا۔

اس ہدایت کے ساتھ ہی اہلِ صبر کے لیے اپنی معیت اور چاہت کا اعلان بھی فرما دیا۔ ان اللہ مَعَ الصّابرین۔

صبر روح کی غذا اور جسم کی تسکین ہے اور اسی کو معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی چادر اپنی رِدا قرار دیا ہے۔ رِدا نہ صرف پردہ پوشی کرتی ہے بلکہ تزئین اور آرائش کو بڑھاتی، اغیار کی نظروں سے بچاتی اور موسم کی شدّت میں حفاظت کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ صبر ہی آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی زینت تھا۔ صبر ہی مخالفین کے طنز و استہزا سے بچاتا تھا اور صبر ہی استقلال و عزم کے ساتھ ثابت قدم رکھتا تھا۔ بات پیغمبرانہ زندگی کی ہو یا روزمرّہ نجی زندگی کی، بہ غور مطالعہ کیا جائے تو آپ کی ذاتِ اقدس کو خارجی اور داخلی طور پر مسلسل حوصلہ شکن مصائب سے گزرنا پڑا۔ آج آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی زندگی کے ہر دَور کو دیکھا جائے تو تعجب ہوتا ہے کہ ابتدائے عمر سے آخری عمر تک حالات کی ناسازگاری اور اس قدر مصائب کسی کے حصّے میں نہ آئے! کم سنی کا زمانہ تھا اور ہر محبّت کرنے والی ہستی ساتھ چھوڑتی جاتی تھی۔ پیدائش سے قبل باپ اور بعد کو ماں، پھر دادا ایسی شفیق ہستیوں سے محرومی! کیا کچھ محسوس نہ ہوتا ہوگا! لیکن اس وقت اِستعِینُوا باللہِ واصبِرو کی بہترین تفسیر نظر آتی ہے۔ پھر لڑکپن اور جوانی کا دَور شروع ہوتا ہے۔ مکّے میں عیش و عشرت کے کون سے سامان تھے! حسنِ بے نقاب جگہ جگہ موجود تھا۔ مَردوں سے زیادہ عیش کی دلدادہ خود عورتیں تھیں۔ بنو ہاشم کے اس صالح جوان پر کس کی نظر نہ جاتی! لیکن وہاں تو حزنِ الی اللہ کی کیفیت تھی اور یہ کیفیت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو مکّے کے بے نقاب حُسن اور متوجّہ کر لینے والی اداؤں سے غرض نہ تھی۔ آپ کی تمام تر توجّہ ان برائیوں کی جانب تھی جو قوم کو کھوکھلا کیے دے رہی تھیں۔ پھر بہ وقت بھی لوگوں کے قلب و ذہن پر ان کی امانت داری اور صادق ہونے کا نقش چھوڑ کر رخصت ہوا اور رنج و غم کے دَور آتے رہے، گزرتے رہے جنھیں آپ خندہ پیشانی اور کشادہ دلی کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔

پھر نبوی زندگی کا آغاز ہوا تو گویا مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اسی وقت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کی وحدانیت کا اعلان کرتے تو جواب میں سنگ باری کی جاتی، آستانۂ فیض پر کانٹے بچھائے جاتے، پاکیزہ گھر میں غلاظت اچھالی جاتی۔ آپ جن راہوں سے گزرتے وہاں جگہ جگہ گڑھے کھود کر راستے کو ٹہنیوں سے پاٹ دیا جاتا تاکہ آپ گر جائیں۔ کبھی حالتِ نماز میں پشتِ مبارک پر اوجھڑی دھر دی جاتی اور تماشبینوں کی دل لگی کا سامان پیدا کیا جاتا۔ کبھی آپ کی گردنِ مبارک میں چادر ڈال کر بل دیے جاتے، گردن کو بھینچا جاتا اور کفار اپنی بے بسی اور ناکامی کے احساس کو اذیتیں دے دے کر ٹھنڈا کرتے۔ یہ اذیتیں ایک دو دن نہیں پورے تیرہ برس برداشت کرنا صبر والوں ہی کا کام تھا۔ ان بیرونی مصائب کے ساتھ ہی اندرونی غم بھی ساتھ ساتھ تھے۔ باپ اور دادا کے بعد سینے سے لگا لینے والے شفیق چچا جو نصف صدی سے زیادہ عرصے سپر بنے رہے، جن کی بے پناہ محبت آپ کے لیے ہر زخم کا مرہم تھی، وفات پا گئے، پھر ہجوم یاس اور شدائد و مصائب کی دوست، مونس و غم خوار بیوی رخصت ہو گئی۔ اس کے علاوہ اولاد کا غم تھا، لیکن ہر موقعِ پر آپ نے صبر کیا اور صبر کی تعلیم دی بلکہ دنیا کو اس کے معنی سمجھا دیے۔

## ۱۰ الرِّضا غنیمتی : (رضائے الٰہی میری غنیمت)

مالِ غنیمت: وہ دولت اور ساز و سامان جو میدانِ جنگ میں دشمنوں کو مغلوب کرنے کے بعد فاتح کے ہاتھ آتا ہے، مالِ غنیمت کہلاتا ہے۔ اسلام سے قبل اسی مال کا لالچ سپاہیوں کو میدانِ جنگ میں لے جاتا تھا۔ پھر وہ مفتوحین کے مال و دولت اور عورتوں کے ساتھ جو رویہ بھی رکھتے جائز سمجھا جاتا۔ وہ ہر شئے کو غنیمت کے طور پر لوٹ لیتے تھے۔ طاقت ور اور صاحبِ اقتدار سردار اپنا حق دوسروں سے زیادہ سمجھتے۔ اسلام نے جنگ و جدل کے اس انداز کو رد کیا بلکہ جنگ کو ایک مقصد عطا کیا اور مالِ غنیمت کو لوٹ کھسوٹ نہیں بلکہ صلے اور انعام کے طور پر جنگ میں حصہ لینے والوں کے لیے جائز کر دیا گیا۔ یہ تو تھی، مالِ غنیمت

کی تعریف۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وَالرِّضا غنیمتی سے مراد کیا ہے؟

رِضا: مالکِ حقیقی کے سامنے تسلیم و رضا کا اقرار کر لینا، اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جانا۔ جو کچھ عطا فرمایا، اس پر جو کچھ بخشا نہیں گیا، اس پر اطاعتِ کُلّی کا اظہار کرنا۔ الغرض عطیہ ہو یا عدمِ عطیہ، فیض یاب ہو یا محروم، ہر صورت میں اللہ تعالیٰ کی بخشش ہی پر دل مطمئن ہو۔ اس کے سوا کسی اور شئے کی آرزو نہ کرے۔ یہی راضی بہ رضا ہونا ہے۔ معلمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس رضا کو غنیمت قرار دیا، یعنی نبیؐ کی مکمّل زندگی ایک جہاد تھی۔ ہر شعبے میں انھوں نے حق کی حمایت کے لیے جہاد کیا۔ علم کے ہتھیار سے دشمنانِ خدا کو مغلوب اور مفتوح کیا اور جب فتح پائی تو مالِ غنیمت میں اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی پائی اور وہی ان کا مقصود تھا۔ نبوت کے ابتدائی زمانے میں یہی انھیں ہدایت بھی فرمائی گئی تھی۔ ارشادِ ربّانی ہے۔ ولا تمنن تستکثر ولربک فاصبر۔

بے غرضانہ احسانات اور لوگوں سے حُسنِ سلوک صرف خدا کی رضا جوئی کے لیے ہو۔ دل میں کبھی یہ خیال بھی نہ آئے کہ احسانات کے بدلے میں ان لوگوں سے کوئی دنیوی فائدہ حاصل ہو گا بلکہ تمھارے تمام امور کا صلہ تو رَاضِیَۃً مرضیۃً ہے۔

## ۱۱ اَلعِجزُ فَخری

: (عاجزی میرا فخر ہے)

ھَل کُنتُ اِلَّا بَشَراً رَّسُولاً۔ یہ آیتِ مبارکہ ایک طرف درجۂ بشریت کو بالاتر کرتی ہے اور دوسری جانب عجز، تواضع اور عبدیت کا بہترین اظہار کرتی ہے۔ واقعی یہ عجز، لائقِ فخر ہے جس نے سابقہ تمام اوہام اور توہمات کا پردہ چاک کر کے یہ سمجھا دیا کہ خدا کی جانب سے آنے والا رسولؐ اپنے تمام کمالات اور اقتدار رکھنے کے باوجود عبد ہی ہے، معبود نہیں ورنہ اس سے قبل تو کم و بیش ہر قوم نے ہی اپنے اپنے مقتداؤں کو معبود کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔ مسیحی جنابِ مسیحؑ کو خدا کا بیٹا، یہودی حضرت عزیرؑ کو ابن اللہ گردان کر جنسِ انسانی سے بالاتر سمجھتے۔ ہندوؤں میں متعدد اوتار مانے جاتے۔ ان کا

ایمان تھا کہ خالق نے صورتِ مخلوق میں آکر اپنی الوہیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ناروے، تبت اور انگلستان کے باشندے اہلِ مصر، اہلِ بابل اور تاتاری مدتوں انسانوں کو خدا بنا کر پوجتے رہے کیوں کہ وہ سب انھیں بشریت سے بلند و بالا ہونے کی عزت بخشتے تھے، لیکن معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عجز نے ان سب اقوام کو عبد اور معبود کی حقیقت سمجھا کر ان کی لاعلمی کو علم و آگاہی میں بدل دیا اور سمجھا دیا کہ انسان بلند ترین اور عظیم ترین ہونے کے باوجود مالکِ حقیقی کا محتاج اور صرف بندہ ہی ہے۔ وہ کبریائی کا نہیں صرف عجز کا سزاوار ہے۔ جب ایک مقامِ عبدیت کو پالیتا ہے تو شرک و کفر، غرور و تکبر اور خود پسندی ایسی برائیوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے قول و عمل، کردار و گفتار اور فکر و عمل خشیتِ الٰہی کے تابع ہوتے ہیں اور یہی اس کا سرمایۂ افتخار ہوتا ہے۔

معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ اقدس کے ہر حصے میں عجز و اخلاق، تمام انبیاء و مصلحین سے ممتاز ترین نظر آتا ہے۔ یوں تو عاجزی کی تعلیم کئی ایک نے دی لیکن معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم وہ معلم ہیں جنھوں نے اس کا درس بھی دیا اور اس پر خود عمل کر کے بھی دکھایا کیوں کہ آپ تو خود اپنی تعلیم کا نمونہ تھے۔ عجز کا یہ عالم تھا کہ آپ گھر کا کام کر لیتے اور اپنے کپڑوں میں پیوند بھی لگا لیتے۔ صفائی کرنا، دودھ دوہنا اور بازار سے سودا سلف لانا بھی آپ کے معمولات میں تھا۔ آپ محفل میں تشریف لاتے تو سلام کا انتظار نہ کرتے بلکہ خود سلام کرنے میں پہل کرتے۔ ایک مرتبہ لوگ آپ کی تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو فرمایا: "اہلِ عجم کی طرح تعظیم کے لیے نہ اٹھا کرو۔"

یہ عجز و تواضع ہی تھی کہ اپنی ذات کے لیے وہ تعریف بھی پسند نہ فرماتے جس کے آپ حق دار تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے کہا: "اے ہمارے آقا! ہمارے آقا کے فرزند! آپ ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند ہیں۔"

اس وقت معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لوگو! پرہیز گاری اختیار کرو تاکہ شیطان تمھیں گرا نہ دے۔ سنو! میں عبداللہؓ کا بیٹا محمدؐ ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسولؐ ہوں، مجھے خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے، میں نہیں چاہتا کہ اس سے زیادہ بڑھاؤ۔"

## ۱۲ اَلزُّہدُ حِرفَتِی

(زہد میرا پیشہ ہے) زہد کے معنی اصطلاحِ شریعہ میں دُنیوی مال و متاع سے بے رغبتی برتنے کے ہیں۔ آگے چل کر حضرت امام احمدؒ بن حنبل نے اس کی وضاحت کے لیے اسے تین درجوں میں تقسیم کر دیا۔

۱: عوام کا زہد: ترک حرام ہے۔

۲: خواص کا زہد: حلال اشیا میں سے (ضرورت سے) زائد کو چھوڑ دینا۔

۳: عارفین کا زہد: ہر وہ شئے، ہر وہ کام اور ہر وہ خواہش ترک کر دینا جو اللہ کی طرف توجہ میں مانع ہو۔

معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم نے جس زہد کو اپنا پیشہ و حرفہ بتایا، وہ زہد کی بلند ترین اور اعلیٰ ترین صورت تھی۔ آپ کی حیاتِ مقدس میں وہ زمانہ بھی آیا جب آپ مکے میں تھے۔ قدم قدم پر آپ کے لیے مخالفتیں اور اذیتیں تھیں۔ یہاں آپ نے اپنے ہی اقربا اور بھائی بندوں کی انتہائی مخالفتیں بھی برداشت کیں۔ شعیب ابی طالب کی محصوری بھی گوارا کی، عزیز، غم گسار ہستیوں کی اموات بھی دیکھیں۔ طائف کے سفر کی تکلیفیں بھی تھیں اور جگہ جگہ سے ناکامی بھی، لیکن یہ زہد ہی تھا جس کے سبب کامیابی کا فقدان اور مصائب کا ہجوم قلب کو متوحش نہ کر سکا۔ اوّل سے آخر تک آپ نے اپنی پوری توجہ اور یقین صرف اللہ ہی کی طرف مبذول کر لیا۔ آپ نے ہر اس چیز کو ہیچ تصوّر کر لیا تھا جو اللہ کے سوا کسی اور طرف لے جا سکتی تھی۔ پھر مکے کے بعد مدینۂ طیبہ کا وہ زمانہ آیا جب آپ نے ایک دو نہیں متعدد کامیابیاں حاصل کیں اور تمام عرب آپ کے زیرِ نگیں آگیا۔ ایسے میں مطلق العنان بادشاہوں کی حیثیت بھی آپ کے سامنے کچھ نہ تھی، لیکن یہ جلیل القدر حیثیت حاصل کر لینے کے بعد بھی آپ فاقہ کش ہی رہے۔ حضرت عائشہ رضؓ صدیقہ فرماتی ہیں کہ مدینے کے قیام سے وفات تک اللہ کے نبیؐ نے کبھی سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ مدینۂ طیبہ کے قیام سے وفات تک کا زمانہ کیا ہے؟ یہ زمانہ وہ تھا جب مدینے کی سرزمین سیم و زر سے بھر چکی تھی اور عرب حدودِ شام سے عدن تک مسلمانوں کے پاس تھا۔ ان حالات میں ایک ایسے ذی مرتبہ انسان کا صرف چند چیزوں پر قناعت

کر لینا معمولی بات نہ تھی۔ یہ بات بھی نہیں کہ آپ زمانے سے کنارہ کش ہو جانا چاہتے تھے بلکہ آپ کی تعلیمات نے رہبانیت کا خاتمہ کیا اور دنیا کی زندگی اور خوشیوں میں خود حصہ لینے کے باوجود خدا کی ذات سے لمحہ بھر کو غافل نہ ہوئے۔ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام کی تفسیر تھی "جب تم فارغ ہوا کرو تب عبادت میں مصروف ہو جاؤ اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جایا کرو"

دراصل یہی زہد کی تعریف ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے آشکار فرمایا۔

## ۱۳ الیقینُ قوّتی : (یقین میری قوت ہے)

یقین تمام شکوک بدگمانیوں اوہام کو مٹا دیتا ہے اور حقیقت و صداقت پیدا کر کے آیاتِ ربانی کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت بخش دیتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے قرآن مجید میں ارشاد ہے "یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں اور خود ان کے نفس کے اندر نشانیاں موجود ہیں تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو"

دوسری جگہ یقین اور اہل یقین کی تعریف اس طرح کی گئی ہے "نیکی یہی نہیں ہے کہ تم مشرق و مغرب کی طرف منہ کر لو بلکہ نیکی (ان لوگوں کی ہے) یہ ہے کہ اللہ پر، روزِ قیامت پر، کتابوں پر اور انبیاءؑ پر یقین رکھتے ہیں"

اس آیتِ مبارکہ میں یقین کو ایمان کہا گیا ہے۔ اسی سورت کے شروع میں ارشاد ہے "جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اس پر (جو کتاب تم پر اتاری گئی) اور اس پر جو کچھ تم سے پہلے نازل کیا گیا اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو ہدایتِ ربانی پر ہیں اور نجات پانے والے ہیں"

الغرض فرمان خداوندی کے مطابق اہلِ یقین ہی فلاح پانے والے ہیں۔ اہلِ یقین ہی ہدایت پانے والے ہیں۔ یہی اہلِ نجات ہیں اور یہی یقین کی دولت ہے جسے معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوت کہا ہے۔ آپ کی حیاتِ مقدس کا ہر لمحہ یقین ہی سے تعبیر تھا اور یہ یقین آپ کا محض اپنی ذات تک محدود نہ تھا کیوں کہ آپ کو یقین کرنا ہی نہیں، یقین دلانا بھی تھا۔ ہستیٔ باری تعالیٰ اعمال کی جزا اور سزا، اس کی حقیقت، وجودِ عالمِ ارواح، ملائک اور یومِ حشر، ان سب کی

صداقت پر آپ کو یقین تھا اور اپنی گفتار و عمل سے یہ یقین ملحدوں، منکروں، مشرکوں اور کافروں کے قلوب میں مستحکم کرتا تھا اسی لیے قرآن مجید میں آپ کو متعدد جگہ شاہدؐ کہا وجئنا بک ھؤلاء شہیدا اور اسی شہادت نے صحابہؓ کو بھی یقین کے درجۂ اعلیٰ تک پہنچا دیا۔ چنانچہ آپ کا یقین تو مسلّم تھا، لیکن صحابۂ کرامؓ بھی اس سے اسی طرح مالا مال تھے۔

معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے یقین کی حقیقت یہ تھی کہ وہ ہر شئے میں باریٔ تعالیٰ ہی کو دیکھتے، ہر لمحہ اسی کی رضا چاہتے۔ قرآنِ حکیم میں یقین کے تین درجے بیان فرمائے گئے ہیں۔

کَلّا لَو تعلمُونَ عِلمَ الیقین، اس یقین کے لیے عقل و فہم کو دخل ہے۔ اگر تم جانتے تو غفلت نہ کرتے۔ تمھارے انکار کا سبب ہی یہ ہے کہ تم عقل کو استعمال نہیں کرتے۔

ثمّ لترونّھا عین الیقین۔ یہ یقین کا دوسرا درجہ ہے۔ یہاں مشاہدے کی ضرورت ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ تم دوزخ ضرور دیکھو گے اور ایسا دیکھو گے کہ تمھیں یقین آجائے گا (کہ خدا کی بات سچی ہے)

انّ ھٰذا لھُوَحقّ الیقین۔ یعنی تجربے سے گزرنے کے بعد یقین کیا جائے چنانچہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ان گمراہوں کے لیے کھولتے پانی کی ضیافت اور جہنّم میں داخل کیا جانا ہے جو یقیناً ہے، یعنی حق الیقین ہے اور اس عذاب سے گزرنے کے بعد ہی انھیں یہ یقین آئے گا۔

غرض کہ یقین ہی علم ہے، یقین ہی مشاہدہ ہے اور یقین ہی تجربہ! اور یہی قوّت انسان کو زندہ رکھتی ہے۔ یقین ہی ایک فرد کی نہیں پوری قوم کی قوّت ہے، زندگی ہے، توانائی ہے لہٰذا اس قوت، توانائی اور زندگی کی، اس شخص کو کس قدر ضرورت تھی جو کُل عالم کے لیے مبعوث کیا گیا تھا۔ یہی وہ قوّت تھی جس نے قلیل مدّت میں آپ کو عظیم کامیابی عطا فرمائی۔ یقین وہ عبادت ہے جس کا اجر بہت عظیم ہے

۱۴ الصّدق شفیعی (صدق میرا ساتھی ہے) صدق کے معنی ہیں سچائی۔ دل اور زبان کی مطابقت یا علم اور

عمل کی باہمی موافقت، طمانیت اور راست بازی! صدق خداوندِ عالم کی صفت ہے جو اعلیٰ ترین انسانوں کو ہی بخشی گئی۔

قرآنِ حکیم میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر ہے اور ہر جگہ یہ سچائی کے معنوں میں ہے۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ۔ (اللہ نے تو سچ فرمایا ہے)

كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ۔ (اہلِ صدق کا ساتھ دو)

صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (اللہ نے اور اس کے رسولؐ نے سچ فرمایا تھا)

یہ لفظ انبیاءؑ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے مثلاً ابراہیمؑ خلیل اللہ کو صدیقاً نبیاً اور جناب یوسفؑ کو صدیق کے لقب سے یاد کیا گیا ہے، لیکن معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدس اور تعلیمات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا ہر قول اور ہر فعل سرتاپا صدق ہی صدق تھا۔ آپ وہ ہستی ہیں جو صدق لے کر آئے، صدق کی تصدیق کی اور عمر بھر اسی پر عمل پیرا رہے حتیٰ کہ بعثت سے قبل ہی صدیق اور امین کہلاتے تھے اور بعثت کے بعد بھی۔ آپ کو جن جن مصائب سے گزرنا پڑا، ان میں صدق ہی تھا جس نے قلوب کی فتح کے لیے اہم ہتھیار کا کام دیا لہٰذا آپ نے فرمایا "والصدق شفیعی"۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے "صادق" کے اوصاف کیا بیان کیے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے "جو اللہ پر، قیامت پر، ملائکہ پر، کتابوں پر اور انبیاءؑ پر ایمان لائے، جو اپنی ضرورت ہوتے ہوئے بھی غریبوں کو، یتیموں کو اور مسکینوں کو، مسافروں کو، مانگنے والوں کو آزادی اور غلاموں میں اپنا مال دیتے ہیں، جو نماز کی پابندی کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، عہد کر کے عہد پورا کرتے ہیں، تنگ دستی، بیماری اور جنگ کے وقت صبر کرتے ہیں، یہی صادق لوگ ہیں یہی متقی لوگ ہیں"۔

صدق کی یہ مکمل تعریف گویا کہ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے عملِ صالح کی مفصل گواہی ہے۔ آپ کی راست بازی اور سچائی کا یہ عالم تھا کہ ابوجہل ایسے منکر اور شقی القلب نے کہا "ابنِ عبداللہ! میں تجھے جھوٹا نہیں سمجھ سکتا، مگر تیری تعلیم پر میرا دل نہیں آتا"۔

یہی نہیں بلکہ ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ کفار نے ان کی تعلیمات سے انکار کرتے ہوئے بھی ان کے صادق ہونے کی گواہی دی اور آپ نے صدق کو اپنا حامی و ناصر

کہتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ صدق نیکی کی راہ دکھاتا ہے اور نیکی جنّت کی راہ دکھاتی ہے۔ انسان سچ بولنے لگتا ہے اور سچ کو عادت بنا لیتا ہے حتیٰ کہ اللہ کے ہاں بھی صدّیق لکھ دیا جاتا ہے۔ جھوٹ گناہوں کی راہ دکھاتا ہے، گناہ دوزخ کی راہ دکھاتا ہے، انسان جھوٹ بولنے لگتا ہے اور جھوٹ کو عادت بنا لیتا ہے حتیٰ کہ اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔"

**۱۵ الطّاعتہ حسبی** (اطاعت میری عزّت ہے) اطاعت سے مراد اطاعتِ خداوندی ہے۔ یُطیع اللہ۔ یعنی تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف قانونِ الٰہی کی پیروی کی جائے۔ خداوندِ عالم جب، جو حکم دے، بندے پر لازم ہے کہ صرف اسی پر عمل کرے۔ اگر کچھ احکام کو تسلیم کیا، کچھ پر عمل کیا اور کچھ کو نظر انداز کر دیا یہ اطاعتِ الٰہی نہیں ہوئی۔ نہ خدا کو ایسے فرماں برداروں کی ضرورت ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے۔ "تمھارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر تم جو فیصلہ کرو، اس پر اپنے دلوں میں کوئی بھی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سرِ تسلیم خم کر دیں۔"

آگے چل کر اطاعت والوں کے لیے وعدہ فرمایا گیا ہے: "وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاؑء، صدّیقین، شہداؑ اور صالحین۔"

یہ تھی اطاعت کی تعریف اور اطاعتِ الٰہی کرنے والوں کی حیثیت، لیکن یہی اطاعتِ الٰہی ہے جسے معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنا شعار کہا، اپنی عزّت کہا۔ یعنی بڑی یکسوئی کے ساتھ اطاعتِ خداوندی پر قائم رہنا۔ اس دوران میں اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں، ایمان کو متزلزل کر دینے والے مصائب نے بھی گھیرا اور شدید مخالفتیں بھی سامنے آئیں مگر یہ اطاعتِ خداوندی ہی تھی کہ لمحے بھر کو بھی آپ کے خیالات، معاملات اور اخلاقیات متذبذب نہ ہوئے، جب اور جہاں حکم ملا، سرِ تسلیم خم کر دیا۔ کوہِ صفا پہ پہلی تبلیغ سے ہجرت تک اعلانِ حق گویا جان پر کھیل جانے کے مترادف تھا، لیکن اقربا و احباب کی جان لیوا مخالفتیں، ریاکارانہ چالیں اور ظلم و تشدّد کوئی بھی سعی و عمل کی راہوں کو مسدود نہ کر سکا اور اللہ کا نبیؐ اطاعتِ خداوندی کے سہارے منزلِ حقیقی کی جانب سفر

کرتا رہا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ احکام صادر ہوتے رہے اور معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم سب سے پہلے خود عمل کرکے اطاعت کا ثبوت دیتے گئے اور نمونہ پیش کرتے گئے۔ ہجرت کا حکم ملا تو مکّے کی بے پناہ محبّت، گھر بار سے انسیت اور وہاں رہ جانے والوں کی چاہت کوئی بھی مانع نہ ہو سکی۔ آپ ہجرت کی صعوبتیں برداشت کرکے ایک نئی جگہ پہنچ گئے۔ جہاد کا حکم ملا تو تین سَو تیرہ سپاہیوں کے ساتھ کفر کی ایک بڑی قوت سے ٹکرا گئے۔ یہ ایمان اور اطاعت ہی کا سبب تھا کہ لمحہ بھر کے لیے بھی شک اور تذبذب نے قلبِ مبارک پر اثر نہ کیا۔ اسی اطاعت کو آپ نے اپنی عزّت قرار دیا اور یہ محدود و مخصوص نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ہے، یعنی جو کچھ آپ نے عمل فرمایا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایمان کی علامت قرار پا گیا اور مسلمانوں کے لیے ابد تک اطاعتِ الٰہی دراصل اطاعتِ رسولؐ ہی ٹھہری چنانچہ ارشاد ہوا۔ مَن یُّطِعِ الرَّسُولَ فَقَد اَطَاعَ اللّٰہَ ۔

۱۶ **الجہادُ خُلُقی** : (جہاد میرا خُلق ہے) قرآن کی اصطلاح میں حق کی مزاحمت میں ظلم کی طاقتیں استعمال کرنے والوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرنا جہاد کہلاتا ہے۔ اس کا حکم اس طرح دیا گیا ہے۔ "اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

ویسے جہاد کے معنی تمام قوّت اور صلاحیتوں کو کسی کام پر لگا دینا ہیں، لیکن یہ کام جب برائی کے خلاف ہو تو خاص مقصد پیدا ہو جاتا ہے۔ جنگ و جدل تو ازل سے ہوتی تھی، لیکن وہ صرف قتل و غارت گری کا انداز تھا۔ ایسے مقابلوں میں کم زور پس جاتے، ناداروں پر زیادتی ہوتی اور تشدّد کو دلیری تصوّر کیا جاتا۔ اسلام نے ان سب زیادتیوں کو شدّت سے روکا، جنگ و جدل کو اعدائے حق کو راہِ راست پر لانے اور ظلم سے روکنے کا ذریعہ قرار دے کر فرمایا۔ "اللہ کی راہ میں (اپنے) مالوں اور جانوں سے ساتھ جہاد کرو۔"

اس کے علاوہ جہاد کی اور بھی قسمیں ہیں۔ یہ تو ہوا کفّار سے جہاد، اس کے بعد طاغوتی قوتوں کے خلاف جہاد اور اپنے نفس سے جہاد۔ جہاد کی یہ تینوں اقسام

تھیں جن کے خلاف معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نبرد آزما رہے۔ حیاتِ مقدس کے ہر لمحے میں آپ ہر قسم کی بُرائی کے خلاف سعی و عمل میں مصروف رہے اسی لیے فرمایا کہ جہاد میری خصلت ہے۔ آپ کا ہر سانس جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تھا۔ سیرتِ پاک کے جس حصے پر بھی نظر ڈالیں، عمل سے، قول سے، جان سے، مال سے، ہر حالت اور ہر کیفیت میں مقصد، بُرائی کا خاتمہ اور حق کی حمایت ہی نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ بعثت سے قبل کی زندگی بھی ظلم و زیادتی کے خلاف مساعی کرنے اور مجبوروں، لاچاروں کی حمایت کرنے میں گزرتی تھی جلف الفضول میں شرکت طاغوتی قوتوں کے خلاف ایک کھلم کھلا اعلان تھا، بے امنی دُور کرنے، مسافروں کی حفاظت کرنے، غریبوں کی مدد کرنے اور ظالموں کو کمزوروں پر ظلم کرنے سے روکنے کا فیصلہ تھا۔ تنصیبِ سنگِ اسود کا واقعہ محض ایک سخت مقابلے کو روک دینے کا باعث نہ تھا بلکہ وہ تمام شیطانی قوتیں جو آیندہ چل کر حق کی مخالفت میں آپ کے مقابل آنے والی تھیں، معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی معاملہ فہمی سے ان سب کو بہت پہلے ہی عاجز کر دیا تھا۔ یہ تھی بعثت سے قبل کی زندگی جس میں ایسے اور متعدد واقعات پیش آئے۔ کبھی فہم و ادراک سے، کبھی صبر و تحمّل سے، کبھی عزم و استقلال سے اور کبھی عفو درگزر سے آپ نے بُرائی کا مقابلہ کیا۔ یہ زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی طرح جہاد تھا۔

پھر منصبِ نبوّت پر سرفراز ہونے کے بعد آپ کو باطل کی تمام طاقتوں کا ایک ساتھ مقابلہ کرنا پڑا۔ اندرونی، بیرونی دشمن تھے، حق کو پامال کرنے والی طاقتیں تھیں، قوّت کے ساتھ بھی اور نت نئی چالوں کے ساتھ بھی بُرائی کی ہر قوّت مقابل آرہی تھی۔ آپ ہر بُرائی اور ہر طاقت کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر محاذ پر موجود تھے اور جہاد کا فرض ادا کر رہے تھے۔ یہ جہاد نفس کے خلاف، شیطانی قوّتوں کے خلاف، باطل پرستوں کے، کفّار و مشرکین اور مادّہ پرستوں کے خلاف ایک مسلسل جہاد تھا جس میں انھوں نے بے مثال اور عظیم کامیابی حاصل کی۔ آپ کی تمام زندگی اسی جہاد میں گزری۔ یہ خدا کی راہ میں سعی و عمل کی ایک خوب صورت مثال ہے جس پر ہر مسلمان کو عمل کرنا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں

برائی کے خلاف جہاد کر کے بھلائی اور خیر کو جاری کرنے والے مجاہد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے "جو نیکی کی طرف بلائیں بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔"

## ۱۷ قُرَّةُ عَینِی فِی الصَّلٰوۃ (نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے)

نماز عبادات میں افضل ترین عبادت اور بندگی کا ایک خاص طریقہ ہے، وہ طریقہ جو خداوندِ عالم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ان کے ذریعے مخلوق کو سکھایا۔ نماز حضرت آدمؑ سے معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاءؑ کی اُمتوں پر فرض کی گئی کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "جنّ و انس کو عبادت کے لیے پیدا کیا گیا۔"

عبادت کے ذریعے ہی انسان کو مہذب اور باوقار بنایا گیا اور عبادات میں اہم ترین درجہ نماز کا ہے۔ ایمان کے بعد جو چیز سب سے پہلے فرض کی گئی، وہ نماز ہے۔ قرآنِ مجید میں مختلف مقامات اور مختلف انداز میں کم و بیش ایک سو چوبیس جگہ اس کا حکم دیا گیا ہے۔ مومن کو مصائب کے وقت صبر و حوصلہ حاصل کرنے کے لیے ہدایت ہے "صبر اور نماز سے مدد لو۔ بے شک نماز ایک سخت اور مشکل کام ہے، مگر ان فرماں برداروں کے لیے مشکل نہیں جو سمجھتے ہیں کہ آخرکار انھیں اپنے رب سے ملنا اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔"

نعمتوں اور کامیابیوں کے حصول کے بعد متفخر ہونے کی بجائے شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ بھی نماز ہی میں بتایا گیا اور ارشاد ہوا "اے نبیؐ! میرے جو بندے ایمان لائے ہیں، ان سے کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے، اس میں سے پوشیدہ اور اعلانیہ راہِ خیر میں خرچ کریں۔"

برائی، بے حیائی اور شیطانی کاموں سے بچنے کے لیے بھی یہی بہترین ہتھیار ہے۔ فرمایا "کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بُری باتوں سے روکتی ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے ہر عبادت میں انسان کے لیے کچھ نہ کچھ سہولت اور نعم البدل رکھا ہے، مثلاً روزہ، زکوٰۃ، حج کسی نہ کسی صورت میں مجبوری کے تحت روزہ قضا بھی رکھا جا سکتا ہے، لیکن نماز وہ عبادت ہے جو کسی حالت میں معاف نہیں

ہے اور کھلے الفاظ میں ہدایت کی گئی ہے: "اللہ کے آگے اس طرح کھڑے ہو جاؤ جس طرح فرماں بردار غلام کھڑے ہوتے ہیں۔ (خوب جان لو) بدامنی کی حالت ہو، خواہ (تم) پیدل ہو یا سوار ہو (جیسے بھی ہو) جس طرح ممکن ہو نماز پڑھو اور جب امن میسر آجائے تو اللہ کو اس طرح سے یاد کرو جس طرح اس نے تمھیں سکھایا اور جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔"

ان احکام کی سب سے زیادہ پابندی خود معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کی، اس کی فضیلت بیان فرمائی اور شدّت سے تاکید کی۔ فرمایا: "میری اُمّت پر سب چیزوں سے پہلے نماز فرض کی گئی اور قیامت میں سب سے پہلے نماز ہی کا حساب لیا جائے گا۔ اگر نماز درست ثابت ہوئی تو کُل اعمال ٹھیک ہوں گے اور اگر نماز خراب نکلی تو سب اعمال اکارت۔"

نماز، اخلاق، معاملات، اطوار و اعمال سب میں درستی پیدا کرتی ہے۔ شیطانی طاقتوں کے مقابلے کے لیے بھی یہی سب سے بہتر ہتھیار ہے۔ جو خدا کے رُو بہ رُو جھکتا اور اپنی بندگی کا اعتراف کرتا ہے، اسے کوئی طاقت مرعوب نہیں کر سکتی۔

الغرض نماز بندگی کے اعتراف کا خوب صورت اور موثّر ترین طریقہ ہے۔ اس عبادت کا طریقہ، اس کے الفاظ خود قرآن مجید میں ہیں۔ سورۂ فاتحہ، قرآن کی دیگر سورتیں، کلمۂ رکوع، کلمۂ سجدہ، یہ سب قرآنِ حکیم میں موجود ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کسی سائل کو بخشنے والا، طلب کرنے کے لیے الفاظ بھی سکھائے، انداز بھی اور پھر طلب کرنے کی ہدایت کرے تو کیا وہ اُسے مایوس لوٹا سکتا ہے؟ کبھی نہیں بلکہ وہ تو یقیناً منتظر ہوگا کہ سائل آئے اور طلب کرے۔ یہی نماز ہے جو دراصل معبود اور عابد کے درمیان رابطہ ہے گویا بندہ مالکِ حقیقی کے دربار میں حاضر ہو کر ہم کلام ہوتا ہے۔ اسی رابطے اور ہم کلامی کو معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے آنکھوں کی ٹھنڈک کہا ہے اور تمام عمر اس پر عمل کیا ہے۔ یہی وہ تعلیم ہے جس کے ذریعے آپؐ نے خود کو زندگی کے ہر شعبے میں قرآن کے مطابق ڈھال کر دنیا کو احکامِ خداوندی سے آگاہ کیا۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضؓ نے اسی لیے

آپ کے اُسوۂ حسنہ کو قرآن سے تعبیر فرمایا۔ قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، خدائی احکام کا مجموعہ اور ایک معجزہ ہے، ایسا معجزہ جو وقتی نہیں بلکہ ہر زمانے اور ہر دَور میں اس کی حقانیت مسلّم ہے اور رہے گی۔ انسانی علم میں جس قدر اضافہ ہوگا، اس کی صداقت اور حقیقت واضح ہوتی رہے گی۔ ویسے اللہ تعالیٰ نے ہر نبیؑ کو معجزے عطا فرمائے جو اپنے اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق تھے۔ حضرت موسیٰؑ کو جادو کا توڑ بخشا جو اُس دَور کی ضرورت تھا۔ مصر میں جگہ جگہ جادو عام تھا۔ بڑے بڑے جادوگر باقاعدہ اس کی تعلیم حاصل کرتے تھے لہٰذا انھیں زک دینے والوں پر ہی اہلِ مصر ایمان لا سکتے تھے چنانچہ دربارِ فرعون میں حضرت موسیٰؑ نے بہ یک وقت ان سب کو شکست دی اور مصر کے بلند پایہ جادوگروں نے تسلیم کر لیا کہ یہ جادو نہیں ہے۔ یہ ان کا معجزہ تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ جب موسیٰؑ ان کے پاس ہماری آیات لے کر آیا تو انھوں نے کہا، یہ تو صریحاً جادو ہے۔ پھر حضرت عیسیٰؑ کو برص کے علاج کی صلاحیت بخشی گئی کیوں کہ اُس دَور اور اس قوم کا یہ عام مرض تھا۔ اس کے سوا بھی مادرزاد اندھوں کو بصارت اور خدا کے حکم سے مُردوں کو زندہ کر دینا بھی ان کا معجزہ تھا۔ صالحؑ نے اونٹنی کا معجزہ دکھایا اور حضرت شمعونؑ بے پناہ طاقت وَر تھے۔ یہ ان کا معجزہ تھا۔ غرض کہ جس زمانے میں جس چیز کی ضرورت ہوئی اللہ تعالیٰ اپنے انبیاءؑ کے ذریعے اسے لوگوں پر آشکار کرتا اور اس کے ذریعے یہ سب انسان اپنی اپنی صداقت کو ثابت کرتے گئے، لیکن معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم جس دَور میں تشریف لائے اُس دَور کے لوگوں کو کسی اَور شئے کی نہیں بلکہ براہان و صداقت کی ضرورت تھی۔ انسانیت کے مقام سے گرے ہوئے یہ انسان قلبی و روحانی امراض کا شکار تھے لہٰذا انھیں اس کلام کی ضرورت تھی جو رُوح و قلب میں اُتر جانے والا اور دلوں پر دستک دینے والا ہو۔ ان کے لیے وہی کلام سب سے بڑا معجزہ ثابت ہو سکتا تھا اور وہ صرف قرآن تھا۔ قرآن، جس نے انسان کو قعرِ مذلت سے نکال کر بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ یہی کلام تھا جس کے اثر سے سلمان فارسیؓ غلامی کی ذلت سے نکل کر اہلِ بیت کے درجے پر پہنچے۔ ابوجہل کی لونڈی سمیعہ

راہِ خدا میں شہادت کے درجے پر فائز ہوئیں اور بُت پرست اُمیّہ بن خلف کے بے توقیر غلام اسلام سے معزّز ہو کر "سیّد سیّد" کہلائے۔ یہ تھا وہ معجزہ جو معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بخشا گیا، لیکن یہ معجزہ دیگر تمام کے معجزوں کی طرح محض وقتی نہیں، نہ عارضی تاثیر رکھتا ہے بلکہ اس کا سلسلہ قیامت سے جا ملتا ہے۔ اس کی تاثیر کا احاطہ عقلِ انسانی ابھی تک نہیں کر سکی۔ ارشادِ ربّانی ہے "میں تیرا ذکر بلند کروں گا۔"

اس کلام کا اس سے بڑا معجزہ اور کیا ہوگا کہ خداوندِ عالم نے جس ہستی کا ذکر بلند کرنے اور جسے عزّت دینے کا وعدہ فرمایا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اسے تسلیم کرنے والوں کو بھی عزّت مل جاتی ہے۔ اس کے ساتھ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا صالح عمل، سیرت کی پاکیزگی، بلند اخلاقی، ضبط و تحمّل اور محبّت و شفقت کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ انھوں نے پتھروں کو موم کر دیا۔ یہ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ خود اس میں رکاوٹیں ڈالنے والے اس کے دامن میں آ کر عزّت محسوس کرنے لگے۔ وہ جلیل القدر سردار جنھوں نے ماہ دو ماہ نہیں بلکہ برسوں اپنی سرداری کے زعم میں امیر و غریب کی اخوّت و مساوات سے انکار کیا، اس دین کو تحقیر سے دیکھا، اس کی غلامی میں آئے تو عزّت و مرتبہ سب کو بھول کر زیست کے آخری لمحوں تک اسی پر فخر کرتے رہے۔ الغرض علم و عمل کا مجموعہ یہی وہ تعلیم ہے جو دنیا کے سب سے بڑے معلّم نے دی اور دس برس کی قلیل مدّت میں ایک نئے دین، نئے فلسفے، نئی تہذیب و تمدّن کی بنیاد رکھ دی جس نے صدیوں سے رائج اصول و قوانین کو توڑ کر دنیا کو نیا قانون بخشا جو ابتدا سے آج تک اور آج سے قیامت تک سب کے لیے یکساں ہے۔ ایک فرد ہو یا پوری قوم، یہ پیغام سب کے لیے یکساں ہے۔ اس درس گاہ اور درس کے اثرات جو دو صدی قبل بھی وہی تھے اور آج بھی وہی ہیں۔ دنیا میں بڑی بڑی درس گاہیں ہیں جن سے اعلیٰ ترین ہستیوں نے علم حاصل کیا، لیکن یہ درس گاہِ محمدؐ ہے جہاں سے علم پانے والوں نے دنیا کو علوم و فنون اور تہذیب و تمدّن کے معنی سمجھا دیے۔ وہ ہستیاں جنھوں نے کہیں سے کوئی تربیت حاصل نہیں کی تھی، لوٹ مار اور خانہ جنگی

میں اپنی عمریں گزار دی تھیں، صرف ایک دین کو اختیار کر کے ایک دم کس طرح بہ یک وقت سپہ سالار، سیاست دان، عالِم، عادل اور منتظم بن گئے! اسلام کے اوّلین دَور کے جس مسلمان کی زندگی کا بھی مطالعہ کیجیے، وہ بہ یک وقت ان تمام خصوصیات سے متصف نظر آتا ہے۔ وہ ایسے مسلمان تھے کہ ان کے ایمان کو کوئی چیز متزلزل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایسے سپہ سالار تھے جنھوں نے دارالخلافہ میں بیٹھے بیٹھے ایران اور شام کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ وہ ایسے منصف تھے کہ جن کے انصاف سے ان کی اولادیں بھی محفوظ نہ رہیں اور وہ ایسے حاکم تھے جن کے دَور میں کوئی غلط کام کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سب عظمت اسی ہمہ گیر تعلیم کے اثر سے تھی۔

معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ مقدّس کے متعدد پہلو ہیں اور ہر پہلو اپنی جگہ اس قدر جامع و عمیق ہے کہ اس کا احاطہ کر لینا کسی انسان کے لیے دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ آپ کی حیاتِ طیبّہ کے کسی ایک پہلو کو بھی اجاگر کرنے کے لیے متعدّد بار زندگی چاہیے۔ یوں تو دنیا میں متعدّد پیغمبر آئے جنھوں نے انسانوں کی ہدایت کا فرض ادا کیا۔ یہ سبھی برحق و برگزیدہ تھے، لیکن معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرض ان سے جداگانہ تھا کیوں کہ دیگر تمام انبیاءؑ و رسلؑ مخصوص علاقوں کے لیے ہادی و مُصلح بنا کر بھیجے گئے تھے مگر یہ تعلیم ایک قوم یا مقرّرہ وقت کے لیے نہیں تھی بلکہ ہر دَور اور ہر وقت کے لیے تھی۔ اس تعلیم میں ایک مکمل ضابطۂ حیات اور کامل دستور العمل تھا اور اس کے مدارج خود خداوند عالم نے مقرّر فرمائے تھے، یعنی پہلے اپنی ذات، پھر خاندان، قبیلہ، قوم، ملک اور پھر کُل عالم۔ اس تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ علم، عمل اور اصلاح کا آغاز پہلے اپنی ذات سے شروع ہو کر بہ تدریج پھیلتا جائے اور ایک خوب صورت معاشرہ وجود میں آجائے۔ اس حکم پر کس طرح عمل کیا گیا؟ اس کا اندازہ معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی سے ہوتا ہے جو اسی تعلیم کی تفسیر نظر آتی ہے۔ حیاتِ مقدّس کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں جس میں آپ نے بنی نوعِ انسان کے لیے مثال نہ چھوڑی ہو۔ ایک مکمل مثال جس کے بعد کسی نمونے یا مثل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ پوری حیاتِ طیبّہ ایک

درس ہے جو آج ہر قوم کے لیے مجموعۂ اخلاق ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش اور اس کی زندگی نہ اتفاقی ہے نہ کوئی کھیل تماشا ہے بلکہ ہر نفس ایک خاص مقصد کے لیے وجود میں آیا ہے۔ اس میں عقل والوں کے لیے قدم قدم پر بڑی واضح نشانیاں موجود ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے "آسمان اور زمین میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں، تمہاری پیدائش میں اور زمین میں جو چوپائے چلتے ہیں، ان میں (نشانیاں موجود ہیں) ان کے لیے جو یقین کرتے ہیں۔"

آج علم کے کسی بھی شعبے کو لیجیے (علمِ حیوانات، علمِ نباتات، علمِ حیات، علمِ ارضیات، علمِ فلکیات، علمِ عضویات، علم التشریح، سائنس، یا علومِ اجتماع، جوں جوں انسان علم کے کمال تک پہنچتا ہے، ذہن یقین کرتا جاتا ہے کہ ان سب علوم کا کوئی نہ کوئی مخترع و موجد ضرور ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی علوم و فنون، صنائع و بدائع ایجاد و اختراع میں غور و فکر کرنے سے وہ نشانیاں سامنے آتی ہیں جو انسان کے قلب کو تسکین اور یقین سے بھر دیتی ہیں۔ پھر شعوری اور لاشعوری طور پر وہ توحید کی شہادت دینے پر مجبور ہو جاتا ہے جو در اصل ازل ہی سے اس میں موجود ہے۔ شعور آنے سے لے کر ہر انسان اپنے دل میں اس کا اعتراف کرتا ہے کہ کوئی جلیل القدر ہستی موجود ہے جس کے تابع کُل عالم ہے اور یہ نظام یوں ہی نہیں چل رہا۔ یہی فکر و احساس توحید کی شہادت ہے جو ابتدا سے ہر نفس میں ہوتی ہے، لیکن پھر آنکھ کھول کر تمام نشانیوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد زبان سے اس کا اقرار کرنا، توحید کا اقرار کرنا ہے اور اس مالکِ حقیقی کے تمام احکام کے مطابق اپنے عمل کو ڈھالنا یا عملی طور پر اقرار و اطاعت کا ثبوت دینا مسلمان ہو جانا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "اے ایمان والو تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ، شیطان کی پیروی نہ کرو۔"

یعنی تمہارے اعمال، تمہارے نظریات، خیالات، طور طریقے، سعی و عمل، عبادات اور معاملات سب احکام خداوندی کے تابع ہوں۔ اپنی زندگی کو مختلف اور کئی حصوں میں تقسیم مت کرنا کہ خدا کے ساتھ دوسروں کو بھی طاقت تسلیم کرنے لگو۔ یہ صریحاً ظلم ہے۔ کفر خدا سے انکار کرنے کا نام ہے۔ ظلم، عدل و انصاف کے

خلاف کام کرنے کو کہتے ہیں اور فسق و فجور کے معنی ہیں دائرۂ بندگی اور اطاعت سے باہر ہو کر اپنے آقا و مالک کے قانون سے انحراف کرنا، یعنی خدا کی نافرمانی کرکے بہ یک وقت کفر، ظلم اور فسق و فجور کا شکار ہو جانا تو یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے "خٰلِدِینَ فِیہَا اَبَدًا" فرمایا گیا اور یہی کفر اور شرک کرنے والوں کی سزا ہے۔ جزا اور سزا اور موجودہ دنیا کے بعد دوسری دنیا کا تصوّر ہر الہامی مذہب میں موجود ہے جہاں اچھے بُرے اعمال کی سزا بھی ملے گی اور انعام بھی۔

یہی تعلیم حضرت نوحؑ نے دی۔ اسی بارے میں صحیفۂ ابراہیمؑ میں خوشخبری دی گئی ہے کہ موجودہ دنیا کے مصائب و مشقّت اٹھانے کے بعد جنّت میں داخل ہوں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے اس بات کی وضاحت فرمائی کہ نیکوکاروں کے لیے ایک صاف ستھری آبادی کا یقین دلایا جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہوں گی۔ منکرین کے لیے انھوں نے ہلاکت اور دردناک عذاب کی خبر دی۔ اسی طرح زبور میں خدا کی عدالت اور اس دن کی وضاحت بار بار کی گئی ہے اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات میں بھی قیامت اور جزا و سزا کے اصول موجود ہیں۔

یہی جزا اور سزا کا تصوّر ہے جسے اسلام نے مفصّل ترین انداز میں پیش کیا ہے اور اس تشنگی کو مٹا دیا ہے، جو دیگر مذاہب کو پڑھنے کے بعد باقی رہ جاتی ہے۔ اس موقع پر اسلام نے یقین دلایا ہے کہ انسان کا کوئی اچھا بُرا عمل ضائع نہیں جائے گا چنانچہ ارشادِ ربّانی ہے "اس دن لوگ گروہ در گروہ آئیں گے تاکہ انھیں ان کے اعمال دکھائے جائیں۔ تو جس نے ذرّہ بھر نیکی کی ہوگی، وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ بھر بُرائی کی ہوگی، وہ اسے دیکھ لے گا۔"

اس دن سے مراد ہے روزِ حشر۔ قرآن حکیم میں اُس دن کے متعدّد نام موجود ہیں اور سب کے معنی ایک ہیں، یعنی جزا و سزا کا دن! جس پر دل سے یقین اور زبان سے اقرار کرنا ایمان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی عقیدے نے انسان کے تمام کاموں کو، ارادوں اور عمل کو ایک مقصد بخش دیا ہے۔ ارادے اور اعمال نیّت کے تابع ہوتے ہیں اور نیّت کی صفائی کے لیے پانچ سہل و سادہ

اصول مقرر کیے گئے ہیں جن پر یقین کرنا ایمان ہے۔ اسلام نے صریح اور واضح الفاظ میں اس کی تلقین فرمائی ہے، یعنی خدا پر، فرشتوں پر، رسولوں پر، کتابوں پر اور جزا و سزا کے دن پر ایمان لے آنے کا مطلب ہی صاحبِ ایمان اور با عقیدہ ہونا ہے۔ انہی عقائد سے انسان کا ہر عمل شروع ہوتا ہے اور انہی پر ختم ہو جاتا ہے۔ عمل کی بنیاد نیّت ہے۔ نیّت کے محرّک خیالات ہیں اور خیالات پر عقائد کی حکومت ہے۔ زندگی میں عام معاملات ہوں یا بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جائیں، سب کا مدار اسی پر ہے۔ اسی نے انسان کو اس کی ذمّے داری کا احساس دلایا اور خیر و شر کی تمیز کا شعور بخشا۔

عقائد میں اگر پختگی ہے تو ہر کام درست ہے ورنہ انسانیت سراپا درندگی ہو کر رہ جائے۔ یہی پانچ اصول ایمان کے حقیقی عناصر ہیں۔ ارشادِ ربّانی ہے۔
"اے ایمان والو! ایمان لاؤ خدا پر، اس کے رسولؐ پر، اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسولؐ پر اتاری اور اُن کتابوں پر جو اس سے قبل اتاریں اور جو شخص خدا کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے پیغمبروں کا اور روزِ آخرت کا انکار کرے گا، وہ سخت گمراہ ہوا۔"

سورۃ البقرہ میں اس عقیدے کی تعلیم اس طرح دی گئی ہے کہ جو لوگ غیب پر، خدا کی صفات اور ملائک پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر (اے محمدؐ) اتارا گیا اور تم سے پہلے پیغمبروں پر اتارا گیا، اس پر یقین رکھتے ہیں (کتابوں پر) اور آخرت (روزِ جزا اور سزا) پر یقین رکھتے ہیں، یہی لوگ ہدایت پر ہیں۔"

خدا پر ایمان لانا تو گویا نجات کے لیے اوّلین شرط ہے۔ ایک قادرِ مطلق، ہمہ صفت قوّت کو تسلیم کرنا، معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات کی ابتدا ہے۔ یہ یقین کہ خداوندِ عالم دنیا کا تنہا خالق و مالک ہے، اسی کی خوشنودی اور رضا جوئی ہی انسان کے ہر عمل کی غرض و غایت ہے۔ ایک مالکِ حقیقی کی جانب سے اعمال کی باز پرس کا احساس غالب ہو تو انسان جلوت و خلوت میں بُرائیوں سے اجتناب کرتا رہے گا جس کے سبب نیکی اور بدی کا ایک معیار قائم ہو جائے گا جو عمر کے ہر حصّے میں انسان کو ادنیٰ سے اعلیٰ اور پستی سے

بلندی کی طرف لے جاتا رہے گا۔ خداوندِ عالم کو وحدہٗ لاشریک ماننے کے بعد اس کے بھیجے ہوئے رسولوں پر ایمان لانا بھی لازمی ہے کیوں کہ یہی وہ صادق اور راست باز ہستیاں ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے احکام بندوں تک پہنچتے ہیں۔ ان کی صداقت کو تسلیم کرنے کا مطلب ہے کہ ہر اس بات کو تسلیم کیا گیا جو انھوں نے کہی اور اُن کی کہی ہوئی ہر بات اور دی ہوئی ہر ہدایت عین منشائے خداوندی ہوتا ہے لہٰذا رسولوں کو جھٹلانا خدا کے احکام سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر ایمان لانا بھی واجب ہے کیوں کہ یہ ملائک ہی ہیں جو خدا اور رسولوں کے درمیان سفارت کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کی خدمات ان کے سپرد کی ہیں جنھیں وہ بجا لاتے ہیں۔ خدا کے حکم سے مخلوقات کو خدا کے قانون کے مطابق چلاتے ہیں اور ہر نفس کے ہر عمل کو ہر دم تحریر کرتے ہیں۔ ان کا کوئی عمل، کوئی حرکت خدا کے حکم سے ہٹ کر نہیں ہوتی اس لیے ان کے ہونے اور ہر دم مصروف رہنے کا اعتراف کرنا بھی عین ایمان ہے۔ پھر وہ صحیفے اور کتب ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انبیاءؑ پر نازل فرمائیں۔ ان سب میں بندوں کے لیے احکام ہیں جو نبیؐ جس دَور اور جس قوم کے لیے آتے رہے، اس کے مطابق ان کی کتابوں میں احکام آتے گئے۔ سب کے بعد یومِ آخرت پر ایمان لانا ہے، یعنی جزا اور سزا کے دن پر، حساب کتاب اور فیصلے کے دن پر، جس کے بارے میں انسان کو بار بار خبر دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: "بے شک تم بھی مرنے والے ہو اور وہ بھی مرنے والے ہیں۔ پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے سامنے دعویٰ پیش کرو گے۔"

یومِ آخرہ پر ایمان لانے کا ذکر قرآن مجید میں عقائد اور ایمان کی تفصیلات میں، سب سے آخر میں دیا گیا ہے، لیکن یہی آخرت کی زندگی اصل زندگی ہے۔ فرمایا: "بے شک آخری گھر اصلی زندگی ہے۔"

دنیا اور آخرت کا تقابل کر کے قرآن نے بار بار آخرت کی زندگی کو اہم اور اصل قرار دیا ہے۔ الغرض یومِ آخرت پر ایمان لانا اسلام کی اہم ترین تعلیم

ہے کیوں کہ موجودہ زندگی اور اس کے تمام تر اعمال اور ان اچھے بُرے اعمال کے نتائج کی تمام تر بنیاد اسی دن پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے موجودہ دنیا کے ہر عمل کو "کسب" سے تعبیر فرمایا ہے اور قیامت کو "یوم الدین" جزا کا دن قرار دیا ہے جس نے جو کیا وہ ضرور دیکھ لے گا۔ اس پر ایمان لانے سے اسلام کا اصل مقصد یہی ہے کہ انسان یقین کر لے کہ اس کے ہر عمل کا بدلہ ضرور دیا جائے گا۔ قول و عمل کی مکمل آزادی اور کامل اختیار عطا کرنے کے بعد ان کے بدلے کا یقین دلانا گویا سلامت روی کے راستے پر لے جانے کے مترادف ہے۔ اچھے اور بہتر معاوضے کی توقع مزدور کو پوری توجہ اور انہماک سے کام کرنے میں بڑی مددگار و معاون ثابت ہوتی ہے۔ ہر شعبے میں بھی توقع انسان کے تمام اعمال و افعال کے لیے محور ہوتی ہے۔ ایک چھوٹا سا یقین، موہوم سی امید اسے لمحہ بہ لمحہ حوصلہ دیتی ہے۔ اسی توقع کو یقین بھی کہا جا سکتا ہے، عقیدہ بھی۔ علم نفسیات نے اسے اعتماد کا نام دیا ہے اور قرآن نے اسے یقین کا، لیکن در حقیقت یہی صلے اور معاوضے کا تصور ہے جس سے عمل کا آغاز بھی ہوتا ہے اور انجام بھی۔ یہی تصور ہر عمل کا محرک ہے۔ قرآن نے اسے بڑی اہمیت دی ہے اور یقین دلایا ہے کہ انسان کو اس کے کیے کا پورا پورا صلہ دیا جائے گا۔ یہ صلہ جب مالکِ حقیقی کی خوشنودی اور رضا ہو تو انسان کیا کچھ نہ کر گزرے گا! پھر تو فلاح و خیر کا کوئی کام بھی اسے ناممکن محسوس نہ ہوگا۔ یہی جانتے ہوئے معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھی عقائد پر زور دیا بلکہ یہی پانچ باتیں ایمان کے اصل عناصر ہیں اور مکّی وحی کا بیشتر حصّہ اسی تلقین و ہدایات پر مشتمل ہے۔ جھٹلانے والوں کے قصّے، ایمان لانے والوں کے واقعات، اُس دَور کے لوگوں کے لیے واضح ہدایات اور یوم آخرت پر پورے پورے انصاف کا وعدہ ہے۔ ان عقائد کو ایک سیدھی سادی تعلیم کے انداز سے پیش کرنا صرف نظریہ آرائی نہ تھی بلکہ اس کا اوّلین مقصد تو اس شرک و کفر کو مٹانا تھا جس میں تمام اقوام ملوّث تھیں اور دوسرا مقصد ایک باعمل اور زندہ قوم کو وجود میں لانا تھا

جو اپنے اعلیٰ اطوار کے ذریعے دنیا بھر کی اصلاح و ہدایت کا کام سرانجام دیتی۔
اب فلاح و خیر کے عظیم ترین کام کا آغاز کسی ایسی قوم سے ہونا تھا جو اس کے
لیے موزوں ترین ہوتی اور وہ قوم عرب تھی۔

# حصّۂ دُوم

## حیاتِ طیبہ

# عہدِ آبائے رسولؐ

عرب وہ جزیرہ نما ہے جس کی اطراف میں مختلف حکومتیں قائم تھیں اور جن کی بدولت اس ملک میں متعدد مذاہب کے پیرو کار پھیلے ہوئے تھے۔ عرب کے مشرق میں خلیج فارس و خلیجِ عمان ہیں۔ مغرب میں بحرِ احمر یا بحرِ قلزم ہیں۔ شمال میں ملک شام اور جنوب میں بحرِ ہند ہے۔ اس کے شمال میں وہ سلسلۂ کوہ ہے جو اسے شام سے جدا کرتا ہے اور آبنائے فاسفورس اسے مصر سے علیحدہ کرتی ہے۔ اس طرح اس کے سہ جانب سمندر اور ایک جانب یعنی بہ جانبِ شمال خشکی (ملک شام) ہے۔ عرب کے مختلف حصے اپنی اپنی جداگانہ خصوصیات کے حامل ہیں۔ بہ ظاہر تو یہ دنیا کے نقشے پر سب سے بڑا جزیرہ نما اور ریگستانی علاقہ ہے، لیکن کچھ اہم خصوصیات کا حامل یہ ملک ہمیشہ سے ہی اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کے لیے مسکن بنا رہا۔ ابتدا سے اسے خاص خاص بندوں نے ہی منتخب کیا۔ آج جب ہم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ یہی وہ سرزمین تھی جہاں حضرت آدمؑ اور بی بی حوا کی ملاقات ہوئی۔ یہیں آدمؑ نے خدا کے حکم سے جبرئیلؑ کے ساتھ خانۂ کعبہ کی بنیاد رکھی۔ یہی وہ مقام تھا جہاں ابوالانبیاء حضرت ابراہیمؑ اپنی زوجۂ مطہرہ جنابہ ہاجرہ اور کم سن فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ تشریف لائے اور اللہ

کے حکم سے انھیں یہاں چھوڑ گئے۔ پھر اسی کے قرب وجوار کے علاقے تھے جہاں جنابِ موسیٰؑ بنو اسرائیل کو فرعون سے نجات دلا کر لائے۔ یہی بیابان داؤدؑ کا مسکن بنے تھے جب وہ بادشاہ سموئیل سے بچ کر وطن سے نکلے۔ اسی صحرا میں بخت نصر کے ہاتھوں تباہ ہو کر بنو اسرائیل کو پناہ ملی تھی۔ غرض کہ ابتدائے آفرینش ہی سے یہ سرزمین مقدس ترین ہے اور بہ لحاظِ قوم متعدد برائیوں کے باوجود اہلِ عرب میں کچھ ایسی خصوصیات موجود تھیں جن کا دنیا کی دیگر اقوام میں فقدان تھا قطع نظر باقی تمام اوصاف کے ان کی اوّلین اور اعلیٰ ترین صفت یہ تھی کہ وہ ایک جلیل القدر پیغمبر جناب ابراہیمؑ کی اولاد تھے اور پھر ہر دَور اور ہر زمانے میں ان کا رہن سہن، طرزِ معاشرت، طوافِ بیت اللہ اور قربانی کی عادتیں وہی رہیں جو ابتدا سے تھیں۔ یہی طور طریق اور بدویانہ زندگی اور بیت اللہ کی حرمت اسلام آنے تک موجود تھی۔ اگرچہ حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ سے لے کر بعثتِ اسلام تک بڑے بڑے انقلاب آئے، اہلِ عرب اَن گنت برائیوں کا شکار ہوئے، لیکن کوئی دین بھی ان کے دلوں کو تسخیر نہ کر سکا۔ ان کے گرد مذاہب ہی مذاہب تھے۔ خلیج فارس سے یمن تک مجوسیت کا دَور دَورہ تھا۔ یمن سے حجاز تک پوری طرح سے یہودیت کی حکومت تھی اور ملکِ شام سے سرحدی قبائل تک عیسائیت کے اثرات موجود تھے، لیکن اہلِ عرب ان تمام مذاہب کے اثرات سے محفوظ اپنے آبائی دین، یعنی طوافِ کعبہ اور قربانی پر قائم تھے۔ یہ دین تھا جسے وہ حنیفی کہتے تھے جو ابراہیمؑ کا دین تھا۔ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا کہتے ہوئے اللہ نے بھی اسے حق قرار دیا ہے۔

اہلِ عرب اس دین اور نسب پر فخر کرتے تھے۔ ان کی دوسری صفت یہ تھی کہ وہ کتابی علوم سے ناآشنا تھے۔ وہ اُمّی تھے۔ خارجی علوم کے اثرات سے پاک اور ظاہری نوشت وخواند و تعلیم سے بے نیاز، لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ جاہل تھے کیوں کہ حق و باطل کے امتیاز کے لیے وہ تحریروں اور تقریروں پر بھروسا کرنے کے عادی نہ تھے بلکہ اچھائی اور برائی میں تمیز اور اپنی یادداشت کے لیے وہ صرف اپنی دماغی صلاحیتوں پر اعتماد کرنے کے

عادی تھے۔ ان کے حافظے بہت قوی تھے۔ ان میں بڑے بڑے شعرا بھی تھے اور داستان گو بھی جو طویل ترین قصیدوں اور سینکڑوں برس پُرانی داستانوں کو زبانی یاد رکھتے تھے۔ لگتا تھا قدرت نے عقل و دانش کے تمام موتی انھی پر نچھاور کر دیے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ باقاعدہ تحریر کے بغیر وہ قرآن کی ہر سورت کو ایک مرتبہ زبانِ مبارک سے سُن کر دل میں محفوظ کر لیتے تھے۔ وہ کچھ جانتے نہ تھے لہٰذا جب جانتے تو عمل و قول اسی کا اظہار کرتے تھے۔

ان کی توجہ طلب خوبی یہ بھی تھی کہ وہ قبیلوں میں جدا جدا ہونے کے باوجود کسی کے محکوم نہ تھے۔ اگرچہ ان کا ملک اس وقت کی دو طاقت وَرترین حکومتوں (ایران اور شام) کی سرحدوں پر واقع تھا مگر وہ دونوں حکومتیں آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکتی تھیں۔ جب جب کسی نے بھی سر اونچا کیا، قدرت نے خود ہی اُسے کچل دیا ورنہ عبسائی حبشی جو یمن فتح کر چکے تھے، ہاتھیوں کے لشکر کے ساتھ مکّہٴ معظمہ کی طرف بھی قدم بڑھا چکے تھے، لیکن خود خلاّقِ عالم کو شمالی عرب کے لیے کسی قوم کی غلامی گوارا نہ تھی۔ دنیا کے سردار و رہنما کے آباء و اجداد غلام کیسے رہ سکتے تھے! یہی وجہ تھی کہ بخت نصر نے بنی اسرائیل کو پامال کیا، یونانیوں اور رومیوں نے مصر سے عراق تک کے علاقے کو صدیوں محکوم رکھا اور ایران اور شام برسوں ایک دوسرے کو پامال کرتے رہے، لیکن ان میں سے کوئی قوّت بھی اہلِ عرب کی آزادی کو سلب نہ کر سکی اور تخلیقِ عالَم کی ابتدا سے اسلام آنے تک وہ خارجی اور باطنی ہر لحاظ سے آزاد رہے۔ ان اہم ترین خصوصیات کے علاوہ اہلِ عرب مہمان نواز، بلند اخلاق، عہد کے پاس دار، شجاع، دلیر اور انصاف کرنے والے تھے۔ انھی اطوار کی بدولت یہ یقین آ جاتا ہے کہ خداوندِ عالم نے ازل ہی سے اس قوم کا انتخاب کر لیا تھا کہ اسی کے ذریعے دینِ حق کی اشاعت کی جائے اور اسی کو نبوّت و رسالت کی خلعت سے نوازا جائے۔

حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے دو فرزند عطا فرمائے جنھیں نبوّت سے سرفراز فرمایا، حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ۔ یہ دونوں بیٹے دو بڑی قوموں کے جدِّ اعلیٰ بننے والے تھے لہٰذا خدا کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ نے انھیں علیحدہ

علیحدہ ملکوں میں آباد کیا۔ چونکہ حضرت اسحٰقؑ کے ننھیالی رشتے دار بابل میں تھے
اس لیے ملکِ شام عطا ہوا اور حضرت اسمٰعیلؑ کے ننھیال والے مصر میں تھے
لہٰذا ان کے لیے عرب کا حصّہ مخصوص ہوا۔ اس طرح یہ دونوں بھائی شام اور عرب
میں آباد ہوگئے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی شادی عرب کے ایک قدیم حکمراں قبیلے
بنو جرہم کے سردار مضاض کی دختر سے ہوئی اور وہ وہاں آباد ہوئے جہاں اب
مکّہ ہے۔ ان دونوں عظیم پدر و فرزند ہی نے اس مسجد کی تعمیر کی جو کرۂ ارض
پر خدا کا اوّلین گھر اور دنیا کے لیے پہلی درس گاہ ہے جہاں سے کُل عالم کو توحید
کا سبق ملا۔ مکّہ معظمہ کا قدیم نام بکّہ ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ
بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا۔ اس آیتِ مبارکہ میں بکّہ کا لفظ مکّہ معظمہ کے لیے ہی استعمال
کیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ زندگی کی ہر آزمائش سے گزرے تو انھیں خواب میں ہدایت
دی گئی کہ بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کریں۔ آپ اس میں بھی پورے اترے۔
اسی واقعے کے بعد انھیں اس مقدّس گھر کی تعمیر کا حکم ہوا چنانچہ دونوں باپ
بیٹے اس عظیم کام میں مصروف ہوگئے۔ کعبۃ اللہ تیار ہوا، حضرت جبرئیلؑ نے حج
اور طواف کے تمام قاعدے سکھائے، تب انھوں نے دعا کی: "اے مالکِ
دو جہاں! اسے عظمت عطا فرما۔ اس ویران جگہ کو آباد کر دے اور ہماری نسل
میں دنیا کی رہنمائی کے لیے ایک عظیم انسان پیدا کر۔"

یہ انھی کی دعا کا اثر تھا کہ جہاں کوسوں کسی انسان کا نام و نشان نہ تھا اور جہاں
حق کا اعلان کرتے ہوئے ان کی صدا حدودِ حرم سے باہر نہ جا سکتی تھی، اسی حق
کی صدا مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک سنی گئی اور آبادی اس طرح
بڑھی کہ اس خطۂ زمین پر حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ فرزند پیدا ہوئے جنھوں نے
ملکِ عرب کو آپس میں تقسیم کیا۔ پھر ان بھائیوں کی نسلیں اس قدر پھیلیں کہ
شمال کی طرف ان کی آبادی شام تک پہنچ گئی جہاں ان کے بھائی بنو اسحٰقؑ آباد تھے
اور جنوب کی طرف بڑھتے بڑھتے یمن اور مغرب کی جانب مصر تک پہنچ گئی۔ پھر
انھی دو بھائیوں کی اولاد بابل اور مصر کے علم و تہذیب کی وارث بنی۔ بحرِ احمر

اور بحرِ ہند جو اس زمانے میں دنیا کی بہترین تجارتی گزرگاہیں تھیں، ان کے قبضے میں آگئیں۔ علاوہ ازیں عرب کے اس اندرونی حصّے پر بھی جو غیر اقوام سے دفاع کے لیے حصار کا کام دیتا تھا، انھی کا تصرّف ہوگیا۔ حضرت اسمٰعیلؑ کے فرزندوں میں قیدار نے سب سے زیادہ نام پایا۔ اس نے اور اس کی نسلوں نے ہمیشہ مکّۂ مکرّمہ کے اندر ہی قیام کیا اور اس کی حرمت کو برقرار رکھا، لیکن پھر وقت کی گرد آلِ اسمٰعیل پر جمتی گئی اور کعبے کی متولّیت بنو قیدار سے نکل کر بنو خزاعہ کے قبضے میں چلی گئی۔ اس طرح ان کی سیاسی حیثیت ختم ہوگئی۔ ان کی نسلیں اس بات کو محسوس تو کرتیں، لیکن اس کے سدِّباب کی کوشش کوئی نہ کرتا کیوں کہ وہ لہو و لعب اور عیش و عشرت میں مبتلا ہوتے گئے۔ چند لوگ ہی تھے جن کی محفلوں میں کبھی آباء و اجداد کا ذکر آتا۔ تب وہ لوگ جانتے کہ کعبے کے متولّی دراصل ان کے باپ دادا تھے۔ اس طرح قیدار کی ۲۰ نسلیں گزر گئیں اور دنیا کے نقشے پر ایک نام وَر قبیلہ ابھرا، خاندانِ قریش! اس عظیم قبیلے کے ایک فرد نے وہ منتشر شیرازہ جمع کیا اور اس گم نام خاندان کو آنے والوں کے لیے ایک فعال عنصر بنا دیا۔ اس طرح سرزمینِ حجاز کی سیاسی، عسکری، مذہبی اور معاشی زندگی میں انقلاب آگیا اور اس عالی ہمت بلند مقام انسان کی بدولت قریش نے ایک نام وَر قبیلے کی حیثیت حاصل کی۔ یہ جلیل القدر انسان تھے، زید بن کلب جن کا لقب قصیٰ تھا۔ تاریخ میں وہ اسی لقب سے زیادہ مشہور ہوئے۔ قصیٰ بن کلب (قصی بن کلاب)، کم سنی میں یتیم ہو گئے تھے، پھر اپنی والدہ فاطمہ بنتِ سعد ازدی کے ساتھ شام چلے گئے اور سوتیلے باپ ربیعہ بن حرام کے سائے میں پرورش پاکر جوان ہوئے۔ تب انھیں علم ہوا کہ وہ قبیلۂ قریش سے تعلّق رکھتے ہیں جو مکّے میں مقیم ہے لہٰذا وہ ماں سے اجازت لے کر طوافِ کعبہ کے لیے مکّہ آئے۔ اس زمانے میں کعبے کے متولّی حلیل بن حبشیہ تھے، وہ ان کے اعلیٰ کردار سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دے دی۔ اس طرح سے سردار حلیل کی وفات کے بعد کعبے کی متولّیت قصیٰ بن کلاب کو ملی۔ انھوں نے مدّتوں کے بعد اپنے دیرینہ مخالف بنو خزاعہ اور بنو بکر کو مکّے سے نکال کر ایک ریاست کی بنیاد رکھی اور خانۂ کعبہ سے متّصل ایک عمارت تعمیر کی جو

تاریخ میں دارالندوہ کے نام سے مشہور ہے۔

دارالندوہ دراصل قریش کا پارلیمانی ایوان تھا جہاں مجلس مشاورت منعقد ہوتی اور تمام امور کے فیصلے کیے جاتے۔ یہیں سے تجارتی قافلے تیار ہوکر روانہ ہوتے، جنگ وجدل کے فیصلے اور تیاریاں ہوتیں، مصالحت کی گفتگو ہوتی آمدنی اور اخراجات کے حساب، شادی بیاہ، موت وزندگی، بیٹوں اور بیٹیوں کی بلوغت کے اعلان ہوتے۔ عہدے اور اختیارات کا تعین کیا جاتا اور یہیں علَم عطا ہوتا۔ غرض کہ دنیا کے تمام کام دارالندوہ ہی میں ہوتے۔ قصیٰ بن کلاب وہ سب سے پہلے سردار تھے جنھوں نے پہاڑوں اور غیر ہموار زمینوں کو کاٹ کر سکونت کے لیے مکان تعمیر کیے اور غیر آباد لوگوں کو آباد کیا۔ قومی امور کے فیصلوں اور دیگر خدمات کے لیے بطون کے سردار مقرّر کیے، سقایہ اور رفادہ کے نام سے دو محصول عائد کیے۔ انھوں نے ہی سیاسی اور جنگی حیثیت کے چودہ عہدے مقرّر کیے جو ظہورِ اسلام کے وقت تک قائم تھے۔ قصیٰ بن کلاب کے چار بیٹے پیدا ہوئے جن میں مغیرہ سب سے زیادہ نام ور ہوئے۔ انھیں پیدائش کے فوری بعد مناف بُت کے قدموں میں ڈال دیا گیا تھا لہٰذا عبدِمناف کے نام ہی سے مشہور ہوئے۔ وہ اپنے بھائیوں میں سب سے زیادہ متحمل مزاج اور باصلاحیت تھے چنانچہ قریش کی سیادت انھی کو ملی اور انھوں نے بڑے اعلیٰ پیمانے پر قصیٰ بن کلاب کے کاموں کو جاری رکھا اور مزید کاوشیں بھی کیں۔ ان کی بارہ اولادیں تھیں، چھ بیٹے اور چھ بیٹیاں۔ بیٹوں نے حبشہ، یمن، عراق اور شام میں تجارت کو غیر معمولی فروغ دیا۔ ابھی تک قریش تنگ دستی میں زندگی گزارتے تھے، لیکن عبدِمناف کے فرزندوں کے ذریعے ان میں خوش حالی آئی۔ ان چھ بھائیوں میں ہاشم غیر معمولی انسان تھے۔ ہاشم بن عبدِمناف نے قریش کی عظمت اور سطوت کو چار چاند لگا دیے۔ تجارت کو مزید وسعت دی، قبیلے کے ہر نفس کو مشقّت کا عادی بنایا اور قحط کے دوران میں متعدّد بار پورے قبیلے کی ضیافت کی۔ علاوہ ازیں انھوں نے باقاعدہ تجارت کے لیے موسم مقرّر فرمائے۔ ایک قافلہ موسمِ سرما میں یمن اور حبشہ کی طرف سفر کرتا اور دوسرا

موسم گرما میں شام اور عراق کی جانب جاتا۔ اس سے دو فائدے ہوئے۔ اوّل یہ کہ قریش میں مسلسل تجارت شروع ہوگئی۔ دوسرا یہ کہ ان کے قافلے دُور دراز جاتے، بڑے بڑے حکمرانوں اور تاجروں سے ملتے تو قریش کی شہرت بڑھتی جاتی۔ جو ممالک ابھی تک قریش سے ناواقف تھے، وہ بھی واقف ہوجاتے۔

ہاشم بن عبدِ مناف کی دس اولادوں میں سب سے زیادہ شہرت عبدالمطلب نے پائی۔ ان کا اصل نام تو عامر بن ہاشم تھا، لیکن کم سِنی میں یتیم ہو جانے کے باعث انھوں نے اپنے چچا مطلّب کے زیرِ سایہ پرورش پائی لہٰذا احسان شناسی کے طور پر خود کو عبدالمطلب کہلانے لگے۔ اپنی نمایاں خصوصیات کے سبب اپنے باپ کی اولادوں میں سرداری کے اہل وہی تھے لہٰذا مکّے کے سردار بنے۔ اور اپنے اجداد کی طرح قبیلے کی بہبود و ترقی اور حرم مقدس کے حقوق کی ادائیگی کے لیے عمر بھر مصروف رہے۔ عبدالمطلب کی کُنیت ابوالحارث تھی کیوں کہ ان کے بڑے فرزند کا نام حارث تھا۔ ان کے زمانۂ سرداری تک، زم زم کا کنواں پٹ گیا تھا اور مدّتیں گزر جانے کے سبب اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا تھا۔ ایک شب انھوں نے خواب دیکھا کہ انھیں اس کنویں کو صاف کر کے دوبارہ جاری کرنے کی ہدایت دی جارہی ہے چنانچہ انھوں نے یہ کام کیا۔ اس سے حجّاج کو پانی کی سہولت میّسر آگئی۔ وہ آبِ زم زم بھر بھر کر عرفات لے جاتے۔ خود بھی فیض اٹھاتے اور دوسروں کو بھی اس کا موقع دیتے۔ عبدالمطلب اپنے گُن اور اوصاف کے باعث عرب کے تمام قبائل میں معزز تصوّر کیے جاتے تھے۔ وہ جب کبھی یمن جاتے تو بنو حمیر کے سردار انھیں مہمان بنانے پر فخر کرتے۔ انھیں ایک نظر دیکھنے کے بعد بادشاہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب کی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ انھی کے دَور میں پیش آیا۔ عیسائی حاکم ابرہہ بن الاشرم نے گرجا تعمیر کیا اور اسے کعبے ایسی حیثیت دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ خانۂ کعبہ کی عمارت کو مسمار کر دیا جاتا۔ اس غرض سے اس نے پیش قدمی کی اور مکّے کے قریب جاکر خیمہ زن ہو گیا جہاں سے اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ قریش کو مشتعل کرنے کی غرض سے ان کے مویشی پکڑ کر لے آئیں۔ انھوں

نے حکم کی تعمیل کی۔ ان مویشیوں میں عبدالمطلب کے چند اونٹ بھی تھے! انہیں خبر ہوئی تو وہ ابرہہ بن الاشرم کے پاس پہنچے اور اپنے اونٹوں کا مطالبہ کیا جسے سن کر مسیحی حاکم متاثر ہوا اور بولا: "اے شیخ مکہ! ہم سمجھتے تھے کہ تم اپنی عبادت گاہ کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے آئے ہو جسے ہم مسمار کرنے والے ہیں لیکن تم نے صرف اونٹوں کی بابت بات کی ہے۔"

اس وقت عبدالمطلب نے مسیحی حاکم کو جو جواب دیا، اس جواب نے نہ صرف اسے بلکہ تمام بُت پرستوں کو چونکا دیا وہ بولے: "اے شاہِ یمن! اونٹوں کا مالک میں ہوں لہٰذا ان کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ خانۂ کعبہ کی حفاظت اس کا مالک خود کرے گا۔"

پھر کعبے کے مالک نے جس طرح سے اس کی حفاظت کی، وہ دنیا جانتی ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں اس واقعے نے سب سے زیادہ شہرت پائی۔ قرآنِ مجید کے تیسویں پارے میں اس کا ذکر موجود ہے۔ سردار عبدالمطلب مال دار انسان تھے۔ ان کے پاس بے شمار اونٹ تھے اور کافی زمین بھی، اس کے علاوہ طائف میں پانی کا ایک چشمہ بھی انھی کا تھا۔ سخاوت اور اخلاق کریمانہ نے قریش کے لیے انھیں ایک مرکزی حیثیت دے دی تھی۔ مسئلہ کسی کا بھی اور کوئی بھی ہوتا، سب انھی سے توقعات رکھتے تھے۔ مستزاد یہ کہ فرزندوں کی تعداد اس قدر تھی کہ قریش کے سب سرداروں پر آپ فائق نظر آتے تھے۔ ایسے میں قریش ہی نہیں بلکہ تمام تر عرب قبائل ان کی تقلید کرتے اور ان پر فخر کرتے تھے۔ وہ جو فیصلہ بھی کر دیتے، حرفِ آخر ہوتا۔ ان کا ہر فعل پیروی کے لائق تصور کیا جاتا۔ اس کی تاریخ میں بڑی عجیب مثالیں ملتی ہیں۔ اوّل یہ کہ ابتدا سے عرب میں قتل کا بدلہ دس اونٹ تھے جنھیں قصاص کے طور پر دے دینا خاص کر مقتدر حضرات کے لیے دشوار نہ تھا اس لیے قتل کی وارداتیں خاصی ہوتی تھیں۔ سردار عبدالمطلب نے ان کی تعداد بڑھا کر سو اونٹ کر دی جس کے خلاف کوئی عرب سردار آواز نہ اٹھا سکا اور قتل کی وارداتوں میں بھی کمی آ گئی۔ یہ تعداد ظہورِ اسلام تک قائم رہی۔ کسی سے کوئی قتل ہو جاتا تو اہلِ عرب قصاص کے طور پر سو اونٹ ادا کرتے۔

دوسرا واقعہ یہ کہ سردار عبدالمطّلب قریش سرداروں میں خضاب استعمال کرنے والے پہلے انسان تھے جس کے بعد خضاب عام ہوا۔ ان کے بارہ بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں جن میں نام وَر ہونے والے حارث، زبیر، ابو طالب، عبداللہ، ابولہب، حمزہ اور عبّاس تھے۔ انھوں نے متعدد شادیاں کیں۔ ان میں دوسری زوجہ فاطمہ بنت عمرو سے چار فرزند زبیر، ابوطالب، عبدِ کعبہ اور عبداللہ ہوئے۔ باقی فرزند دوسری ازواج سے تھے۔ فاطمہ بنت عمرو کے سب سے چھوٹے فرزند عبداللہ بن عبدالمطّلب تھے جن پر قریش کے تمام قبائل فخر کیا کرتے تھے۔

عبدالمطّلب کے بارہ فرزندوں میں دس کے حالات تاریخ میں ملتے ہیں جن میں سے سات کا تعلق اسلامی تاریخ سے بھی ہے۔ سردار عبدالمطّلب کے فرزندوں میں حُسنِ سیرت وصورت، کردار واخلاق میں سب سے نمایاں شخصیت عبداللہؓ کی تھی۔ وہ راست بازی، ایمان داری، سخاوت، خدمتِ خلق اور عہد کی پابندی کرنے میں اپنے تمام اجداد سے بڑھ کر تھے۔ اس وقت اگرچہ عرب کے ہر قبیلے کے سردار کی نظر ان پر تھی، لیکن بنو زہرہ کے رئیس کی بھتیجی، آمنہ بنت وہب کا انتخاب کیا گیا جو اعلیٰ صفات کی حامل اور پاک باز خاتون تھیں اور یتیمی کے سبب چچا کی سرپرستی میں رہتی تھیں۔ اس وقت عرب کے معزز جوانوں کی طرح عبداللہ بن عبدالمطّلب بھی تجارت کرتے تھے۔ ایک زمانے میں سردار عبدالمطّلب نے منّت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ انھیں دس فرزند عطا فرمائے گا تو وہ ایک کو تقربِ الٰہی کے لیے قربان کر دیں گے۔ جب دسویں فرزند نے جنم لیا تو انھوں نے منّت پوری کرنے کے ارادے سے قرعہ ڈالا۔ تینوں مرتبہ عبداللہ ہی کا نام نکلا۔ بیٹے سے بے پناہ محبّت کے باوجود سردار عبدالمطّلب نے اُن کی قربانی کا ارادہ کر لیا اور خود عبداللہ نے بھی رضائے الٰہی اور خوشنودیٔ پدر کی خاطر قربان ہونا منظور کر لیا، لیکن اس وقت ابوطالب مزاحم ہوئے۔ پھر ایک کاہنہ سے مشورہ طلب کیا گیا جس نے کہا: "یہ قرعہ اونٹوں کے ساتھ ڈالو۔"

تب اونٹوں کی تعداد بڑھائی جاتی رہی اور عبداللہ کے نام کے ساتھ قرعہ ڈالا جاتا رہا لیکن ہر بار انھی کا نام آتا، یہاں تک کہ اونٹوں کی تعداد سَو تک

پہنچ گئی تب اونٹوں کا قرعہ نکل آیا اور سردار عبدالمطلب نے فرزند کا فدیہ ادا کرنے اور اپنی منت کے بدلے سو اونٹ تقربِ الٰہی کے لیے قربان کیے۔ اسی واقعے کے بعد عبداللہ بن عبدالمطلب کا عقد آمنہ بنتِ وہب کے ساتھ ہوا جس کے بعد وہ ملکِ شام کی طرف بہ غرضِ تجارت چلے گئے جہاں سے واپسی پر بیمار ہوگئے۔ جب تک یہ تجارتی قافلہ یثرب پہنچا وہ سفر کے قابل نہ رہے، یہاں تک کہ اپنی ننھیال بنو نجار میں قیام کے لیے مجبور ہوگئے اور تجارتی قافلہ سفر کرتا ہوا مکے پہنچ گیا۔ سردار عبدالمطلب نے فرزند کو نہ پایا تو مضطرب ہوئے۔ احوال جان کر بڑے فرزند حارث کو بھیجا کہ انھیں لے آئیں، لیکن حارث کے پہنچنے سے قبل ہی عبداللہ سفرِ آخرت اختیار کر چکے تھے۔ ان کی عمر کے بارے میں تاریخ میں متعدد روایات نظر آتی ہیں لیکن مورخین کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ وفات کے وقت ان کی عمر پچیس برس تھی۔ اس وقت وہ ہستی جس کے لیے قدرت نے اس خاندان کو روزِ اول ہی سے عزت بخشی تھی، شکمِ مادر میں تھی۔ عبداللہ بن عبدالمطلب نے اپنے ترکے میں چند بکریاں اور ایک باندی اُمِ ایمن چھوڑیں جو ان کے فرزند کو وراثت میں ملیں۔ اس زمانے میں عربوں کی مذہبی، معاشرتی اور سیاسی حالت بڑی عجیب تھی جسے جانے بغیر اس عظیم انقلاب کو نہیں سمجھا جا سکتا جو رُونما ہونے والا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ ان کی مذہبی تاریخ دنیا کی ذہنی و اعتقادی ترقی کا وہ سلسلہ ہے جسے نظر انداز کر کے ہر دَور نامکمل اور اَدھورا نظر آتا ہے۔ عہد بہ عہد تاریخ کو سمجھنے کے لیے اسلام سے قبل کے حالات و واقعات کو سمجھنا لازمی ہے۔ اس دَور کو عموماً "دَورِ جاہلیہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن مورخین نے اسے بھی دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ "جاہلیۂ اولیٰ" اور "جاہلیہ ثانی"

## جاہلیۂ اولیٰ

(۱) عربِ بائدہ۔ عاد و ثمود۔ بنو جرہم۔ بحیان۔ طسم اور جدیس۔

(۲) عربِ عاربہ۔ بنو قحطان۔ یعرب۔ حضرموت۔ سبا اور حمیر۔

(۳) عربِ مستعربہ۔ مدین۔ ودان۔ بنو ارم اور آلِ اسمٰعیلؑ۔

عرب باشندوں کی یہ تین قسمیں اسلام سے صدیوں بیشتر ختم ہو چکی تھیں۔ یہ اپنے ابتدائی زمانے میں شاید صحیح عقائد پر ہوں لیکن پھر گم راہی کا شکار ہو کر فنا ہوتے گئے۔ ان میں سے عاد و ثمود کا تذکرہ تو قرآنِ مجید میں بھی ہے، لیکن گم راہی اور عقائد و حالات کی یکسانی میں ان کے درمیان کوئی خاص فرق نہ تھا اسی سبب اس دَور کو "جاہلیہ اولیٰ" کہا جاتا ہے۔

## جاہلیۂ ثانیہ

یہ دَور بھی خاصا طویل تھا جس کا خاتمہ ظہورِ اسلام پر ہوا۔ اس دَور کے لیے "جاہلیۃ" کا لفظ عام طور پر استعمال ہوتا ہے، لیکن محض اس بنا پر کہ وہ حق سے ناواقف تھے۔ وہ تعقل و تدبّر اور تہذیب و تمدّن سے ناآشنا نہ تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ثقافت اور تہذیب کے معاملے میں کسی قوم سے کم نہ تھے۔ اکثر خوبیاں دنیا نے انھی سے سیکھیں۔ ان کی غیر معمولی صفت ان کا حافظہ تھی جس کے باعث وہ لکھنے پڑھنے کے محتاج نہ تھے۔ ہر چند کہ اُس دَور میں ان کے طرزِ زندگی اور معاشی حالات انھیں ہر علم سے بے بہرہ کر چکے تھے، لیکن ان میں وہ جنگ جو پیدا ہوئے جنھوں نے دنیا کو اصولِ جنگ سکھائے۔ وہ ایسے تاجر تھے جنھوں نے دنیا کو تجارت کے گُر سمجھا دیے اور ایسے سردار تھے جنھوں نے صدیوں کے منتشر انسانوں کو سمیٹ کر سلطنتیں قائم کیں اور بعد کی آنے والی نسلوں کے لیے بھی اصولِ حکمرانی وضع کر دیے۔ وہ جاہل تھے، ایسے جاہل جن کی زبان دنیا کی زبانوں کی ماں ہے جن کے شعراء نے دنیا بھر کے شعری ادب کو فصاحت و بلاغت کا گنجینہ عطا کر دیا جس کے مقابل آج بھی دنیا بھر کے ادبی خزانے ہیچ نظر آتے ہیں۔ اگر کچھ اور بھی نہیں تو یہی صفت انھیں دیگر اقوام سے ممتاز کر دیتی ہے۔ اسی فصاحت کے سبب وہ سب کو عجم (گونگا) کہتے تھے۔ اوّل سے آخر تک زبان میں فصاحت کے معنی ہیں کہ وہ تفکر سے عاری نہ تھے۔ اسلام سے عین قبل عربی ادب میں بلند معیار نظموں کا بڑا ذخیرہ موجود تھا جن میں زبان کی نزاکت، قواعد اور صَرف و نحو کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ عربی شاعری میں جس قدر وسعت اور پختگی پائی جاتی ہے، وہ عربوں کے فکر و احساس

کی دلیل ہے۔ پھر ان کی نثر، تقاریر، ضرب الامثال، خطابات اور عام قصے کہانیوں تک میں یہ صفت بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ عرب میں ہر سال میلے لگتے جہاں متعدد فنون کے مظاہروں کے ساتھ کھیل کود، نیزہ بازی، شمشیر زنی، شہ سواری اور تیر اندازی کے مقابلے ہوتے، وہاں ایک ادبی اجلاس بھی ضرور منعقد ہوتا تھا جس میں ہر قبیلے کے لوگ بڑی سرگرمی سے حصّہ لیتے تھے اور زبان و ادب کے معیار کو بلند کرتے تھے۔ علاوہ ازیں بعض سردار خود اپنے گھروں میں علمی مجالس کا اہتمام کرتے جن میں شعراً حصّہ لیتے اور ایک دوسرے پر تنقید بھی کرتے۔ عام لوگ جو فصاحت و بلاغت سے عاری تصوّر کیے جاتے، وہ بھی عہدِ رفتہ کے واقعات ازبر کر کے اپنے قبائل کے لوگوں کو سناتے جو سبق آموز بھی ہوتے اور عبرت انگیز بھی۔ یہی زمانہ تھا جب نضر ابنِ حارث نے شاہناموں کا زبانی ترجمہ کیا اور شام کے تاریخی واقعات بھی ترجمہ کیے۔ اسے دونوں زبانوں کے وہ واقعات ازبر تھے۔ مکّہ مکرّمہ میں امرء القیس، لبید بن ربیعہ، زہیر بن ابی سلمیٰ، طرفہ بن العبد، عمرو بن کلثوم، حارث بن حمزہ اور عنترہ بن شدّاد چھٹی صدی عیسوی میں دنیائے سخن کے امام مانے جاتے تھے۔ "سبع معلقات" نظموں کا مجموعہ ہی تھا جسے آبِ زر سے لکھوا کر کعبے پر آویزاں کیا گیا تھا۔ اس اعزاز نے جہاں اس کلام کو شہرت بخشی، وہاں ان شعراء کو بھی لافانی مقام بخش دیا۔ مذہبی معاملات میں بھی اس دَور میں بڑے بڑے عالم موجود تھے۔ عبداللہ بن سلام، عثمان بن طلحہ اور ورقہ بن نوفل، یہودیت، ابراہیمیت اور عیسائیت کے زبردست عالم تھے۔ ورقہ بن نوفل نے تو یہودیت اور عیسائیت کا مطالعہ کر کے توریت اور انجیل کو عربی زبان میں منتقل کیا تھا۔ یہ قوم جاہل نہ تھی۔

ہاں جاہلیہ سے مراد اگر بے دینی اور بے رحمی ہے تو واقعی یہ لفظ اُن پر صادق آتا ہے۔ ویسے بھی اگر غور کیا جائے تو "جاہلیۃ" کا لفظ علم کے متضاد نہیں بلکہ حلم کے متضاد ہے۔ اس لحاظ سے اس میں کلام نہیں کیوں کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد ان تمام علاقوں میں کوئی شریعت اور کوئی دین باقی نہ رہا تھا۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم مقامی تھی۔ وہ سرزمینِ عرب کے لیے نہیں بلکہ

صرف بنو اسرائیل کے لیے مبعوث کیے گئے تھے لہٰذا عربوں پر ان تعلیمات کا کوئی اثر نہ تھا۔ چند خاص گھرانے جو ابتدا سے ربِّ کعبہ کی عظمت کو ماننے اور شریعتِ ابراہیمی کی پابندی کرتے تھے، ان کے سوا سب اہلِ عرب جدّت پسند تھے۔ جس طرح ان کی تہذیب میں جدّت و تنوّع تھا، اسی طرح ان کے عقیدے اور مذہب کا عالم بھی یہی تھا۔ اسلام سے عین قبل اُن میں دنیابھر کے طریقہ ہائے عبادت رائج ہو چکے تھے۔ بُت پرستی عام تھی جس نے ان کے قلوب و ذہن کو تسخیر کر کے انھیں توہّم پرست بنا دیا تھا۔ معبود کی تلاش میں وہ فطرت کی ہر شئے کو پوجنے لگے تھے۔ نہ جانے اس کی محرّک کیا چیز تھی، طبیعت کا اضطراب تھا یا خلّاقِ عالم کی جستجو کہ نہ صرف چاند، سورج، پتھر، درخت بلکہ اپنے اجداد کے بُتوں تک کی پرستش کرتے تھے۔ جگہ جگہ بُت خانے اور بُت عام تھے۔ خانۂ کعبہ ظہورِ اسلام کے وقت بُتوں کا مسکن تھا۔ ان میں عہدِ رفتہ کے مشہور و معروف عظیم انسانوں کے مجسّمے رکھے ہوئے تھے جنھیں یاد رکھنے کے لیے نسلیں ان کی پرستش کر رہی تھیں۔ ان کے علاوہ متعدّد عبادت گاہیں اور بھی تھیں جن کی رکھوالی کرنا اور چڑھاوے چڑھانا عین سعادت تصوّر کیا جاتا تھا۔ رضاء، قلیس، ذوالخلفہ، رئیام اور رغمان یہ سب عبادت گاہیں ہی تھیں جہاں وہ اپنی ہی بنائی مخلوق کو خدا سمجھ کر گڑگڑاتے۔ ان بُت خانوں کے باہر بھی جگہ جگہ بُت نصب تھے۔ ود، سواع، یغوث، نسر، یعوق، عمیانس، مدان، کندہ اور دریع، یہ سب مَردوں کی شکل میں تھے اور عربوں کے آباء و اجداد تھے جنھیں شاید ابتدا میں کسی نے احترام کے طور پر انسانی قالب میں ڈھال لیا ہو گا اور بعد کے لوگوں نے ان کی پرستش شروع کر دی ہو گی۔ آساف اور نائلہ کے لیے مشہور ہے کہ وہ میاں بیوی تھے۔ مناۃ ایک حسین دیوی تھی۔ کعث سات گز کا ایک طویل بُت تھا۔ سعد ایک طویل و عریض میدان میں نصب تھا اور اہلِ نجران ایک کھجور کے درخت کی پوجا کرتے تھے۔ یہ تمام معبود اور بُت خانے ان کے لیے بڑے اہم تھے، لیکن قدیم ترین اور قابلِ احترام عبادت گاہ خانۂ کعبہ ہی تھی۔ تمام سال اہلِ عرب اپنے اپنے بُتوں کی عبادت کر کے زیارتِ کعبہ کے لیے جب مکّے آتے تو اس

مقدّس گھر کے لیے سب کے جذبات یکساں ہی ہوتے۔ اگرچہ یہاں بھی متعدّد بُت جمع تھے، لیکن وہ معبودِ اعظم ہبل کو ہی اپنا خالق مانتے اور طوافِ کعبہ کرتے۔

کعبۃ اللہ کو پہلی بار حضرت آدمؑ نے حضرت جبرئیلؑ کے ساتھ مل کر تعمیر کیا تھا اور یہاں عبادت کے لیے آتے بھی تھے۔ پھر یہ عمارت طوفانِ نوحؑ کی نذر ہو گئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے اسے دوبارہ اُن عظیم باپ اور بیٹے کے ہاتھوں سے تعمیر کرایا جن سے اہلِ عرب کی نسل چلنے والی تھی۔ شروع میں یہ صرف خدا کا گھر تھا، کرۂ ارض پر خدا کی عبادت کے لیے اوّلین گھر۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ بُتوں کا مسکن بنتا گیا۔ بنوجرہم نے ۲۰۰ء میں آلِ عدنان (بنواسرائیل) کو صرف اس بنا پر مکّے سے نکال دیا تھا کہ وہ اصنام پرستی کے لیے تیّار نہ تھے اور اس مقدّس گھر کو اَن دیکھے خدا کا گھر گردانتے تھے۔ وہ مکّے سے نکلے تو بنوجرہم کی کلید برداری اور بنوخزاعہ کی پروہتی میں پہلی بار بُتوں کو جگہ دی گئی۔ پھر اصنام بڑھتے گئے، شرک میں اضافہ ہوتا گیا، زینت میں اضافے کے لیے انبیاءؑ کے مجسمے سجائے جانے لگے اور عقیدت کے اظہار کی خاطر نت نئے انداز سے عبادت کی جانے لگی۔ الغرض "کہیں معبود تھے پتھر کہیں مسجود شجر" کے مصداق ہر فرد کا معبود الگ تھا۔

وہ تمام عیوب جو شرک کا ثمر ہوتے ہیں اُن میں موجود تھے، یعنی رہزنی، شراب، جُوا، عیّاشی، عورتوں پر مظالم، نسل در نسل انتقام اور فخر و غرور۔ دوسری جانب آباء و اجداد کی وہ خوبیاں جو کسی بھی انسان کو بامِ عروج تک پہنچا دیتی ہیں، اُن میں پائی جاتی تھیں۔ بدترین برائیاں اور اعلیٰ ترین اوصاف ان کی نس نس میں خون کے مانند گردش کرتے۔ وہ ایک عجیب قوم بن گئے تھے۔ معاشرتی طور پر بھی وہ سب قوموں سے مختلف تھے۔ اُنھیں مصر، روم اور ایران ایسے متمدّن ممالک کی ہمسائیگی نصیب تھی جہاں وہ بہ غرضِ تجارت جاتے، ترقّی یافتہ اقوام سے تعلّقات رکھتے، اپنے اوصاف سے اُنھیں متاثر بھی کرتے، لیکن خود تہذیب کے میدان میں آگے نہ بڑھتے۔ معاشرتی طور پر وہ پس ماندہ تھے۔ وہ جیسے بھی تھے خود میں تبدیلی لانے کو تیّار نہ تھے۔ اپنی حالت پر بہ قناعت، خاندانی

نجابت پر غرور و ناز کا سبب تھا یا پھر ان کے وطن کی جغرافیائی حالت تھی کہ عرب کا زیادہ تر حصّہ لق و دق صحرا اور بے آب و گیاہ میدان تھا جس کے سبب انھیں وسائلِ زندگی بہ مشکل ہی نصیب ہوتے تھے اور جس طرح اس ملک کے مختلف حصّے اپنی جداگانہ خصوصیات کی وجہ سے ایک دوسرے سے ممیّز نظر آتے تھے، اسی طرح یہاں کے باشندے بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ فطرت میں بھی اور رہن سہن میں بھی ان کی دو قسمیں تھیں جن کے اندازِ زندگی میں بڑا فرق تھا، بدوی اور حضری!

**بدوی** یہ صحراؤں میں رہتے اور خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ شاید کوئی زمانہ ایسا ہوگا جب یہ خانہ بدوش عرب مستقلاً کسی ایک جگہ سکونت اختیار کر کے متمدّن زندگی کی خواہش پوری نہ کر سکے ہوں گے۔ پھر یہ اسی انداز کے عادی ہو گئے اور مقدور ہونے کے باوجود کسی مقام پر مستقل قیام سے کترانے لگے۔ یہ کب ہوا اور کیسے انھیں خود بھی علم نہ تھا۔ سبزہ زاروں اور پانی کے چشموں کی تلاش میں وہ اپنے مویشی اور گھر بار کے ساتھ سفر کرتے رہے۔ ان کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ وہ چلتے چلتے ریگستانوں کے کناروں پر جہاں بھی شادابی پاتے، خیمہ زن ہو جاتے اور جوں ہی شادابی تمام ہوتی، ان کا عرصۂ قیام بھی تمام ہو جاتا۔ صنعت و حرفت اور تجارت و زراعت سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہ کام تو ان کی آزادی کے منافی تھے۔ وہ تو لوٹ مار کرتے، قافلوں سے مال و اسباب لوٹنا اور مویشی ہتھیا لینا ان کا بہترین مشغلہ تھا۔ کوئی چھاپا مارنے کو نہ ملتا تو تھوڑے فاصلے پر خیمہ زن اپنے ہی بھائی کے گھر ڈاکا ڈالتے، لیکن متضاد اطوار کے مالک وہ بھی تھے۔ انھیں زیرِ بارِ احسان ہونا گوارا نہ تھا۔ کوئی بدوی کسی تاجر کا زیرِ بارِ احسان ہوتا تو اس کے قافلے کی حفاظت کے لیے جان سے بھی گزر جاتا۔

بدوی عرب کی زندگی میں اونٹ کی بڑی اہمیت تھی۔ اونٹ نہ صرف قافلے کی نقل و حمل کا ذریعہ ہوتے بلکہ ان کی دولت، سواری، عزّت، ضرورت اور حیثیت سبھی کچھ اونٹ تھے۔ وہ ساتھی بھی تھے سہارا بھی، غذا بھی اور علاج

بھی۔ بدوی عرب کو کوئی جسمانی مرض لاحق ہوتا تو وہ اونٹ کے پیشاب سے غسل کرتا اور اپنی دانست میں شفا پا جاتا۔ اس کی دوسری اہم ضرورت عورت تھی۔ ہر گھر کی عورت امورِ خانہ داری انجام دیتی۔ جنگل سے ایندھن لاتی، مویشیوں کا دودھ دوہتی، ان کے بالوں سے لباس اور جوتے تیار کرتی اور اپنے بیٹوں کو آباء و اجداد کے واقعات سنا کر دشمن سے انتقام پر اُکساتی۔ یہ تھی بدوی عرب کی زندگی۔

**حضری** ان کے اندازِ زندگی بدویوں سے بالکل مختلف تھے۔ یہ کسی ایک جگہ سکونت اختیار کرتے جہاں ان کی نسلیں پروان چڑھتیں، خاندان اور قبیلے ہوتے، رسمیں اور روایات ہوتیں۔ حضری عرب ان روایات کی حفاظت مذہب سے زیادہ کرتے۔ اُن کے دَم سے شہر کے شہر آباد تھے جن میں بعض بہت ترقی یافتہ ہوتے، اس قدر کہ بعد کے آنے والوں نے اُن کے اصول اپنائے۔ وہ آج تک ترقی یافتہ ہی کہلاتے ہیں۔ حضری عرب مختلف تہذیب و تمدن کے حامل اور ان کی رسومات ایک دوسرے سے جداگانہ تھیں۔ عام طور پر ان کی عادات و اطوار اور معیارِ زندگی ان کے پیشوں اور وطن کے لحاظ سے ہوتیں۔ علاقوں اور حیثیتوں کے لحاظ سے یہ مختلف قسم کا رہن سہن رکھتے، نیم پختہ، پختہ، ایک منزلہ، دو منزلہ مکانات ہوتے۔ کبھی کوئی رئیس سہ منزلہ مکان بھی بنوا لیتا۔ یہ صرف صاحبِ ثروت لوگ ہی ہوتے جن کے اپنے اصطبل ہوتے۔ لونڈی، غلام، شراب و شباب کی محفلیں آراستہ ہوتیں۔ یہ تمام عیش انھیں تجارت کے بل پر حاصل ہوتے جو ایک عام پیشہ تھا، مگر تجارت بھی دو قسم کی ہوتی، اندرونی اور بیرونی! یہ تجارت سامان کی بھی ہوتی، ملبوسات و زیورات کی بھی اور اسلحہ اور گھوڑوں کی بھی۔ جو جتنے زیادہ ممالک میں جا کر تجارت کرتا اتنا ہی معزز کہلاتا تھا۔ فنونِ لطیفہ کا شوق ان کی اکثریت کو تھا۔ کشتی، نیزہ بازی، شہ سواری، اور شمشیر زنی میں مہارت کے بغیر کوئی جوان مکمل تصور نہ کیا جاتا۔ علم کے معاملے میں بھی یہی حال تھا۔ کچھ صاحبِ ثروت گھرانے شعراء کی باقاعدہ سرپرستی کر کے اپنی خاندانی نجابت و عظمت کے قصیدے لکھواتے جس کے سبب قبیلے اور قبیلوں کے باہر بھی ان کی خوبیاں مشہور ہو جاتیں۔ حضری عرب سبھی ایک سے نہ

تھے بلکہ یہ تین طبقوں پر مشتمل تھے، امیر، درمیانہ اور غریب! اسی لحاظ سے ان کا رہن سہن اور رسم رواج تھے۔ قانون سب کے لیے ایک نہ تھا بلکہ شہروں میں کوئی قانون نہ تھا۔ ان کے لیے حُبّ الوطنی، اخلاق، مذہب اور قانون بس قبیلے کے لیے جان دے دینا تھا۔ عرب اجنبیوں کو بڑی فراخ دلی سے خود میں سمو لیتے تھے بلکہ ان کے قدیم رئیس نوواردوں کی سرپرستی بھی کرتے تھے، مگر نووارد کو یہ حق نہ دیا جاتا۔ ہاں وہ اس کی عزت پوری طرح کرتے بلکہ یہ عزت اور مساوات کی بہت بڑی مثال ہے کہ عرب میں سرپرست اور نووارد کے لیے ایک ہی لفظ استعمال کیا جاتا، مولا! سہارا دینے والا بھی اور سہارا لینے والا بھی! وہ بہ یک وقت سختی اور نرمی کا امتزاج تھے۔ نیکی پر آتے تو بڑے سے بڑے کارنامے انجام دے دیتے اور بُرائی کرنے پر آتے تو تباہ کیے بغیر نہ چھوڑتے۔ کبھی وہ معمولی سے جھگڑے پر قبائل کے قبائل تہس نہس کر دیتے۔ بیٹوں کو وہ باپ دادا کے دشمنوں سے بدلہ لینے کے لیے پرورش کرتے، لیکن کبھی وہی دشمن اگر ان کے دروازے پر آجاتا تو اُسے پناہ دیتے۔ ان میں بدکاری بھی ہوتی اور عشقیہ شاعری بھی، لیکن انھی میں ایسے معززین بھی تھے جن کی پاک بازی کی قسم کھائی جاتی تھی۔ عورت کے معاملے میں بھی ان کی یہی کیفیت تھی۔ بیٹی کی پیدائش کی خبر سن کر وہ مُنہ چھپاتے پھرتے۔ دختر کشی بھی عام تھی۔ اسی کے ساتھ ایسا بھی تھا کہ عورت کی عزت کی خاطر اُن کے درمیان جنگ چھڑ جاتی۔ ان کا قول تھا کہ میراث کا حق دار صرف وہ ہے جو تلوار پکڑ سکتا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ بچّوں اور عورتوں کو وہ وراثت سے محروم کر دیتے تھے۔ حضری عربوں کی اکثریت عورت کو صرف افزائشِ نسل کا ذریعہ تصوّر کرتی تھی۔ ان میں نکاح اور عدت کی کوئی تعداد و معیاد نہ تھی۔ نہ رشتوں کی حرمت باقی تھی۔ ان کے قبیلوں میں دختر کشی ایسی بُری رسمیں رائج تھیں۔ وہ خون کے ان رشتوں کی پروا نہیں کرتے مگر متبنیٰ کی بیوہ یا مُطلقہ کو خون کے رشتوں کی مانند تصوّر کر کے وراثت میں تسلیم کرتے تھے۔ یہ تھیں ان کی وہ عادات جو انھیں ایک دوسرے سے ممتاز رکھتیں، لیکن ایک چیز ان سب میں موجود تھی جو انھیں متفق کر دیتی تھی، وہ تھی آزاد رہنے کی

خواہش، پابندی اور محکومی سے انھیں نفرت تھی۔ ایک قبیلہ دوسرے کی اور تمام قبیلے بیرونی قوت کی حکومت برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اسی بات نے انھیں سنگ دل بنا دیا تھا اور یہی چیز انھیں تلوار کھینچ لینے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس کیفیت کو صدیاں گزر گئی تھیں، یہاں تک کہ ان کے قلب و ذہن پر جمود طاری ہو چکا تھا۔ اپنی تہذیب سے کوئی اعلیٰ تہذیب انھیں نظر ہی نہ آتی تھی، اپنی بُرائیوں اور پستی کا انھیں احساس ہی باقی نہ رہا تھا۔ عام خیال یہی ہے کہ ان میں کوئی باقاعدہ اور منظم حکومت نہ تھی۔ اس خیال کو ان کے اندازِ زیست نے کچھ زیادہ ہی تقویت دی ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہ تھا۔ گمراہی کے اس دور میں بھی عرب کے کچھ شہر بڑی مملکت کہلائے جانے کے مستحق تھے جن میں سرِفہرست مکہ مکرمہ کا نام آتا ہے۔ یہاں کے سرداروں نے عقائد کی ہزار ہا خرابی کے باوجود خانۂ کعبہ کی حرمت و حفاظت کے لیے ایک ایسی مشترک حکومت اور ایک ایسا جدید طریقہ رائج کیا تھا جو آج ہزاروں برس گزرنے کے باوجود ترقی یافتہ طریقہ ہی کہلاتا ہے۔ بہ ظاہر تو یہ ایک مذہبی انتظام ہی تھا لیکن دراصل وہ ان کے نظامِ اجتماعی کا ایک حصہ تھا جس سے ان کے اخلاق، کردار، سخاوت، شجاعت، اتفاق و اتحاد، حلم و بردباری اور مہمان نوازی ایسی اعلیٰ ترین خوبیاں سامنے آتی ہیں۔ اسی کی بدولت ان کے عدمِ تحمل اور نااتفاقیوں کے اسباب بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس مشترکہ حکومت کی بنیاد قصی بن کلاب نے رکھی۔ ۴۴۵ء میں انھوں نے مکہ مکرمہ پر قبضہ کرنے کے بعد معززین میں مناصب تقسیم کر کے گویا ہر نفس کو اس کے فرائض کا احساس دلا دیا تھا۔ اس وقت کسی بھی قوم میں کوئی عسکری نظام موجود نہ تھا، بڑی بڑی اقوام جنگی اصول و قوانین اور حربی نصب العین سے عاری تھیں، ایسے میں عرب کا بچہ بچہ نہ صرف شجاعت و دلیری اور جنگی تجربات رکھتا تھا بلکہ یہ قوم دیگر متعدد خامیوں کے باوجود بڑی تنظیم کے ساتھ جنگ لڑتی تھی۔

ذرائع معاش کی قلت، اکثر حصوں میں پانی کی کمی سے زراعت کا متاثر ہونا اور پھر آپس ہی میں اتفاق و اتحاد کا فقدان، یہ اسباب وہ تھے جو کسی بھی قوم میں

ہوں تو فراغت سے زندگی بسر کرنا محال ہوتا ہے۔ ان کے لیے بھی فراغت ممکن نہ تھی، لیکن ہر مجبوری کے باوجود وہ عسکری طور پر کم زور نہ تھے۔ وہ باقاعدہ لڑائیاں لڑتے جو اندرونی بھی تھیں اور بیرونی بھی! اندرونی جنگوں کا محرّک عموماً دو باتیں ہوتیں، خاندانی تفاخر برقرار رکھنے کے لیے شجاعت ودلیری کی دھاک بٹھانا یا اپنے بزرگوں کا انتقام لینا۔ یہ باتیں نسلوں سے تھیں۔ محض جھوٹی شان برقرار رکھنے کے لیے وہ طویل جنگیں لڑتے۔ حربِ بسوس، حربِ واحس اور اوس وخزرج کی جنگیں ان میں غیر معمولی شہرت رکھتی ہیں۔ فخر وغرور کو برقرار رکھنے والی جنگوں میں حربِ فجار بڑی ہول ناک جنگ تھی۔

بیرونی جنگوں کا سبب عموماً مالِ غنیمت ہوتا جو اکثر اوقات گزر بسر کا ذریعہ بھی ہوتا۔ جو بھی جس قدر حاصل کرتا، اتنا ہی دلیر اور معزز گردانا جاتا۔ یہ جہاں چھاپا مارتے، مال ومویشی اور عورتیں سبھی کچھ سمیٹ لاتے اور سرداروں کی نظروں میں اتنا ہی بلند مرتبہ پاتے۔ انھوں نے مالِ غنیمت کی تقسیم کے لیے بھی چند اصول مرتب کیے تھے۔ حضری عرب ان سب کی بہت پابندی کرتے تھے۔ جنگ سے حاصل شدہ مال کے متعدد نام رکھے ہوئے تھے، صِلات، رُبع، صَفی، النشیط، اور الفضول۔

(۱) صِلات: مغلوب ومقتول کی تمام خاص اشیا فاتح کو دے دی جاتیں۔ یہ مالِ غنیمت کے علاوہ اس کا حصّہ ہوتا۔ جو صِلات کہلاتا۔ قبیلے کے دیرینہ دشمن کو زیر کرنے والا اس کا حق دار ہوتا۔

(۲) رُبع: مالِ غنیمت کا چوتھائی حصّہ رُبع کہلاتا جو شیخِ قبیلہ کا حصّہ ہوتا تھا۔

(۳) صَفی: (خالص اور صاف شے) مالِ غنیمت کی تقسیم سے قبل اگر کوئی بہادر گھوڑا یا تلوار پسند کر لیتا تو یہ صَفی کہلاتا تھا۔

(۴) النشیط: جس دلیر کو ایک مہم سے آتے ہی دوسری مہم پر جانا ہوتا تو وہ تقسیمِ مال سے قبل ہی اپنا حصّہ لے لیتا جو اسی کا حق سمجھا جاتا تھا۔

(۵) الفضول (ناقابلِ تقسیم مال) مالِ غنیمت کی تقسیم کے بعد جو اشیا بچ جاتیں، الفضول کہلاتی تھیں۔ انھیں برابر برابر بانٹ لیا جاتا تھا۔

ان جنگوں کے لیے جو امیر مقرر کیا جاتا، منکھف کہلاتا تھا۔ فوج روانگی سے قبل سر منڈوا دیتی تاکہ بالوں کے ذریعے کوئی انھیں زیر نہ کر سکے۔ فوج کے ساتھ شعراء بھی ہوتے، اطبّا و جرّاح بھی اور خواتین بھی۔ بڑی بڑی جنگوں میں مقتول کی لاش کو مُثلہ بھی کرتے تھے تاکہ انتقام کی آگ پوری طرح بجھ جائے اور مقتول کی تذلیل بھی ہو سکے۔ یہ لوگ میدانوں میں گھوڑے استعمال کرتے اور ریگستانوں میں اونٹ۔ ہر قبیلہ اپنے جانور پر ایک مخصوص ٹھپّا لگاتا جس کے سبب گم ہو جانے کا احتمال نہ رہتا۔ اسلحہ میں وہ تلوار کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ یوں تو ہر قوم میں اس کا رواج تھا اور ہر ملک کی تلوار اپنی ساخت اور خصوصیت کے اعتبار سے مختلف تھی، یعنی ہندی، شامی، سلیمانی اور خراسانی، لیکن اس کا استعمال جس طرح عربوں نے کیا ہے، اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ صرف عربی زبان میں تلوار کے سَو سے زائد نام ہیں۔ انھیں دورانِ جنگ میں محاصرہ کرنے کے لیے منجنیق، کبش اور دبابہ کی ضرورت بھی پیش آتی، مگر یہ اسلحہ اور قلعہ شکن آلات دیگر قبائل میں رائج تھے۔ ان آلات کو عام طور پر یہودی بناتے اور استعمال کرتے، خاص قریش نہیں، لیکن جنگ کے اصول و ضوابط جس طرح مکّہ مکرّمہ میں پائے جاتے تھے کہیں اور نہ تھے۔ عسکری نظم انھیں اپنے اسلاف سے ملا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ عہدوں کے نام تبدیل ہوتے رہے، لیکن ذمّے داریاں وہی رہیں جن کی بدولت قریشی جوان ہر دم مستعد نظر آتے۔ اگر وہ کسی مجبوری کے سبب خود کسی جنگ میں حصّہ نہ لے سکتے تو اپنے پروردہ غلاموں کو روانہ کر دیتے۔ قریش رئیس، حبشی غلام خرید کر انھیں باقاعدہ جنگ کی تربیت دیتے، وہ جنگ کے مواقع پر ان کی قوّت ثابت ہوتے۔

یہ عربوں کی وہ خصوصیات اور ان کی وہ حالت تھی جس کا ذکر کیے بغیر ان کے لیے کچھ کہنا ممکن نہیں۔ وہ اپنی خصوصیات مثلاً دلیری، سخاوت، مہماں نوازی اور پاس داریٔ عہد کے سبب جہاں جاتے، معزّز تصوّر کیے جاتے۔ وہ خود اور ان کا (دنیا کے عین وسط میں) ملک سب کے لیے ہی توجّہ طلب تھا۔ یہ لوگ متضاد خصوصیات کے سبب بہترین بھی تھے اور بدترین بھی،

لیکن دیگر ممالک اور مذاہب کے پیروکار ان سے قطعاً مختلف تھے۔ اسلام سے عین قبل متمدّن اور ترقّی یافتہ ترین ممالک کے لوگ بھی متمدّن کہلائے جانے کے مستحق نہ تھے۔ معاشی، سیاسی اور مذہبی اعتبار سے وہ اس مقام پر پہنچ چکے تھے جس کے بعد پستی کا کوئی اور مقام نہ تھا اور اس ذلّت و پستی کا بڑا سبب یہی تھا کہ ان کے پاس کوئی طریقۂ زندگی نہ تھا۔ جو کچھ بھی ان کے پاس تھا اسے وہ وقت اور ضرورتوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر مسخ کر چکے تھے لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ خالقِ کائنات سابقہ تمام قوانین کو منسوخ فرما کر بنی نوعِ انسان کے لیے کوئی نیا قانون وضع فرماتا۔

## دینِ حق کی ضرورت

خدا صرف خلّاقِ عالم ہی نہیں، پروردگارِ عالم بھی ہے، مالک و فرماں روا بھی ہے اور ہدایت دینے والا بھی۔ انسان اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ ہونے کے باوجود بہرحال مخلوق ہے، خداوندِ عالم کا مطیع ہے۔ اُسے پہلے سانس سے آخری سانس تک عمل کرنے کے لیے کسی طریقے، کسی انداز کی ضرورت ہے جس کا انتظام خلّاقِ عالم نے خود ہی فرما دیا ہے اور اس کے لیے طریقۂ کار یہ رکھا کہ وہ اپنے مالک و آقا کو پہچانے، اس کی وحدانیت اور لامحدود قوّتوں کا اعتراف دل اور زبان سے کرے اور اس کی جانب سے جو جو ہدایات ملتی رہیں ان پر عمل کرے۔ بس انسان کے لیے یہی طریقۂ زندگی ہے، یہی دستور العمل ہے جسے عرفِ عام میں مذہب کہتے ہیں۔ اس کی درستی ہی کُل حیات کی درستی ہے معاملہ فردِ واحد کا ہو یا پوری قوم کا، مذہب کے اثرات یکساں ہوتے ہیں جو زندگی کے ہر شعبے میں بناؤ اور بگاڑ کا سبب بنتے چلے جاتے ہیں۔

مذہب کی تاریخ بھی انسان کی طرح پُرانی ہے۔ انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی اصلاح و ہدایت کا آغاز ہوا۔ خالقِ کائنات کی جانب سے احکام کا سلسلہ شروع ہوا تو پہلا حکم یہی تھا کہ انسان، خالق کو واحد و یکتا تسلیم کرے اور اسی کے احکام کی تعمیل کرے۔ دنیا میں متعدّد مذاہب آئے۔ ان سب کا اوّلین اصول

یہی تھا۔ پھر ہر قوم کے لیے اس کے دور اور حالات کے مطابق احکام تھے۔ جب تک وہ قوم ان احکام کی تعمیل کرتی رہی نافرمانی کی مرتکب نہ ہوئی، خداوندِ عالم نے دوسرے مذہب اور دوسرے طریقِ حیات کی ضرورت محسوس نہ کی، لیکن جب کسی قوم نے نافرمانی کی، اپنے مذہب میں من مانی ایجادیں کرلیں، حقیقت سے دُور ہوگئی تو خالقِ کائنات نے اسے منسوخ فرماکر دوسرا دستورالعمل وضع کردیا۔ عام قاعدہ بھی یہی ہے کہ جب تک قانون کی پابندی کی جاتی ہے، اس وقت تک اس میں کسی ترمیم و تبدیلی کی ضرورت پیش نہیں آتی! جب کوئی قوم ایک دستورالعمل کو ماننا چھوڑ دیتی ہے تبھی اس کے لیے حاکمِ وقت دوسرا دستور بناتا ہے۔ عام قاعدہ یہی ہے اور قانونِ قدرت بھی یہی ہے۔ تمام الہامی کتب میں انسان کے لیے ایک ہی سے احکام ہیں کیوں کہ وہ سب ایک ہی عدالت سے صادر ہوئے ہیں۔ شروع میں ہدایات آئیں۔ پھر چھوٹے چھوٹے صحیفے نازل ہوئے۔ خداوندِ عالم ان کے ذریعے خلقت کی رہنمائی فرماتا رہا، لیکن جوں جوں نسلِ انسانی بڑھتی گئی، ضرورتیں بھی سوا ہوتی گئیں۔ تب انسان خدائی احکام میں ایجادات و اختراع کرنے لگا۔ کچھ لوگ حد سے بڑھتے گئے بلکہ خود کو ہی طاقت سمجھنے لگے۔ جب ایسا ہوتا تو انسانوں کا بڑا طبقہ بے راہ روی اختیار کرکے من مانی شروع کردیتا۔ ایسے میں جائز و ناجائز، حق اور باطل کی تمیز مٹ جاتی اور چند ہستیاں جو احکام خداوندی کی پیروی کرنا چاہتیں، اس انقلاب کا شکار ہوکر رہ جاتیں جو مقتدر ہستیاں لائی تھیں۔ ایسے میں فطرت کے عین مطابق مالکِ حقیقی اس قوم کی اصلاح و ہدایت کے لیے نئے احکام نازل فرماتا، نیا قانون مرتب کرتا جو اس قوم کے بگڑے ہوئے معاملات کی اصلاح کرکے اسے نئے انداز سے زندہ رہنے کے اصول سکھا دیتا۔ یہ نیا قانون کیا ہوتا؟ تمام پرانے قوانین کا مجموعہ، قدرے واضح انداز میں! سابقہ احکام کچھ ایسی تبدیلیوں کے ساتھ جن کی وقت اور حالات کے تحت ضرورت ہوتی۔ یوں انبیاءؑ آتے گئے، مذاہب آتے گئے، انسان پیروی بھی کرتے گئے اور نافرمانی بھی۔ یہ تمام انبیاءؑ، حق پر تھے اور ان کے لائے ہوئے تمام دین لائقِ عمل تھے جنھیں وقت

گزرنے کے ساتھ ساتھ وہی اقوام اپنے خود ساختہ مسائل کے سبب رد کردیتی تھیں جن کے لیے یہ لائے جاتے تھے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں نافرمانی کہا گیا ہے۔ نافرمانی یہ نہیں ہے کہ بھوک سے مرتا ہوا ایک انسان خود کو بچانے کے لیے غیر اختیاری طور پر حرام کا سہارا لے بلکہ نافرمانی یہ ہے کہ حلال اور جائز شے کی موجودگی میں عقل و دانش کے باوجود حرام اختیار کیا جائے اور یہ عمل برابر دُہرایا جائے۔ جب ہر شعبۂ حیات میں بُرائی اور بھلائی کی تمیز مٹ جاتی ہے تبھی کسی انقلاب کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اصول ہے کہ وہ اپنی کائنات اور اپنی بنائی ہوئی مخلوق کو سزا دینے یا مٹانے کے لیے عجلت نہیں کرتا بلکہ بار بار سنبھلنے کا موقع عطا فرماتا ہے۔ انسان کو عقل و خرد اور ہوش و حواس عطا کرکے حق کو پہچان جانے کی توفیق بخشتا ہے۔ بہ الفاظِ دگر اپنے بنائے ہوئے قانون کو بار بار واضح انداز سے، کسی نئے ذریعے سے اس کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ سب انداز محض اس لیے ہیں کہ انسان بہتر طریقے سے زندگی گزار کر اچھے انجام کا مستحق بن جائے۔ غرض کہ یہ سب ہوتا رہا، اسے موقع دیا جاتا رہا۔ ابتدا میں بات کسی علاقے، کسی گروہ یا کسی قوم کی تھی۔ وہ بے راہ روی کا شکار ہوتے تو ان کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ انھی میں سے کسی کو منتخب فرماتا اور اس طرح تبلیغ و ہدایت کا سلسلہ شروع ہو جاتا، لیکن اب کسی علاقے، کسی گروہ یا قوم کی بات نہ تھی بلکہ بے راہ روی کا شکار تو ہر قوم تھی، ہر علاقہ تھا۔ انسان کے اندر نافرمانی اور خود پسندی حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ اب بندہ نافرمان ہی نہیں خدائی کا دعوے دار تھا۔ ہر مقتدر شخص اپنے عمل سے خود کو یہی ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ خود ساختہ ضروریات کی تکمیل کے لیے ہر ذریعہ اختیار کرنا اور اپنی ذات کو مطمئن رکھنا ہی اُن کا دین تھا۔ بُرائی کسی ایک میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں اس طرح داخل تھی کہ اس پر فخر کیا جاتا تھا۔ مذہب، جو اتفاق و محبت، ہمدردی اور دوسروں کے لیے ایثار کا سبق دیتا ہے، ان لوگوں میں محض اپنی اپنی برتری جتا کر نااتفاقی اور نفرت کا سبب بن رہا تھا۔ ہر قوم خود کو ہی معزز گردان کر دوسروں کو ذلت کا احساس دلاتی تھی۔ وہ سب باتیں جو مذہب میں

نہ تھیں، عیبن مذہب تصوّر کی جارہی تھیں اور یہ کیفیت بڑھتی جارہی تھی۔ انجام یہ کہ بندے اور معبود کا تعلق ٹوٹ چکا تھا۔ بڑے بڑے مذاہب کے پیروکار بھی وحدانیت کی اوّلین تعلیم بھول کر شرک میں ملوّث تھے۔ انسانوں کے درمیان بھی ناقابلِ عبور فاصلے حائل ہو چکے تھے جس کے سبب وہ انسانوں کی طرح نہیں بلکہ حیوانوں سے بدتر زندگی گزار رہے تھے۔ ہر جانب بگاڑ ہی بگاڑ تھا۔ بس خورونوش اور افزائشِ نسل کا سلسلہ جاری تھا اور وہ سب اسی کو زندگی تصوّر کرتے تھے۔ انسان اور حیوان میں مذہب اور طریقے کا فرق ہی تو ہے۔ انسانوں سے مذہب اٹھا دیا جائے تو ان دو مخلوقوں میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔ وہی بھوک مٹانا آرام کرنا اور مخالف جنس کی طلب کرنا حیوان کا کام بھی ہے انسان کا بھی، لیکن بھوک مٹانے کے خوب صورت طریقے اور افزائشِ نسل کا حسین مقصد تو مذہب کا ہی عطیہ ہے۔ عرب سے ہٹ کر بھی جب ہم دیگر ممالک و اقوام پر نظر ڈالتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ اسلام سے عین قبل انسان اور حیوان کی ضروریات اور زندگی گزارنے کے انداز میں کوئی بھی فرق باقی نہ تھا۔ لگتا تھا کہ وہ انسان نہیں رہا۔ نہ اس کی نظر میں انسانیت کا کوئی احترام باقی تھا۔ سبھی کی حالت ایک سی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کم وبیش ہر ملک میں آمریت کا دَور دورہ تھا خود غرضی اور مطلق العنانی گوشے گوشے میں عام تھی۔ اگرچہ عرب کے سوا ہر ملک میں باقاعدہ حکومت قائم تھی، لیکن کہیں بھی حکمرانی کا مقصد بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود اور ان کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنا نہ تھا بلکہ آئینِ سیاست کی بنیاد ظلم و تشدد پر رکھی جاتی تھی۔ صاحبانِ اقتدار عوام کی محنت و مشقت سے حاصل کردہ دولت سے عیش کرتے تھے جس کے سبب ان کی نظر میں اپنے سوا کوئی اہم نہ تھا۔ طاقت کو استحکام اور بقا کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ جو جتنی جلد مخالف کو زیر کرلے، اتنا ہی بہادر اور جو جس قدر خوب صورتی کے ساتھ دھوکا دے سکے وہ اتنا ہی بڑا سیاست داں گردانا جاتا تھا۔ پھر ایک دوسرے کی تقلید میں سبھی ان

اصولوں پر کار بند تھے جس کے سبب معاشرتی و اخلاقی طور پر زوال کی انتہا پر پہنچ چکے تھے۔ ہر فرد جدا جدا صرف اپنی ہی حیثیت سمجھتا تھا۔ ان میں وہ اقوام بھی شامل تھیں جن میں مذاہب آچکے تھے، حق کی آواز پہنچ چکی تھی، لیکن اب وہ سچائی سے محروم ہو کر گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ ہر طبقہ صرف خود میں مگن تھا۔ وہ صرف حرص و ہوس کے دلدادہ تھے۔ تسکینِ نفس کے لیے وہ ہر جائز و ناجائز کام کرتے تھے اور زندگی کی جملہ ذمّے داریوں سے بے پروا ہو کر صرف اپنی خوشیوں کے لیے ذرائع تلاش کرتے تھے۔ حکمراں طبقہ، جاگیرداروں، بادشاہوں اور شہزادوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر ملک میں یہی طبقہ اقتدار کو بروئے کار لاکر ہر قسم کی بُرائیوں کا سدِّ باب کر سکتا ہے۔ یہ قائد کہلاتے ہیں اور انھی کی قیادت عوام کو صراطِ مستقیم سے آشنا کر سکتی ہے، لیکن بدنصیبی کی انتہا تھی کہ یہی لوگ معاشرے میں پیدا ہونے والی بے نظمی اور بُرائی کا سرچشمہ تھے اور ہر تباہی کے بعد بھی گویا راحت و آرام صرف انھی کا حصّہ تھا۔ وہ اپنی خواہشات کے مطابق قانون وضع کرتے اور اپنی ضرورت کے مطابق اسے توڑ دیتے تھے۔ وہ ہستیاں جنھیں خلّاقِ عالم نے بنی نوعِ انسان کی قیادت کا عظیم فرض سونپا تھا، قوّت اور ذہانت بخشی تھی، انھیں عیش کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ وہ اپنی ہر صلاحیت صرف تعیّشات کے حصول کے لیے ہی استعمال کرتے تھے۔ وہ آسائش و زیبائش کے ایسے ایسے انداز اختیار کرتے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی آج ان کے حالات جان کر حیرت ہوتی ہے۔ سامانِ تعیّش کی فراوانی اور عورتوں کی بہتات نے انھیں دنیا و مافیہا سے بیگانہ کر دیا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس زندگی کا اثر عوام تک بھی پہنچ رہا تھا نتیجہ یہ محصولات بڑھتے جاتے اور حکومت کے بے جا مطالبات پورے کرنے کے لیے عوام اپنی مشقّت کی کمائی کو محصولات کی شکل میں ادا کرتے کرتے مر جاتے تھے۔ لگان اور حکمراں کی چکّی کے درمیان عوام پستے رہتے اور جب ان کے لیے بڑے بڑے محصولات ادا کرنا ناممکن ہو جاتا تو اعلیٰ حکّام وصول یابی کے لیے تشدّد اور ظلم کے ہتھیار استعمال کرنے لگتے۔

اس طرح سے جان محفوظ رہی اور نہ مال۔ پھر وقت نے بہت کچھ بدلا۔ سیاسی اور جنگی حالات میں تبدیلی آئی، مذہبی معاملات میں انقلاب آئے، لیکن زندگی کے یہ انداز نہ بدلے۔ ہاں ان سب میں اضافہ ہوتا گیا۔ محصولات بڑھے، مظالم شدید ہوئے اور فرق آیا تو اتنا کہ لین دین کے طریقے بدل گئے۔ شروع میں محصول زر کی صورت میں ادا کیا جاتا، پھر تحائف اور نذرانے طلب کیے جانے لگے۔ کسی تہوار یا خوشی کے موقع پر عوام پر دباؤ ڈالا جاتا کہ حکام کی خدمت میں نذرانے پیش کریں۔ مدتوں یہی رواج رہا، پھر اس کی شکل بھی بدل گئی اور دولت کے ساتھ ساتھ نذرانے کے طور پر عورت کو بھی پیش کیا جانے لگا۔ اس دستور کو عروج تک پہنچانے میں ایران اور روم نے کمال حاصل کیا۔ وہ ایسے نذرانوں کی وصول یابی کو آئین کہتے تھے۔ عیدِ نوروز کے موقع پر عوام کی عزت کا دیوالہ نکل جاتا۔ جو جہاں اختیار رکھتا، وہ عوام کو حق سے محروم کر کے ہر عیش اپنے لیے ہی مخصوص کر لیتا تھا۔ زندگی کے اس انداز نے انسانی معاشرے کو تین طبقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ دو طبقے حکمران کے سامنے جھکنے اور تعمیلِ حکم کے لیے مجبور تھے۔ یہی وہ شیطانی قوت تھی جسے طاغوت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان کی پوجا اور پرستش گویا ایک راسخ قانون بن چکی تھی جسے توڑنا کسی کے اختیار میں نہ تھا۔ ان طاغوتی طاقتوں سے لذت و راحت کی زندگی اور غریب عوام کے نصیب سے ذلت اور محرومی کوئی نہ بدل سکتا تھا۔ معاشرے میں کسی فرد کی جرأت نہ تھی کسی بھی تبدیلی کے لیے سوچ سکتا۔ غلام کا بیٹا غلام اور حکمران کا بیٹا حکمران ہی بنتا تھا۔ دنیا بھر میں ان تینوں طبقوں کی زندگی ایک ہی تھی۔ حکمران فرعون اور نمرود کا نمونہ پیش کر رہے تھے اور عوام اور غلام ظلم کی چکی میں پس رہے تھے۔ ان میں اعلیٰ ترین مذاہب کے دعوے دار بھی تھے اور بے بہرہ لوگ بھی، لیکن ان سب میں فرعون، ہامان اور قارون موجود تھے جن کے ہاتھوں عوام کا استحصال ہو رہا تھا۔ طاقت کی پرستش مختلف اندازمیں کی جا رہی تھی۔ طاقت کے سامنے جھک جانا اور کمزور کو جھکا لینا، ان تمام کا شیوہ تھا۔ اس وقت قابلِ ذکر مذاہب پانچ تھے اور ان سب سے اصلیت مفقود ہو چکی تھی۔ بڑی بڑی اقوام انھی مذاہب

میں تقسیم تھیں۔

## (۱) یہودیت

مذاہبِ عالم کی تاریخ میں سب سے پہلے اسی کا ذکر آتا ہے۔ اس کے پیروکاروں کے لیے اس وقت کوئی علاقہ مخصوص نہ تھا۔ یہ قوم دنیا کے مختلف حصّوں میں بکھری ہوئی تھی۔ اگرچہ یہی وہ قوم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انبیاءؑ کی تعلیمات کا وارث قرار دیا تھا۔ اس کے پاس دیگر مذاہب کے مقابلے میں دینی سرمایہ بھی بہت زیادہ تھا اور فہم و صلاحیت بھی وافر، لیکن مذہب کے ابتدائی زمانے میں بھی یہ قوم مسلسل نافرمانی کرتی رہی۔ پھر بہ تدریج یہ قوم اصولوں سے ہٹتی گئی، یہاں تک کہ حضرت عزیرؑ کو محض توریت کے ازبر سنا دینے پر خدا کا فرزند کہنے لگی۔ شرک کی اس انتہا کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اوّل اوّل اِسے اصلاح کے متعدد مواقع عطا فرمائے۔ بار بار رہبر و مصلح پیدا کیے۔ کسی بھی قوم میں اتنے پیغمبر پیدا نہیں ہوئے جتنے یہود کی اصلاح کے لیے آئے، لیکن یہ لوگ دینی تعلیمات، اور خدائی احکام کو فراموش کر کے انبیاءؑ کا مذاق اُڑاتے، انھیں جھٹلاتے اور اذیتیں دیتے رہے۔ انجام کار قدرت نے سزا کے طور پر ان سے دنیا کی قیادت چھین لی، انھیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا اور دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا کر منتشر کر دیا۔ اصولاً انھیں سزا کے بعد سنبھل جانا چاہیے تھا، لیکن عتابِ خداوندی کے بعد بھی ان کی حالت یہ تھی کہ جو جہاں تھا، اپنے دین کو مسخ کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ان سے قیادت و حکومت چھن گئی تھی۔ وہ خود غلام تھے، لیکن اپنے ہی قوم کے کم زوروں پر تصرّف پاتے تو تشدّد کرنے لگتے تھے۔ فساد، دنگا اور جھگڑے کرنا ان میں عام تھا۔ ان کے غرور و تکبّر کا یہ عالم تھا کہ اعلانیہ کہتے "ہم خدا کی اولاد ہیں کرۂ ارض پر ہم سے بہتر کوئی نہیں" اس تصوّر کے ساتھ وہ ہر بدفعلی کو جائز سمجھتے اور جب انھیں ان بداعمالیوں کی سزا ملتی تو کہتے "لوگو! ان دِنوں خدا کا ہاتھ تنگ ہے لہٰذا اپنے فرزندوں کو کَس رہا ہے۔" (نعوذ باللہ)

غرض کہ اخلاق و مروّت اور ایثار کا ان میں کوئی تصوّر نہ تھا۔ اُس دَور کی

کیفیت کی سب سے واضح تصویر خود قرآنِ کریم نے کھینچی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔
"جنھیں توریت عطا کی گئی تھی، پھر انھوں نے اس کے بار کو نہ اٹھایا (تعمیل نہ کی) ان کی مثال اس گدھے جیسی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں۔ جو لوگ خدا کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں، ان کی مثال بُری ہے اور بے شک خدا ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ کہہ دو کہ اے یہود، اگر تم دعویٰ کرتے ہو کہ تم ہی خدا کے دوست ہو اور دوسرے لوگ نہیں تو اگر تم سچے ہو تو ذرا موت کی آرزو تو کرو اور بے شک یہ ان اعمال کے سبب جو کر چکے ہیں، ہرگز (موت کی) آرزو نہ کریں گے خدا ظالموں سے خوب واقف ہے۔"
علاوہ ازیں ان کے اعمال کی گواہی الاعراف، التوبہ، بنی اسرائیل، البقرہ، الاحزاب اور متعدد سورتوں میں دی گئی ہے۔ دوسرا قابلِ ذکر مذہب عیسائیت تھا۔

## (۲) عیسائیت

یورپ، ایشیا اور افریقہ کے برِّ اعظموں میں اور رومیوں کا یہی مذہب تھا، لیکن اس وقت تک اس کی اصل تعلیم مفقود ہو چکی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ضروریات بڑھیں تو انھوں نے خود کو دین کے مطابق نہیں بلکہ دین کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا اور اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ایجاد و اختراع شروع کر دیں۔ انبیاؑ کی تاریخ اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ قوموں کی اکثریت نے ان کے ساتھ بے انصافیاں کیں۔ حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک جنھوں نے بھی انسان کی ہدایت و اصلاح کا فرض ادا کیا، مخالفت کا شکار ہوئے، جھٹلائے گئے، یہاں تک کہ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے، لیکن جس بے انصافی کا شکار جنابِ مسیحؑ ہوئے، اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ایک بڑی قوم نے آپ کی ماں جنابِ مریم پر اتہام لگایا اور دوسری بڑی قوم نے آپ کی لائی ہوئی تعلیم کو مسخ کر دیا اور وحدانیت کی تعلیم دینے والی اس ہستی ہی کو خدا کا بیٹا کہنے لگی۔ پھر یہ بات اس قدر عام ہوئی کہ ان کی اور جنابِ مریم کی حیثیتوں کو متعین کرنے کے لیے اسی مذہب میں متعدد فرقے پیدا ہو گئے جو

ہر وقت ایک دوسرے سے مصروفِ پیکار رہتے اور جبراً اپنے اپنے عقائد منوانے کی کوشش کرتے۔ اس اختلاف نے فرقہ بندی کو اس طرح سے جنم دیا کہ ہر گھر میں بحث و مباحث ہونے لگے۔ نتیجہ دشمنی کے سوا کچھ نہ نکلتا۔ یہی مذہبی دشمنی تھی جس کے سبب ۵۱۴ء میں عیسائیوں کے دو گروہوں میں وہ ہولناک جنگ ہوئی کہ ۶۵۰۰۰ مسیحیوں کو فارغ البلد ہونا پڑا۔ علاوہ ازیں وہ راہب اور پادری جو مسیحیت کے پرچار کے دعوے دار تھے، نظریاتی اختلاف اور باہمی نااتفاقی کے باعث آپس ہی میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ پھر یہ تعصب اتنا بڑھا کہ علمائے دین کا یہ طبقہ بھی دین سے بے پروا ہو کر دوسرے فرقے کے علماء کو جھٹلانے میں مصروف ہو گیا، یہاں تک کہ ایک گرجا کے راہب دوسرے فرقے کے گرجا کی بے حرمتی کرتے اور بہر صورت انھیں نیچا دکھانا چاہتے۔ اس ضمن میں جو بھی موقع ہاتھ آتا، اسے وہ ضائع نہ کرتے۔ یہ حال کسی ایک شہر یا علاقے کا نہ تھا بلکہ جہاں جہاں رومیوں کے زیرِ سایہ عیسائیت پھیل رہی تھی، یہی حال ہو رہا تھا۔ فرقوں میں تقسیم ہو کر یہ دین اپنی اصلیت کھو چکا تھا۔ کوئی بھی اصل اصول اور جنابِ مسیحؑ کی لائی ہوئی تعلیم سے واقف نہ رہا تھا۔ جن لوگوں میں تھوڑی بہت اصلیت باقی تھی، ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کے مصداق تھی۔ وہ دین کی یہ حالت دیکھتے ہوئے دل گرفتہ ہو کر اس کے اثرات سے بچنے کے لیے خود ہی سمٹ رہے تھے جو جہاں تھا سسک سسک کر وقت گزار رہا تھا۔ تاریخ یورپ کے مطابق تیسری صدی سے ساتویں صدی عیسوی تک یہ دین مکمل طور پر مشرکانہ رسوم/بت پرستی میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔ انتہا یہ کہ مسیحی جنابِ مسیحؑ اور حضرت مریم کے مجسمے بنا بنا کر عبادت کرتے اور ان سے مرادیں مانگتے تھے۔ اس زمانے میں تجرّد کی زندگی بھی عام ہو گئی تھی۔ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف اس کی خوشنودی کے لیے رہبانیت اختیار کر لی اور نہ صرف رہبانیت ہی بلکہ خود کو طرح طرح سے اذیتیں بھی دینے لگے۔ کسی نے زندگی کی ہر آسائش خود پر حرام کر لی، کسی نے خدا تک پہنچنے کے لیے خود کو گرجا کی حد تک محدود کر کے ہر دنیاداری

اور فرض سے قطع تعلق کر لیا اور کسی نے عمر بھر غسل نہ کرنے کی قسم کھا لی ۔ چونکہ یہ باتیں مذہب کا حصہ نہ تھیں لہٰذا روحانیت کی تکمیل کرنے کی بجائے یہ سب فعل انھیں خراب کرنے لگے ۔ کچھ وقت اور گزرا تو ان لوگوں کی اکثریت فطرت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے غلط راستے اختیار کرنے لگی ۔ اس کی گواہی قرآن حکیم نے اس طرح دی ہے "عیسیٰ ابن مریم کو مبعوث کیا، ان کو انجیل عطا کی، پس جن لوگوں نے ان کی پیروی کی، ہم نے ان کے دلوں کو راحت اور رحمت سے بھر دیا اور رہبانیت تو انھوں نے خود ایجاد کر لی ۔ ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا، مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انھوں نے خود ہی یہ بدعت نکالی، پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا، اسے ادا نہ کیا ۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہوئے تھے، اس کا اجر ہم نے ان کو عطا کیا، مگر ان میں سے اکثر فاسق لوگ ہیں ۔"

ابتدا میں عیسائیوں کے پاس نہ کوئی واضح طریقہ موجود تھا اور نہ شریعت. ازدواجی، سیاسی، معاشی، معاشرتی زندگی کا کوئی مکمل نمونہ بھی ان کے سامنے نہ تھا ۔ جوں جوں ان تمام شعبہ ہائے حیات میں کسی سنت اور کسی طریقے کی ضرورت پیش آتی گئی، مسیحی علماء بیرونی فلسفوں کی طرف متوجہ ہوتے گئے ۔ ان تمام بدفعلیوں و بداعمالیوں کا سبب یہی تھا کہ شریعتِ موسوی کو چھوڑ کر وہ شریعتِ عیسوی کی طرف آئے تو مکمل ہدایت نہ پا سکے ۔ تب وہ کبھی مصری اور ایرانی فلسفوں سے متاثر ہوئے تو کبھی سنیاسیوں اور جوگیوں کے ترکِ دنیا کو تقربِ الٰہی کا ذریعہ سمجھ بیٹھے ۔ اختلافِ رائے کا سبب بھی یہی بیرونی فلسفے تھے چنانچہ عین اسلام سے قبل ان کے متعدد فرقے تھے، یعقوبی، نسطوری، مارونی! ان سب کے عقائد جدا جدا تھے ۔ یعقوبی اس بات پر مصر تھے کہ جنابِ مسیحؑ ہی خدا ہیں ۔ اپنے اس اعتقاد کے تحت وہ باقی سب کو جھٹلاتے تھے ۔ پھر ملکانی یا کیتھولک تھے جن کا ایمان تھا کہ خدا تین میں سے تیسرا ہے ۔ وہ اپنے عقیدے کے پرچار کے لیے جنگ و جدل تک اتر آتے تھے ۔ مارونی عقیدے کے مسیحی جناب مریم کو بھی الوہیت میں شریک کرتے تھے ۔ قرآن نے ان سب کی تکذیب

فرمائی۔ ارشاد ہوا "وہ لوگ کافر ہو گئے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تین میں سے تیسرا ہے حالانکہ ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے"۔

## زرتشت

ان دو اہلِ کتاب قوموں کے علاوہ ایرانی بھی اپنے مذہب کو قدیم تصوّر کرتے تھے۔ وہ مدّت سے مظاہرِ قدرت کی پوجا کرتے تھے۔ ساتویں صدی قبلِ مسیح میں زرتشتی مذہب کا آغاز ہوا۔ ساتویں اور چھٹی صدی قبلِ مسیح کے درمیان آذربائیجان کے ایک مقام ارومیہ میں زرتشت نامی ایک شخص پیدا ہوا جس نے بیس برس کی عمر میں نبوّت کا دعویٰ کر کے ایک نئے مذہب کی تبلیغ شروع کی جس میں آگ کی پرستش کی جاتی تھی۔ یہ عقیدہ عام ہوا تو ملک بھر میں آتش کدے تعمیر ہونے اور آگ کی پوجا کی جانے لگی۔ اوّل اوّل یہ دین بڑی شدّت سے لوگوں پر اثر انداز ہوا، لیکن پھر کچھ ہی وقت گزرا تو آتش پرستوں کو اندازہ ہوا کہ ان کا معبود ان کا کوئی مسئلہ حل نہیں کر سکتا۔ تب جس تیزی سے یہ دین پھیلا تھا، اسی تیزی سے لوگوں کے دلوں سے اس کا یقین اٹھ گیا لیکن آگ کی عبادت کی جاتی رہی، محض ایک رسم کے انداز میں! لوگ آتش کدوں میں بھی جاتے اور آگ کا طواف بھی کرتے۔ چونکہ آگ کی پرستش کے سوا اس مذہب میں زندگی کے لیے کوئی ضابطہ وقاعدہ نہ تھا، لہٰذا جلد ہی یہ قوم روایات کا شکار ہو کر رہ گئی۔ اب جس کا جو دل چاہتا، وہی کرتا۔ خصوصاً اُمرا کے لیے نہ سزا کا خوف نہ کسی الزام کا ڈر۔ جو جہاں تھا، اپنی جگہ آزاد تھا۔ مانی کا مذہب اسی بے راہ روی کا نتیجہ تھا۔ اس دوران میں ایران میں متعدد مذاہب کا آغاز ہوا جو اتنی ہی جلد فنا ہو گئے۔ تیسری صدی عیسوی میں مانی کے مذہب نے ان سب کو چونکا دیا۔ یہ دین دراصل مجوسیت اور عیسائیت کا امتزاج تھا۔ اس دین میں گوشت کھایا جاتا، شراب سے اجتناب کیا جاتا اور نکاح کرنے کی اجازت نہ تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ انسان تجرّد کی زندگی گزار کر جلد فنا ہو جائے۔ مانی، بابل کے قریب پیدا ہوا۔ وہ خود حضرت عیسیٰؑ اور زرتشت کو تسلیم کرتا تھا اس لیے اس کے مذہب کے اصول ان دونوں مذاہب سے اخذ کیے ہوئے

تھے، لیکن یہ بھی ان کے مسائل کو حل کرنے میں بری طرح ناکام رہا۔ ایک جانب نکاح حرام تھا، پیدائش مسائل میں اضافہ کردیتی تھی تو دوسری جانب فطرت سے مجبور ہو کر لوگ عیاشیاں کرتے تھے۔ اس طرح یہ متمدن اور ترقی یافتہ قوم جنسی بحران میں مبتلا ہو کر ان حالات کا شکار ہوئی کہ اسے مانی کے قتل کے سوا کوئی راستہ نظر نہ آیا، لیکن اس مذہب کے اثرات عرصۂ دراز تک رہے۔ اسی عہد میں مزدک نے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔ غالباً نصف صدی سے زیادہ عرصے تک مانی کے مذہب کے اصول، نکاح نہ کرنا کا ازالہ کیا گیا۔ مزدک نے اپنے مذہب کا پہلا اصول "دولت اور عورت کسی کی ملکیت نہیں ہے" بیان کرکے ہر عورت کو ہر مرد کے لیے جائز قرار دے دیا۔ عیش پرست لوگوں نے اسے بڑی خوشی کے ساتھ لبیک کہا اور خود اس کی سرپرستی ایران کے حاکم قباد نے کی۔ انجام یہ کہ جنسی بے راہ روی عام ہوگئی۔ کھلے بندوں عیاشی ہونے لگی۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس دور میں عورت کا تقدس باقی نہ رہا تو بے جا نہ ہوگا۔ اس وقت ہر مرد کو اجازت تھی کہ جس وقت چاہے، جس گھر میں گھس جائے اور وہاں کے زن و مال پر قبضہ کرلے۔ اس طرح سے باپ بیٹی، ماں بیٹے اور بھائی بہن میں کوئی پہچان نہ رہی۔ یہ حالت ۴۸۷ء سے ۵۳۱ء تک رہی، یہاں تک کہ نوشیرواں عادل نے برسر اقتدار آتے ہی اس مذہب کے ایک لاکھ سے زیادہ پیروکاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، لیکن مدتوں اس کے اثرات امرا اور رئیسوں میں باقی رہے۔ ایرانی بادشاہ جشن نوروز پر باقاعدہ امرا کو اپنی اپنی بیٹیاں دربار میں پیش کرنے کا حکم دیتے تھے۔ نذرانے اور رشوتوں کے طور پر بھی عورتیں پیش کی جاتی تھیں۔ بہرکیف اس طرح نت نئے مذاہب ظہور پذیر ہوتے اور فنا ہوتے رہے، لیکن زرتشت کا مذہب خصوصاً آتش پرستی کی رسم جاری رہی۔ ساسانی حکمراں اسے سرکاری مذہب سمجھتے ہوئے باقاعدہ طواف کے لیے آتش کدے جاتے تھے اور پورا ایران ان کی تقلید کرتا تھا۔ ظہورِ اسلام تک یہی حالت رہی۔

## ہندومت اور بدھ مت

اس زمانے میں ہندوستان کے گرد و نواح میں ہندومت کا چرچا تھا۔

چین اور جنوبی ایشیا میں بدھ مت کا رواج تھا، لیکن ان کی حالت دیگر تمام سے بدتر تھی کیوں کہ باقی تمام اقوام میں انسانی تقسیم خود انسانوں کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ ہندوستان میں اونچ نیچ، ذات پات اور اعلیٰ و ادنیٰ کا تصور الہامی خیال کیا جاتا تھا۔ برہمن، چھتری، ویش اور شودر، یہ چار طبقے تھے جنھوں نے انسانوں میں زبردست بُعد پیدا کر دیا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ قادرِ مطلق نے برہمن کو اپنے سر سے، چھتری کو اپنے بازوؤں سے، ویش کو اپنی رانوں سے اور شودر کو اپنے پیروں سے پیدا کیا ہے لہٰذا برہمن بلند ترین ذات اور شودر پنچ تھے۔ برہمن سزا کا مستحق تصور نہ کیا جاتا تھا اور شودر کی کسی نازیبا بات پر اس کی زبان تک کاٹ دی جاتی تھی۔ غرض کہ اس فرق نے نہ صرف ایک بہت بڑے طبقے کی زندگی تباہ کی ہوئی تھی بلکہ دیگر تمام طبقوں میں بھی بہت سے نقائص پیدا کر دیے تھے۔ عام قاعدہ یہی ہے کہ زندگی میں ہر شعبے پر عقائد کا سب سے زیادہ اثر پڑتا ہے اور چھٹی صدی عیسوی میں اہلِ ہند کے عقائد میں شرک سرِ فہرست تھا۔ محض قادرِ مطلق کی ذاتِ اعلیٰ میں کسی کو شریک کرنا ہی نہیں بلکہ ان کے عقیدے میں متعدد معبود تھے۔ اگرچہ ان کی مذہبی کتابوں میں معبودوں کی تعداد ۳۳ درج ہے، لیکن ظہورِ اسلام سے عین قبل یہ تعداد ۳۳ کروڑ تک پہنچ چکی تھی کیوں کہ وہ ہر طاقت ور چیز کو معبود تصور کر لیتے تھے۔ اس ضمن میں نباتات، اشجار، دریا، پہاڑ، حیوانات اور پتھروں تک کی پوجا کی جاتی تھی اور یہ کہنہ رواج ان کے ایمان میں راسخ ہو چکا تھا۔ معاشرے میں شرک اور بت پرستی کو بنیادی حیثیت دے دی گئی تھی۔ اہلِ ہند کے طرزِ حیات کا یہ اثر عام ہوا تو بدھ مت کے پیرو بھی محفوظ نہ رہے۔ اگرچہ بدھ مت کی اصل تعلیمات میں شرک کا تصور تھا نہ بت پرستی کی اجازت تھی بلکہ بدھ مت کے بانی مہاتما بدھ نے تو محض ذات پات اور اونچ نیچ کے خلاف آواز بلند کی تھی، تمام انسانوں کے حقوق کو برابر قرار دیا تھا، رسم، رِیت اور انسانی قربانی سے نفرت کرتے ہوئے بے جان معبودوں کی عبادت سے روکا تھا۔ یہی سبب تھا کہ شروع میں اس دین نے ہندو دھرم کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں لیکن زیادہ وقت نہ گزرا کہ اس کے پیروکار بھی شرک کو رواج دینے لگے بلکہ خود

گوتم بدھ کے مجسمے کی پرستش کی جانے لگی۔ غرض کہ کرۂ ارض پر کوئی قوم بھی ایسی باقی نہ تھی جو مذہبی، سیاسی، معاشرتی یا کسی بھی اعتبار سے صالح کہلائی جانے کی مستحق ہو۔ چونکہ مذاہب کی شکل کم و بیش ہر قوم ہی میں مسخ ہو چکی تھی، لہٰذا ہر شعبۂ زیست میں بے راہ روی عام ہو گئی تھی۔ اس وقت خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرنے والا کوئی نہ رہا تھا۔ ہر طرف تاریکی اور ظلمت کا دَور دورہ تھا۔ آج عقلِ انسانی جہالت کا جس قدر تصوّر کر سکتی ہے، وہ تمام اقوام اس تصوّر سے بڑھ کر جاہل تھیں۔ انھیں زندگی کے مقصد کی خبر تھی نہ اپنے انجام کی پروا۔ ایسے میں انسانیت کسی نجات دِلانے والے کی طلب گار تھی۔ تاریخ ایک انقلاب چاہتی تھی، ایسا انقلاب جو ظلمت میں گھِرے ہوئے انسان کو روشنی کی کرن سے منزل کی راہ دِکھائے تاکہ یہ بھٹکا ہوا انسان اپنا کوئی مقام متعیّن کر سکے، اپنی کھوئی ہوئی منزل پا سکے لہٰذا اس مرتبہ خلّاقِ عالم نے، کسی خاص ملک یا محض خاص قوم کے لیے نہیں بلکہ کُل عالم کی ہدایت کے لیے ایک مکمّل قانون وضع کیا جو اپنی وسعت و ہمہ گیری کے سبب قدرت کی جانب سے آنے والا آخری پیغام تھا۔ ایک ایسا فیصلہ کُن قانون جس میں کسی ردّو بدل اور کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔ اِس پیغام کو دنیا تک پہنچانے کے لیے اس نے جس ہستی کا انتخاب فرمایا، وہ ہستی معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم کی تھی۔

# ولادتِ باسعادت سے قبولِ وحی کی استعداد تک

## ۹ ربیع الاوّل (۲۲ اپریل ۵۷۱ء)

یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائیت کو دنیا میں آئے چھٹی صدی اختتام تک پہنچنے والی تھی۔ دنیا معرفتِ نبوّت کو فراموش کر کے قعرِ مذلّت میں گری ہوئی تھی۔ کہیں کہیں کوئی فردِ حق کا متلاشی اور کسی معلّم و رہبر کا منتظر تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب توحیدِ حق کے سب سے بڑے معلّم نے اپنے وجودِ اطہر سے کائنات کو مشرّف فرمایا۔ عرب کے لوگ بڑے خوددار اور ہر معاملے میں بہت غیوّر تھے۔ انھیں کسی کا احسان لینا گوارا نہ تھا لہٰذا ابتدا ہی سے ان کا رواج تھا کہ جو بھی اہم واقعہ پیش آتا، اُسے شاعری اور نثری قصّوں میں ماہ و سال سمیت یاد رکھنے کے لیے نشان بنا لیتے تھے، یہاں تک کہ کوئی اس سے بھی زیادہ اہم بات ظہور میں آجاتی تھی۔ چونکہ قبل اسلام عام الفیل کا واقعہ سب سے اہم تھا اس لیے وہ اسی کے حوالے سے خاص واقعات یاد کرتے تھے۔ اس روشنی میں حضرت عبداللہ بن عبدالمطّلب کی وفات کے چھ ماہ اور عرب تاریخ کے مطابق عام الفیل سے ۵۵ یوم کے بعد ۹ ربیع الاوّل، بہ روز دوشنبہ، قبل از طلوعِ آفتاب عبدالمطّلب کے گھر میں وہ آفتاب طلوع ہوا جس سے کُل عالم کی ظلمت چھَٹ جانے والی تھی۔ سن عیسوی کے مطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کا مبارک دن تھا۔ فخرِ دو عالمؐ کی پیدائش کے وقت عبدالمطّلب خانۂ کعبہ میں مصروفِ عبادت تھے جہاں انھیں یہ خوشخبری ملی تو بہ نفسِ نفیس

تشریف لائے۔ غم وخوشی کی ملی جُلی کیفیت تھی۔ سمجھ نہ پائے کہ خوش ہوں یا افسردہ! جوان بیٹے سے بچھڑ جانے کا غم کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگا، مگر جس محرومی سے خود دوچار تھے۔ اب اس کم سِن کو اس سے بچانا چاہتے تھے لہٰذا اسے سینے سے لگائے ہوئے بیت اللہ میں آئے اور مالکِ حقیقی سے دعا کی "اے ربِّ کعبہ! اسے عزّت عطا کر۔"

## اسمِ مبارک

اب اسمِ مبارک کا مسئلہ تھا۔ پکارنے کے لیے تو کوئی بھی خوب صورت لفظ دیا جا سکتا تھا، لیکن یہاں تو جذبات ہی کچھ اور تھے۔ عبدالمطلب کا بس نہ چلتا تھا کہ دنیا بھر کا حسین نام اسے بخش دیتے۔ عرب کا کہنہ رواج تھا کہ پیدائش سے سات یوم بعد دعوتِ طعام کے وقت نام کا اعلان کیا جاتا تھا۔ شیخ مکہ عبدالمطلب کے یہ سات یوم غور وفکر کی نذر ہوئے تھے۔ اس تمام عرصے میں انھوں نے بڑا انوکھا نام تجویز کیا تھا جسے سُن کر خود اہلِ مکّہ چونک گئے تھے۔ ساتویں دن ضیافت کا اہتمام تھا جس کے بعد انھوں نے اعلان کیا "اے قریش! میں نے اپنے پوتے کا نام محمّدؐ رکھا ہے۔"

مروجہ تمام ناموں سے مختلف، لہجے اور معنی میں الگ تھلگ، ایک خاص شان لیے یہ نام جس نے بھی سُنا، متعجب ہوا اور طرح طرح سے استفسار ہونے لگے۔

خود عبدالمطلب کے فرزند بھی متجسّس ہوئے تو انھوں نے اہلِ مکّہ اور اہلِ خاندان سب کو ایک ہی جواب دیا "میں چاہتا ہوں کہ میرے پوتے کی ستائش تمام دنیا کرے۔"

اس دن اکثر لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹ گئے، لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ نام اسی ہستی کے لیے موزوں و مناسب تھا کیوں کہ پھر ستائش کرنے والوں میں تعجب کرنے والے بھی شامل تھے۔

**رضاعت اور بچپن کے اہم واقعات:** ایامِ رضاعت میں بھی والدہ ماجدہ کے علاوہ دو خواتین کو دودھ پلانے کی عزّت نصیب ہوئی۔ سب سے پہلے خود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی والدہؓ ماجدہ جنابِ آمنہ نے دودھ

پلایا۔ پھر ابولہب کی لونڈی ثوبیہ نے اور اس کے بعد حلیمہ سعدیہ نے یہ فخر حاصل کیا۔ عرب کا قدیم ترین رواج تھا کہ معززین اپنے نومولود بچوں کو دودھ پلانے والی دایا کے سپرد کر کے کسی پُر فضا مقام پر بھیج دیا کرتے تھے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ ان بچوں کی صحت ہی پر بڑا خوش گوار اثر پڑتا بلکہ ذہنی طور پر بھی نشوونما بہتر ہوتی تھی۔ یہ رضاعی مائیں سال میں دو مرتبہ ان بچوں کو ان کے والدین کے پاس ملانے لاتی تھیں۔ اس کی وجوہ دو تھیں۔ اوّل تو بچپن کے ابتدائی چند سال اقربا سے الگ گزارنے کے بعد وہ بنا کسی سہارے کے کام کے قابل بھی ہو جاتے اور قوتِ فیصلہ سے بھی محروم نہ رہتے۔ دوسری بات یہ کہ کھُلی اور پُر فضا جگہ میں رہتے ہوئے ان تمام امراض سے محفوظ رہتے جو بند اور نشیبی علاقوں میں عام ہوتے تھے۔ عربوں میں بیٹوں کی تربیت کا زرّیں اصول یہی تھا جس کے سبب ان کی تاریخ دلیروں کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ ان کا ایک ایک جوان مخالف فوج کے پورے دستے پر غالب آ جاتا تھا۔ عبد المطّلب نے بیٹوں کی پرورش بھی اس طرح سے کی تھی اور اب پوتے کو بھی حلیمہ سعدیہ کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ اہلِ مکّہ کے لیے کوئی نئی خاتون نہ تھیں، قریش کے متعدّد بچوں کو دودھ پلا چکی تھیں اور حمزہ بن عبد المطّلب بھی انھی کے رضاعی فرزند تھے۔ اب اسی گھرانے کا ایک بچّہ اور ملا تو وہ بہ خوشی اُسے لے گئیں۔ وہ اپنے دستور کے مطابق سال میں دو مرتبہ انھیں مکّے لاتیں۔ جب ایامِ رضاعت تمام ہوئے اور وہ انھیں عبد المطّلب کے حوالے کر دینے کے لیے واپس لائیں تو انھیں علم ہوا کہ مکّے میں ایک وبا پھیلی ہوئی ہے جس کی لپیٹ میں متعدّد بچّے آ چکے تھے اور عبد المطّلب اپنے پوتے کو اس سے بچانا چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ عبد المطّلب نے انھیں پھر حلیمہ سعدیہ کے ساتھ قبیلۂ بنو سعد بھیج دیا۔ عمرِ مبارک کا یہی وہ حصّہ تھا جب شقِّ صدر کا واقعہ پیش آیا۔ دو برس کا مزید عرصہ گزارنے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) حضرت آمنہ کے سایۂ عاطفت میں آ گئے، لیکن قدرت کو فخرِ دو عالمؐ کے لیے اپنے سوا کسی کا سہارا منظور نہ تھا کہ چھ برس کی عمر میں جب آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ان کے ساتھ یثرب سے مکّے واپس آ رہے تھے تو مقامِ ابواء میں حضرت آمنہ کا انتقال ہو گیا۔

اس وقت اُمّ ایمن آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو لے کر واپس آئیں تو اس گنجِ گراں مایہ کو عبدالمطّلب نے سمیٹ لیا جو انھیں تمام دنیا کی دولت سے زیادہ عزیز تھے۔ اس وقت تو کسی کو بھی علم نہ تھا کہ مکّے کے سردار اور کعبے کے متولّی عبدالمطّلب کے زیرِ سایہ پلنے والا یتیم و یسیر بچّہ ہی وہ نجات دہندہ ہے جو دنیا کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لائے گا اور آدمؑ کی گم کردہ راہ اولاد کو صراطِ مستقیم سے آشنا کرے گا لیکن عبدالمطّلب کی بے پناہ محبّت اور امتیازی سلوک دیکھ کر لوگ چونک ضرور جاتے تھے۔ انھوں نے عبداللہ کی اس امانت کو یوں سمیٹ لیا تھا جیسے وہی ان کی متاعِ حیات ہوں۔ شفیق دادا کی محبّت کا وہ عالم تھا کہ اس پوتے کو چند لمحوں کے لیے بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ دن میں ہی نہیں بلکہ رات میں بھی نیند سے جاگتے تو پہلے اس آفتابِ دو عالم کے رخِ انور کو شفقت سے دیکھتے کہ آیا بے آرام تو نہیں ہے۔ دادا کی محبّت کے عجیب عجیب انداز تھے جو مختلف تواریخ میں درج ہیں۔

مکّے کے لڑکے ہر شام جمع ہو کر نت نئے کھیل کھیلا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عبدالمطّلب نے دیکھا کہ ان کا پوتا نہ گھر کے اندرونی حصّے میں موجود تھا نہ میدان میں۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ اس شام تو کسی نے بھی انھیں نہیں دیکھا۔ تب وہ بے چین ہو گئے۔ اس وقت سب نے حیرت سے دیکھا کہ مکّے کا شیخ اور کعبے کا جلیل القدر متولّی اپنے پوتے کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ کبھی وہ ادھر جاتے کبھی اُدھر۔ ایسا لگتا تھا کہ نہ خدّام پر اعتماد ہے نہ فرزندوں پر بھروسا۔ گاہے پکارتے، گاہے دیکھتے ہوئے گھر سے حرم تک کے متعدّد چکّر لگا ڈالے۔ اگرچہ تھوڑی دیر کے بعد ہی ایک بڑے سے پتھر سے ٹیک لگائے ہوئے کم سن پوتا نظر آ گیا تو وہ مطمئن ہو گئے، لیکن ان کی بے قراری نے سب کو احساس دلا دیا کہ وہ محبّت اور شفقت جس سے دیگر بچّے محروم ہیں، وہ ان کے دل میں آمنہ کے لال اور عبداللہ کے جگر گوشے کے لیے موجود ہے۔

غالباً یہی زمانہ تھا جب ان کے چند اونٹ گم ہو گئے۔ مکّے کے لڑکے ایسی خدمت کے لیے ہر دم تیار رہا کرتے تھے اور یہ تو شیخ مکّہ کے اونٹ تھے۔ جونہی

یہ خبر مشہور ہوئی، وہ ٹولیوں میں بٹ کر مختلف راستوں پر روانہ ہو گئے۔ اس بار پہلی مرتبہ پوتے نے اجازت طلب کی تو دادا انکار نہ کر سکے، لیکن ان کے چلے جانے کے بعد محسوس ہوتا تھا کہ کوئی قیمتی شئے گم ہو گئی ہے۔ کبھی استفسار کرتے، کبھی دل تھام لیتے، کبھی بیٹھ جاتے، کبھی ٹہلنے لگتے۔ کافی دیر گزر گئی، جانے والے واپس نہ آئے۔ تب وہ خود ہی چل دیے۔ اس وقت ان کے قدم کعبے کی طرف اُٹھ رہے تھے، آنکھوں میں نمی تھی اور جذبات الفاظ میں ڈھل رہے تھے۔ "اے ربِّ کعبہ! میرے محمدؐ کی حفاظت کرنا!"

دیکھنے والے حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ مکّے کے قوی ہیکل رئیس اور وہ پختہ دل انسان جو کبھی کسی مصیبت یا بحران سے نہ گھبراتے تھے، کسی سانحے سے مایوس نہ ہوتے تھے اور دشمن کی کثیر تعداد فوج کی خبر انھیں ہراساں نہ کر سکتی تھی، آج کون سے جذبے کا شکار ہو گئے ہیں! تھوڑی دیر کے بعد ہی آپ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) شتر سمیت لوٹ آئے تو دادا نے تو انھیں دیکھا ان کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا اور آنکھوں میں تشکّر کے اشک چھلک آئے۔ انھوں نے بازو پھیلائے اور دونوں جہاں کی اس نعمت کو سمیٹ لیا۔

یہ منظر دیکھ کر قریش کے معزّز سردار ہنس دیے اور بولے "شیخ مکّہ! آپ کا اپنا فرزند بھی اسی عمر کا ہے، آپ اس کی اتنی پروا نہیں کرتے، مگر پوتے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ آخر کیوں؟"

عبدالمطّلب ان کے سوال کا جواب نہ دے سکے اور شاید اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ انھوں نے بس فرطِ محبّت سے پوتے کو سینے سے لگا یا اور بولے "اے دادا کی جان! اب میں تجھے کہیں نہ جانے دوں گا!"

پھر یہ واقعہ بھی تاریخ کی کتابوں میں درج ہے کہ قریش کے تمام قبائل کے معزّزین کی محفل جمی ہوئی تھی۔ آئے دن وہ کسی نہ کسی مسئلے کا حل طلب کرنے کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ اس بار بھی کچھ یہی انداز تھا۔ عبدالمطلب حسبِ دستور اپنی مسند پر جلوہ افروز تھے اور معزّزین قریش علی قدرِ مراتب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تبھی رحمت و عظمت کا کم سن پیکر دوڑتا

ہوا آیا اور عبدالمطلب کے سامنے مسندِ خاص پر بیٹھ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایسی محفلوں میں بیٹھنے کی اجازت کسی بچّے کو نہ دی جاتی تھی لہٰذا کئی آوازیں بلند ہوئیں، تنبیہانہ نظریں اٹھیں، لیکن ان سب کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی معمّر دادا نے پوتے کی پیٹھ پر مشفقانہ ہاتھ پھیرا اور بولے "اسے مت روکو! یہ خود کو بزرگ سمجھتا ہے اور میرا خیال بھی ایسا ہی ہے۔"

قریش پھر حیران ہوئے، لیکن اس کے بعد مسلسل واقعات انھیں چونکاتے رہے یہاں تک کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) آٹھ برس کے ہو گئے اور دادا بیاسی سال کی عمر پاکر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کا منصب و مقام ابو طالب کو ملا۔

ابو طالب (عبدِ مناف) عبداللہؓ کے حقیقی بھائی تھے، یعنی ایک ماں اور ایک باپ کے فرزند اور اس وقت عبدالمطلب کے جوان بیٹوں میں لائق اور فائق بھی! لہٰذا مکّے کے سردار اور کعبے کے متولی منتخب کیے گئے۔ اس عظیم منصب کے ساتھ ہی عبدالمطلب نے دمِ آخر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پرورش کی ذمّے داری بھی انھی کے سپرد کی تھی۔ جسے انھوں نے تاحیات نبھایا اور بھتیجے کو کبھی خود سے جدا نہ کیا۔ زندگی میں بڑے بڑے کٹھن دور آئے، صبر آزما مشکلات نے حوصلہ آزمایا، لیکن اس مردِ آہن نے سب کا مقابلہ کیا اور انھیں اپنی حفاظت و حمایت سے محروم نہ کیا۔ ابو طالب کثیر الاولاد تھے، اپنے بچوں کے لیے بھی ایک چاہنے والے شفیق باپ تھے، لیکن بھتیجے کو ان سے بڑھ کر چاہتے تھے۔ پھر چند برس کے بعد ہی وہ واقعہ پیش آیا جس نے ان کی محبت کے انداز بدل دیے۔ پھر ان کی چاہت میں والہانہ پن اور بے تابی آ گئی۔

**سفرِ شام:** یہ واقعہ اس وقت کے بارے میں مشہور ہے جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بارہ سال کے ہوئے۔ ان دنوں ابو طالب بہ غرضِ تجارت شام کی طرف سفر کرنے والے تھے۔ تجارتی سفر میں وہ عموماً کسی نہ کسی فرزند کو لے جاتے تھے تاکہ تربیت کا فرض بھی ادا ہو جائے اور بیٹا تجارت میں طاق

تھی۔ اس بار ساتھ جانے کی خواہش کا اظہار بھتیجے نے کیا تو وہ انھیں ساتھ لے کر روانہ ہوگئے۔ جب یہ لوگ بصریٰ پہنچے تو ان کی ملاقات بحیرا نامی ایک راہب سے ہوئی جو زیادہ تر وقت عبادت کرکے گزارتا تھا۔ اسی جگہ مکّے کے اس قافلہ نے قیام کیا تو بحیرا نے انھیں دیکھا۔ پھر از راہِ عزت شیخ مکّہ کو مدعو کیا جن کے ساتھ بارہ سالہ لڑکے کو دیکھ کر اس نے حیرت سے رشتے کی وضاحت طلب کی اور بولا "شیخ مکّہ! تم اپنے بھتیجے کو یہودیوں کے ملک میں نہ لے جاؤ کیوں کہ ان کا ظہور ہونے والا ہے۔ اگر یہودیوں نے انھیں پہچان لیا تو ایذا پہنچانے کے درپے ہو جائیں گے"۔

اتنا سننے کے بعد ابوطالب نے اپنے معتبر غلام کے ساتھ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو مکّے واپس بھیج دیا اور خود آگے روانہ ہو گئے۔ اس غلام کا نام کسی بھی مستند تاریخ میں درج نہیں ہے۔ اس واقعے کو مورّخین کی اکثریت نے کم و بیش انھی الفاظ میں درج کیا ہے، لیکن قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصور پوری نے اپنی مشہور کتاب رحمت اللعالمین جلد اوّل میں قرآنِ مجید کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس زمانے میں یہودی خود رسولِ موعود کے منتظر رہا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ انھی کے آنے پر یہودیوں کو فتح و نصرت حاصل ہوگی اور یہ اعتقاد انھیں بعثت تک رہا۔ اس کا مطلب ہے کہ بحیرا راہب کا واقعہ فرضی ہے ورنہ یہودی اگر انھیں پہچان جاتے تو اپنے اعتقاد کے مطابق فتح و نصرت کا دیوتا سمجھتے ہوئے ایمان لے آتے۔ نتیجہ یہ کہ راہب والی داستان کو موصوف نے حقیقت سے بعید قرار دیا ہے۔ بہرکیف ابوطالب آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا خاص خیال رکھتے۔ پھر عُمر کے ساتھ ساتھ بے شمار واقعات ظہور میں آتے گئے اور ان کی لگاوٹ بڑھتی گئی۔

**ملائک کی صفت**: ایک مرتبہ خانۂ کعبہ کی صفائی اور مرمّت ہو رہی تھی۔ معززینِ عرب اس خدمت میں پیش پیش تھے۔ کام چونکہ بہت تھا لہٰذا کم سن لڑکوں کو بھی شامل کر لیا گیا جو پتھر اور مٹّی لانے پر مامور ہو

گئے۔ لڑکے بہ خوشی یہ کام کر رہے تھے، لیکن ٹوکری میں مٹی اور سنگریزوں کا وزن بہت زیادہ تھا لہٰذا ان سب نے اپنے اپنے تہ بند کھول کر کنڈلی بنالی اور سر پر رکھ لی اور اس پر ٹوکریاں رکھ رکھ کر لے جانے لگے۔ ان کم سِن لڑکوں میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی شریک تھے۔ بوجھ ان کے پاس بھی بہت تھا، لیکن وہ تہ بند کھول دینے کے لیے تیار نہ تھے کیوں کہ ایسا بے باکانہ کام انھوں نے کبھی نہ کیا تھا۔ شرم و حیا ان کی وہ صفت تھی جس کی برابری کوئی بھی نہ کر سکتا تھا۔ اس وقت بھی وہی حجاب غالب تھا۔ اتنے میں آپ کے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہم عمر بھی تھے۔ ایسے میں انھوں نے سوچا ان کے تہ بند کی کنڈلی بناکر سر پر رکھ دیں، لیکن ابھی انھوں نے ہاتھ لگایا ہی تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بے ہوش ہو کر گر گئے۔

**تنصیبِ حجرِ اسود:** یہی زمانہ تھا جب تنصیبِ حجرِ اسود کا موقع آیا جس نے قریش سرداروں کے درمیان سخت کشمکش پیدا کر دی۔ واقعہ یہ تھا کہ عرصۂ دراز سے خانۂ کعبہ کی مرمت نہ ہوئی تھی جس کے باعث دیواریں بدرنگ اور بوسیدہ ہو گئی تھیں۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ بہر طور اس کی مرمت کی جائے چنانچہ دستور کے مطابق ادنیٰ و اعلیٰ پیر و جواں سبھی جمع ہو گئے اور کعبے کی درستی کو ذریعۂ ثواب تصور کرتے ہوئے مصروف ہو گئے۔ ان دنوں مکے میں بڑے جوش کا عالم تھا۔ سبھی کسی نہ کسی انداز سے حصہ لے رہے تھے، یہاں تک کہ ہفتوں کی محنت کے بعد اس مقدس گھر کی مرمت مکمل ہوئی، مگر جب حجرِ اسود کو نصب کرنے کا موقع آیا تو ہر فرد کی آرزو تھی کہ یہ اعزاز اسی کو نصیب ہو۔ خواہش لفظوں میں ڈھلی تو بحث و تکرار شروع ہو گئی۔ وہ سب اس مقدس گھر کے بارے میں اپنی اپنی خدمات گنوا کر خود کو اس کام کا حق دار گردان رہے تھے۔ اس طرح باپ کے مقابلے پر بیٹا اور چچا کے سامنے بھتیجا آ گیا۔ لگتا تھا کہ حجرِ اسود کو نصب کرنے کے مقدس کام میں وہ سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ معاملہ طول پکڑتا جا رہا تھا اور کوئی فیصلہ نہ ہو پاتا تھا، حتیٰ کہ وہ اپنی فطرت کے مطابق

قتل و غارت پر اتر آئے۔ اسی وقت عبدالدار نے ایک بکرا ذبح کیا، اس کے خون سے ایک پیالا بھرا اور جھگڑے کو مزید بڑھانے کے لیے بد شیلے اور مغلوب الغضب عربوں کے درمیان کھڑے ہو کر بہ آوازِ بلند کہا "بہادرو! خون چاٹ کر عہد کرو کہ یہ مقدّس کام تم ہی انجام دو گے! پھر سب باری باری مقابلہ کرو۔ جو جیت جائے وہی تنصیب حجرِ اسود کا مقدّس کام سرانجام دے گا۔"

یہ سنتے ہی قبیلے کے بوڑھوں، جوانوں اور نوجوانوں نے خون کے بھرے ہوئے پیالے میں انگلیاں ڈبو ڈبو کر قسم کھائی "معبودِ اعظم ہبل کی قسم! حجرِ اسود کو صرف میں ہی نصب کروں گا، خواہ مجھے ان سب کو تہِ تیغ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔"

یہ الفاظ سب نے دُہرائے، اسی دَوران میں کچھ پُرجوش جوان کھڑے ہو گئے اور نیاموں سے تلواریں نکل آئیں۔ قریب تھا کہ مقابلہ شروع ہو جاتا کہ ایک دَم قریش کا معمر ترین شخص ابو اُمیہ بن مغیرہ کھڑا ہوا اور ہاتھ بلند کر کے چلّایا "بھائیو! لڑائی بند کرو۔ معاملہ کل پر ملتوی کر دو۔" سب نے اسے تعجّب سے دیکھا۔ تب اس نے اپنی بات جاری رکھی اور بولا۔ "کل صبح ہم میں سے جو شخص بھی سب سے پہلے حرم کے باب الصّفا سے اندر داخل ہو گا، وہی اس کا فیصلہ کرے گا اور ہم سب جان و دل سے اس فیصلے کو منظور کر لیں گے۔"

بات بڑی معقول اور صلح پسندانہ تھی۔ ہر چند کہ کچھ لوگوں کے تماشا دیکھنے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی، لیکن اکثریت نے اسے پسند کیا اور لڑائی سے ہاتھ روک لیے۔ اس وقت ہر فرد اپنے دل میں یہ عزم کر کے چلا گیا کہ کل صبح سب سے پہلے وہی باب الصّفا سے حرم میں داخل ہو گا۔ یہ رات بڑی ہی صبر آزما تھی۔ وہ کئی کئی بار اُٹھ کر آسمان کی جانب دیکھتے کہ سیاہی چھٹے تو حرم میں جائیں، لیکن یہ تقدیر کی چیرہ دستی نہیں بلکہ قادرِ مطلق کا عجیب کرشمہ تھا اور حتمی فیصلہ بھی کہ اس صبح حرم میں باب الصّفا سے داخل ہونے والا وہی نوجوان تھا جو ہر شب کے آخری حصّے میں سیاہی چھٹنے سے قبل

تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر قدرت کا مشاہدہ اور کائنات پر غور و فکر کیا کرتا تھا۔
دوسری صبح مکے کے شرفا بعجلت تمام حرم میں داخل ہوئے تو انھوں نے ہاشمی خاندان کے اس جوان کو دیکھا جس کے انداز انھیں چونکا دیا کرتے تھے اور جس کے دادا نے اُسے اچھوتا اور نرالا نام دیا تھا تاکہ دنیا بھر کی ستائش کا مرکز رہے۔
جب سے اب تک عمر کے ہر دور میں وہ اپنے اعلیٰ اطوار اور پاکیزہ انداز سے خود کو اس ستائش کے قابل ثابت کر رہا تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ اہلِ مکہ دل کی گہرائیوں سے اس جوان کی خوبیوں کے معترف تھے۔ فیصلے کے مطابق وہ سب، ان کے گرد جمع ہو گئے اور اپنا مسئلہ ان کے سامنے پیش کر دیا جسے انھوں نے یوں سلجھا دیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے معززینِ مکہ کی زبانی گزشتہ روز وقوع پذیر ہونے والے تنازع کے بارے میں سنا پھر رفعِ شر کے لیے ایک چادر طلب کی، حجرِ اسود کو اپنے مبارک ہاتھوں سے اس پر رکھا اور ان تمام سرداروں کو یہ چادر پکڑ کر اٹھانے کی تاکید کی۔ اس فیصلے نے ان کو ایک بار پھر چونکا دیا۔ وہی سردار جو گزشتہ روز ایک دوسرے کو مار ڈالنے کے درپے تھے، اب بہ اتفاق اس چادر کو پکڑے ہوئے حجرِ اسود کو بلند کرنے کی سعادت پر مسرور تھے اور ہر جانب "احسنت و مرحبا" کے نعرے گونج رہے تھے۔ جب یہ پتھر اصل جگہ پر پہنچ گیا تب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے بہ نفسِ نفیس نصب فرما دیا اور ایک بڑی ہولناک لڑائی ہوتے ہوتے رک گئی۔ اس وقت سوائے چند مفسدوں کے سبھی اس فیصلے کو بہترین سمجھ رہے تھے۔ ہر گھر میں ابنِ عبداللہ ﷺ کے تذکرے ہو رہے تھے۔ ایسے واقعات پیش آتے گئے۔ قریش کی توجہ اور ابو طالب کی لگاوٹ بڑھتی گئی۔ وقت گزرتا رہا، یہاں تک کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جوان ہو گئے۔

**نورانی پیکر:** عرب کے لڑکے جوان ہوتے تو ان کے رنگ ہی عجیب ہوتے، چال میں اکڑ ہوتی، نظروں میں مستانہ پن اور تبسم میں بے باکی آجاتی۔ وہ جدھر سے بھی گزرتے، کوئی نہ کوئی کارنامہ انجام دینا چاہتے، گویا ان کے لیے عالمِ شباب بھرپور بہار کا زمانہ ہوتا۔ ویسے بھی اس ماحول میں کوچہ کوچہ، گلی گلی شراب خانے اور

قہوہ خانے قائم تھے نہ وہاں بوڑھے اور جوان سبھی چند گھنٹوں کی مستی کے لیے ایمان بیچ دیتے تھے۔ تسکینِ نفس کے لیے انھیں ہر نقصان گوارا تھا۔ پھر یوں بھی ہر گام پر حُسنِ بے پردہ دعوتِ نظارہ دیتا تو قدم بہک جاتے اور اخلاق کی ہر بندش توڑ دینے کو دل چاہتا۔ یہاں دیدار کی گدائی کا سوال نہ تھا بلکہ دعوتِ عام تھی۔ گھر گھر ہوس کے وہ جال بچھے ہوئے تھے کہ جو ایک بار پھنس جاتا، نفس کی رغبت اسے ہوش نہ لینے دیتی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سکون کے لیے شراب و شباب ضروری تصوّر کیے جاتے۔ ان کے سوا سکون کا کوئی ذریعہ ہی نہ تھا۔ ایسے بہکے ہوئے ماحول میں تمام بُرائیوں سے دامن بچا کر گزر جانا، بہ ذاتِ خود ایک معجزہ تھا۔ کردار کی بلندی اور پاکیزگی یہی ہے کہ بُرائی کا ہر موقع میسّر ہو اور اسے نظر انداز کر دیا جائے۔
عبداللہ کے فرزندؐ ایسے ہی جوان تھے۔ شباب ان پر بھی آیا تھا، لیکن باوقار، سنجیدہ اور متین شباب! عرب کے تمام تر جوانوں سے بالکل مختلف اور جداگانہ انداز۔ نورانی پیکر میں وہ تقدّس جسے دیکھ کر بزرگی بھی شرمائے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مکّہ معظّمہ ہی میں رہتے تھے، لیکن یہاں کی محفلیں آپ کو متاثر نہ کر سکتی تھیں، نہ دُختِ رَز اور کھلے بندوں بکنے والا حُسن آپ کے دامن کو آلودہ کر سکا تھا، نہ عربوں کی باہمی جنگ و جدل اور قتل و غارت گری کے دلچسپ تماشے آپ کو متوجّہ کر پائے تھے اور نہ صدیوں سے قائم رسم رواج اور مذاہب نے راغب کیا تھا۔ بچپن سے جوانی تک ایک دو بار نہیں بلکہ سینکڑوں مرتبہ ایسے مواقع آئے جب مکّے کے شراب خانوں، آراستہ و پیراستہ قحبہ خانوں، لہو و لعب کے میدانوں، رقص و سرور کی محفلوں، شیخی خورے شعراء اور خوش مدی داستاں گو افراد نے اس قریشی جوان کو اپنی طرف متوجّہ کرنا چاہا۔ اتفاقاً ہی نہیں بلکہ خاص ارادے کے ساتھ منصوبے بنا بنا کر اپنی محفلوں میں شریک کرنا چاہا، لیکن یہ سعید فطرت انسان، خانوادۂ ابراہیمی کے انوکھے جوان ان سب سے اس طرح بچ کر نکل گئے کہ دیکھنے والے دیکھتے اور پکارنے والے پکارتے ہی رہ گئے۔

**جہاں بانی کا آغاز:** یہ تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جوانی کے ابتدائی سال تھے جب اہلِ مکّہ کی ہزار ہا بُرائیوں کے باوجود آپؐ کا دردمند دل اُن کی

حالت پر کڑھتا تھا۔ ان کی باہمی جنگیں پھر ان کے جانی اور مالی نقصانات کا احساس دلاتیں۔ کمزوروں کے دُکھوں پر ان کی نظر جاتی تو ٹھٹک کر رہ جاتی لیکن جوں جوں آپؐ شعور کی عمر کو پہنچتے رہے، ان کے مسائل کے سدِّ باب کے طریقوں پر غور و فکر کرنے لگے۔ اس وقت ان کی پہلی بالغ نظر اپنے کثیر الاولاد چچا پر پڑی۔ شیخِ مکّہ اور کعبہ کے متولّی ہونے کے سبب ان کی ذمّے داریاں تو بہت تھیں مگر تجارت کے لیے وقت کم ہی ملتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ گھر میں مفلسی کا دَور دَورہ تھا۔ عیال کی کثرت اور مال کی کمی بڑی تنگی پیدا کر دیتی تھی۔ ایسے میں انھیں لازماً کسی سہارے کی ضرورت تھی لہٰذا تمام حالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ان کے صالح بھتیجے نے شُبانی شروع کر دی۔ بہ ظاہر تو یہ چچا کی مدد اور ذمّے داریوں میں حصّہ بٹانا تھا جسے وہ خود اپنا فرض تصوّر کر رہے تھے، لیکن اس وقت شاید انھیں خود بھی احساس نہ تھا کہ شُبانی تو دراصل انبیائے اکرام کی میراث تھی جو بہر صورت انھیں بھی کرنا تھی اور اس راہ پر انھیں حالات نہیں، ان کا احساسِ ذمّے داری نہیں بلکہ قدرت خود ہی لے آئی تھی۔ جلیل القدر انبیاؑ میں سے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت داؤدؑ، جنابِ موسیٰؑ اور جنابِ عیسیٰؑ میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس نے ابتدا میں بکریاں نہ چرائی ہوں۔ اب عبداللہ کے فرزند نے بھی یہی شغل اختیار کیا تو مکّے کے معزّزین بھی حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔ کچھ نے کہا کہ شیخِ مکّہ کے بھتیجے نے گلّہ بانی شروع کر دی ہے اور گلّہ بانی قریش سرداروں نے کبھی نہ کی تھی۔ ان کے خیال میں یہ غلاموں کا کام تھا، آقا اور آقازادوں کا نہیں، لیکن تعجب کرنے والے اس بات سے ناواقف تھے کہ گلّہ بانی تو دراصل جہاں بانی کا آغاز تھا، دنیا کو مستعدی اور مشقّت کا درس دینے کی ابتدا تھی۔ عملِ پیہم، فرض شناسی، چوکسی اور خدمتِ خلق کا ثبوت تھا۔ اس زمانے میں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) شب و روز محنت کرتے۔
اس کام میں معزّزینِ مکّہ کے تحیّر آمیز استفسار اور شفیق چچا کی مخالفت، کوئی چیز بھی رکاوٹ نہ بن سکی بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ آپ آمدنی بڑھانے کے بارے میں سوچتے تاکہ ضرورت مندوں کی مدد بھی کی جا سکے اور فراغت کا وقت

مصروفیت کی نذر ہو سکے۔

## صادق وامین

کچھ وقت اور گزرا تو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے ایک نئی مصروفیت تلاش کرلی، وہ یہ کہ مکّے کے بڑے بڑے تاجروں کے ساتھ معمولی نفع پر کاروبار شروع کر دیا۔ غالباً یہی زمانہ تھا جب مکّے کے عام اور خاص تمام لوگوں کو اس انوکھی فطرت کے جوان کو بڑے قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ جوں جوں وہ انھیں آزماتے گئے، ان کی عظمت کے معترف ہوتے گئے کیوں کہ ہر کاروبار اور سودے کے بعد انھیں اندازہ ہوتا کہ وہ تمام تاجروں سے مختلف فطرت کے مالک، عہد کے پابند اور خود اپنے مال کی کمی یا نقص کو واضح کر کے سودا کرنے والے تاجر تھے۔ اس سے قبل بھی تجارت عام تھی، لیکن ایسا کوئی رواج نہ تھا۔ عرب کے تاجر تو گاہک کو بہر طور پھانس کر صرف مال فروخت کرنے کی سوچتے اور چلتے بنتے تھے لہٰذا اب ان کے پاکیزہ اطوار نے آہستہ آہستہ ان لوگوں کو اچنبھے میں ڈال دیا۔ جو بھی ایک بار معاملہ کرتا، ان کے حُسنِ کارکردگی اور شریفانہ صحبت سے اس درجہ متاثر ہوتا کہ نہ صرف خود ہی بار بار شرکت چاہتا بلکہ دوسروں کو بھی راہ دکھاتا۔ تب دوسرے لوگ خود ہی عاجزانہ پیشکش کرتے۔ اس طرح اس کاروبار میں اضافہ ہوتا گیا۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) مال کے ساتھ مختلف جگہوں پر بھی جاتے، یمن، نجد، حبشہ اور شام کے سفر کرتے۔ اس زمانے میں شام تجارت کی سب سے بڑی منڈی تھا۔ تجارت کے سلسلے میں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) باقاعدہ سفر کرتے اور لوگوں سے ملتے۔ اس طرح تجارت بڑھتی گئی اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم)، اپنے صالح عمل، صداقت اور سچائی سے دنیا کو ایمان داری کا درس دیتے گئے۔

وہ ماحول جہاں تجارت محض چرب زبانی پر چلتی تھی، جہاں کا ہر تاجر خورد بُرد کا ماہر اور خام مال کو بڑے منافع پر بیچ دینے کو ہی تجارت گردانتا تھا، وہاں ان سب کو ایک نوجوان تاجر نے ایمان دار اور سچائی کے معنی سمجھا دیے تھے۔ اس طرح بہت کم وقت میں عرب کے تمام قبائل یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ عبد اللہ کے

فرزند امانت دار ہیں، صادق ہیں۔ جہاں بھی دو چار جمع ہو جاتے، یہ تذکرہ ہوتا تو صادق اور امین کہہ کر آپ کا ذکر کرتے اور جہاں تجارت کے آغاز کا ارادہ کرتے انھی پہ اعتماد کرتے۔ ہر چند کہ وہ خود برائیوں میں مبتلا تھے، لیکن اپنی ذات کے لیے ان میں سے ہر فرد ایمان داری اور سچائی ہی کی طلب کرتا تھا جس کے لیے ان سب کی نظریں آپ ہی کی جانب اٹھتی تھیں۔

**حرب الفجار :** جس زمانے میں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اپنی معرفت کو کار آمد بنا کر چچا کی مدد بھی کر رہے تھے اور مکّے کے قبائل کو سچائی کا درس بھی دے رہے تھے، اس زمانے میں اور بھی متعدّد مسائل توجّہ طلب تھے جن پر آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے پوری پوری توجّہ دی بلکہ ان کے حل کرنے میں بھرپور حصّہ لیا۔ اسی زمانے میں بنو کنانہ اور بنو قیس کے درمیان جنگ ہوئی جس میں قریش نے بنو کنانہ کا ساتھ دیا لہٰذا قریشی جوانوں کے ساتھ اس جنگ میں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے بھی شرکت کی۔ اس جنگ کو حرب الفجار کہتے ہیں۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی عمر کے بارے میں مورّخین کی آراء بڑی مختلف ہیں۔ ایک روایت کے مطابق اس وقت آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی عمر پندرہ برس تھی اور دوسری کے مطابق بیس برس۔ بہر حال اس وقت آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کاروبار اور خدمتِ خلق کے تمام امور بڑے جوش و خروش سے سر انجام دیتے تھے اور کوئی کام بھی بے مقصد نہ ہوتا تھا۔ بہ غرضِ تجارت جب آپ قبائل کا دورہ کرتے تو ان تمام معاشرتی برائیوں کو قلب کی گہرائیوں سے محسوس کرتے جو عربوں کی عادت بن چکی تھیں۔ تہِ دل سے آپ ان کی خیر خواہی چاہتے تھے۔

**حلف الفضول :** مکّے کا حال بھی دیگر قبائل سے کچھ کم نہ تھا۔ وہ سب بھی چوری، ڈکیتی اور باہمی مخالفتوں کا شکار تھے۔ جہاں دیگر تمام قبائل اپنے مخالف قبیلوں کو نیچا دکھانے کے لیے نت نئی حرکتوں سے انھیں تکلیف پہنچانا چاہتے وہاں عین مکّے کے اندر جوان اور نوجوان سبھی منہ زور گھوڑوں کی طرح ہر وقت اپنے حریف کے لیے تیار رہتے تھے۔ اس کی وجہ سے عام حال یہ تھا کہ آئے دن مسافر لُوٹے جاتے، سرِ راہ قتل ہوتے، تجارتی قافلوں پہ چھاپے مارے جاتے اور جیسے

بھی ممکن ہوتا، ان کے سفر میں دشواریاں پیدا کی جاتی تھیں۔ ان تمام بدفعلیوں کے سبب امن غارت ہو چکا تھا۔ لوگ گھروں سے نکلتے ہوئے خوف کھاتے، قبائل کے سردار اور ذی حیثیت لوگ ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے لیے اپنے اپنے تمام وسائل استعمال کرتے تو ان کا اصل نشانہ سردار نہیں بلکہ عوام بن جاتے تھے۔ مُقتدر لوگ تو اپنے بچاؤ اور حفاظت کے لیے کچھ نہ کچھ کر ہی لیتے تھے لیکن اس اس زمانے میں غریبوں کی زندگی ناگفتہ بہ تھی۔ یہ بیچارے گھروں سے نکلتے تو شرپسندوں کے ہاتھوں پڑ جاتے اور گھروں کے اندر چھپنا چاہتے تو چوری ڈکیتی سے لٹ جاتے۔ غرض عوام کے دل سے خوف و خطرہ ٹلتا۔ قبیلے کے سرداروں کی زیادتیوں کا بدلہ لینے کے لیے دوسرے قبیلے والے ان کے قبیلے کے عام گھروں کو نذرِ آتش کر دیتے۔ کبھی چوری چکاری سے نقصان پہنچاتے، کبھی یونہی اپنی برائی جتانے کے لیے چوٹ دے جاتے۔ یہ حالات ایسے تھے جن کے بارے میں آپ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) اکثر اوقات غور کرتے کہ کس طرح عام لوگوں کی مشکلات حل کی جائیں؟ پھر اس سوچ نے الفاظ کا رنگ بھی اختیار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی ہاشم کی طرف سے باقاعدہ ایک مہم شروع ہوئی۔ یہ دراصل اصلاحی امور اور قیامِ امن کا آغاز تھا۔ سب سے پہلے زبیر بن عبدالمطلب کے گھر چند قبائل (بنی زہرہ، بنی تمیم، بنی اسد اور بنی ہاشم) کے معززین کو مدعو کیا گیا اور طعام کے بعد اس موضوع پر گفتگو ہوئی۔ سب نے موجودہ حالات پر روشنی ڈال کر اپنی اپنی خدمات پیش کیں کہ جو بھی ہو سکے گا، وہ کریں گے۔ اس فیصلے کے بعد اس محفل میں باقاعدہ ایک حلف نامہ تیار ہوا جس میں اِس محفل میں شریک تمام ارکان نے مندرجہ ذیل عہد کیا۔

(۱) ہم ملک سے بدامنی دُور کریں گے۔

(۲) ہم مسافروں کی حفاظت کریں گے۔

(۳) ہم غریبوں کی امداد کریں گے۔

(۴) ہم زبردستوں کو زیر دستوں پر ظلم کرنے سے روکیں گے۔

اس عہد نامے اور اقرار نامے کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس

مجلس کے ہر رکن نے ان الفاظ میں عہد کیا۔ "جب تک دریا میں صوف کو پرورش کرنے کی شان باقی ہے، ہم مظلوموں کا ساتھ دیں گے تاآنکہ ان کا حق ادا ہو جائے۔ معاشرے میں ہم ان کی خبرگیری اور حفاظت کریں گے۔"

بہرحال اس کے الفاظ جو بھی ہوں، مقصد ملک میں امن قائم کرنا اور کمزوروں کی مدد کرنا ہی تھا اور اس کا اثر بھی ہوا کہ ڈکیتی، چوری اور قتل و غارت گری کی وارداتیں کم ہو گئیں۔ اسی اقرار نامے یا حلف نامے یا عہد نامے کو حلف الفضول کہا جاتا ہے جس کا تذکرہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) زمانۂ نبوت میں بھی کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر آج بھی مجھے کوئی ایسے حلف نامے کے لیے بلائے تو میں بہ خوشی قبول کر لوں۔ الغرض لڑکپن اور جوانی میں ایسے صدہا واقعات پیش آئے جو دنیا کے لیے ایک درس تھے، ایک ہدایت تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہر عمل دوسروں کو نیکی اور بھلائی کی ترغیب دیتا تھا۔

**تجارتی تعلقات:** کچھ وقت ان حالات کی نذر ہو گیا اور پھر وہ وقت بھی آیا جب عرب بدترین قحط کی حالت میں مبتلا ہو گئے۔ عوام ہی نہیں بلکہ ذی مرتبہ اور صاحبِ حیثیت لوگ بھی قحط کے ہاتھوں اپنے ہوش و حواس کھونے لگے۔ ایسے میں کاروباری امور اس بُری طرح متاثر ہوئے کہ تاجروں نے اپنے اپنے کاروبار ختم کر کے یا تو دوسروں کے ساتھ شریک ہونے کی کوشش کی یا کسی اور کام کی سوچنے لگے۔ اس طرح کام کم اور ضرورت مند زیادہ ہو گئے یہاں تک کہ اس وقت شیخ مکہ ابو طالب اور خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی کسی مستقل اور موزوں مصروفیت کی تلاش کرنے لگے۔

اس قحط کے زمانے میں قریش کے ایک معزز سردار خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی کی دختر خدیجہؓ بنت خویلد کو ایک ایسے نائب کی ضرورت محسوس ہوئی جو امورِ تجارت کو اپنی رائے سے انجام دے کر ان کے مال کو باہر لے جائے۔ بہ الفاظِ دیگر ان کی خواہش تھی کہ ان کے مال سے کوئی تجارت کرے اور منافع انھیں لا دے۔ یہ متموّل خاتون اپنی گوناگوں اوصاف کی بدولت طاہرہ مشہور تھیں۔ ان کے دو نکاح ہو چکے تھے اور دونوں بار بیوہ ہو گئی تھیں۔ اب تین

اولادوں اور بے اندازہ دولت کی مالک تھیں۔ ذریعۂ معاش اب بھی تجارت ہی تھا۔ اس وسیع تجارت کا نگراں کوئی نہ تھا لہٰذا عرصۂ دراز سے مختلف اقربا کو معقول معاوضہ دے کر تجارت کراتی تھیں، لیکن ان سے مطمئن نہ تھیں یا پھر شاید کسی مستقل اور مضبوط سہارے کی طلب گار تھیں۔ جس وقت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) عرب کے تمام قبائل میں صادق اور امین کے لقب سے مشہور تھے اور لوگ دوڑ دوڑ کر ان کی شرکت میں تجارت کی پیشکش کرتے تھے، اس وقت ان خاتون نے بھی حضورؐ کی جانب دستِ رفاقت بڑھایا جسے انھوں نے قبول کر لیا۔ اس طرح قریش کے اس اعلیٰ اطوار جوان اور ان متموّل خاتون کا تجارتی تعلق قائم ہو گیا۔

**تزویج:** معاملہ طے ہو جانے کے بعد خدیجہؓ بنتِ خویلد نے اپنا مال ومتاع ان کے حوالے کیا اور شام جا کر تجارت کی درخواست کی۔ ساتھ ہی بہ وقتِ روانگی اپنے غلام میسرہ کو ان کے ساتھ جانے کا حکم صادر فرمایا تاکہ اس سفر کے مکمل حالات بھی انھیں معلوم ہو جائیں اور میسرہ بھی تجارتی سفر کا تجربہ حاصل کر سکے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے اس سفر کا آغاز کیا اور ان کے حسبِ منشا ان کے مال سے تجارت کر کے چند ماہ کے بعد واپس آ گئے۔ اس برس کا منافع گزشتہ برسوں کی تجارت سے بہت زیادہ تھا جو حضورؐ نے رتّی رتّی ان کے حوالے کر دیا۔ اس قدر منافع کے ساتھ جب خدیجہؓ بنتِ خویلد کو اپنے غلام کی زبانی حالاتِ سفر اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صالح فطرت کے متعلق علم ہوا تو وہ ان کے بارے میں سوچنے لگیں۔ پھر یہی اعتماد پیغامِ نکاح کا سبب بن گیا۔ اس وقت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سنِ مبارک پچیس برس تھا اور حضرت خدیجہؓ بنتِ خویلد کی عمر چالیس سال تھی۔ ایک طرف وہ جوان جس کی تمام تر صلاحیتیں شباب پر ہوں، جس کے حُسنِ سیرت وصورت کے معترف قریش کے تمام سردار ہوں، جس کی عظمت وشرافت عرب کے تمام قبائل کا موضوع ہو اور جس نے عمر بھر کسی نوعمر دوشیزہ پر نظر ڈالنا پسند نہ کیا ہو، اس نے اخلاق وکردار کے اعلیٰ معیار پر ایک چالیس سالہ خاتون کو پرکھا اور تاحیات ساتھ نبھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت تک حضرت خدیجہؓ بنتِ خویلد خود بھی

بہت سے پیغامات ٹھکرا چکی تھیں لیکن اُن کے اوصاف کے مدِنظر ان سے وابستہ ہونے کی آرزو کررہی تھیں چنانچہ انھوں نے باقاعدہ نکاح کا پیغام دیا جو منظور ہوا اور یہ نکاح عمل میں آیا۔ اس وقت ابوطالب، حمزہؓ بن عبدالمطلب اور چند رؤسائے مکہ کے ساتھ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت خدیجہؓ بنتِ خویلد کے مکان پہ تشریف لے گئے۔ ابوطالب نے مروّجہ دستور کے مطابق خطبۂ نکاح پڑھایا اور عمرو بن اسد (خدیجہؓ بنتِ خویلد کے چچا) کی وکالت پہ پانچ سَو طلائی درہم مہر کے عوض نکاح ہوا اور خدیجہؓ بنتِ خویلد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے وابستہ ہوگئیں۔

عرب قبائل میں کئی کئی شادیوں کا عام رواج تھا بعض اوقات مرد سفر کے لیے جاتے اور شادی کرکے بیوی ساتھ لے آتے تھے۔ کسی بیوہ یا کسی مُطلقہ سے نکاح کرلینا معیوب نہ تھا اور چونکہ ان کا کوئی مقصد نہ ہوتا تھا لہٰذا عمر کا فرق بھی اہم تصوّر نہ کیا جاتا۔ متعدد عورتوں کو عقد میں لے آنا شان کی بات سمجھی جاتی تھی۔ بعد ازاں انھی متعدد شادیوں کو اسلام نے ایک مقصد عطا کردیا، لیکن اس وقت متعدد شادیوں کی آزادی کے باوجود قریش کے قبائل میں یہ شادی عجیب تصوّر کی جارہی تھی، شاید اس لیے کہ بنو ہاشم کے اس قابلِ فخر جوان پہ ایک دو کی نہیں کئی قبیلوں کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ کم عمر لڑکیاں تو گھر میں بھی موجود تھیں اور باہر بھی۔ پھر پہلی شادی کے لیے عرب نوجوان کسی بڑی عمر کی بیوہ کا انتخاب نہ کرتے تھے۔ ایسے میں شیخِ مکہ کے پچیس سالہ بھتیجے نے بڑے بڑے خاندانوں کی دوشیزاؤں کو نظر انداز کرکے انھیں اپنایا تھا جو عمر میں ان سے پندرہ برس بڑی اور دو بار بیوہ ہوچکی تھیں۔ جو سنتا انگشت بہ دنداں رہ جاتا۔ اس وقت ایک دو نے نہیں کئیوں نے پیش گوئی کی کہ یہ شادی ایک وقتی معاہدہ ہے جو بہت جلد ٹوٹ جائے گا، لیکن وقت نے ثابت کردیا کہ یہ رشتہ بڑا مقدس اور پاکیزہ تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک بہترین شوہر ثابت ہوئے اور وہ ایک بے مثل بیوی۔ ایک فرزند کے سوا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تمام اولاد انھی سے ہوئی۔ وہ صرف ایک بیوی اور بچوں کی ماں ہی نہیں بلکہ ہر شعبۂ حیات میں شریکِ حیات ثابت ہوئیں اور جب تک زندہ رہیں، ہر ذمے داری کو بہ حُسن وخوبی ادا کیا، ہر مصیبت اور ہر دُکھ میں ساتھ دیا۔

**نبیؐ کا گھر:** اب شادی اور عیال کے سبب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذمّے داریاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ ابھی تک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تنہا تھے، کاروبار میں تعلقات بھی بناتے تھے اور تجارتی سفر بھی کرتے تھے، لیکن اب ایک گھر بن گیا تھا اور گھر سے ایک خاندان۔ یہ گھر اور یہ خاندان کسی عام آدمی کا نہ تھا بلکہ بنو ہاشم کے اس جوان کا گھر تھا جس نے اپنوں سے زیادہ دوسروں کے بارے میں سوچا اور ان کے مسائل حل کرنے پر غور کیا تھا۔ اس انسان کا گھر دراصل وہ گوشہ تھا جہاں نبوّت سے قبل ہی خدا ترسی اور تقوے کی ابتدا ہو گئی تھی۔ مورّخین نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیاتِ مقدّس کے ان واقعات کو کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے کہ اس دَور کے لیے بس ایک گوشہ نشیں اور مسلسل جستجو کرنے والے انسان کا ہی تصوّر ابھرتا ہے، لیکن جب ہم آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیاتِ طیبّہ کے ہر شعبے کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو توقادرِ مطلق نے اس کائنات کو سنوارنے اور بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لیے مقرّر فرمایا ہے۔ تب ایک گوشہ نشیں انسان کا تصوّر محو ہو کر ایک ایسے اولوالعزم انسان کا تصوّر قائم ہو جاتا ہے جو اپنی زندگی کے ہر حصّے کو عوام کی رہنمائی اور درس کے لیے پوری طرح سے عیاں کر دیتا ہے جس کے لیے اس انسان کو خاص و عام سب میں شامل ہونا پڑتا ہے، ان کے معاملات سے دلچسپی لینا، ان کے دُکھوں اور خوشیوں میں پوری طرح سے شریک ہونا پڑتا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خوشیوں کی محفلوں میں بھی مدعو کیے جاتے اور لوگوں کے دُکھوں میں بھی شریک ہوتے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر مہمان بھی آتے، ضرورت مند بھی اور عام ملاقاتی بھی اور یہی وہ موقع تھا جب قریش پر یہ بات پوری طرح سے عیاں ہو گئی کہ اس صادق اور امین بلند سیرت اور دردمند انسان کی بیرونی زندگی اور نجی معاملات میں حیرت انگیز مطابقت ہے۔ مکّے میں بڑے بڑے سردار موجود تھے، اہلِ علم بھی اور ذی مرتبہ بھی، چار دیواری سے باہر ان کی عظمت کے ڈنکے بجتے تھے، لیکن ان سب کی بیرونی اور اندرونی زندگی میں بڑا بُعد تھا۔ وہ ظاہر داری کی ردا لپیٹ کر عوام میں آتے تو دیکھنے والے اَش اَش کر اٹھتے۔ وہ تقریریں کرتے تو لوگوں کے دلوں میں ہلچل مچ جاتی، لیکن گھر کی چار دیواری کے اندر وہ کچھ اور ہوتے، گویا یہ دین کے میزان جدا جدا تھے، لیکن اس بات کا اندازہ

شرف انھی ہستیوں کو ہوتا جو نجی زندگی میں انھیں بے پردہ دیکھ لیتے تھے۔ یہ ان لوگوں پر الزام نہیں بلکہ حقیقت یہی ہے کہ کسی انسان کی حقیقت جاننے اور سیرت و کردار کو پہچاننے کے لیے سب سے بڑا ذریعہ اس کا گھر ہوتا ہے۔ بیویاں ان کے معاملاتِ نیک و بد کی رازدار اور اولاد ان رازوں کی امین ہوتی ہے۔ ایک بہترین مقرر اپنے گھر میں بدگو اور بدزبان بھی ہو سکتا ہے۔ سخاوت کی ہدایات دینے والے اپنے مال کو بچا کر رکھنے کے عادی بھی ہو سکتے ہیں جس کا اندازہ محض نجی زندگی ہی میں کیا جاتا ہے کیوں کہ عوامی زندگی میں خود کو خاص انسان بنا کر پیش کرنے والے نجی زندگی میں طویل عرصے تک ظاہرداری میں کامیاب نہیں ہو سکتے، کبھی نہ کبھی تو اصلیت کھل ہی جاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ گھر اصلیت کی پہچان کے لیے ایک کسوٹی ہے۔ اسی کسوٹی پر جب آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی ذاتِ اقدس کو پرکھا جاتا ہے تو برملا یہ کہہ دینے کو دل چاہتا ہے کہ صرف آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی ہستی وہ ہستی ہے جو باہر کی زندگی میں بھی امین اور صادق اور گھر کے اندر بھی سچائی اور صداقت کا مجسّمہ تھی۔ دوست اور اقربا کے لیے ہی نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی فیض عام تھا۔ لوگوں کو امانت رکھوانے کی ضرورت پیش آتی تو یہی گھر تھا۔ کسی معاملے کی صداقت جاننا ہوتی تو لوگ ادھر ہی کا رخ کرتے اور سچائی کی گواہی دلوانا یا طلب کرنا ہوتی تب بھی اسی طرف دوڑتے تھے کیوں کہ اصل میں یہی وہ گھر تھا جس نے گھر کا اصل مقصد بعثتِ نبوی سے بہت پہلے دنیا پہ آشکار کر دیا تھا کہ گھر محض عیش و آرام کرنے کی جگہ نہیں کہ دن بھر کا تھکا ماندہ انسان جائے، آرام کرے یا دیگر ضروریات پوری کرے بلکہ گھر سے خاندان، خاندان سے معاشرہ اور معاشرے سے قوم بنتی ہے۔ گھر اگر مثالی ہے تو خاندان، معاشرہ اور پھر قوم سب اسی اساس پر ڈھلتی چلی جائے گی۔ یہ گھر واقعی مثالی تھا، دارالعمل تھا جہاں رہتے ہوئے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) بھلائی نیکی اور خیر کے کاموں کی ہدایت فرمانے سے قبل خود عمل کرتے تھے لہٰذا اہلِ مکّہ دل کی گہرائیوں سے ان کی اخلاقی عظمت اور سچائی کے معترف تھے۔ الغرض بعثتِ نبوی، ہجرتِ مدینہ اور فتحِ مکّہ کے بعد آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے جہالت کے بس تیرہ اونچ نیچ کے تفرقوں کو مٹانے اور جن برائیوں کو ختم کرنے کے لیے

بہ بانگِ دہل وہ خطبہ دیا تھا جس کی مثال تاریخِ انسانیت میں کہیں نہیں ملتی۔ بعثت سے بہت قبل ان تمام برائیوں سے ان کا گھر پاک تھا۔

**تلاشِ حق**: ایک پاکیزہ زندگی گزارتے ہوئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) معاشرے کی ہر چھوٹی بڑی ذمّے داری ادا کر رہے تھے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان میں ایک خاص جستجو کا مادہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مکّہ بتوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ خانۂ کعبہ میں تین سَو ساٹھ بُت نصب تھے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خاندان اِسی صنم کدے کا کلید بردار تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس خاندان کے سب سے اہم فرد تھے، لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی ان بُتوں کی جانب دیکھا تھا نہ کبھی کچھ طلب کیا تھا۔ بُت پرستوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی آپؐ نے کبھی ان کے مشاغل میں حصّہ نہیں لیا تھا بلکہ بعض وقت تو اہلِ مکّہ اور ان کے یہ مشاغل آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہیچ نظر آتے جس کے سبب ان سب محفلوں سے آپ گریز کرتے۔

اس زمانے میں مکّے کے دو معزّزین ابن ابی قحافہ ملقب بہ ابوبکرؓ اور حکیم بن حزام کے سوا آپؐ کسی کی صحبت میں وقت نہ گزارتے۔ برائیوں اور فضول کاموں سے گریز تو خیر نیک سرشتی کا تقاضا تھا لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تنہا ہوتے تب بھی فکر کا مرکز کچھ اور ہی ہوتا۔ کبھی اپنی ذات کی ابتدا اور انتہا کے بارے میں غور فرماتے اور کبھی کائنات کے، جدھر بھی دیکھتے، تجسّس بڑھ جاتا۔ گردشِ لیل و نہار، آفتاب و ماہتاب کا ایک خاص وقت پر طلوع اور غروب، ستاروں کا چمکنا اور غائب ہونا اور دن کا رات کے تعاقب میں اور رات کا دن کے پیچھے مسلسل دوڑنا کس کے حکم پر ہے؟ یہ غیر تمناہی عالم کس کے تابعِ فرمان ہے؟ جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تنہا ہوتے یا سفر میں، تب جوں جوں مشاہدہ بڑھتا جاتا، خالقِ حقیقی کی طلب محسوس ہوتی جاتی۔ پھر آہستہ آہستہ اس فکر کا نتیجہ تنہائی پسندی کی صورت میں ظاہر ہوا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے معمولات میں فرق لے آئے۔ اہلِ مکّہ اور ان کی ہنگامہ خیز محفلوں سے آپ بچنا چاہتے جو بعض اوقات ممکن نہ ہوتا۔ خصوصاً گھر میں موجودگی کے باوجود ملاقاتیوں سے بچنا آئینِ اخلاق کے خلاف تھا لہٰذا دُنیوی اُمور سے فارغ ہو جانے

تو ہم عصر احباب اور اقربا کی صحبت میں اوقات گزاری کی بجائے آپؐ غارِ حرا کو اپنا مسکن بنا لیتے۔ مکّے سے چند میل کے فاصلے پہ چار گز طویل اور پونے دو گز عریض یہ پُرسکون گوشہ (جوابِ جبلِ نور کہلاتا ہے) طبع مبارک کو بہت بھایا تھا۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) جب بھی یہاں آتے، وقت کا احساس ہی نہ ہوتا۔ ایسے میں بس مطمئن خلوتیں ہوتیں، ہجوم افکار ہوتا اور قادرِ مطلق کا عجیب تصوّر بندھ جاتا۔

وقت کے ساتھ ساتھ یہ کیفیت بڑھتی ہی گئی اور غارِ حرا میں قیام کی مدّت بھی زیادہ سے زیادہ ہوتی گئی۔ جب آپؐ وہاں تشریف لے جاتے تو کئی کئی یوم گزر جاتے لیکن اس محویّت اور تنہائی پسندی کے یہ معنی ہرگز نہ تھے کہ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) دنیا سے کٹ کر محض گوشہ نشین ہو گئے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہی دَور تھا جب آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی معاشرتی اور معاشی ذمّے داریاں عروج پر تھیں۔ چھ بچّوں کی ولادت، ان کی تربیت، پھر ایک صاحبزادی حضرت زینب کی شادی، دو کے نکاح اور ایک فرزند کی پیدائش اور وفات۔ غرض کہ خوشی اور غمی کے واقعات کا ایک ہجوم تھا جن سے آپؐ کو بہرحال گزرنا تھا ذاتِ الٰہی آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو قبولِ وحی کی استعداد کے لیے ریاضت کی راہ پر ڈال رہی تھی۔ آپ کو بہ یک وقت دینی اور دنیوی معاملات درپیش تھے اور ہر دو ذمّے داریوں کو مکمّل طور پر ادا کرنا تھا۔ ایسے میں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے کسی امر کو نظر انداز نہ کیا بلکہ ان سب کو بہ حُسن و خوبی انجام دینے کے بعد دنیا سے کٹ جانے والوں کے لیے بڑی عجیب مثال پیش کر دی اور یہ ثابت کر دیا کہ دنیوی فرائض اور ذمّے داریوں کی ادائیگی بھی عبادت و ریاضت سے کم نہیں ہے۔

اس طرح سے وقت گزرتا گیا اور آپ پابندی کے ساتھ غارِ حرا میں محفلِ خلوت سجاتے رہے۔ کبھی آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ستّو اور پانی بھی اپنے ساتھ لے جاتے اور وہاں زیادہ وقت گزارتے جو گھنٹوں پر نہیں بلکہ دنوں پر مشتمل ہوتا۔ یہ بالکل وہی کیفیت تھی جو توریت عطا ہونے سے قبل جنابِ موسیٰؑ پر گزری تھی۔ وہ چالیس یوم کوہِ طور پہ روزے کی حالت میں رہے اور یہ تمام وقت انھوں نے عبادت و ریاضت میں گزارا یا جس طرح کہ جنابِ عیسیٰؑ بہ حالتِ صوم ایک سنسان اور ویران جنگل میں

یادِ الٰہی میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اب بالکل وہی کیفیت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تھی۔ فرق محض اتنا تھا کہ قبولِ وحی کی استعداد پیدا کرنے کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ریاضت کا زمانہ دِنوں اور مہینوں پر نہیں بلکہ برسوں پر محیط تھا۔ پھر عزلت نشینی کی حالت میں مراقبہ اور خالقِ کائنات کا تصوّر بڑھتا گیا جس کے بعد رویائے صادقہ نے رہبری شروع کر دی۔ وہ اس طرح کہ عرب کے اس صالح انسان کو غارِ حرا کی خلوتوں میں ایک وسیع دنیا اور اس کی حقیقتیں نظر آتیں۔ کبھی تاریکی، روشنی میں بدل جاتی، کبھی علم و دانش کے وہ وہ باب کُھلتے جنھیں دیکھنے کی صلاحیت قدرت نے صرف اسی انسانِ کامل کو عطا فرمائی تھی۔ یہ خواب ہوتے یا مشاہدے سب صحیح ثابت ہوتے، گویا یہ کیفیت رویائے صادقہ اور منکشف ہونے والے اسرار سب نبوّت کا عنوان و دیباچہ تھے جو غور و فکر اور جستجو کو مزید بڑھا دیتے تھے۔ ان مشاہدات سے شاہد کی تلاش کچھ اور بڑھ جاتی۔

کچھ وقت اور گزر گیا تب اسرار و انکشافات کے انداز بدلے۔ بارہا غارِ حرا روشن ہو جاتا۔ یہ روشنی ایسی ہوتی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) دیکھتے ہی رہ جاتے۔ آپ سمجھنا بھی چاہتے تو سمجھ نہ پاتے کیوں کہ یہ تمام تر کیفیات فہم و ادراک سے بالاتر تھیں، مگر اُن میں سے ہر کیفیت شوق کو بڑھاتی اور طلب کو سوا کر دیتی تھی اور ہر طلب مطلوبِ حقیقی کے لیے غور و فکر میں اضافہ کر دیتی تھی۔ یہ عرصہ پانچ برس پر محیط تھا۔ پھر یہی فکرِ حق کے اس متلاشی کو متعدد ادوار اور کیفیات سے گزار کر اس مقام تک لے آئی جو شریعتِ کبریٰ کی تاسیس کے لیے مخصوص تھا۔

# نزولِ وحی اور وحی کے درجات

## ماہ ربیع الاوّل - ۱۱ فروری (۶۱ء)

جب قبولِ وحی کی استعداد مکمل ہوئی اور ریاضت کا زمانہ تمام ہوا تو وہ مرحلہ آیا جس کی تیاری خود خالقِ کائنات نے مدتوں کی تھی، جس کے لیے اس ایوان کو آراستہ کیا گیا تھا، اس مشتِ خاک کو اشرف المخلوقات کا بلند درجہ عطا فرمایا تھا اور جس کے بعد بھی اس نے برسوں اس گھڑی کا انتظار کیا تھا۔ بالآخر یہ شبِ تاریک کٹی اور آفتابِ نبوت طلوع ہوا۔ اُس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)، غارِ حرا میں رونق افروز تھے کہ حضرت جبرئیلؑ نازل ہوئے اور ربِ کائنات کی طرف سے قرآن مجید کی پہلی سورۂ مبارک کے ابتدائی الفاظ پڑھے۔ قادرِ مطلق کا یہ فرمان، قرآنِ حکیم کی اوّلین سورۃ کی ابتدا، فطرتِ انسانی کے عین مطابق تھی۔ یہ وہ ہدایت تھی جسے دیگر مذاہب کے علمائے کرام اپنی اپنی الہامی کتابوں میں نہ پاکر اپنے اپنے دین سے برگشتہ ہو گئے تھے۔ انجیلِ مقدس میں کہیں بھی علم کا لفظ نظر نہیں آتا لہٰذا جوں جوں مسیحی علمائے دین اور مدبرین کا علم بڑھتا گیا، وہ اپنے اپنے دین سے شاکی ہوتے گئے۔ پھر لوگوں نے ایجادات و اختراعات شروع کیں، کسی نے گلہ کیا کہ اس کا مذہب فطرت سے دور ہے، اس کے بعد وقت کے ساتھ ساتھ علم کی جستجو انھیں مذہب سے دُور لے گئی، لیکن یہ قرآن ہے کہ جس کا پہلا حکم ہی حصولِ علم کی ہدایت ہے۔ علم جو انسان کی طلب ہے، خواہش ہے، ضرورت ہے۔

اِقرأ... اِقرأ (پڑھ، پڑھ) یہ ہدایت، نصیحت اوّل سے آخر تک انسانی طلب وخواہش کے عین مطابق ہے۔ یہ وہ کلام ہے، وہ دین ہے کہ علم جس قدر وسیع ہوتا ہے، اس کی حقیقت اتنی ہی زیادہ آشکار ہوتی جاتی ہے۔ لوگ اسے جتنا سمجھتے اور غور کرتے ہیں، اتنا ہی فطرت کے قریب ہوتے جاتے ہیں بہرکیف اس وقت یہ منظر بڑا عجیب تھا جب روح الامین وہ منصب لے کر نازل ہوئے تھے جس کا اہل عرب کے اس روشن ضمیر انسان کے سوا کوئی نہ تھا، لیکن یہ اچھوتا انسان، عرب کا وہ اُمّی جس نے تعلیم حاصل نہ کی تھی، عمر بھر کوئی تحریر نہ پڑھی تھی، اب حیران ومبہوت اس آنے والے کو دیکھ رہا تھا۔ گنجینۂ علم تو اسے اَب عطا ہونے والا تھا، بھلا پہلے وہ کیسے پڑھتا لہٰذا اِقرأ اِقرأ کے جواب میں لبوں سے نکلا "میں پڑھنا نہیں جانتا"

اس جواب پر روح الامین نے تین مرتبہ سینے سے لگا کر بھینچا، تب لاعلمی کا قفل ٹوٹ گیا اور علم کے خزانے نطق کے سہارے نکلنے لگے اور اللہ کے آخری نبیؐ نے جبرئیلؑ امیں کے سناتے کے بعد پڑھا۔

اِقرأ باسمِ ربِّکَ الّذی خَلَقَ۔ خَلَقَ الاِنسانَ مِن عَلَق ٥
اِقرأ وربُّکَ الاکرام الّذی عَلَّمَ بالقَلَمِ عَلَّمَ الانسانَ
مَا لَم یَعلَم ٥

ترجمہ: اے نبیؐ، اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھیے جس نے کُل عالم کو پیدا کیا، انسان کو لہو کی ایک بوند سے بنایا۔ پڑھیے کہ آپ کا پروردگار بڑا ہی کریم ہے جس نے انسان کو علم سکھایا اور وہ سب باتیں سکھائیں جن کا اسے (انسان کو) علم نہ تھا۔

یہ اوّلین تعارف تھا۔ پہلی وحی جو معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوئی۔ اگرچہ قرآنِ مجید لیلۃ القدر میں روح الامین کو عطا ہو چکا تھا، لیکن ان کے غارِ حرا میں پہلی بار آنے کی تاریخ ۹ ربیع الاوّل ۱۲ فروری ۶۱۰ء بتائی جاتی ہے۔ اسی وقت انھوں نے وضو کا طریقہ اور دو رکعت نماز سکھائی اور واپس چلے گئے۔ یہ لمحہ وہ تھا کہ معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ آپ (صلّی اللہ

علیہ وسلم، فوراً گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے کہا: "مجھے چادر اُڑھاؤ"۔ انھوں نے تعمیلِ حکم کی۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) لیٹ گئے اور جب ذرا طبیعت سنبھلی تو فرمایا: "مجھے اپنی جان کا خوف ہے"۔

یہ سُن کر اس عظیم بیوی نے جو کچھ کہا، وہ نہ صرف شوہر کی بزرگی اور بڑائی کے لیے بلکہ ان کی اپنی عظمت کے اظہار کے لیے بھی کافی ہے۔ یہ نبوّت کی پہلی تصدیق تھی یا تسلّی کے چند بول، جو بھی تھا انھوں نے اس وقت ان کے بلند اخلاق اور اعلیٰ اطوار کی گواہی دی اور بولیں: "آپ غم نہ کیجیے کیوں کہ آپ غریب پرور ہیں، سخی اور کشادہ قلب ہیں، رشتوں کو جوڑنے والے یتیم اور بیواؤں کی مدد کرنے والے ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی بھی رسوا نہ کرے گا"۔

صورتِ حال جاننے کے بعد انھوں نے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو تسلّیاں تو دیں لیکن دراصل انھیں خود بھی اطمینانِ قلب کی ضرورت تھی لہٰذا جونہی آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی طبیعت قدرے بحال ہوئی تو وہ آپ کو اپنے چچازاد کے پاس لے گئیں۔

ورقہ بن نوفل، حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے چچازاد بھائی، اس خاندان کے معمّر ترین انسان، عبرانی زبان کے ماہر، عیسائیت کی مسندِ امامت کے ایک بڑے امام اور توریت و دیگر الہامی کتب (صحائفِ آسمانی) کے جاننے والے تھے۔ برسوں سے تلاشِ حق نے انھیں گوشہ نشیں بنا دیا تھا۔ کفر و شرک سے انھیں ہمیشہ سے نفرت تھی۔ وہ خاندانِ بنو ہاشم کے اس قابلِ فخر انسان سے اُس وقت سے واقف تھے جب ان کی قوم اُنھیں امین و صادق کہا کرتی تھی اور اب تو پچھلے پندرہ برس سے قرابت داری نے انھیں سمجھنے کے متعدد مواقع بخشے تھے۔ اس وقت انھوں نے غارِ حرا کا واقعہ اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی زبانِ مبارک سے وہ آیات سنیں جو روح الامین سنا کر گئے تھے تو بولے: "ابو قاسم! آپ تردّد نہ کریں۔ یہ وہی ناموسِ اکبر ہے جو موسیٰؑ پر اترا تھا۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم تمھیں ملک سے نکال دے گی"۔

یہ سن کر معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "کیا میری قوم مجھے نکال دے گی؟"

ورقہ بن نوفل نے کہا: "ہاں ایسا ہی ہوگا کیوں کہ اس دنیا میں جس نے بھی ایسی تعلیم پیش کی، اسے اس دنیا کی عداوت کا نشانہ ضرور بننا پڑا"۔

اتنا سننے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خاموش ہو گئے اور گھر لوٹ آئے۔

**فترۃ الوحی :** بلاشبہ یہ چیز باعث تردد تھی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خوف ہوا لیکن یہ خوف فرشتے کے آنے یا مستقبل کی دشواریوں کا نہیں تھا۔ نہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) آنے والے مصائب سے ہراساں تھے بلکہ یہ خوف محض جلال الٰہی کا مظہر تھا، نبوت کے بارِ گراں کا احساس تھا۔ قادرِ مطلق نے انھیں بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لیے منتخب کیا تھا اور ایک عظیم منصب بخشا تھا۔ اس ذمے داری کے احساس کے ساتھ ہی ایک چیز اور بھی کہ اب برسوں کا اضطراب اور جستجو کا مادّہ مٹ چکا تھا۔ جس مطلوبِ حقیقی کی تلاش تھی، اس نے خود ہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو آدمؑ کی گم کردہ راہ اولاد کو صراطِ مستقیم سے آشنا کرنے کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ بہر حال اس عظیم امر کا متحمل ایک دم سے نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ خالقِ حقیقی کو خود بھی اس کیفیت کا احساس تھا کہ فرشتۂ غیب کے پہلی بار نظر آنے کا تجربہ ہی اتنا سخت تھا جس کا متحمل ہونے کے لیے قلب اور حوصلے کی ضرورت تھی اسی لیے پہلی وحی میں صرف یہ بتانے پر اکتفا کیا گیا کہ آپ کا رب، خالق و مالک جس نے انسان کو خون کی بوند سے پیدا کر کے علم سے نوازا، آپ اس سے مخاطب ہیں۔ یہ پہلا تعارف تھا جس کے بعد وحی کا سلسلہ رُک گیا۔ اس زمانے کو فترۃ الوحی (وحی کے بند رہنے کا زمانہ) کہا گیا ہے۔ اس دوران میں معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم بڑے دل گرفتہ رہا کرتے تھے۔ بعض اوقات آپ کو وحیٔ الٰہی نہ آنے کا غم اس قدر شدید ہوتا کہ زندگی سے بیزاری محسوس ہوتی۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فترۃ الوحی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک دن میں راستے سے گزر رہا تھا، یکایک میں نے ایک آواز سنی، سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تو روح الامین کو آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا پایا۔ میں یہ دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا۔ اس طرح وحی کا درمیانی وقفہ بڑے اضطراب میں گزرا۔ رفتہ رفتہ فرشتۂ وحی نظر آیا اور خالق کائنات کے اولین تعارف کے بعد اب متعارف کرانے کا حکم دیا گیا تو معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض نبوت کی ادائیگی کی ابتدا کی اور سب سے پہلے دینِ حق قریب ترین لوگوں

کے سامنے پیش کیا۔

**سابقین والاولین:** اس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیش کردہ تعلیمات پر ایمان لانے والی سب سے پہلی ہستی اُمّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی تھی۔ وہ نہ صرف یہ کہ خواتین ہی میں سب سے پہلے ایمان لائیں بلکہ کفر سے اسلام کی طرف آنے والی پہلی ہستی بھی وہی تھیں۔ دوستوں اور ساتھیوں میں اس آواز پر لبیک کہنے والے ابوبکرؓ صدیق تھے جو مَردوں میں پہلی شخصیت تھے۔ بچّوں میں یہ اعزاز علیؓ ابن ابی طالب کو نصیب ہوا جن کی عمر اس وقت آٹھ یا دس برس بتائی جاتی ہے اور غلاموں میں پہلے مسلمان ہونے والے زیدؓ بن حارث تھے۔ ان چار ہستیوں میں دو نفوس خدیجۃؓ الکبریٰ اور حضرت ابوبکرؓ صدیق وہ تھے جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چہل سالہ زندگی کے ہر لمحے اور ہر ساعت سے واقف تھے لہٰذا بنا کسی حیل و حجت کے ایمان لے آنا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت اور مطہرانہ حیات کی گواہی دینے کے مترادف تھا۔ یہ اسلام کا اولین سال تھا اور تبلیغ کا فرض اندرخانہ ادا ہو رہا تھا جس کے سبب عمروؓ بن عتبہ، خالدؓ بن سعید اور بلالؓ حبشی مسلمان ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق تاجر تھے۔ مکّے میں ان کی دُکان تھی لہٰذا ہر طبقے اور ہر قبیلے کے لوگوں سے میل ملاپ رکھتے تھے۔ ان کے حلقۂ احباب میں عثمانؓ بن عفان، زبیرؓ بن العوام، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، طلحہؓ بن عبداللہ اور سعدؓ بن ابی وقاص حق سے آگاہ ہوئے تو ایمان لے آئے۔ پھر جوں جوں یہ تحریک پھیلتی گئی، مسلمانوں میں اضافہ ہوتا گیا اور بہت کم وقت میں ابوعبیدہؓ بن الجراح، عثمانؓ بن مظعون، عامرؓ بن فہیرہ، سعیدؓ بن زید، ابوحذیفہ، صائبؓ بن عثمان، ارقمؓ بن ارقم اس جماعت میں شامل ہو گئے۔ ایک سے دوسرے کو اطلاع ملتی تو حق کے متلاشی دربارِ رسالت میں حاضر ہو جاتے۔ اس دَور میں مسلمان ہونے والی خواتین میں اُمّ المومنین حضرت خدیجۃؓ الکبریٰ کے بعد بنتِ رسولؐ حضرت زینبؓ، اسماءؓ بنتِ ابوبکرؓ صدیق، فاطمہؓ بنتِ خطاب (خواہر حضرت عمرؓ فاروق) اسی زمانے میں مسلمان ہوئیں۔ یہی لوگ جو اس وقت ایمان لائے، سابقین والاولین کہلائے۔ پھر وقت گزرتا رہا اور اللہ کے نبیؐ خاموشی کے ساتھ اپنے اردگرد کے افراد

میں اس تعلیم کا چرچا کرتے رہے اور مسلمانوں کی تعداد بڑھتی رہی ۔ اس زمانے میں یہ لوگ چھُپ چھُپ کر مالکِ حقیقی کا تذکرہ کرتے اور چپکے چپکے عبادت کرتے۔ اگرچہ شرک کے اس ماحول میں جہاں ہر طرف بُت ہی بُت تھے ،خدائے واحد لاشریک کی بندگی کرنا مشکل ترین امر تھا ، لیکن صدیوں سے قعرِ مذلّت میں گرا ہوا یہ انسان ، پیکرِ محسوس کا خوگر اور شجر و سنگ کو معبود و مسجود گرداننے والا یہ اشرف المخلوقات ، اب مالکِ حقیقی کو پہچان رہا تھا اور اسلام بہ تدریج پھیلتا جارہا تھا۔ اس طرح سے تین برس گزر گئے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے دوسرا حکم نازل ہوا۔

## دعوتِ عام : ۴ سالِ نبوّت (۶۱۴ء)

یَا اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ہ قُمْ فَاَنْذِرْ ہ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ ہ وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ ہ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ ہ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَکْثِرُ ہ وَلِرَبِّکَ فَاصْبِرْ ہ

ترجمہ : (اے محمدؐ) جو کپڑے پیٹے ہوئے ہو ، اُٹھو اور ہدایت کرو۔ اپنے پروردگار کی بڑائی کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو ۔ ناپاکی سے دُور رہو۔ اس نیّت سے احسان مت کرو کہ اس سے زیادہ کے طالب ہو اور اپنے پروردگار کے لیے صبر کرو ۔

اس آیتِ مبارکہ نے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو نبوّت کے معنی سمجھا دیے اور مقاصد و فرائض واضح کر دیے ۔ یہ حکم تھا خدا کی کبریائی اور ربوبیت کو آشکار کرنے ، لوگوں کو اعمال و اخلاق کی ظاہری اور باطنی تعلیم اور نجاست سے بچنے کی ترغیب دینے ، بے راہ اور گم راہ انسانوں کو یوم حساب کا احساس دلانے کا! یہ سب کچھ کرنے کے بعد اسلام کی تعلیم کے عین مطابق اُن سے کوئی اُمید وابستہ نہ کرنا ، نہ ان پر کوئی احسان جتانا بلکہ اس راہ میں جو مصائب درپیش ہوں انھیں صبر و استقلال سے برداشت کرنا ۔ گویا اس وحیٔ الٰہی کے واضح معنی یہی تھے کہ مصائب و مشکلات کا آغاز ہو گیا تھا چنانچہ اب تبلیغ کا دوسرا درجہ تھا اور خاموشی کے ساتھ محض ہر دَم کے ساتھیوں کے لیے نہیں بلکہ دعوتِ عام کا حکم دیا گیا تھا لہٰذا معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ بات اعلانیہ کرنے کے لیے اپنے گھر

پر ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ معززین کی محفل میں وہ اس امر کا تذکرہ کریں گے ۔ یہ سوچتے ہوئے انھوں نے اپنے قرابت داروں کو طعام پہ مدعو کیا۔ یہ سب معززینِ بنو ہاشم تھے، لیکن پہلے دن دوسروں کی بیہودہ گوئی کے سبب کچھ کہنے کا موقع نہ ملا۔ تب یہ دعوت دوسرے دن رکھی گئی۔ ان مہمانوں کی تعداد تاریخ میں ۳۹، ۴۰ یا ۴۴ درج ہے۔ طعام کے بعد معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم کھڑے ہوئے اور بڑا موثّر خطبہ دیا۔ آپ نے فرمایا: "اے بنی مطّلب! خدا کی قسم جو چیز میں تمھارے لیے لایا ہوں، میں نہیں جانتا کوئی اور فرد اس سے قبل اپنی قوم کے لیے اس سے بہتر تعلیم اور اس سے افضل شئے لایا ہو جو خدائے واحد لاشریک نے مجھے تمھارے لیے عطا کی۔ میں تمھارے پاس دنیا اور آخرت کی بھلائی لایا ہوں اور مجھے خدا نے حکم دیا ہے کہ میں تمھیں اس کی دعوت دوں۔ سنو! خدا واحد و لاشریک ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں اس کا بندہ اور رسولؐ ہوں اور تمھیں اس کی دعوت دیتا ہوں اور ہدایت کی طرف بُلاتا ہوں۔ تم میں سے کون ہے جو میرے اس کام میں میرا ساتھ دے اور اس کے نتیجے میں میرا بھائی بنے؟"

یہ پہلا خطبہ تھا جو معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم نے دعوتِ حق کے لیے دیا۔ اس وقت کسی معمّر و جوان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ سب عالمِ سکوت میں اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے محفل میں کوئی موجود ہی نہ ہو۔ یا پھر ان کی عقل وحدانیت کی اس تعلیم کا احاطہ کرنے کے قابل ہی نہ تھی۔ اس دن اس دعوت کا جواب صرف علیؓ ابنِ ابی طالب نے دیا۔ تب قریش کے یہ معمر معززین ٹھٹول کے انداز میں ہنس دیے اور پھر محفل برخاست ہو گئی، گویا اس خطبے کا کسی نے بھی کوئی اثر نہ لیا، لیکن رنج محسوس کرنے کے باوجود آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے بڑے ہی تحمّل سے صورتِ حال کو برداشت کیا۔ اس راہ میں استقلال کا حکم پہلے ہی دیا گیا تھا لہٰذا تبلیغ پھر سے شروع کی گئی اور اس بار یہ کام اعلانیہ کیا جا رہا تھا۔ جو جہاں ملتا، آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اسے توحید کا پیغام سُناتے۔ اس طرح مزید چند افراد نے دینِ حق قبول کر لیا۔

یہ وہ وقت تھا جب اسلام کی اشاعت کرنا مشکل ترین کام تھا۔ نہ صرف یہ

کہ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض دیگر تمام انبیاءؑ سے مختلف تھا بلکہ ان کی تعلیم بھی اس قوم کے ذہن سے بالکل خلاف تھی۔ ابھی تک جو لوگ اس دین کی طرف مائل ہو رہے تھے اور اس دعوت پر لبیک کہتے تھے، وہ دو قسم کے تھے۔ اوّل وہ معززین جو بڑے بڑے منصب اور دولت رکھتے تھے، لیکن عرصۂ دراز سے حق کی تلاش میں تھے۔ چونکہ یہ لوگ متعدد معبودوں سے برگشتہ، سلیم الفطرت اور صالح اعمال والے تھے لہٰذا انھیں حق کو پہچان لینے میں دیر نہ لگی۔

ان میں صدیقِ اکبر حضرت ابو بکرؓ، عثمانؓ بن عفان، ابو عبیدہؓ بن الجراح سعیدؓ بن زید، سعدؓ بن وقاص اور چند دیگر حضرات شامل تھے۔ انھیں معبودِ حقیقی کی جستجو تھی اس لیے وہ اپنے مراتب و مناصب کی پروا کیے بغیر اسے قبول کر رہے تھے۔ دوسری قسم ان ہستیوں کی تھی جن کے پاس اعلیٰ مناصب تھے نہ خوش حالی اور نہ انھیں ان چیزوں کی طلب تھی کیوں کہ ان میں زیادہ تر قریشی سرداروں کے غلام اور ابنِ غلام تھے، مثلاً بلالؓ بن رباح، عمارؓ بن یاسر، سمعۃؓ، یاسرؓ وغیرہ! یہ لوگ مسلمان ہوئے تو معززینِ مکہ ان کے افلاس اور غربت کی وجہ سے بڑی تضحیک سے ان کا تذکرہ کرتے کیوں کہ قبل از اسلام بھی ان لوگوں کو کوئی عزت نصیب تھی نہ وہ لائقِ رحم تصوّر کیے جاتے تھے۔ ذلیل ہونا، سختیاں برداشت کرنا اور اپنے ان آقاؤں کی خدمت بجا لانا ہی ان کی زندگی تھی۔ لہٰذا اسلام کی فطری کشش نے سب سے پہلے انھی کے دل مسخر کیے۔ نہ تو انھیں جان کا خوف تھا اور نہ اذیتیں برداشت کرنے کی پروا۔ ان تمام اذیتوں اور بدترین حالات سے تو وہ اسلام کی دولت حاصل کیے بغیر بھی گزر رہے تھے۔ دراصل یہی ان کا وہ جذبہ تھا کہ جب دینِ حق قبول کرنے کے سبب انھیں قریش کے جور و ستم کا نشانہ بننا پڑا تو انھوں نے بے پناہ حوصلے اور قوّتِ برداشت کا ثبوت دیا۔ اس پس منظر سے بے خبر قریش کے سردار سمجھ رہے تھے کہ عبداللہ کے فرزند نے ایک دین پیش کیا ہے جسے چند غریبوں نے ان کے اخلاق و محبت اور کلام کی تاثیر سے متاثر ہو کر قبول کر لیا ہے لہٰذا یہ لوگ ایک شغل کے طور پر استہزا کرتے کبھی مذاق اُڑاتے اور اس نئے دین کے تمسخرانہ ذکر سے اپنی محفلوں کو آراستہ کرتے۔ کچھ

عرصے اہلِ مکّہ کا یہی حال رہا۔ پھر انھوں نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھی تو یکبارگی چونک اٹھے۔ اب تمسخر کی جگہ تجسّس نے لے لی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب حکمِ ربّانی ہوا۔ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (تجھے جو حکم دیا گیا ہے اسے واشگاف کردے)

اس حکم کے بعد ہی معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم کوہِ صفا پر تشریف لے گئے اور قریش کو بہ آوازِ بلند پکار کر جمع کیا۔ جب قرب وجوار کے لوگ جمع ہو گئے تو ان سے دریافت کیا"۔ اے قریش! تم مجھے صادق سمجھتے ہو یا کاذب؟"

سوال بڑا عجیب اور اچانک تھا۔ چند لمحے تو کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ پھر انھیں سچ کہے بنا چارہ نہ رہا اور بولے "۔ ابنِ عبداللہ! سچ تو یہ ہے کہ ہم نے کبھی بھی تجھے ہزل گوئی کرتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ ہر موقع پر صادق اور امین ہی پایا ہے"۔

یہ سننے کے بعد معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی گفتگو کی ابتدا بڑے انوکھے انداز سے کی اور فرمایا "۔ اے عبدالمطلب کے بیٹو، اے فہر کے بیٹو، اے کعب کے بیٹو! تم جانتے ہو میں اس پہاڑ کی بلند چوٹی پر کھڑا ہوا اردگرد دیکھ سکتا ہوں جب کہ تم نہیں دیکھ سکتے۔ ایسی حالت میں اگر میں تمھیں یہ خبر دوں کہ رہزنوں کا ایک گروہ مکّے پر حملہ آور ہونے کے لیے آرہا ہے تو کیا تم میری اس بات کا یقین کرو گے؟"

یہ سنتے ہی ہر جانب سے آوازیں بلند ہوئیں "۔ ہاں ہاں۔ ہم ضرور اس بات کا یقین کریں گے کیوں کہ تجھے جھٹلانے کی کوئی وجہ نہیں ہے"۔

یہ جواب سننے کے بعد اب معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی آواز بلند کی اور بولے "۔ تو پھر سنو، میں تمھیں ایک شدید عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ اے قبیلۂ قریش! اپنی جانوں کو آگ سے بچاؤ۔ اے بنی زہرہ، اے بنی مناف! خود کو آگ سے بچاؤ! موت تمھارے سروں پر ناچ رہی ہے اور مجھے تمھارا عالمِ آخرت اسی طرح نظر آرہا جیسے عالمِ دنیا، لیکن میں نہ اس دنیا میں تمھاری منفعت پہ قادر ہوں نہ آخرت کے کسی حصّے پر۔ میری اور تمھاری مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص دشمن کو دیکھ کر اپنے گھر والوں کو اطلاع دیتے روانہ ہو، لیکن ہر لمحے اسے یہ اندیشہ

لاحق ہو کر اس کے پہنچنے سے قبل دشمن اس کے گھر والوں تک نہ پہنچ جائے۔ اس لیے وہ راستے ہی میں پکارنے لگتا ہے کہ دشمن آپہنچا، دشمن آپہنچا!"

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) گفتگو کر رہے تھے اور آپ کا اصل مقصد جان کر غصے کے مارے مجمع کا بُرا حال ہو اجا رہا تھا۔ ابھی تک تو وہ اس پکار کو کوئی خاص بات سمجھ کر آگئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں! اس وقت آپ کی بات کاٹنے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ٹوکنے کی پہل ابولہب نے کی۔ اس کے ساتھ ہی یہ لوگ برہم ہونے اور اپنا اپنا وقت ضائع ہونے پر انھیں الزام دیتے ہوئے چھٹ گئے۔ ان لوگوں کے پاس غور کرنے کا وقت تھا نہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت۔ اُس دن کچھ اور تو نہ ہوا البتہ اعلانیہ تبلیغ کا آغاز ہو گیا، پھر معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرِ عام تبلیغ شروع کر دی جس میں توحید کا اعلان کر کے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) باطل معبودوں کی عبادت سے روکتے تھے۔ یہ آواز ایک جانب ایمان میں حرارت پیدا کر کے دلوں کو اس طرح گرما دیتی کہ لوگ اس دین کی کشش سے کھنچے چلے آتے، لیکن دوسری جانب جھٹلانے والوں کو بری طرح سے مشتعل کر دیتی تھی۔ انجام کار جس تیزی سے یہ دین پھیلتا جاتا، اتنی ہی زیادہ اس کی مخالفت ہوتی، لیکن دشمن اسے روک نہ سکے۔ اسلام بہ تدریج پھیلتا گیا اور مسلمانوں کی مختصر سی جماعت بن گئی جن میں سے ہر نفس دینِ حق کے لیے جان پر کھیل جانے کو تیار نظر آتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے عرب کے کہنہ بُت خانوں اور آباء و اجداد کے قدیم معبدوں کو ٹھکرا کر اس دین کے دامن میں پناہ لی تھی۔ اس نئے عقیدے کے بارے میں ان کا استقلال دیکھ کر معززین مکہ حیران ہوتے۔ مکے میں مسلمان ہونے والے متعدد غلام ایسے تھے جن کے آقا کافر تھے اور بنا کسی سبب کے محض ضد میں آکر اس دین سے انکار کر رہے تھے۔ یہ لوگ اپنے غلاموں کو ان کے آبائی دین پر لانے کی کوشش کرتے تو وہ اپنے مشرک آقاؤں کے ہاتھوں دکھ سہنا گوارا کر لیتے لیکن ہر تکلیف کے بعد ان کا ایمان کچھ زیادہ ہی پختہ ہو جاتا۔ ہر اذیت کے جواب میں وہ خدا کی وحدانیت اور رسالت مآب کی رسالت کا کلمہ پڑھتے تو قریش بُری طرح سے چڑ جاتے اور ان

غلاموں پر سختیاں شدید کر دیتے۔ اس زمانے میں معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم باقاعدہ اجتماعات میں جاتے۔ کہیں کھیل تماشوں کے لیے مجمع ہوتا، کہیں بازار لگتے یا چند نفوس یونہی یک جا نظر آتے تو اللہ کے نبیؐ ان کی ہدایت کو پہنچ جاتے اور جُوا، شراب، زنا، دختر کشی اور چوری چکاری ایسی عام بُرائیوں کے خلاف تقریریں کرتے۔ عرب میں عکاظ، ذوالمجاز اور بعینہ کے میلے کئی کئی دن لگتے تھے جن میں نہ صرف عرب قبائل کے لوگ ہی شرکت کرتے بلکہ بیرونی تاجر بھی اپنا اپنا مال لے کر آتے۔ ایسے میں ایک نئے دین کا اعلان اور اپنی ان تمام بُرائیوں کا تذکرہ جو اُن میں عام تھیں، قریش کے مغرور اور خود پسند رُؤسا کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا۔ صدیوں سے وہ ان تعیشات کے عادی تھے۔ اب کسی نے ان کے خلاف آواز بلند کی تھی تو انھیں گوارا نہ تھا۔ وہ اپنی مخالفت کا اظہار تو خوب کرتے لیکن اس دین کی بہ تدریج اشاعت اور مقبولیت انھیں خوف زدہ کر دیتی، تب انھیں اپنا جھوٹا بھرم اور اقتدار سب خطرے میں نظر آنے لگتا۔ یہ صورتِ حال انھی کی نہیں بلکہ اکثر قبائل کی تھی۔ ہر طاقت کو باطل قرار دے کر محض ایک قوّت کو تسلیم کرنا مخالفت کے متعدد اسباب پیدا کر رہا تھا۔ وہ جب بھی جس عقیدے کے بارے میں غور کرتے تو اپنی شان و شوکت کی بقا اور خود ساختہ بڑائی کی حفاظت کے لیے مخالفت کے سوا کوئی راستہ نظر نہ آتا اور پھر ہر طرح وہ اسے اپنے لیے نقصان دہ ہی محسوس کرتے۔

**مخالفت کی وجوہ:** عقیدۂ توحید اور اسلامی تعلیم ان کے ذہنوں کے قطعاً خلاف تھی۔ اس میں ادنیٰ اور اعلیٰ کی کوئی تمیز نہ تھی۔ ابوبکرؓ صدّیق اور عثمانؓ بن عفّان ایسے رئیس اور بلالؓ حبشی ایسے غلام کا مرتبہ ایک تھا۔ ایسے میں عرب کے رئیس خاندان، شرافت و نجابت اور اسلاف کے کارناموں پر فخر کرنے والے اسلامی مساوات کو سراسر اپنی توہین تصوّر کر رہے تھے۔

(۲) عرب کے اکثر قبائل بنو ہاشم سے کد رکھتے تھے۔ بنو امیّہ تو برابر کے حریف تھے۔ ان دو گھرانوں میں عرصۂ دراز سے رقابت چلی آ رہی تھی لہٰذا حریف خاندان کے ایک فرد کی تعلیمات پر عمل کرنا ان کی اَنا اور خودداری کے خلاف تھا۔

(۳) عرب صدیوں سے خوگرِ پیکرِ محسوس تھے۔ اب ایک نادیدہ خدا کو تسلیم کرنا اور اَن دیکھی قوّت کو مالک وخالق مان لینا ان کے نزدیک عقل سے عاری ہونے کی علامت تھی۔ اب بُت پرستی پر وہ اس درجہ قانع ہو چکے تھے کہ کسی مذہب اور کسی عقیدے کو اس سے بہتر تصوّر ہی نہ کرتے تھے۔

(۴) وہ نبوّت کے معنی سے نا آشنا تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کی اصلاح انسان نہیں کر سکتا۔

(۵) عام طور پر وہ سب بے شمار بُرائیوں میں ملوّث، ہر قانون وہر قاعدے سے آزاد اور ہر بندش سے بے نیاز تھے۔ ان کی مسرّتوں کا ذریعہ بے مقصد لڑائیاں اور عیش وعشرت کے سامان تھے۔ ان میں رشتوں کا تقدّس ختم ہو چکا تھا۔ سگی ماں کے سوا ہر عورت ان پر جائز تھی۔ ایسے میں انھوں نے دیکھا کہ نیا قانون ان تمام بُرائیوں سے اجتناب کی تلقین کرتا ہے، ایک قوّت کے لافانی ہونے کا اعلان کرکے سب انسانوں کو برابر کا درجہ دیتا ہے تو وہ ہراساں ہو گئے۔ اس دین کا ہر حکم، ہر قانون ان کے اقتدار اور جھوٹی شان کے لیے ایک کاری ضرب تھا۔

مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر انھوں نے اس دین کی مخالفت کی اور اس پر جم گئے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب وہ کسی چیز کو بہ قائمی ہوش وحواس جھٹلا دے تو اپنی سماعت وبصارت اور فکر کی تمام صلاحیتوں کے دروازے بند کر لیتا ہے۔ اس کیفیت کو دل پر مہر لگنے سے تعبیر کیا جاتا ہے، لہٰذا قریش کے دلوں پر مہریں لگ چکی تھیں۔ دینِ حق کے معاملے میں وہ اندھے، بہرے اور گونگے ہو چکے تھے کہ نہ راہِ حق دیکھ سکتے تھے نہ صحیح بات سُن سکتے تھے۔ اس لیے مخالفت پر اتر آئے۔ مگر کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ انھیں دینِ حق کے سامنے اپنی بے بسی کا اندازہ ہونے لگا تو باہم مشورے کرنے اور سوچنے لگے۔

**وفد:** متفقہ فیصلہ کرنے کے بعد معززینِ مکّہ ابوطالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: "شیخ مکّہ! کیا آپ ان حالات سے ناواقف ہیں کہ آپ کا بھتیجا ہمارے آباء واجداد کے دین کو بُرا کہتا ہے، لوگوں کو ان کی عظمت کے خلاف بھڑکاتا اور بھڑکاتا ہے۔ یہ سراسر ہمارے معبودوں کی توہین ہے لہٰذا آپ اُسے ان

سرگرمیوں سے باز رکھیں ورنہ اسے ہمارے حوالے کردیں تاکہ ہم دو میں سے کسی ایک کا فیصلہ ہوجائے۔"

معززینِ قریش کی یہ گفتگو سننے کے بعد حضرت ابوطالب نے اندازہ لگایا کہ صورتِ حال نازک ہوچکی ہے۔ ان سب کا مقابلہ کرنا بھی مشکل تھا لہٰذا بہتر صورت یہی تھی کہ بھتیجے کو سمجھاتے۔ انھوں نے کہا: جانِ عم! مجھ پر اس قدر بار نہ ڈالو جو میں اٹھا نہ سکوں۔"

محبوب چچا نے حکم دیا تھا یا گزارش کی تھی، معلمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم جان نہ سکے۔ ہاں انھیں محسوس ہوا کہ وہ ہستی جس نے یتیمی کے دَور سے لے کر نبوت کی مشکلات تک زندگی میں ہر لمحے ساتھ دیا تھا، اس کے پائے ثبات میں بھی لغزش آگئی ہے۔ اس کے واضح معنی یہی تھے کہ اب یہ کام انھیں تنہا سرانجام دینا تھا۔ اس بات کا نہیں بلکہ چچا کی بے چارگی کا احساس کر کے وہ دل گرفتہ ہو گئے اور بولے "یا عم! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر آفتاب اور بائیں ہاتھ پر ماہتاب بھی رکھ دیں گے اور اس امر سے روکنا چاہیں گے تب بھی میں دینِ حق کی اشاعت سے دست بردار نہ ہوں گا، یہاں تک کہ یا تو خداوندِ عالم اس کام کو تکمیل تک پہنچا دے یا میں اس راہ میں قربان ہوجاؤں۔"

یہ کہتے ہوئے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی کیفیات کیا تھیں، اس کا اندازہ بس ابوطالب ہی کر سکتے تھے، سو انھوں نے قریش کے تمام مطالبے ٹھکرانے کے بعد آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) سے کہا "جانِ عم! بلا خوف و خطر اپنا کام کرتے رہو، میں تمھارے ساتھ ہوں۔"

اس واقعے کو تاریخ میں مختلف مقامات پر جگہ دی گئی ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ یہ واقعہ ہجرتِ حبشہ کے بعد کا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت اس وقت کی جب وہ کفّار کی کارروائیوں اور ظالمانہ اذیتوں سے تنگ آگئے تھے۔ بہرکیف ابوطالب کے ایک جملے نے ایک جانب آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو اپنا کام جاری رکھنے کی اجازت دے دی تو دوسری جانب اسی ایک جملے نے قریش کے دلوں میں آگ لگا دی۔ وہ حمایت

حاصل کرنے آئے تھے، مگر ابو طالب نے ان کے مطالبات رد کر کے اپنے بھتیجے کی پشت پناہی کا اعلان کر دیا تھا۔ ایک بار وہ پھر جمع ہوئے اور مشورے کرنے لگے۔ ابھی تک کچھ مجبوریاں اور کچھ مصلحتیں تھیں جن کے سبب انھوں نے اس دین کے خلاف باقاعدہ مخالفت کا اعلان نہ کیا تھا اور چپکے چپکے اپنے اپنے غلاموں اور اقربا کو بھی روک رہے تھے۔ وہ مجبوری یہ تھی کہ کچھ ہی عرصے قبل حرب الفجار وقوع پذیر ہوئی تھی اور اس جنگ میں قریش قریب قریب مالی طور پر تباہ ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ چھوٹی چھوٹی خانہ جنگیاں جو اُن کی عادت تھیں، انھیں کم زور کر چکی تھیں لہٰذا وہ اس دین سے خطرہ محسوس کرنے کے باوجود اس کے خلاف خوں ریزی پر آمادہ نہ تھے۔ اس مجبوری کے ساتھ ایک مصلحت بھی تھی، وہ یہ کہ اس زمانے میں مقتول کے قبیلے والے پورے جوش کے ساتھ انتقام لینے کے عادی تھے۔ وہ میدان میں آتے تو جب تک انتقام کی آگ پوری طرح نہ بجھا لیتے، سکون نہ پاتے تھے اس لیے اس دین کے خلاف قتل و غارت کا مطلب یہ تھا کہ عرب کے وہ متعدد قبیلے جن کا ایک ایک دو دو آدمی مسلمان ہو چکا تھا، وہ سب اور خود معلمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خاندان والے بنو ہاشم ان کے مخالف ہو جاتے۔ بہ یک وقت اتنے قبائل کو اپنا دشمن بنانا اور مقابل لے آنا آئینِ سیاست کے خلاف تھا۔ یہی وجوہ تھیں کہ قریش اذیتیں دیتے، مخالفت کرتے، لیکن باقاعدہ اعلانِ جنگ نہ کر سکتے تھے، مگر اب ابو طالب کے جواب نے انھیں مشتعل کر دیا تھا لہٰذا اس دن انھوں نے مکّے کے گلی کوچوں میں باقاعدہ ہنگامے کیے اور جلوس بھی نکالے۔ جنھوں نے پہلے درگزر کیا تھا، وہ بھی آ موجود ہوئے اور ہم فکر و ہم آواز ہو کر اس دین کو ختم کر دینے کے درپے ہو گئے۔ اس وقت ان مخالفت کرنے والوں میں سب سے بلند آواز ابو لہب بن عبد المطلب کی تھی۔ یہ وہی چچا تھا جو کچھ عرصے قبل تک اس رشتے پر فخر کیا کرتا تھا۔ یہ وہی تھا جس نے بھتیجے کی ولادت کی خبر سن کر خبر سنانے والی اپنی پرانی لونڈی کو آزاد کر دیا تھا اور اہلِ مکّہ کے درمیان اس بھتیجے کا تذکرہ کرتے ہوئے جس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا تھا، لیکن اعلانِ وحدانیت سننے کے بعد

اس کا قلب سیاہ ہو چکا تھا۔ شروع دن سے اس نے انکار ہی کو اپنی عادت بنا لیا تھا۔ اب معززینِ مکہ، قریش کے دارالندوہ میں جمع ہوئے تو دینِ حق کے خلاف سب سے بلند آواز ابولہب ہی کی تھی۔ وہ سب معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم کو عاجز کر دینے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ یہ اجتماع چند گھنٹوں کا نہیں تھا بلکہ یہ مشورے کئی دن ہوتے رہے۔ ان دنوں کاروباری مصروفیات، باہمی نااتفاقی خوشی اور غمی کے واقعات سبھی ثانوی بن گئے تھے۔ اہمیت تھی تو نئے دین اور نئے عقیدے کی جس نے ان سب کو اضطراب میں ڈال دیا تھا۔ اس تحریک کو دبانے کے لیے مرد ہی نہیں، عورتیں بھی پُرجوش تھیں۔ ابولہب کی بیوی اُمِّ جمیل اور ابوسفیان کی بیوی ہندہ خواتین میں جوش پیدا کرنے کے لیے مصروفِ عمل تھیں۔

**کفّار کی کاوشیں:** آخر کفّار کا اجتماع اور دارالندوہ میں منعقد ہونے والی محفلیں رنگ لائیں اور اسلام کو پامال کرنے اور معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم کو عاجز و بے بس کر دینے کے لیے وہ سب اس فیصلے پر متفق ہو گئے کہ معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم کا چین اور سکون غارت کرنے کی خاطر ہمہ وقت مصروف رہا جائے جس کے انداز کئی تھے۔ انھوں نے متفقہ فیصلے کے بعد مندرجہ ذیل اعلان کیا۔

(۱) جتنے معززین اس دین میں داخل ہو چکے ہیں، ان کے اقربا اور ورثا کو مجبور کیا جائے کہ انھیں ان کے آبائی دین پر واپس لانے کی ہر تدبیر آزمائیں، یہاں تک کہ وہ نئے دین سے منحرف ہو کر کہنہ معبودوں کی عبادت کرنے لگیں یا اس راہ میں مارے جائیں۔

(۲) جن غلاموں اور بے کس لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے، ان پر اس قدر تشدّد کیا جائے کہ وہ توبہ کر لیں یا ان کا قصّہ پاک ہو جائے۔

(۳) تبلیغ کے وقت معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم کو اس قدر جھٹلایا جائے کہ وہ اپنی بات جاری نہ رکھ سکیں اور مجمع چھٹ جائے۔ ان کے گھر کے باہر کی زندگی میں اس قدر دشواریاں پیدا کی جائیں کہ وہ باہر آنا ہی چھوڑ دیں۔

ان تدابیر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے باقاعدہ کام کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جن لوگوں نے یہ امور سر انجام دینے کا فیصلہ کیا، ان کی پشت پناہی بڑے بڑے سرداروں نے کی۔ اس زمانے میں مکے کا ماحول بڑا عجیب تھا۔ مسلمانوں پر جو جور ستم ڈھائے گئے، وہ خود ایک مکمل تاریخ ہے۔ مسلمان ہونے والے آزاد لوگ تو اپنے اقربا کے ہاتھوں جن حالات کا شکار ہوئے سو ہوئے، لیکن غلاموں کی شدید آزمائش کا دَور جیسے خود ان کے آقاؤں کے ہاتھوں شروع ہو گیا تھا۔ ایسے میں معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت کو روکنے کے لیے بھی کفّار نے ہر قوت آزمالی تھی۔ اوّل تو اسلام کے بدترین دشمن حکم بن عاص، عقبہ بن ابی معیط اور ابولہب، آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے ہمسائے تھے۔ وہ باہر ہی نہیں گھر کے اندر بھی انھیں سکون سے نہ بیٹھنے دیتے۔ کبھی کھانا پک رہا ہوتا تو ہنڈیا میں غلاظت اچھال دی جاتی۔ ابولہب کی بیوی اُمِ جمیل ہر رات جنگل سے خار دار لکڑیاں لاتی اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے دروازے کے باہر اس طرح بچھا دیتی کہ جونہی صبح کے وقت باہر تشریف لائیں تو پائے مبارک لہولہان ہو جائیں۔ یہی زمانہ تھا جب معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بہ بانگِ دہل تبلیغ شروع کی تو ان پر اور ان کے اصحاب پر تشدّد کی انتہا ہو گئی۔ قرابت دار اور ہمسائے طرح طرح سے ستاتے، نت نئے سوال کرتے تو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کبھی تو ٹال جاتے، کبھی نرمی سے کہتے۔

"فرزندگانِ عبدِ مناف! حقِ ہمسائیگی خوب ادا کرتے ہو!"

لیکن کبھی آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) رنجیدہ ہو جاتے، خصوصاً اس وقت جب مشرکین خدائے واحد کے لیے عجیب عجیب انداز سے سوال کرتے۔ حضرت عبد اللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ ان دنوں کفّار یہ سوال کرتے تھے: "ابنِ عبد اللہ! ہمیں اپنے رب کا نسب تو بتائیے!"

کفّار یہ سوال تضحیک کے لیے کرتے تھے۔ اس طرح وہ اللہ اور اللہ کے نبیؐ کا مذاق اُڑاتے تھے۔ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم ان کی کم عقلی پر دل گرفتہ ہو کر انھیں سمجھانا چاہتے تو وہ چھٹ جاتے۔ ان دنوں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) دعوتِ حق کے لیے جہاں بھی جاتے، ابولہب ان کے پیچھے پیچھے چلتا اس وقت آپ

(صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے: "لوگو! خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ میں تمھیں اسی کی عبادت کی ہدایت دیتا ہوں۔ تم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، میری تصدیق کرو۔ میرا ساتھ دو تاکہ میں جس کام کے لیے بھیجا گیا ہوں اسے پورا کرسکوں۔"

ابھی یہ آواز بلند ہوتی کہ عقب سے ابولہب چلّا کر کہتا: "لوگو! یہ شخص ساحر ہے۔ لات وعزّیٰ کی قسم یہ تمھیں تمھارے معبودوں سے پھیر کر اُدھر لے جانا چاہتا ہے جو مذہب اس نے گھڑا ہے لہٰذا اس کی بات نہ سنو۔"

انھی دنوں ذوالمجاز کے بازار میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لے گئے اور لوگوں کو مخاطب کیا: "لوگو! کہو لا الٰہ الّا اللہ تو فلاح پاؤ گے۔"

اس وقت آپؐ کے پیچھے چلتے ہوئے ابولہب نے پتھر مارنا شروع کیے تو آپؐ کی پشت اور شانے خون سے تر ہوکر ایڑیوں کو بھگونے لگے۔

ابولہب نے کہا: "لوگو! اس سے دریافت کرو کہ جس خدا کا ذکر کرتا ہے، وہ سونے کا بنا ہوا ہے یا چاندی کا؟ اور اس کا نسب کیا ہے؟"

یہ اذیتیں دینے والے اور جھٹلانے والے وہ لوگ تھے جن کے سبب مسلمانوں پر مکّے کی زمین تنگ ہوگئی تھی۔ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی سب مقابل آنے لگے۔ جو جس قدر دکھ دیتا خود کو اتنا ہی دلیر اور معزز تصور کرتا تھا۔ اس طرح نبوّت کے پانچ برس گزر گئے۔

**ہجرتِ حبشہ:** مکّے میں اذیتیں حد سے بڑھ گئیں تو معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ اس جانب ہجرت کی دو وجوہ تھیں۔ اوّل یہ کہ حبشہ سے ان کے دوستانہ مراسم اور تجارتی تعلقات رہ چکے تھے۔ نجاشی ایک بامروّت اور سنجیدہ انسان تھا۔ وہ ایک الہامی مذہب کا پیروکار تھا۔ وہ مذہب جس کی تصدیق خود اسلام نے کی تھی اور جس مذہب نے خود اسلام کی خبر دی تھی۔ یہ تعلق بڑا گہرا تھا لہٰذا آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے مسلمانوں کے لیے اس جگہ کا انتخاب فرمایا۔

عافیت و امن کی تلاش میں کافروں کے درمیان سے دوسرے الہامی مذہب

کے پیرو کاروں کی طرف جانے کی ہدایت کرنا گویا ایک درس تھا جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسلام کے اوّلین دَور ہی میں مسلمانوں کو دیا تھا۔ اس کے واضح معنی یہی تھے کہ اہلِ کتاب بہر صورت، کافروں سے بہتر اور لائق اعتبار ہیں۔ دوسری وجہ مکّے کے وہ حالات تھے جو روز بہ روز سنگین صورت اختیار کر رہے تھے۔ زمین تنگ اور زندگی دشوار ہوئی تو انھیں ہجرت کا حکم دیا گیا۔ نبوّت کے پانچویں برس جناب عثمانؓ بن عفان کی سرکردگی میں بارہ مرد اور چار عورتوں کا مختصر سا قافلہ روانہ ہوا۔ خوش قسمتی سے سفر کے دوران میں انھیں دو کشتیاں بھی مل گئیں جنھوں نے نصف دینار کے عوض منزلِ مقصود تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔ جب یہ خبر قریش کو ملی تو وہ ان کے تعاقب میں دوڑے، مگر اس وقت تک وہ سفر شروع کر چکے تھے۔ نتیجتاً تعاقب کرنے والے ناکام لوٹ آئے اور باہمی مشورے کرنے لگے۔ انھیں تو مکّے کے اندر بھی یہ دین گوارا نہ تھا چہ جائیکہ جن جن ممالک میں ان کے تجارتی تعلقات تھے، وہاں اسلام کا پیغام پہنچتا۔ یہ بات ان کے لیے قطعی ناقابلِ برداشت تھی۔

ابھی وہ مشورے کر ہی رہے تھے کہ کچھ ہی عرصے کے بعد مسلمانوں کے دوسرے قافلے نے حبشہ کی راہ لی۔ تراسی مرد اور اٹھارہ عورتوں کا یہ قافلہ جعفرؓ بن ابی طالب کی سرکردگی میں روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ ابو سفیان کی دختر اُمّ حبیبہؓ اور ان کے شوہر عبیدؓ اللہ بھی تھے۔ اس بار پھر قریش میں ایک ہلچل مچ گئی۔ تعاقب کی مقدور بھر کوششیں کی گئیں، لیکن وہ اس بار بھی کفِ افسوس ملتے رہ گئے اور جانے والوں کی ایک بڑی تعداد ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس ناکامی کا الزام وہ آپس ہی میں ایک دوسرے کو دیتے ہوئے اس صورتِ حال کے سدّباب کے لیے پھر سے مشورے کرنے لگے۔ ان کے لیے یہ بات بڑی اذیت ناک تھی کہ حبشہ میں مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت امن سے زندگی بسر کر رہی تھی۔ یہ خیال ان سرداروں کو اپنی توہین کا احساس دلاتا۔ وہ سوچتے کہ جس دین کو وہ ملک کے اندر ختم کرنا چاہتے تھے وہ دُور دُور پہنچ رہا تھا۔ ان دنوں وہ سب انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔ روزانہ مشورے ہوتے اور مہاجرین کے خلاف تدبیریں سوچی

جائیں۔ آخر کار فیصلہ ہوا کہ یہ بات نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہے۔ اگر خاموش بیٹھ گئے تو مسلمانوں کا حوصلہ بڑھ جائے گا لہٰذا کسی کو نجاشی کے دربار میں روانہ کیا جائے جو اس کے سامنے مسلمانوں کے جرائم ثابت کر کے ان کی واپسی کی درخواست کرے۔ اس طرح جب مسلمانوں کو وہاں سے خارج کر دیا جائے گا تو باقی لوگ یہ دین اختیار کرنے یا فرار ہونے کی ہمت نہ کر سکیں گے۔

## سُفرائے قریش

عمرو رضؓ بن العاص کی سرکردگی میں ایک سفارت تیار ہوئی جس کا اہم کارکن عبد اللہؓ بن ربیعہ کو مقرر کیا گیا۔ اس وقت عمرو رضؓ بن العاص کے بلیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا کہ نجاشی کے دربار میں جا کر مسلمانوں کے جرائم کو ثابت کرنے اور مذہب کو ڈھونگ بتا کر انھیں سزا دلوانے۔ اس وفد کا ہر شخص خود کو اہم سمجھ رہا تھا اور قیمتی تحائف کے ساتھ بڑی شان کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ جس وقت مشرکین کا یہ وفد حبشہ پہنچا تو پہلے نجاشی کے درباریوں اور پادریوں سے ملا، ان کی خدمت میں تحائف پیش کیے، انھیں اپنی ہم نوائی پر آمادہ کیا اور دوسرے دن کا وقت لے لیا۔ یہ دن تمام سُفرائنے پوری تیاری کرنے میں صَرف کیا اور دوسرے دن نجاشی کے دربار میں حاضر ہو کر حاضری کی تمام رسمیں ادا کیں۔ اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے عمروؓ بن العاص نے عرض کیا: "اے عالی مقام بادشاہ! ہمارے ملک سے کچھ مجرم بھاگ کر آپ کے ملک میں آگئے ہیں۔ ہماری گزارش ہے کہ انھیں ہمارے حوالے کر دیجیے تاکہ ہم انھیں واپس لے جائیں۔"

نجاشی ایک سنجیدہ انسان تھا۔ اس نے کوئی فیصلہ صادر کرنے سے قبل مسلمانوں کو دربار میں طلب کیا اور مکّے سے فرار ہو کر آنے کی وجہ دریافت کی۔

اس وقت جعفرؓ بن ابی طالب مسلمانوں کی جانب سے گفتگو کے لیے آگے بڑھے اور فصیح و بلیغ تقریر کی: "اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے۔ بُت پرست تھے، مُردار کھاتے اور بدکاریاں کرتے تھے، ہمسائیوں کو ستانا، بھائی کا بھائی پر ظلم کرنا، ایک دوسرے کا حق مارنا، دختر کشی کرنا عام تھا اور حال یہ تھا کہ ہم اپنی ان بُرائیوں پر فخر کیا کرتے تھے۔ جب ہماری بُرائیاں حد سے

بڑھ گئیں، ہم میں انسانیت کا کوئی نشان باقی نہ رہا، کوئی قاعدہ اور قانون نہ رہا تو ایسے میں خدا نے ہم میں ایک بزرگ ہستی کو مبعوث کیا جس کے حسب نسب، صداقت اور سچائی کی برابری قوم کا کوئی فرد نہ کر سکتا تھا۔ اس کی ان خوبیوں کی معترف ساری قوم تھی۔ اس نے ہمیں توحید کی تعلیم دی، شرک اور بُت پرستی سے بچنے کی تلقین کی، سچ بولنے، عہد پورا کرنے اور نماز پڑھنے کی تعلیم دی۔

ہمارا جرم صرف اس قدر ہے کہ ہم اس نبیؐ پر ایمان لے آئے اور محض ایک خدا کو مالک و خالق مان لیا۔ اب ہماری قوم چاہتی ہے کہ ہم خدائے واحد و لاشریک کی عبادت نہ کریں بلکہ پہلے کی طرح مٹی، پتھر اور لکڑی کے لاتعداد بُتوں کو پوجیں اور خود ساختہ معبودوں کی پرستش کریں اس لیے یہ لوگ ہمیں اذیتیں پہنچاتے رہے اور طرح طرح سے ستاتے رہے۔ ان کے مظالم سے بچنے ہی کے لیے ہم نے آپ کے ملک میں پناہ لی ہے۔"

حضرت جعفرؓ بن ابی طالب مختصراً گزشتہ پانچ سالہ حالات سُنا کر خاموش ہو گئے تو نجاشی بہت متاثر ہوا۔ اس نے مشرکین کے وفد کے قائد کی طرف دیکھ کر دریافت کیا۔ "اس جرم کے سوا جو اس جوان نے بیان کیے ہیں، ان لوگوں کا کوئی اور جرم بھی ہے؟"

عمروؓ بن العاص نے کہا: "نہیں، اس جرم کے سوا ان لوگوں کا کوئی اور قصور نہیں ہے۔"

نجاشی نے اسی لب و لہجے اور انداز میں پھر پوچھا: "کیا ان لوگوں میں سے کوئی تمہارا غلام ہے؟"

عمروؓ بن العاص نے کہا: "نہیں، ان میں کوئی ہمارا غلام نہیں ہے۔"

نجاشی نے ان معلومات کے بعد جعفرؓ بن ابی طالب کو دیکھا اور کہا: "مجھے وہ کلام سناؤ جو تمہارے نبیؐ پر نازل ہوتا ہے۔"

اس وقت جعفرؓ بن ابی طالب نے سورۂ مریم کی چند آیات پڑھیں تو نجاشی پہ رقت طاری ہو گئی۔

"خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل مقدس ایک ہی چراغ کا پرتو ہیں۔" نجاشی نے کہا۔

منکرین پیچ وتاب کھاکر رہ گئے، لیکن انھیں علم نہ تھا کہ یہ نجاشی کا نہیں، خدا کا فیصلہ تھا کہ وَاعْلَمُوا اَنَّکُمْ غَیْرُ مُعْجِزِ اللّٰہِ وَاَنَّ اللّٰہَ مُخْزِی الْکٰفِرِیْنَ ۝ (یاد رکھو تم اللہ تعالیٰ کو نہیں ہرا سکتے۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کافروں کو رسوا کرے گا)

اس دن نجاشی نے مشرکین کے وفد کو دربار سے چلے جانے کا حکم دے دیا۔ جس سے سفرا شدید مشتعل ہوئے، لیکن عمرو رضؓ بن العاص کی سیاست دانی کا جواب نہ تھا۔

اس وقت ایک اور چال چلی گئی اور دوسرے دن پھر دربار تک رسائی پاکر نجاشی کے حضور پہنچے اور کہا: "عالی مقام بادشاہ! کیا آپ جانتے ہیں کہ مسلمان جنابِ مسیحؑ کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟"

یہ سوال واقعی بڑا اہم تھا۔ نہ صرف نجاشی بلکہ دربار میں موجود تمام درباری مسلمانوں کا عقیدہ جاننے کے مشتاق تھے۔ ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کو بھرے دربار میں طلب کیا گیا اور اس بار یہ سوال ان کے لیے واقعی اضطراب آمیز تھا کیوں کہ ایک طرف قرآن نے ان تمام باطل خیالات کو جھٹلا دیا تھا جنھیں مسیحی اپنا ایمان بنائے بیٹھے تھے، دوسری طرف بھرے دربار میں ان کا اعلان کر دینا گویا پوری مسیحی قوم کی مخالفت کرنے کے مترادف تھا، لیکن نتیجہ جو بھی ہوتا، حق گوئی ان کا شعار اور رضائے الٰہی ان کا مقصد تھا۔ اسی سبب جعفر رضؓ بن ابی طالب نے بلا تامل کہا: "عیسیٰؑ ابن مریم، اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور خدا کی جانب سے ایک روح، ایک کلمہ جسے خدا نے مقدس مریم پر القا کیا تھا۔"

اس وقت دربار میں موجود دینِ مسیحؑ کے علما پیچ وتاب کھا رہے تھے کیوں کہ یہ عقیدہ ان کے ایمان کے بالکل خلاف تھا۔ ان کا مشتعل انداز دیکھ کر مشرکین مکہ بڑے پُر امید تھے کہ جو کل نہ ہو سکا، وہ آج ہو جائے گا۔ غرض کہ سبھی کی نظریں نجاشی پر مرکوز تھیں اور وہ اُس کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے کہ نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا: "خدا کی قسم جو کچھ بھی تم نے کہا، جنابِ مسیحؑ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں تھے۔" اس کے بعد اس نے قریش کے لائے ہوئے تحائف انھیں واپس کیے اور انھیں چلے جانے

کا حکم دیا، پھر بولا "یہ سب لے جاؤ میں رشوت نہیں لیتا"۔

ایک مرتبہ پھر قریش ناکام لوٹے۔ اس ناکامی نے اہلِ مکّہ کو بڑی طرح ہراساں کر دیا۔ مسلمان، حبشہ میں بہ اطمینان رہیں اور خدائے واحد کی عبادت کریں، یہ بات انھیں کسی طور گوارا نہ تھی۔ دوسرے یہ بات اسلام کے لیے ایک سہارا تھی۔ جو لوگ ابھی تک متوجّہ نہ تھے، وہ اب اس دین کی طرف توجّہ دینے لگے تھے۔ ضمنی طور پر کہیں عمرؓو بن العاص موضوعِ گفتگو بن رہے تھے، کہیں نجاشی اور نجاشی کا دربار، لیکن اصل موضوع ہر جگہ اسلام ہی تھا۔ جہاں دو چار جمع ہوتے، مشورے ہونے لگتے۔ کئی یوم انھی حالات کی نذر ہو گئے، پھر مدبّرینِ مکّہ کے متفقہ فیصلوں کے بعد اس بار ایک نیا انداز اختیار کیا گیا اور طے پایا کہ اگر صرف ایک ہستی پر قابو پا لیا جائے تو اس دین کی اشاعت بھی رک سکتی ہے اور مسلمانوں کا زور بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ اس بات پر سب مطمئن ہو گئے اور نیا انداز اختیار کیا گیا۔

## قریش کے مطالبات

اس بار سب سے پہلے قریش کا معمّر آدمی عتبہ اس گفتگو کے لیے منتخب کیا گیا۔ وہ اپنے علم اور گویائی میں ثانی نہ رکھتا تھا۔ ایک دن وہ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی خدمت میں آیا اور عرض کیا "برادر زادے! اگر تم نیا دین پھیلانے کے پسِ پردہ دولت چاہتے ہو تو ہم تمھیں بے شمار دولت دینے کے لیے تیار ہیں۔ اگر تم حکومت کے طلب گار ہو تو ہم تمھیں تمام عرب کا بادشاہ تسلیم کیے لیتے ہیں۔ اگر تم کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق جوڑنے کے خواہش مند ہو تو اس سے بھی انکار نہیں۔ ہم اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان میں تمھاری شادی کرائے دیتے ہیں۔ اگر تم پر کسی جادو یا سحر کا اثر ہے تو اس کا بھی علاج کرایا جا سکتا ہے مگر تم ہمارے آبائی دین کو خراب نہ کرو اور اپنا یہ طریقۂ حیات ترک کر دو کیوں کہ سچ جانو، اس بات سے ہمیں بڑی اذیّت ہوتی ہے کہ ہمارے کہنہ معبودوں کی بے حرمتی کی جائے۔" اتنا کہنے کے بعد عتبہ خاموش ہو گیا۔

اس وقت خدمتِ اقدس میں موجود مسلمانوں کو اس کی یہ پیشکش سخت

گراں محسوس ہوئی، مگر انھوں نے معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے روئے مبارک کی جانب دیکھا۔ جہاں ہمیشہ کی طرح تحمّل اور بردباری تھی۔

عتبہ کے خاموش ہو جانے پر اس پیکرِ اخلاق نے بڑے مشفقانہ انداز میں کہا "میرے بارے میں آپ کی کوئی بات بھی درست نہیں ہے۔ بہ خدا مجھے مال و دولت، عزّت و شہرت اقتدار اور حکومت میں سے کچھ بھی درکار نہیں اور نہ میں مریض ہوں۔ نہ خللِ دماغ کا شکار۔ ہاں اگر آپ میرے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو سنیے!" یہ کہنے کے بعد معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے سورۂ حٰم کی چند آیات کی تلاوت کی تو عتبہ حیرانی کے عالم میں بیٹھا رہ گیا۔ یہاں تک کہ آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم خاموش ہو گئے۔

عتبہ سکوت کے عالم میں بیٹھا رہا، پھر کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلا گیا۔ جس وقت وہ قریش کی محفل میں واپس پہنچا تو وہ سب اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے کہا "مکّے کے معزّز سردارو! میرا خیال ہے کہ تم ابنِ عبداللہ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔"

یہ مشورہ ان سب نے حیرت سے سنا۔ انھیں لگا کہ عتبہ کی حالت میں تبدیلی آگئی ہے۔

پھر وہ سبھی استفسار کرنے لگے۔ تو چند ساعت سنجیدہ رہنے کے بعد عتبہ نے کہا "دوستو! آج جو کلام میں نے سنا ہے، نہ وہ سحر ہے نہ جادو، نہ شعر ہے، نہ کہاوت بلکہ وہ ایک ایسا کلام ہے جو میں نے کبھی نہیں سنا۔"

قریشی سردار دیر تک عتبہ کا مذاق اڑاتے رہے، لیکن انھیں محسوس ہوا کہ انھوں نے جہاں سے سفر شروع کیا تھا، وہیں موجود ہیں۔ وہ ابھی اپنے پچھلے طریقوں پر قائم تھے، یعنی وہی کمزوروں پر ستم، وہی فرضِ تبلیغ میں رکاوٹ اور وہی سرِعام اللہ کے نبیؐ کو جھٹلانا اور ان کا مضحکہ اُڑانا۔ اب ان کی پیشکش کو پائے استحقار سے ٹھکرایا گیا اور عتبہ ایسا معمّر شخص بھی ایک مشورہ دے کر چلا گیا تو مشرکین نے ایک نئی ترکیب سوچی کہ اس بار پیشکش نہیں، مطالبات کیے جائیں۔ اگر وہ نبوّت میں صادق ہیں تو یہ مطالبات ضرور پورے کریں گے۔

## عاجز کر دینے کی کاوشیں

وہاں موجود ہر شخص نے اس فیصلے کی تائید کی۔ انھوں نے اسی دن دربارِ رسالت میں اپنا ایلچی بھیجا اور کہا کہ معززینِ مکّہ، کعبے میں آپ سے گفت و شنید کے لیے جمع ہیں۔ اتنا سننے کے بعد معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو قدرے اطمینان ہوا۔ کئی یوم سے مکّے میں کوئی اجتماع نہیں ہوا تھا کہ وہ فرضِ نبوّت ادا کرتے یا خدا کی وحدانیت کا تذکرہ کرتے۔ اب جو رشد و ہدایت کا موقع ملا تو وہ بلا تامّل روانہ ہو گئے۔ اس وقت کعبے کے اندر معززین کی محفل جمی ہوئی تھی جن میں چند بڑے بڑے اور نام ور سردار بھی موجود تھے۔ ان میں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے عم زاد حارث بن عبدالمطّلب کا فرزند ابوسفیان بن حارث تھا جو شاعری میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا اور اب تک متعدّد بار آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی ہجو لکھ کر داد وصول کر چکا تھا۔ دوسرا ہبیل بن عمرو پختہ عقیدے کا بُت پرست تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ انسان کی ہدایت کے لیے انسان نہیں آ سکتا۔ تیسرا ابوجہل تھا جو اپنی دانش مندی اور بردقت ذہانت کے سبب ابوالحکم مشہور تھا۔ چوتھا ابوسفیان بن حرب تھا جو خاندانِ بنو اُمیّہ کا معزز اور صاحبِ علم انسان تھا اور نسلاً بنو ہاشم سے رقابت ہونے کے سبب اعترافِ حق کو اپنی توہین تصوّر کرتا تھا۔ اسلام سے انکار کا بڑا سبب بھی یہی خاندانی چپقلش اور رقابت تھی۔ ان معززین میں پانچویں شخصیت ابولہب کی تھی جو اسلام کے اوّلین دن سے مضحکہ اُڑانے اور جھٹلانے کا تہیّہ کر کے آج تک پوری طرح اس پر قائم تھا بلکہ شاید مکّے کے معززین میں یہی فرد تھا جس نے اپنی تمام صلاحیتیں استعمال کر کے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو ہر دُکھ پہنچایا تھا۔ ان کے علاوہ چند اور سردار بھی جمع تھے کہ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کعبے میں داخل ہوئے۔

ابتدائی گفتگو کے بعد وہ اصل مقصد پر آئے اور کسی نے کہا "ابنِ عبداللہ! آج ہم نے تمھیں اس لیے بُلایا ہے کہ تم پر اپنی وہ مشکلات آشکار کر دیں جو ساری قوم پر صرف تمھاری بدولت آئی ہیں۔ ہماری نظر سے کوئی شخص ایسا نہیں گزرا جس نے اپنی قوم کے لیے وہ مصائب پیدا کیے ہوں جو تم نے کیے۔ اس بات کو برسوں

گزر گئے، لیکن ان مصائب میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ہم اس صورتِ حال سے تنگ ہی نہیں بلکہ عاجز آ گئے ہیں۔ ہمارے ضبط کی انتہا ہو چکی ہے للذا آج تمھیں یہ وضاحت کرنا ہو گی کہ اس نئے دین کا ڈھونگ رچا کر آخر تم چاہتے کیا ہو؟ ہم اپنے اسلاف کے معبودوں کے لیے ایک لفظ بھی نہ سنیں گے۔ یہ بات ہم سب کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔"

اس وقت مجمع پر سکوت طاری تھا۔ یہ سوال کرنے کے بعد سبھی رخِ انور کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے جواب طلب کر رہے ہوں۔ ایسے میں عرب کے اس روشن ضمیر آقا کے چہرے پر وہ رنگ تھا جیسے کوئی استاد مدّتوں درس دینے کے بعد بھی شاگرد کو کم علم پاتا ہے۔ اس وقت آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی آنکھوں میں دُکھ کے سائے تھے جیسے کہہ رہے ہوں کہ اے قریش! تم نے کچھ بھی نہ سمجھا، لیکن یہ کہنے کی بجائے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے فرمایا "یہ سوال چند یوم قبل بھی تمھاری جانب سے کیا گیا تھا۔ میں نے اس وقت بھی یہی جواب دیا تھا اور اب بھی یہی کہوں گا کہ میری تعلیم نہ حصولِ زر کے لیے ہے، نہ جاہ و اقتدار کے لیے۔ نہ ہی میں مریض ہوں، نہ سحر زدہ بلکہ خدائے واحد و لاشریک نے مجھے تمھاری اصلاح و ہدایت کے لیے رسولؐ بنا کر بھیجا ہے۔ میں تمھاری طرح ہی ایک انسان ہوں جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام اتارا ہے۔ تم اگر میری تعلیمات پر عمل کرو گے تو دین اور دنیا میں تمھاری بھلائی ہے اور آخرت کا سرمایہ تمھارے لیے ہے، لیکن اگر تم خدا کی وحدانیت سے انکار کرو گے تو دائمی عذاب ہے اور میں تمھارے لیے اسی قادرِ مطلق کے حکم کا منتظر ہوں۔"

معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی بات تمام کی تو ابو جہل نے چلّا کر کہا۔ "ابنِ عبداللہ! تم بار بار خدا کے عذاب کا ذکر کرتے ہو۔ اگر سچے ہو تو ذرا اپنے خدا سے کہو کہ آسمان کا ایک ٹکڑا ہی ہم پر گرا دے ورنہ ہم اس پر کبھی بھی ایمان نہ لائیں گے۔"

اس وقت معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم سکوت کے عالم میں تھے اور کفّار طرح طرح سے مطالبات کر رہے تھے۔

ابن حارث نے کہا "ابنِ عبداللہ! تم اپنے خدا سے کہو کہ تمھارے دائیں بائیں فرشتے مقرر کردے جو تمھاری سچائی کی گواہی کے لیے لوگوں سے کہتے رہیں کہ اس کی مخالفت نہ کرو یہ سچا نبی ہے۔"

پھر تو سبھی اٹھ اٹھ کر باتیں بنانے لگے۔ کسی نے کہا "اگر تم سچے نبی ہو تو اپنے خدا سے کہہ کر اہلِ عرب کی پانی کی تنگی دُور کرا دو اور کہو ان پہاڑوں کو سامنے سے ہٹا کر اس میدان میں شام و عراق ایسی نہریں جاری کردے یا ہمارے آباء واجداد کو زندہ کر کے قصی بن کلاب سے تمھاری نبوت کی تصدیق کرا دے ورنہ ہم ایمان نہ لائیں گے۔"

کوئی بولا "ذرا اپنے خدا سے کہہ کر اپنے لیے اعلیٰ حیثیت ہی طلب کر لو تاکہ تم اندازِ بود و باش سے پیغمبر نظر آؤ۔"

کسی نے کھڑے ہو کر زور سے کہا "ابنِ عبداللہ! دیکھو تمھیں جھٹلانے کے بعد ہم سبھی عذابِ جہنم کے مستحق ہو چکے ہیں۔ اب لے آؤ نا وہ قیامت جس سے تم ہمیں برسوں سے ڈرا رہے ہو۔"

غرض کہ کفار طرح طرح سے عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے اور چاروں طرف سے مذاق اُڑانے کو ٹوٹے پڑتے تھے۔ اس کا جواب اللہ کے نبیؐ نے نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے دیا۔ ارشاد ہوا۔ سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۝ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۝

(ترجمہ: مانگنے والے نے عذاب طلب کیا۔ وہ عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے کافروں کے لیے جسے کوئی دفع کرنے والا نہیں)

یہ بات معلمِ اعظمؐ خود سمجھ سکتے تھے، لیکن ان لوگوں کو سمجھا نہیں سکتے تھے جن کا مقصد سمجھنا نہیں بلکہ بھڑکانا تھا۔ درحقیقت کفار کی یہی محفل تھی جس کے بعد اہلِ مکہ عام طور پر یہ ذکر کرنے لگے کہ ہر پیغمبر کی کوئی نہ کوئی نشانی ضرور ہوتی ہے۔ جنابِ صالحؑ کی اونٹنی، موسیٰؑ کا عصا اور جنابِ مسیحؑ مُردوں کو زندہ کرتے تھے لیکن ابنِ عبداللہ ایسا کوئی کام نہیں کرتے۔ بس ان کے سچے نہ ہونے کی سب سے بڑی علامت یہی ہے۔ تمسخر اُڑانے والوں کے ہاتھ یہ بات آ گئی تو انھوں نے اپنی

کارروائی تیز کر دی۔ انھیں مذاق اڑانے کے لیے ایک اور راہ مل گئی۔ وہ معجزے طلب کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے "اے قریش! میں ان کاموں کے لیے نبی بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ میں تو خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے تمھیں پیغام سنانے کے لیے آیا ہوں۔ وہ جو تمھیں کھلی کھلی ہدایات دیتا ہے۔ عمل کرو گے تو فلاح پاؤ گے ورنہ خدا تمھارے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے"۔

اس وقت بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی جواب دیا تو مشرکین مکہ جز بز ہو کر رہ گئے۔ پھر وہ ہر روز اشتعال دلانے والی حرکتیں کرنے لگے۔ گفتگو میں ادب و احترام اور شائستگی ختم ہو گئی تھی۔ تکلیف دینے کے جدید سے جدید طریقے رواج پا رہے تھے۔ یہ انداز محض عام مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی تھے۔ جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نماز پڑھتے تو پیٹھ پر وزن رکھ دیا جاتا۔ کبھی گلے میں چادر ڈال کر اسے اس قدر بل دیے جاتے کہ سانس گھٹ جاتا۔ غرض کہ مکے کے ہر شخص کا حال یہ تھا کہ جس کی جتنی ہمت تھی، وہ اسلام کی اشاعت کو روکنے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایذا دینے کے لیے صرف کر رہا تھا، لیکن مشرکین کی کوشش بھی اشاعتِ حق میں رکاوٹ نہ بن سکتی تھی۔ عجیب بات تھی کہ استہزا کرنے والے معجزے طلب کرتے اور چاندی سونے کے خزانے مانگتے۔ اس وقت ان لوگوں کے نزدیک سب سے بڑا معجزہ پہاڑوں کو ہٹا کر سامانِ عیش طلب کرنا تھا۔ انھیں علم نہ تھا کہ جس دین کو وہ جھٹلا رہے ہیں، کچھ عرصے کے بعد اسی کے نام لیوا جبرالٹر سے کوہ قاف تک کے تمام پہاڑوں کو روند ڈالیں گے اور اسے معجزہ یا نبوت کی شان نہیں بلکہ دینِ حق کی برکت تصور کریں گے، لیکن اس وقت تو ان سب کے مطالبات واضح نشانی ہی تھے۔ ادھر وہ مصر تھے، ادھر ارشادِ ربانی تھا۔ "اے نبیؐ! حقیقت یہ ہے کہ ان کفار میں سے ہر شخص یہ آرزو کرتا ہے کہ اس کے پاس کھلی ہوئی کتاب آئے اور ایسا ہرگز نہیں ہوگا کیوں کہ دراصل ان لوگوں کو آخرت کا کوئی خوف ہی نہیں ہے"۔

معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اسی سے بچانا چاہتے تھے لہٰذا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نرمی سے فرماتے "اے میری قوم! میری تعلیم میں ہی سب نشانیاں موجود

ہیں اور قرآن اس دین کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔"
اس کا اندازہ تو دانش مند لوگ ہی کر سکتے ہیں، سو ایسے بھی موجود تھے اور یومیہ ایک دو حاضرِ خدمت ہو کر اس آزمائش میں مبتلا ہو جاتے جو اسلام کے اوّلین دَور میں ایمان لانے والوں کا مقدّر تھی۔

## بزم مقدّس

اس زمانے میں دارالارقم معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی قیام گاہ اور مسلمانوں کے لیے ایک درس گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں پر صحابہؓ کرام خدمتِ اقدس میں حاضر رہتے، دین کی تعلیم حاصل کرتے اور جہاں جہاں رسائی ہوتی، اس کا پرچار کیا کرتے۔ اس طرح ہر روز اس مقدّس بزم کے شرکاء میں اضافہ ہو جاتا تھا اور یہ عمل ایسا نہ تھا کہ نظر انداز کر دیا جاتا۔ ایسے میں مکّے کے ان رئیسوں کی عقل ٹھکانے نہ رہتی۔ انہیں لگتا کہ ان کی تمام کاوشیں اُلٹ ثابت ہو رہی ہیں۔ ان کا کوئی عمل بھی مسلمانوں کے پائے استقلال میں جنبش پیدا نہیں کر سکا اور کوئی حربہ بھی دینِ حق کی اشاعت کو نہیں روک سکا تھا۔ وہ بری طرح جھنجلا گئے۔ عقیدۂ شرک کی بدولت ان میں عام خیال بھی پیدا ہوا کہ ان کی یہ مسلسل ناکامی کسی جادو یا سحر کا نتیجہ ہے۔ تب وہ کاہنوں کو طلب کرنے لگے۔ جس کی جہاں جہاں رسائی تھی، جاتا اور جو کر سکتا تھا کرتا۔ ان دنوں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو تکلیف دینا ان لوگوں نے اپنا مقصد بنا لیا تھا۔ ان کے انداز بھی دل شکن ہوتے اور موضوعات بھی۔ غرض کہ نبوّت کا یہ دَور شدید مشکلات کا دَور تھا۔ تبلیغ میں مزاحمتوں کے پہاڑ حائل تھے۔ ایک ہستی کے خلاف دشمنی کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بعض اوقات تو مسلمانوں کو مایوسیاں گھیر لیتیں اور خود معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی مضطرب ہو جاتے۔ یہی اضطراب تھا جسے دور کرنے کے لیے اُس زمانے میں وہ سورتیں نازل ہوئیں جو پیش گوئی بھی تھیں اور ہمّت افزائی کے لیے تسلّیاں بھی لہٰذا سورۂ الضحیٰ اسی دَور میں نازل ہوئی اور ارشاد ہوا" قسم ہے روزِ روشن کی اور رات کی جب کہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے (اے نبیؐ) تمھارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا۔

دبے یارو مددگار) نہ وہ تم سے ناراض ہے۔ یقیناً تمھارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے اور عنقریب تمھارا رب تمھیں اتنا عطا کرے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔"

اس تسلّی کے ساتھ نعمت کا احساس بھی دلانا تھا اور رہدایت بھی ضروری تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب اللہ کے نبیؐ نے اللہ کی وحدانیت کا اعلان کیا تھا۔ کل تک جو انسان اپنی قوم میں صادق اور امین کہلاتا تھا، اب محض دعوتِ اسلام کے سبب کاہن اور ساحر گردانا جا رہا تھا۔ ہمسائے اور رشتے دار بڑھ بڑھ کر آوازے کستے اور جس کا جو دل چاہتا کہہ دیتا۔ تب آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) خود ان کے اور اپنے بارے میں پریشان ہو جاتے۔ ایسے میں ربِ کائنات نے پہلے اُن اوصاف کا احساس دلایا جو انھیں عطا فرمائے تھے۔ اس کے لیے سورۂ اَلَم نَشرح نازل ہوئی اور قادرِ مطلق نے دریافت کیا "اے نبیؐ! کیا ہم نے تمھارا سینہ تمھارے لیے کھول نہیں دیا اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ اُتار دیا جو تمھاری کمر توڑ رہا تھا اور تمھیں رفعت دی۔ تمھارا آوازہ بلند کر دیا۔ پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے اور مشکل کے بعد آسانی بھی لہٰذا جب بھی فراغت پاؤ عبادت میں مصروف ہو جاؤ اور اپنے رب کی طرف راغب ہو جاؤ۔"

دراصل یہی وہ تسلّیاں تھیں جنھوں نے ان حالات میں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو وہ مصائب برداشت کرنے کی ہمّت بخش دی جنھیں برداشت کرنا ناممکنات میں سے تھا لہٰذا آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ان سب سے گزرتے اور دینِ حق کی تبلیغ کا فرض ادا کرتے رہے۔ کفر کی تمام قوتیں مدافعت کرتی رہیں۔ اہلِ مکّہ اپنی تمام تر قوّتیں مسلمانوں کے خلاف استعمال کر رہے تھے۔ ہر شخص مصروفِ پیکار اور اپنی اپنی کارکردگی کا ثبوت دینے کے لیے زیادہ سے زیادہ تبلیغی امور میں رکاوٹ بنتا، لیکن ربِ کائنات کا وعدہ تھا کہ وَرَفَعنَا لَکَ ذِکرَکَ لہٰذا یہ ذکر بلند ہو رہا تھا۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو رفعت مل رہی تھی۔ دینِ حق پھیل رہا تھا۔ روز ایک نہ ایک شخص حاضرِ خدمت ہوتا

اور وحدانیت کا اعتراف کر کے باطل کی ہر قوّت اور ہر عمل کو جھوٹا ثابت کر دیتا۔
اس طرح وقت گزرتا رہا اور نبوّت کو چھ برس ہو گئے۔

## حمزہؓ بن عبدالمطلب ۶ سالِ نبوّت (۶۱۷ء)

ایک دن ابوجہل معززینِ مکّہ کی محفل سے بہت مشتعل انداز میں اٹھ کر چلا۔ اس نے کوہِ صفا کے نزدیک معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھا تو مزید بھڑک اٹھا اور بدکلامی کرنے لگا۔ شروع میں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے درگزر فرمایا مگر وہ غلیظ گفتگو پہ آتے آتے حد سے گزر گیا اور ایک پتھر اٹھا کر اس زور سے مارا کہ سرِ مبارک سے خون جاری ہو گیا۔ یہ خبر فوراً ہی مکّے میں پھیل گئی اور حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کے حق کی طرف مائل ہونے کا سبب بن گئی۔ یہ نبوّت کا چھٹا برس تھا اور کفّار کی اسلام دشمنی باقاعدہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ کفّار جماعتوں میں تقسیم ہو کر کام کرتے اور ان کی ہر زیادتی اور ستم کو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) تحمّل کے ساتھ درگزر فرماتے تھے۔ یہ تمام حالات حمزہؓ بن عبدالمطلب سے چھُپے ہوئے نہ تھے جو رشتے میں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے چچا اور عمر میں صرف چند برس کا فرق ہونے کے سبب بے پناہ محبّت کرتے تھے۔ علاوہ ازیں رضائی بھائی بھی تھے اور خالہ زاد بھی۔ ان کا شغل سپہ گری تھا۔ جن دنوں مصروفیّت نہ ہوتی، وہ شکار بھی کرتے۔ اہلِ مکّہ سے ان کے تعلّقات بھی اچھے تھے اور ان چھ برس کے حالات بھی نظر میں تھے۔ اب جو ابوجہل نے اس گستاخی کا مظاہرہ کیا تو کنیز کی زبانی یہ رُوداد سن کر مضطرب ہو گئے۔ پہلے تیر کمان لیے اس کے پاس پہنچے اور پھر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ یہ وقت مشرکین پر بہت بھاری تھا۔ وہ نئے سرے سے انھیں زک دینے کی سوچنے لگے۔ اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے عمرؓ ابن الخطّاب کا انتخاب کیا گیا۔

## عمرؓ ابن الخطّاب ۹ سالِ نبوّت (۶۱۹ء)

عمرؓ عرب کے جوشیلے جوان تھے۔ قبیلۂ بنو عدی کی یہ متحرّک ہستی اسلام سے ناواقف نہ تھی البتّہ اپنے گھرانے کے ایمان لانے والوں سے بیگانہ ضرور

تھی۔ سعیدؓ بن زید ان کے بہنوئی اور نعیمؓ بن عبداللہ ان کے قریبی رشتے دار تھے۔ دونوں ہی حق سے آشنا ہو چکے تھے، لیکن اس کا اعلان نہ کیا گیا تھا۔ اس دن عمرؓ ابن الخطّاب جوش میں آئے اور تلوار لے کر روانہ ہو گئے۔ اس وقت ان کے قدم دارالارقم کی طرف اٹھ رہے تھے اور قریش ان کی کامیاب واپسی کے انتظار میں بڑی بڑی شرطیں لگا رہے تھے کسی نے کہا "عمرؓ واپس آئے تو میں پانچ اونٹ ان کے قدموں میں نثار کروں گا۔"

کوئی بولا "وہ کامیاب لوٹے گا تو میں تجھ سے دُگنے اونٹ اس پر قربان کر دوں گا۔"

اِدھر یہ باتیں ہو رہی تھیں اُدھر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اثنائے راہ میں نعیمؓ بن عبداللہ مل گئے اور ان کا مقصد جان کر بولے "انھیں بعد میں قتل کرنا پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمھاری بہن (فاطمہؓ) اور بہنوئی مسلمان ہو چکے ہیں۔"

اس طنز سے عمرؓ ابن الخطّاب کی جوشیلی طبیعت کچھ اور بھڑک گئی۔ شرمندگی بھی تھی اور دکھ بھی لہٰذا فوری طور پر ان کے قدم دارالارقم کی بجائے اس راہ پر چل پڑے جو بہن کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ سعیدؓ بن زید وہ عظیم انسان تھے جو اسلام کے اوّلین دنوں ہی میں ایمان لے آئے تھے اور ازاں بعد معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جن دس ہستیوں کو جنّت کی بشارت دی تھی، ان میں وہ بھی شامل تھے۔ ان کے گھر جا کر عمرؓ ابن الخطّاب کی دنیائے عقیدت میں ہلچل مچ گئی۔ بہن اور بہنوئی کو شدید زدوکوب کرنے کے بعد جب وہ ان کے قلب سے دینِ حق کی محبّت کم نہ کر سکے تو متعجّب ہوئے۔ دین سے یہ وابستگی نہیں، دیوانگی توجّہ طلب تھی۔ انھوں نے کہا "مجھے وہ اوراق دکھاؤ جو تم پڑھ رہے تھے اور میری آمد پر جنھیں چھپا آئے ہو۔"

بہن نے وہ اوراق پیش کیے جنھیں بھائی کی آہٹ پاتے ہی چھپا آئی تھیں۔ یہ کون سی سورۃ تھی، اس کے بارے میں متعدّد روایات ہیں۔ سورۂ طٰہٰ سورۂ المدثّر اور سورۂ حدید، تواریخ میں ان تین کا ذکر ملتا ہے۔ بہر حال جو بھی تھیں، ان آیاتِ ربّانی سے عمرؓ ابن الخطّاب کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ کلامِ ربّانی

نے زبان پر سکوت طاری کر کے دل کا قفل توڑ دیا اور عمرؓ جو تلوار لہراتے ہوئے نکلے تھے، اب ان کا اپنا قلب ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ اسی دن وہ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔ یہ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کے مسلمان ہونے کے تین یوم بعد کا واقعہ ہے۔

اس واقعے سے تاریخ اسلام کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس وقت تک مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کفّار کی بڑی طاقت کا مقابلہ کر رہی تھی۔ مسلمانوں کی تعداد چالیس پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ ان میں عرب کے دولت مند بھی تھے اور حمزہؓ عبدالمطلب ایسے دلیر بھی اور حق پر نثار ہو جانے کے تمنائی غریب لوگ بھی، لیکن عمرؓ ابن الخطّاب کے مسلمان ہونے کے بعد یہ پہلا واقعہ تھا کہ مسلمانوں نے اعلانیہ کعبتہ اللہ میں نماز ادا کی اور کسی کو دَم مارنے کی جراَت نہ ہوئی۔

اسی سال چند بڑے اہم کام ہوئے اوّل یہ کہ دائرۂ تبلیغ مکّے کی حدود سے آگے دُور دُور تک پھیل گیا۔ دوسری بات یہ کہ کافر آقاؤں کے ہاتھوں اذیّت سہنے والے غلاموں کی آزادی کا آغاز ہوا۔ صدّیق اکبر حضرت ابو بکرؓ نے اپنی دولت کا ایک بڑا حصّہ ان غلام مسلمانوں کو آزادی دلانے کے لیے وقف کر دیا۔ اِدھر مکّے کا متموّل اور باعزّت طبقہ حلقہ بگوش اسلام ہو کر مسلمانوں کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ اُدھر حبشہ کے مسلمان، شاہِ حبشہ کے لطف و کرم کے سبب سکون کی زندگی گزار رہے تھے اور قریش کے معزّز سردار اب کسی نئے انداز پر غور کر رہے تھے۔ اس طرح نبوّت کے چھ برس مکمل ہوئے اور ساتواں سال اپنے جلو میں نئی مشکلات لے آیا۔

## معاشرتی مقاطعہ (بائیکاٹ) ۷ نبوی (۶۱۷ء)

قریش نے دیکھا کہ ان کی کاوشیں نقش بر آب ثابت ہو رہی ہیں۔ اس کی بجائے کہ مسلمان اپنے کہنہ دین پر لوٹ آتے یا اسلام کی اشاعت میں کمی آجاتی، یہ دین دُور دُور پہنچ رہا تھا اور مکّے کے اندر بھی حمزہؓ بن عبدالمطلب اور عمرؓ ابن الخطّاب ایسی ہستیاں اس کی طرف ملتفت ہو گئی تھیں۔ اس بار

انھوں نے معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو محصور کر کے اور ان کے خاندان کو تمام عرب قبائل سے توڑ کر تبلیغ میں رکاوٹ اور ان کے سکون کو پامال کر دینے کا فیصلہ کیا جس کی بہترین صورت معاشرتی مقاطعہ تھا۔ اس کے لیے قریش کے تمام رؤساء نے ایک جلسے کا اہتمام کیا اور مقاطعے کی تجویز پیش کی جس پر سب متفق ہوئے تو یہ معاہدہ تیار ہوا جو زبانی نہیں بلکہ باقاعدہ تحریری تھا اور اس کے اہم ترین نکات مندرجہ ذیل تھے۔

(۱) بنو ہاشم سے رشتہ توڑ دو۔

(۲) انھیں گلیوں اور بازاروں میں مت نکلنے دو۔

(۳) ان سے خرید و فروخت مت کرو۔

(۴) شادی بیاہ، رشتے ناتے مت جوڑو۔

اس معاہدے پر تمام قبائل کے سرداروں نے دستخط کیے، اس پر مہریں لگائی گئیں پھر اسے مستحکم و پختہ کرنے کے بعد کعبۃ اللہ کے دروازے پر لٹکا دیا گیا۔ اس معاہدے کی حیثیت ایک دستاویز کی سی تھی جس کی مخالفت کرنا یا کسی ایک شرط سے انکار کر دینا گویا اہلِ مکہ ہی کو نہیں، قریش کے تمام قبائل کو اپنا مخالف بنانا تھا۔ اس بات سے کفّار کا مقصد یہ تھا کہ یا تو بنو ہاشم کے ایک فرد کو ان کے حوالے کر دیں جو ان کے معبودوں کو باطل ٹھہراتا تھا ورنہ وہ فرد خود اور تمام مسلمان ان کے آگے جھک جائیں اور اپنی روش کو ترک کر دیں، لیکن یہ دونوں باتیں ناممکن تھیں۔ ابو طالب اس بات کو خوب جانتے تھے۔ اس وقت انھوں نے بنو ہاشم کے تمام معززین کو بٹھا کر صورتِ حال کا تذکرہ کیا تو ابولہب کے سوا سبھی ان کے ہم خیال ثابت ہوئے۔ جو مسلمان ہو چکے تھے وہ بھی اور جو ابھی تک ایمان نہ لائے تھے، وہ بھی معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ تھے۔ بس، خاندانِ بنو ہاشم کا یہ تنہا فرد تھا جس نے کھُل کر کفّار کا ساتھ دیا اور ان تین برسوں کے طویل عرصے میں اس خاندان پر جب کسی سہولت یا آسانی کا وقت آیا تو اس نے دشواریاں پیدا کیں اور جہاں تک ہو سکا ان کے مصائب میں اضافے

کا سبب بنتا رہا۔ بہرکیف اس وقت ابو طالب کفّار کے اس معاہدے کو کسی حملے کا پیش خیمہ تصوّر کرتے ہوئے بنو ہاشم کے ساتھ ابو قبیس کی گھاٹیوں میں سے ایک گھاٹی میں چلے گئے جو شعیب ابی طالب کہلاتی تھی۔ جونہی مسلمان اس میں محصور ہوئے، قریش نے اشیائے خوردنی اور ضروریات کی دیگر تمام چیزوں پر پابندی لگا دی۔ ایک تو یونہی مکّے میں غلّے کی کمی، مستزاد یہ کہ رسد کی تمام راہیں مسدود۔ نہ تجارت نہ سفارت۔ الغرض محصوری کا یہ زمانہ بڑا ہی اذیّت ناک تھا۔ اس وقت قریبی رشتے داروں میں سے باہر صرف ابو لہب تھا جو ہر آسانی میں رکاوٹ ڈال دینے کو اپنا فرض تصوّر کرتا تھا۔ اس نے تاجروں میں یہ اعلان کر دیا کہ اگر محصورین میں سے کوئی بھولے سے کچھ خریدنے آ جائے تو قیمت اتنی زیادہ طلب کرو کہ وہ ادا نہ کر سکے۔ وہ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا چچا تھا، عبدالمطلب کا فرزند! جس کی دشمنی کے انداز دیکھ کر خود کفّار بھی تعجّب کرتے تھے۔ یہ دَور وہ تھا جب ہر عیب اور ہر بُرائی کے باوجود عرب معاشرے میں قطعِ رحمی گناہِ عظیم تصوّر کی جاتی تھی۔ عربوں کی یہی کہنہ روایت تھی کہ جب معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دعوتِ اسلام پیش کی تو بنو ہاشم میں سے بہت سے ایمان نہ لائے لیکن وہ اعلانیہ عبداللہ کے فرزند کی حمایت کیا کرتے تھے۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت عباسؓ، مسلمان ہونے سے قبل بھی بھتیجے کے طرف دار تھے، اتنے کہ کفّار کی ان محفلوں میں شریک نہ ہوتے جہاں اسلام اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے خلاف تدبیریں سوچی جاتی تھیں اور خود کفّار بھی انھیں مجبور نہیں کرتے تھے کیوں کہ غیر کے مقابلے میں اپنے اور لہو کے مقابلے میں قریب ترین رشتے دار کی حمایت اور مدد کرنا عربوں کی اخلاقی روایات کے عین مطابق تھا اسی لیے مکّے کی تیرہ سالہ زندگی میں کافروں نے کبھی بنو ہاشم کے کسی فرد کو یہ طعنہ نہ دیا کہ معبودوں کو بُرا کہنے والے بھتیجے کا ساتھ دیتے ہو! غرض کہ جہالت کی انتہا میں بھی رشتے کا احترام کیا جاتا تھا، لیکن یہ ابو لہب تھا جس نے اسلام کی ابتدا سے آج ہر روایت کو توڑ کر اپنے خون سے دشمنی کی بدترین مثال قائم

کی تھی۔ یہ اسلام دشمنی تھی یا کفر کی محبت، جو بھی تھا اللہ تعالیٰ کی جانب سے مذمت کا سبب بن گیا تھا۔ قرآن مجید کی ایک سو چودہ سورتوں میں سے صرف ایک سورۃ ایسی ہے جس میں کفار میں سے کسی کا نام لے کر عذاب کی خبر دی گئی ہے اور وہ سورۂ لہب ہے جو ابولہب کی بابت نازل ہوئی۔ ارشاد ہوا۔ تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝

ترجمہ: ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ۔ وہ نامراد ہو گیا۔ اس کا مال جو کچھ اس نے کمایا اس کے کام نہ آیا۔ عنقریب وہ شعلہ مارتی ہوئی آگ میں ڈالا جائے گا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی جو سر پہ ایندھن لیے پھرتی ہے اور اس کی گردن میں کھجور کی چھال کی رسّی ہو گی۔

یہ سورۃ کس وقت نازل ہوئی مفسرین قرآن وقت کا تعین نہ کر سکے البتہ یہ کہے بس اس وقت اتری جب ابولہب اور اس کی بیوی نے اسلام دشمنی کی انتہا کر دی تھی۔ بہرحال مقاطعے کا یہ وہ زمانہ تھا جب اس نے اپنے خاندان سے علیحدہ ہو کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کا اعلان کیا اور محصوری کے اس دور کو سخت بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، لیکن یہ پیکرِ صبر و رضا اُف بھی نہ کرتے۔ ان دنوں محصورین کی گزر اوقات کے دو ذرائع تھے۔ یا تو وہ حج کے ایام میں گھاٹی سے نکل کر خرید و فروخت کرتے ورنہ وہ جاں نثار جو گھاٹی سے باہر تھے، در پردہ مدد کر دیا کرتے، لیکن اس میں کامیابی کم ہی ہوتی تھی کیوں کہ مکے کے جوان ہر دم تاک میں رہتے تھے جہاں کہیں بھی یہ نوجوان کسی کو محصورین کی مدد پہ آمادہ پاتے رکاوٹیں ڈالتے۔

حکیم بن حزام، خدیجۃ الکبریٰ کے بھتیجے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کچھ گندم لیا تاکہ شعب ابی طالب کے مکینوں کے لیے بھیج دیں۔ کسی طرح ابوجہل کو علم ہو گیا تو وہ سدِ راہ ہوا۔ خاصی دیر کشمکش جاری رہی۔ اس دن ابوالبختری کی مدد سے کسی طرح یہ گندم اندر پہنچا دیا گیا، لیکن اتنی مختصر سی امداد سے مفلسی

کم تو نہ ہو سکتی تھی۔ بڑے تو وقت گزار ہی لیتے، لیکن بچوں کا تڑپنا بڑا ہی صبر آزما ہوتا۔ وہ بلک بلک کر روتے تو ان کی آواز باہر تک آتی۔ ایسے میں کفار خوش ہوتے۔ تین برس کا عرصہ ان ایمان والوں نے اس طرح گزارا کہ ہر آزمائش میں پڑے، ہر سختی برداشت کی، چھال اور پتے بھی کھائے اور چمڑا بھی ابال کر کھایا۔ حج کے زمانے میں لڑنا حرام تھا لہٰذا کفار مداخلت نہ کرتے۔ تب اللہ کے نبیؐ گھاٹی سے باہر تشریف لاتے اور لوگوں کو اللہ کا پیغام سناتے۔ ایسے میں سب سے بڑی رکاوٹ ابو لہب ہی بن جاتا تھا۔ اسلام کی نفرت میں وہ ان اصولوں کو بھی نظر انداز کر دیتا تھا جن کی تمام کفار پابندی کرتے تھے۔ ایسے میں جب کہ قرآن حکیم کی پیش گوئی نے ان دونوں میاں بیوی کے جلیسے آگ لگا دی تھی، ان کے خیال میں یہ (سورۃ اللھب) خود ساختہ اور من گھڑت کلام تھا جو اُن کی تذلیل کے لیے کہا گیا تھا۔ یہ سوچ کر انھوں نے اپنی کارروائی تیز کر دی۔ اس تیزی نے مسلمانوں پر کتنے ستم توڑے، ان سب پر وہ فخر کیا کرتا تھا۔ بہرحال کفر اپنی تمام قوتیں استعمال کرتا رہا اور اہل ایمان اللہ کے بھروسے پر اپنا وقت گزارتے رہے۔ اس طرح سے تین برس گزر گئے اور کعبۃ اللہ پر آویزاں معاہدے کو دیمک نے چاٹ لیا، لیکن ابن ہشام اور طبری کے حوالے سے علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ شقِ معاہدہ کی تحریک خود قریش کی جانب سے ہوئی۔

## شقِ معاہدہ ۱۰ نبوی (سنہ ۶۲۰ء)

قبیلۂ بنو عامر کے دلیر جوان ہشام عامری کو جب بھی موقع نصیب ہوتا محصورین کو غلہ یا ضرورت کی دیگر اشیا پہنچا دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر اس کام کا فیصلہ کیا۔ وہ عبدالمطلب کے نواسے زہیر بن امیّہ کے پاس گئے اور بولے: "ابن امیّہ! تم جانتے ہو، ابنِ عبداللہ سے تمھارا کیا تعلق ہے اور ابو طالب تمھارے کون ہیں!"

زہیر نے جواب دیا: "ابنِ عبداللہ میرے ماموں کے فرزند ہیں اور ابو طالب میرے ماموں ہیں۔"

ہشام عامری بولے "پھر تو افسوس کی بات ہے کہ برسوں سے تم کھاتے پیتے اور عیش کرتے ہو اور تمہارے ماموں محصوری اور مفلسی کے عالم میں وقت گزار رہے ہیں"

زہیر دل گرفتہ سے ہو گئے اور بولے "میں تنہا اتنے بہت سے ظالموں کے خلاف کیا کر سکتا ہوں! میں اگر کچھ کر سکتا تو اس ظالمانہ معاہدے کو چاک کر دیتا"

ہشام بن عامری چند لمحے خاموش رہے، پھر بولے "میری بھی یہی آرزو ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم تنہا نہیں ہو اور مطعم بن عدی، ابوالبختری اور زمعہ بن اسود ایسے کچھ اور لوگ بھی ہمارے ہم نوا ہیں۔ الگ الگ نہیں تو سب مل کر آواز اٹھا سکتے ہیں"

اس گفتگو کے بعد یہ تمام ہم خیال لوگ متحد ہوئے اور حرم میں جا کر زہیر نے بلند آواز میں کہا "اے اہلِ مکہ! تمہارے اخلاق اور سخاوت کے تذکرے ہوتے ہیں، لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ہم سب سکھ کی زندگی گزاریں اور ایک خاندان (بنو ہاشم) آب و دانے سے بھی محروم رہے۔ خدا کی قسم آج تمہیں یہ معاہدہ چاک کرنا ہوگا"

یہ پکار سنتے ہی ابوجہل دوڑا آیا اور معاہدے کی حفاظت کے لیے چلا کر بولا "خبردار! کوئی اس معاہدے کو ہاتھ نہ لگائے"

اس طرح تو تو میں میں شروع ہو گئی۔ دونوں طرف کے لوگ دلیلیں دینے اور ایک دوسرے کو قائل کرنے لگے۔ اس وقت مطعم بن عدی نے ہاتھ بڑھا کر معاہدے کی یہ دستاویز نوچ لی، پھر چاک کر دی۔ اس کے بعد یہ سب ہتھیار لگا کر شعیب ابی طالب کی طرف گئے اور محصورین کو نکال کر مکے میں لے آئے۔ اب پھر وہی زندگی شروع ہو گئی۔ گزر اوقات کے لیے تجارت کا آغاز ہوا اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرضِ تبلیغ پھر سے ادا کرنے لگے۔

## عام الحزن کے حزن ۱۰ نبوی (۶۲۰ء)

تین برس کے مصائب اور ذہنی انتشار نے ابوطالب کو بیمار کر دیا، گو یا محصوری کا زمانہ تمام ہونے کے باوجود ابھی مشکلات باقی تھیں۔ خصوصاً معلمِ اعظم

صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ابھی ایک سخت وقت اور آنے والا تھا۔ مصیبت پر ایک اور مصیبت نازل ہوئی اور شعب ابی طالب سے نکلتے ہی ابوطالب کا انتقال ہوگیا۔ وہ عظیم ہستی جس نے آٹھ برس کی عمر سے تربیت کا فرض ادا کیا، ہر موقع پر مددگار رہے اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے مقابلے میں تمام عرب کو اپنا مخالف بنالیا، ہر تکلیف میں حصّے دار رہے اور اب تین برس کی محصوری اور فاقہ کشی کا زمانہ گزار کر کے واپس آئے تو چند دن علیل رہ کر وفات پا گئے۔ نبوّت کے دس برس کے تمام عرصے میں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی دلی آرزو تھی کہ محبوب چچا اس دین میں داخل ہوجائیں تاکہ عمر بھر کی تکالیف کا ازالہ آخرت میں ہوجائے۔ یہی سوچ کر وہ علالت میں ان کے پاس تشریف لائے۔ انھوں نے دیکھا معززینِ مکّہ بھی بہ غرضِ عیادت موجود تھے۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے چچا کی نقاہت اور کمزوری کا اندازہ کیا اور بولے "یا عم! اس وقت لا الٰہ الا اللہ کہہ دیجیے۔ میں خدائے بزرگ و برتر کے سامنے آپ کے ایمان لانے کی شہادت دوں گا!"

معززینِ مکّہ نے جب یہ بات سنی تو ابوطالب سے بولے "اے شیخِ مکّہ! کیا تم عبدالمطّلب کے دین سے پھر جاؤ گے؟"

ابوطالب یہ سن کر متذبذب ہو گئے اور بولے "میں عبدالمطّلب کے دین پر مرتا ہوں"۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی جانب دیکھا اور بولے "میں وہ کلمہ پڑھ دیتا، لیکن قریش سمجھیں گے کہ میں موت سے ڈر گیا ہوں"۔

آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) رنجیدہ ہو گئے اور فرمایا "میں آپ کے لیے دعائے مغفرت کروں گا جب تک کہ خداوندِ عالم مجھے منع نہ کردے"۔

اس وقت آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی کیفیت عجیب تھی۔ یہ اندازہ ہی نہ ہوتا تھا کہ محبوب چچا کے مرجانے کا غم زیادہ ہے یا دینِ حق سے ان کے منہ پھیر کر مرجانے کا غم! بہرحال ابھی آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا رنج کم نہ ہوا تھا کہ اس سانحے کے تین یوم بعد خدیجۃ الکبریٰؓ داغِ مفارقت دے گئیں۔ یہ نبوّت کی گواہی دینے والی پہلی قابلِ احترام خاتون تھیں، اللہ کے آخری نبیؐ

کی مددگار و شریک تھیں جنھیں خود خداوندِ عالم نے جبرئیلؑ کے ہاتھ سلام بھیجا اور جنت میں انھیں ان کے مقام سے آگاہ فرمایا یہ اللہ کو پیاری ہوئیں تو معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو اندرونی و بیرونی تفکرات نے گھیر لیا اسی لیے اس سال کو انھوں نے عام الحزن یعنی غموں کا سال قرار دیا۔ ان تمام صدموں سے گزرنے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پھر دینِ حق کی تبلیغ کا کام شروع کیا۔ اس بار بھی مشکلات حائل تھیں لیکن ان کے انداز بدل گئے تھے۔ اب مکّے کے رئیس ابوطالب نہیں بلکہ یہاں کا سردار ابوجہل تھا جو مسلمانوں اور ان کے دین کے لیے ایک بدترین انسان اور فطرت کے لحاظ سے بڑا ظالم تھا۔ مسلمان اس سے جس قدر مایوس تھے، مشرکین کو اتنی ہی توقعات تھیں لہٰذا ان سب کا اندازہ کر کے انھوں نے اپنی کارروائی تیز کر دی۔ وہ ایک تمسخرانہ بات کہتا، باقی تمام مزہ لیتے۔ ایک مرتبہ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں داخل ہوئے تو مشرکین کی محفل آراستہ تھی۔ ان میں ابوجہل بھی موجود تھا۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق ٹھٹھا مار کر ہنستے ہوئے کہا "لوگو! تمھارا نبیؐ آگیا۔"

کسی نے مذاق کو بڑھانے کے لیے پوچھا "ابوالحکم! تجھے انکار ہے اس کی نبوت سے؟"

ابوجہل نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ مارتے ہوئے کہا "مجھے کیوں انکار ہونا! جھوٹا ہی سہی پر ہے تو نبیؐ!"

اس جملے پر ہر جانب سے ٹھٹول ہونے لگا۔ ہر شخص ہنسی سے بے حال نظر آتا تھا۔ یہ نبوّت کا دسواں سال تھا اور حیاتِ طیبہ کے پچاس برس مکمل ہو چکے تھے۔ اس دوران میں اس پیکرِ صبر و تحمّل کو بڑی بڑی مشکلات نے گھیرا۔ قیامت خیز مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑا، جبینِ مبارک کبھی شکن آلود نہ ہوئی تھی، لیکن آج کفّار کے یہ انداز دیکھ کر اس پیکرِ صدق و صفا کے روئے مبارک پر ناپسندیدگی کے آثار ہویدا ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا "ابوجہل! تیرے لیے وہ وقت قریب ہے جب تو ہنسے گا کم اور روئے گا زیادہ!" یہ کہتے ہوئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حاضرین کی طرف دیکھا۔ چہرے پر بہ دستور سختی اور سنجیدگی تھی، فرمایا "اے

قریش! تمھارے لیے وہ ساعت آنے والی ہے جب تم اس دین میں داخل ہو جاؤ گے جس سے انکار کرتے ہو۔"

اس وقت ہنسنے والوں کی ہنسی بند ہوگئی اور ابوجہل اس ذات کو جھٹلانے کے باوجود مرعوب ہوکر رہ گیا۔ اس لمحے ان لوگوں کو یقین آیا یا نہیں آیا، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ یہ پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ جملہ کفار کے لیے رسوائی مقدر ہوگئی۔

## سفرِ طائف۔ ماہ ذی القعدہ ۱۰ نبوی (۶۲۰ء)

اس زمانے میں رُشد و ہدایت کا کام مکے کے اندر ہی ہو رہا تھا اور قریب قریب وہ لوگ جنھیں ہدایت پانا تھی، ایمان لا چکے تھے۔ باقی شقی القلب تھے جن سے قریب قریب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مایوس ہو چکے تھے۔ علاوہ ازیں وقت کا تقاضا تھا کہ پیغام حق بیرونی علاقوں میں پہنچایا جائے۔ حالات کا بھی یہی اصرار تھا اور یہی منشائے خداوندی بھی! مکے میں اب تمسخر کرنے والوں کی باقاعدہ جماعت تبلیغ میں رکاوٹ بنتی۔

اسی موقع پر حکم ہوا۔ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۝

ترجمہ: (اے نبیؐ) آپ کو جو حکم دیا گیا ہے، وہ صاف صاف بیان کر دیجیے۔ ان مشرکین سے رُخ پھیر لیجیے اور استہزا کرنے والوں سے آپ کی کفالت ہم خود کریں گے۔

یہ حکم تھا، کام جاری رکھنے اور آگے بڑھانے کی ہدایت! چنانچہ منکرین اور تمسخر کرنے والوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اللہ کے نبیؐ نے اپنے نئے سفر کا آغاز کیا اور نبوت کے دسویں برس ماہ ذی القعدہ کے اختتام کے قریب اپنے آزاد کردہ غلام زیدؓ بن حارثہ کو لے کر بہ غرضِ تبلیغ طائف کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان دنوں طائف میں بنو ثقیف آباد تھے۔ چونکہ یہ مقام بڑا سرسبز و شاداب اور پہاڑی پہ واقع تھا للہذا یہاں کے باشندے دیگر علاقوں کے مقابلے میں اپنے علاقے کو اور دوسرے تمام لوگوں کی نسبت خود کو افضل و اعلیٰ تصور کرتے تھے۔ یہ شدید

گرمی کا زمانہ تھا۔ ایسے میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سفر کرتے ہوئے طائف پہنچے تو پہلی ملاقات سردارانِ طائف سے ہوئی جو تین بھائی تھے۔ عبد یالیل بن عمرو، مسعود بن عمرو اور حبیب بن عمرو، انھیں دعوت اسلام دی گئی تو ان تینوں نے بڑی ہی حقارت اور گستاخی کے ساتھ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ یہاں سے اللہ کے نبیؐ اور نبیؐ کے غلام آگے روانہ ہوئے اور طائف کی آبادی میں جا کر اپنی بات کا آغاز کیا کہ ان تینوں بھائیوں کے اشارہ کرنے پر ان کے غلام اور طائف کے شریر لڑکے ان کے پیچھے لگ گئے اور سنگ ریزے اچھالتے ہوئے بد کلامی کرنے لگے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ ایک معمولی لباس زیبِ تن کرنے اور پیدل سفر کرنے والا انسان نبوت کے درجے پر فائز نہیں ہو سکتا چنانچہ یہ خیال عام ہوا تو سبھی تذلیل کرنے اور تکلیف دینے پر اتر آئے۔ یہ ذہنی اور جسمانی اذیت کی عجیب مثال تھی۔ وہ لوگ حق کے پیغام کا ایک لفظ بھی سننے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ مستزاد یہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جہاں جہاں سے گزرتے، سنگ باری کرنے والے ساتھ لگ جاتے۔ یہاں تک کہ جسم مبارک سے خون جاری ہو گیا اور جب نماز کا وقت ہوا اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک تنہا گوشے میں ٹھہر کر نعلین اتارنے لگے تو دیکھا کہ پائے مبارک شل ہو چکے تھے۔ یہ طائف میں تبلیغ کا پہلا دن تھا۔ دوسرا دن بھی ایسا ہی گزرا۔ اس دن انھیں اندازہ ہوا کہ طائف کے مشرکین مکے کے لوگوں سے کہیں زیادہ تند مزاج اور سنگ دل ہیں۔ شرفا اور رئیس تو بات کرنے کو بھی تیار نہ تھے اور دینِ حق کی بات تو جیسے انھیں گوارا ہی نہ تھی۔ دوسرا دن بھی تمسخرانہ انکار، جوتے، پتھر اور گندگی اچھالنے میں گزر گیا۔ یہ صورتِ حال اس قدر بڑھی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تھک کر ایک گوشے میں پناہ لینا پڑی، لیکن حالت جو بھی ہوتی، تبلیغ کا کام ترک نہ کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ تھوڑی دیر کہیں بیٹھنے کے بعد جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنا کام پھر شروع کرتے، نیکی اور بھلائی کی ہدایت دیتے یا معبودِ حقیقی کے بارے میں بتاتے تو گھروں کی بالائی منزلوں سے گندگی کی بالٹیاں الٹ دی جاتیں۔ لڑکے منہ چڑاتے، گالیاں دیتے، پتھر برساتے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر کہیں بیٹھ جانا چاہتے تو

پھر اٹھا دیتے۔ ایسے میں رحمتِ عالمؐ ان کے حق میں دعائیں کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ ایک دن اہلِ طائف نے سنگ دلی و شقاوت کی انتہا کردی۔ انھوں نے جونہی معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ دیکھا، پتھر برسانے شروع کر دیے۔ اللہ کے نبیؐ جدھر جاتے وہ بدگوئی اور سنگ باری کرتے ہوئے ان کے عقب میں دوڑتے۔ اس طرح پتھر کھاتے اور طائف کا چکر لگاتے لگاتے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) زخمی ہو گئے۔ پھر حال یہ ہوا کہ چلنے کے قابل ہی نہ رہے۔ تب آپ نے ایک باغ میں پناہ لی۔ اس باغ کے مالک دو مکی رئیس عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ تھے۔ اگرچہ اس دین کے مخالف وہ خود بھی تھے اور یہاں ایک نبیؐ کی آمد کو گراں محسوس کر رہے تھے، لیکن مہمان نوازی ان کے اسلاف کی شان رہی تھی۔ دوسرے جان گئے تھے کہ طائف کا کوئی متنفس بھی اس دین کی طرف مائل نہیں ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے انھوں نے ان دو آنے والوں پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے غلام عداس کے ہاتھ انھیں انگور کے چند خوشے بھیجے۔ عداس آپؐ کے قریب آیا تو ان دونوں نے دُور سے دیکھا کہ وہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھوں کو چوم رہا ہے۔ انھوں نے یہ منظر کچھ ناگواری سے دیکھا اور جب عداس واپس آیا تو بولے: "تُو کیوں اس بے تابی سے ہاتھ چوم رہا تھا؟"

عداس نے کہا: "آقا آج روئے زمین پر اس شخص سے بہتر کوئی اور نہیں ہے۔ اس شخص نے مجھے وہ بات بتائی ہے جو صرف ایک نبی ہی بتا سکتا ہے۔"

اس بات کے بارے میں تواریخ میں درج ہے کہ عداس نے جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں انگور پیش کیے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "بسم اللہ۔"

یہ سن کر عداس نے حیرت سے پوچھا: "یہ کون سا کلام ہے؟ یہاں کے باشندے تو نہیں بولتے۔"

معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم کہاں کے رہنے والے ہو اور تمھارا دین کیا ہے؟"

عداس بولا: "جناب! میں مسیحی ہوں اور نینوا کا رہنے والا ہوں۔"

یہ سُن کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا: "تم مردِ صالح یونسؑ بن متّی کے شہر نینوا کے رہنے والے ہو۔ وہ میرا بھائی تھا۔ وہ بھی نبی تھا اور میں بھی نبی ہوں۔"
ان دونوں بھائیوں کو عداس سے یہ باتیں سننے کی ضرورت نہ تھی لہٰذا ہاتھ چومنے اور عزت کے ساتھ اس مہمان کا ذکر کرنے پر وہ اسے لعن طعن کرنے لگے اور عداس دوبارہ اس جانب نہ آسکا۔ معلّمِ اعظم اللہ علیہ وسلم قدرے ستانے کے بعد اس باغ سے روانہ ہوئے۔ اب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) قدرے تازہ دم ہو گئے تھے اور سورج کی حدت بھی کم ہو گئی تھی لہٰذا جہاں کچھ ہجوم نظر آیا، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) وعظ کرنے لگے، لیکن لگتا تھا کہ بد نصیب اہلِ طائف خدا کی وحدانیت اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کی کوئی بات بھی سننے کے لیے تیار نہ تھے اور ان تمام دنوں میں بُری طرح سے بھر چکے تھے لہٰذا یہ آواز جونہی بلند ہوئی، ہر جانب سے اینٹیں اور پتھر برسانا شروع کر دیے جن کی ضربوں سے اللہ کے نبی بُری طرح زخمی ہو گئے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔
ان شریروں کا تو مقصد یہی تھا جسے پورا کر کے وہ منتشر ہو گئے اور حضرت زیدؓ بن حارثہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی پیٹھ پہ لاد کر آبادی سے دُور ایک پہاڑی کے دامن میں لے آئے اور لٹا دیا، پھر دامن سے ہوا دی اور رخِ انور پر پانی کے چھینٹے مارے۔ تب کچھ دیر کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوش میں آگئے۔ اِسی دن اہلِ طائف سے نا امید ہو کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ یہ دس روزہ سفر بڑا ہی تکلیف دہ تھا۔ اس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی حالت سے زیادہ اس بات کا غم تھا کہ یہاں ایک فرد نے بھی اسلام قبول نہ کیا تھا۔
آپ رنجیدہ ہو کر واپسی کا سفر شروع کر رہے تھے کہ حضرت جبرئیلؑ نے اجازت طلب کی اور بولے: "یا رسول اللہ! اگر حکم صادر فرمائیں تو طائف کے پہاڑوں کو ان لوگوں پہ الٹ دوں؟"
یہ وقت وہ تھا جب اہلِ طائف کے ہاتھوں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زخموں اور تکلیفوں کی انتہا ہو چکی تھی، لیکن اس حالت میں بھی جذبات میں آنے کی بجائے

سراپائے رحمت نے فرمایا "نہیں۔ میں اہلِ طائف کے لیے پیغامِ حق لایا تھا، اگر یہ لوگ قبول نہیں کرتے تو کیا ہوا! امید ہے کہ ان کی آیندہ نسلیں ضرور خدائے واحد پر ایمان لانے والی ہوں گی"۔

## جنّوں کا حلقہ بگوشِ اسلام ہونا

اس سفر سے واپس ہوتے ہوئے معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کبھی قدرے آرام کے لیے اور کبھی نماز کے لیے قیام کیا۔ اُسی قیام کے دوران میں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نمازِ فجر کے بعد تلاوت کر رہے تھے کہ جنّوں کی ایک جماعت نے حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ اس سے قبل یہ مخلوق کلامِ الٰہی سن چکی تھی۔ وہ شریعت موسوی پر ایمان رکھتے اور کتبِ سماوی کے جاننے والے تھے جس کی گواہی خود ربِّ کائنات نے دی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "(اے نبیؐ) جب ہم نے جنّوں میں سے کئی آپ کی جانب متوجہ کیے کہ قرآن سنیں، ایسے میں وہ آپ کے پاس پہنچے تو کہنے لگے کہ خاموش ہو جاؤ۔ پس جب آپ نے تلاوت تمام کی تو وہ واپس اپنی برادری میں گئے اور ان کو نصیحت کی کہ اے قوم ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰؑ کے بعد نازل ہوئی ہے اور جو سابقہ کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور سچّا دین اور سیدھا راستہ بتاتی ہے لہٰذا اے قوم، تم خدا کی طرف بُلانے والے کی بات قبول کرو اور اس پر ایمان لاؤ تاکہ وہ تمھارے گناہ بخش دے اور دکھ دینے والے عذاب سے محفوظ رکھے۔"

ان واقعات کی گواہی سورۃ الجنّ، حجر، رحمٰن اور متعدّد دیگر سورتوں میں موجود ہے جس کا مطلب ہے کہ جنّہ کے قرآن سننے کے واقعات ایک سے زائد مرتبہ پیش آئے۔ بہر حال طائف کے اشرف المخلوقات نے نہیں تو ایک پوشیدہ مخلوق نے حق کا اعتراف کیا اور اس دائرے میں داخل ہو گئے۔ اس طرح اشاعتِ حق کے اعتبار سے یہ سفر ناکام نہیں تھا۔

اسی سفر سے واپسی پر آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے مکّے کے معزّز مطعم بن عدی کو پیغام بھیجا جس کا مقصد حمایت طلب کرنا تھا۔ عرب کا قدیم رواج تھا کہ کوئی معزّز

سردار اگر کسی فرد کو اپنی پناہ میں لینے کا اعلان کر دیا کرتا تو پوری قوم اس فیصلے کا احترام کرتی تھی۔ اسی بنا پر مطعم بن عدی نے ہتھیار لگائے اور حرم میں جا کر اعلان کیا کہ میں نے ابنِ عبداللہ کی حمایت کی۔ اب قریش میں سے کوئی فرد بھی آپ کو ایذا نہ دے سکتا تھا لہٰذا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مکے میں داخل ہوئے، حرم میں جا کر بہ اطمینان نماز ادا کی اور گھر تشریف لے گئے۔ اس تمام وقت میں مطعم بن عدی اور اس کے فرزندوں نے ہتھیار باندھ کر پہرا دیا۔ جب تک مکے کے گھر گھر حمایت کی خبر نہ پہنچ گئی، انھوں نے ہتھیار نہ کھولے۔

## قبائل کا دورہ۔ ۱۰ نبوی (۶۲۰ء)

اب تبلیغ کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا۔ معلمِ اعظمؐ کو نبوت ملے دس سال ہو چکے تھے۔ اسلام کی آواز دُور دُور جا رہی تھی لہٰذا اب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعوتِ حق کے لیے قبائل کا دورہ کرنا ضروری تصور کیا۔ ابھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بارے میں محوِ فکر تھے کہ حج کا زمانہ آ گیا۔ ان دنوں تمام قبائل کے معززین طوافِ کعبہ اور اپنے اپنے بتوں کی پرستش کے لیے جمع ہوتے تھے۔ دعوتِ حق کے لیے ایسے اجتماعات بڑے مناسب تھے لہٰذا قریش کی سر توڑ مخالفت کے باوجود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مکے سے باہر نکل کر مسافروں اور قافلوں کو روکا کرتے۔ خصوصاً عکاظ، مجنّہ اور ذوالمجاز کے میلوں میں دینِ حق کی تبلیغ کرتے تو حسبِ سابق ابولہب تاک میں رہتا۔ جونہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کی وحدانیت اور اپنی رسالت کی بابت اعلان کرتے تو وہ چلا کر کہتا: "لوگو! یہ میرا بھتیجا ہے۔ جو دین سے پھر کر ایسی باتیں کرتا ہے اس کی بات مت سننا!"

سورۃ اللہب کے نزول کے بعد تو جیسے اس نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جھٹلا کر اپنی توہین کا بدلہ لینا اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔ اس طرح کاوشیں کرتے اور مخالفتیں سہتے ہوئے کچھ وقت گزرا اور حج کا زمانہ تمام ہوا۔ میلے بھی ٹھنڈے پڑ گئے۔ ایسے میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قبائل کے دورے کا فیصلہ کیا۔

اس سفر میں صدیق اکبر حضرت ابوبکرؓ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ تھے اور ہر قبیلے میں جا کر تعارف کا فرض ادا کر رہے تھے۔ جب بھی کسی

قبیلے کے سردار کے پاس جاتے تو کہتے "آپ نے کسی پیغمبر کا تذکرہ سنا ہے؟"

جواب ملتا "ہاں سن رہے ہیں کہ مکے کے کسی معزز نے یہ دعویٰ کیا ہے"

تب صدیقِ اکبرؓ کہتے "آپ نے درست سنا ہے۔ وہ حق کی دعوت دیتے ہیں اور یہی ہیں"

تب لوگ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو بڑے اشتیاق سے دیکھنے لگتے اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اپنی بات شروع کرتے۔ اس وقت آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے جن قبائل کا دورہ کیا، ان میں بنو عامر، بنو ہذیل، بنو محارب، بنو فزارہ، بنو غسّان، بنو مرۃ، بنو حنیفہ، بنو سلیم، بنو عیش، بنو نضیر، بنو کندہ، بنو کلب، حارث بن کعب، عذرہ، حضارمہ اور بنی ایکار کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام میں حق کے شیدائی کو ہر جگہ ایک نئے انداز کا سامنا کرنا پڑا۔

بنو عامر کا سردار بحیرہ بن فراس تھا۔ وہ اس کلام کو سن کر متعجب ہوا اور بڑی رازداری سے بولا "اگر ہم اس دین میں داخل ہو جائیں اور تمام مخالفین پر غالب آ جائیں تو آپ مجھ سے یہ وعدہ کریں کہ آپ کے بعد یہ امر مجھ سے متعلق ہوگا"

اس کا مطلب یہ تھا کہ خلافت اسے ملے۔

معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ بات بڑے غور سے سنی اور ناگواری کو ضبط کرتے ہوئے فرمایا "یہ سب خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے کہ وہ میرے بعد جسے چاہے مقرر فرما دے"

اتنا سنتے ہی بحیرہ بن فراس کا انداز بدل گیا۔ وہ طنز و تمسخر کے لہجے میں بولا۔ "مشکلیں ہم برداشت کریں اور جب تیرا کام بن جائے تو عیش کوئی اور کرے اچھا ہمیں تجھ سے کوئی سروکار نہیں"

سردار کے اس فیصلے کے بعد پورے قبیلے میں سے کسی ایک فرد نے بھی آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی جانب توجہ نہ دی۔ تب آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) آگے روانہ ہو گئے۔

بنو حنیفہ نے کچھ سننے ہی سے انکار کر دیا۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے ہدایت شروع کی تو ان کے معززین نے بڑی تلخی اور گستاخی کے ساتھ جواب دیا۔ بعد ازاں

اسی قبیلے کے رئیس مسیلمہ کذاب نے خود نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔
بنو ہذیل کا سردار مفروق تھا۔ اس نے جونہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کے بارے میں سنا تو پوچھا "آپ کی تعلیمات کیا ہیں اور آپ کن باتوں کی تلقین کرتے ہیں؟"
اس سوال پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خدا کی وحدانیت اور اپنی رسالت کا ذکر کیا اور سورۂ انعام کی چند آیات تلاوت کیں جو مختصراً اسلامی تعلیمات کا نمونہ تھیں۔
"اے نبی! کہہ دیجیے (لوگوں سے) کہ آؤ میں تمھیں وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جو تمھارے پروردگار نے تم پر حرام کر دی ہیں اور ان کی نسبت فرمایا ہے کہ تم کسی چیز کو خدا کا شریک مت بنانا۔ ماں باپ سے بدسلوکی مت کرنا بلکہ سلوک کرتے رہنا۔ ناداری کے اندیشے سے اپنی اولاد کو قتل مت کرنا کیوں کہ ان کو اور تم کو ہم ہی رزق دیتے ہیں اور بے حیائی کے تمام کام ظاہر ہوں یا پوشیدہ، ان کے پاس مت پھٹکنا اور کسی جان والے کو، جس کا قتل خدا وندِ عالم نے حرام کر دیا ہے، ناحق قتل مت کرنا۔ ان تمام باتوں کی تاکید تمھارا رب تمھیں اس لیے کرتا ہے کہ تم سمجھو۔"
مفروق اور دیگر لوگوں نے یہ کلام بہ غور سنا اور تعریف کرتے ہوئے بولے۔ "بلاشبہ یہ کلام قابلِ تحسین ہے، لیکن مدتوں سے ہم کسریٰ کے زیرِ اثر ہیں اور معاہدے کے پابند ہیں، دوسرے یہ کہ ہمارے لیے آباء و اجداد کے قدیم معبودوں کو چھوڑ دینا مشکل ہے لہٰذا ہم آپ پر ایمان نہیں لا سکتے۔"
اس صاف گوئی کو معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند کیا اور فرمایا "اللہ اپنے دین کا آپ مددگار رہے؟"
اس طرح آپؐ دشوار سفر کرتے رہے۔ سفر اور موسم کی سختی دونوں ہی حوصلہ آزما رہی تھیں، لیکن آزمائشوں کی لاتعداد بھٹیوں سے گزرنے کے بعد تپ کر کندن بن جانے والی بات تھی۔ اب تو یہ حوصلہ ناقابلِ تسخیر ہو چکا تھا لہٰذا سفر جاری رہا۔ پھر یہ کہ ایک خاص مقصد تھا جس کے باعث ہرنا کامی مزید چلنے کا

حوصلہ عطا کرتی تھی۔

اسی دوران میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ملاقات سوید بن صامت رضی سے ہوئی جو ایک زود گو شاعر تھے اور ان کا تخلص کامل تھا۔ انھیں دعوتِ اسلام دی گئی تو رازداری سے بولے "میرے اور آپ کے پاس ایک ہی چیز ہے"۔

معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے استفسار فرمایا۔

انھوں نے جواب دیا "میرے پاس حکمتِ لقمان ہے"۔ اس وضاحت کے بعد انھوں نے اپنا کلام سنایا جو بلاشبہہ بہترین اشعار پر مشتمل تھا۔

ان کے اشعار سننے کے بعد معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابنِ صامت! یقیناً تمھارا کلام بہت عمدہ ہے، لیکن میرے پاس قرآن ہے جو اس سے افضل ترین اور ہدایت و نور ہے۔۔"۔ اتنا کہنے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چند آیات تلاوت کیں۔

"کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ خدا جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے، وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ ان جیسے لوگ (پھر سے) پیدا کر دے اور اس نے تو ان لوگوں کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا ہے جس میں کوئی شک نہیں، لیکن ظالموں نے ان (نشانیوں کو) قبول نہ کیا"۔

کلامِ الٰہی کے اثر سے سوید بن صامت رضی پر جیسے وجد کا عالم طاری ہو گیا۔ وہ جیسے اپنی سدھ بدھ ہی کھو بیٹھے۔ جب معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہوئے تو وہ ایمان لے آئے، لیکن کچھ عرصے کے بعد جب وہ اپنی قوم میں لوٹ گئے تو جنگِ بعاث میں مارے گئے۔ اس طرح قبائل کا دورہ مکمل ہوا اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) دینِ حق کی آواز دُور دُور پہنچا کر مکے واپس آ گئے۔

## یمن کا ساحر

قبائل کے دَورے سے واپس آئے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ملاقات ضماد ازدی سے ہوئی۔ یہ یمن کا ماہر جادوگر اور کاہن تھا جس کے علم کی شہرت دُور دُور تک تھی۔ اہلِ مکہ کو اس کی آمد کی خبر ہوئی تو تیاری کرنے لگے۔ ہمیشہ اس تیاری کا مقصد کچھ اور ہوتا تھا، لیکن اب کچھ اور تھا۔ ان دنوں قریشی سرداروں

نے یہ عادت بنالی تھی کہ باہر سے جو بھی آتا معززین پہلے ہی اسے گھیر لیتے اور بہرصورت اسلام سے بدظن کرتے کہ مبادا وہ مسلمان ہو جائے۔ گویا یہ بھی اشاعتِ دین میں رخنہ ڈالنے اور معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ناکام بنانے کا ایک انداز تھا لہٰذا اس وقت بھی انھوں نے ضماد ازدی کو خوب بھڑکایا۔ کسی نے کہا "ابنِ عبداللہ پر جنّات کا اثر ہے"

کوئی بولا "سحر اور جادو ہے"

ضماد ازدی نے کہا "میں ہر مرض کے جنتر منتر جانتا ہوں اور ابنِ عبداللہ کا علاج اپنے منتروں سے کر سکتا ہوں" اس فیصلے کے بعد وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور بولا "کیا میں آپ کو اپنا منتر سناؤں؟"

معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "اپنا منتر سنانے سے قبل مجھ سے سن لو" اتنا کہنے کے بعد آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے چند آیاتِ ربّانی تلاوت کیں تو یمن کا یہ ماہر جادوگر بہ غور سنتا رہا۔ اس نے اس دوران میں تین بار انھی آیات کو سننے کی فرمائش کی اور معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تینوں مرتبہ یہ فرمائش پوری کی۔ تواریخ سے یہ وضاحت نہیں ملتی کہ وہ کون سی سورۃ تھی!

ضماد ازدی نے کہا "میں نے سینکڑوں شعراء کو سنا، متعدد کاہن اور ساحر دیکھے، لیکن ایسا کلام آج تک نہیں سنا۔ بلاشبہ یہ سحر ہے نہ جادو نہ کسی جن کا اثر بلکہ یہ ایک بحرِ بیکراں ہے اور میں اس کی صداقت کی گواہی دیتا ہوں"

## ایاس بن معاذ

اسی زمانے میں اوس اور خزرج کے معرکوں میں اوس کو شکست ہوئی اور کسی حمایتی کی ضرورت محسوس کی تو قبیلۂ اوس کے معززین قریش کے پاس گئے کہ انھیں اپنا حلیف بنائیں۔ ان معززین میں ایاس بن معاذ بھی تھے۔

معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس سفارت کے بارے میں علم ہوا تو ان کے پاس تشریف لے گئے اور رسمی گفتگو کے بعد فرمایا "میرے پاس تمھاری بہبود اور بھلائی کے لیے ایک چیز ہے، کیا تم سنو گے؟"

ایاس بن معاذ ایک صالح فطرت جوان تھے۔ انھوں نے اس چیز کے بارے

میں اشتیاق ظاہر کیا۔
آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کے سامنے اسلام کے زرّیں اصول پیش کیے اور تلاوت کی جسے سننے کے بعد ایاس بن معاذ نے اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا اور بولا "میرے ساتھیو! ہم جس مقصد کے تحت یہاں آئے ہیں، یہ دین اس سے بہت بہتر ہے۔"
یہ سنتے ہی اُن کے ساتھی بُری طرح مشتعل ہو گئے۔ وفد کے سالار ابوالجیس نے زمین سے کچھ خاک اٹھا کر ان کے مُنہ پر ماری اور بولا "چپ رہ! ہم فضول گفتگو سننے کے لیے یہاں نہیں آئے۔"
یہ سن کر معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور چند نفوس کا یہ وفد اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد چلا گیا جہاں جا کر کچھ عرصے کے بعد ایاس بن معاذ مختصر سی علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ ان کے بارے میں کہا گیا کہ وفات کے وقت ان کی زبان اُنھی کلمات کا ورد کر رہی تھی جو انھوں نے معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنے تھے۔ اس طرح اسلام کی آواز ایاس بن معاذ کے ذریعے اوس اور خزرج تک بہت پہلے ہی پہنچ گئی۔
بہرحال نبوّت کا دسواں سال اپنے دامن میں کچھ کامیابیاں اور کچھ ناکامیاں سمیٹے گزر گیا۔ قبائل کا دورہ اور طائف کا سفر اگرچہ کامیاب نہ رہا تھا لیکن اردگرد کے تمام قبائل اس دین سے متعارف ضرور ہو گئے تھے جس کے سبب قریش انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔ اِدھر اللہ کے نبیؐ فرضِ تبلیغ ادا کر رہے تھے، اسلام کی فطری کشش لوگوں کو متوجہ کر رہی تھی، اُدھر منکرین اپنی تمام قوتیں آزما رہے تھے اور ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ کے مصداق یہ دین اپنے حقّ و صداقت کی بدولت مشرکین کی تمام تدبیروں کو ناکام بنا کر غلبہ پا رہا تھا۔

## عقدِ ثانی و ثالث

نبوّت کے دسویں برس ہی رمضان المبارک میں معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم

نے ام المومنین حضرت سودہؓ سے نکاح کیا اور اسی برس شوّال کے مہینے میں صدّیقِ اکبر حضرت ابوبکرؓ کی دختر جنابہ عائشہؓ صدیقہ سے عقد کیا جن کی رخصتی تین برس بعد عمل میں آئی۔

## معراج ۔ ۲۷ رجب المرجب ۱۰ نبوی (۶۲۰ء)

دس برس کی طویل مدّت میں معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو دنیا کی ہر دشواری اور ہر مصیبت نے گھیرا تھا مگر آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) وہ نبی تھے جن پر نبوّت تمام ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو نبوّت و رسالت سے سرفراز فرمایا تھا اور اس تمام عرصے میں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اپنی ذمّے داریوں سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہ ہوئے تھے۔ معاشرے کے ایک فرد، ایک معلّم، شوہر، باپ، قرابت دار، تاجر اور ہمسائے کی حیثیت سے آپ کا ہر عمل مثالی تھا۔ ہر رشتے اور ہر رویّے میں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم)، رسول تھے، ہادی و مصلح تھے، رہبر تھے۔ زندگی کے ہر شعبے میں آپ نے اللہ کی ہدایت پر عمل کیا تھا، اسی کی رضا چاہی تھی۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اس وقت بھی نبی کے انداز میں سوچتے جب مشرکین ایذا پہنچاتے، تمسخر اڑاتے اور ہر بات کو جھٹلاتے تھے۔ تب بھی آپؐ نبی ہوتے جب عام انسانوں کی محفلوں میں رونق افروز ہوتے، بازار جاتے، خرید و فروخت کرتے یا اہل و اعیال میں شامل ہوتے۔ دراصل یہ بھی شانِ رسالت ہی تھی کہ قبل از نبوّت بھی آپؐ نے کسی نبی کی طرح عہدِ شباب پاکیزہ اور بے داغ گزارا تھا اور منصبِ نبوّت پر فائز ہونے کے بعد بھی ہر لمحہ اور ہر ساعت آپ نے اللہ کی ہدایت پر نظر رکھی، گویا کہ یہ جلیل القدر ہستی کارِ نبوّت کے لیے ہی پیدا کی گئی تھی۔ حیاتِ مقدّس کی ہر ساعت بنی نوعِ انسان کے لیے ایک نمونہ اور ہدایت تھی۔

یہ کامل ترین انسان اور اشرف المخلوقات میں افضل البشر ہستی اب عمر کے اس حصّے میں داخل ہو چکی تھی جب مالکِ حقیقی نے کارِ خاص پر مقرر فرماتے اور نئی ہدایات دینے کے لیے اپنے حضور طلب فرمایا۔ اس وقت آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم)، اللہ کے مہمان ہوئے۔ اسی مہمانی اور میزبانی کو معراج کہتے ہیں۔ معراج

کے معنی ہیں عروج، عزت و رفعت۔ تمام انبیا علیہم کی زندگی میں اس کے مختلف انداز نظر آتے ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے قادرِ مطلق نے اپنے خاص بندوں کو کائنات کا مشاہدہ بھی کرایا اور امرِ خاص پر متقرر فرمانے کے لیے بہ ذاتِ خود ہدایات دینے کی عزّت بھی عطا کی۔

حضرتِ آدمؑ ہر سال بیت اللہ کی زیارت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جنابؑ کوہِ عرفات پر سو گئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام اولاد کو جو قیامت تک پیدا ہونے والی ہے، صالحین کو دائیں جانب اور منکرین کو بائیں جانب صف بستہ کر کے ایک خواب دِکھایا۔ اس وقت جنابِ آدمؑ نے ان سب کو اسلام کی تعلیم دی تب اللہ نے ان سے (آدمؑ) کلام کیا۔ جنابِ ابراہیمؑ نے اعلائے کلمۃ الحق کیا تو باطل معبودوں کی حمایت کے لیے زمانہ مخالف ہو گیا۔ باہم مشورے شروع ہوئے اور بات ٹھہری کہ انھیں زندہ جلا دیا جائے۔ تب قلنا یا نارُ کونی برداً سلاماً علیٰ ابراہیم کہنا گویا کہ ربِ کائنات کی جانب سے ان کے لیے عزّت و رفعت تھی۔

جنابِ موسیٰؑ نے وادیٔ المقدّس میں حق تعالیٰ سے کلام کیا۔ پھر کوہِ طور پہ طلب کیے گئے اور چہل یوم قیام کے بعد انھیں احکامِ شریعت عطا کیے گئے۔ پھر جنابِ مسیحؑ نے تمام شب یادِ الٰہی میں پہاڑ پہ گزاری۔ ان کی عبادت مکمل ہوئی تو ان بارہ اصولوں کا اعلان کیا گیا جو ان کے لیے مقرّر کیے گئے تھے۔ یہ تمام واقعات ان جلیل القدر ہستیوں کی رفعت و عروج کا اظہار کرتے ہیں۔

اب یہی موقع معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لیے تھا، لیکن سب سے مختلف سب سے جداگانہ! اس طلبِ خاص کا مطلب تھا کہ مالکِ حقیقی اپنے محبوب بندے کو کائنات کا مشاہدہ کرانے، گفتگو فرمانے، نئے تقرّر کے لیے اور مزید بلند منصب عطا کرنے کی خاطر بُلانا چاہتا ہے۔ یہ طلب کب ہوئی؟ اس سوال کے جواب میں مورّخین کی آرا مختلف نظر آتی ہیں۔ امام طبری کے خیال میں نبوّت نازل ہونے کے دوسرے دن ہی معراج ہوئی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسے نبوّت کے بارہ سال بعد لکھا ہے۔ عام خیال بھی یہی ہے کہ معراج سفرِ طائف

کے بعد ہوئی۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے لکھا کہ معراج نبوت کے دس برس بعد ہوئی۔ اکثریت اسی پر متفق ہے کہ یہ سفر ہجرت سے قبل اور طائف سے واپسی کے بعد پیش آیا۔ اس کے بارے میں علامہ سلیمان سلمان منصور پوری نے تاریخ اور مہینے کے تعین کے ساتھ لکھا ہے چنانچہ ۲۷ رجب المرجب سنہ ۱۰ نبوی کو معراج ہوئی اور خالقِ کائنات نے اپنے بندے کو ملکوت سموات والارض کی سیر کرائی۔ معراج کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے، لیکن قرآنِ مجید اور مستند تواریخ میں اس کی تفصیل اس طرح درج ہے کہ اس مبارک رات میں حضرت جبرئیل ؑ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک بُراق کے ذریعے مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے گئے۔ اس دوران میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) دُور دراز کے تمام اہم مقامات سے گزرے۔ اس سفید مرکب کا نام بُراق تھا۔ اس کی صبا رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جہاں جہاں نظر جا سکتی تھی وہاں اس کا قدم پڑتا تھا اور اس طرح وہ لمحوں میں صدیوں کی مسافت طے کر رہا تھا لہٰذا اس سفر میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) حرم شریف سے روانہ ہوئے تو یثرب کے نخلستانوں سے گزرے۔ (جو ہجرت گاہ بننے والی تھی) طورِ سینا بھی راہ میں آیا۔ (جہاں جنابِ موسیٰ ؑ کو قادرِ مطلق نے شرفِ کلام بخشا تھا) بیت اللحم کا علاقہ بھی قطع کیا۔ (جو روح القدس کی جائے ولادت تھا) حیرت انگیز بات تھی کہ اس تیز رفتاری کے باوجود یہ سب نظارے نمایاں اور صاف تھے۔ ان تمام متبرک مقامات سے گزرتے ہوئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بیت المقدس پہنچے جہاں تمام جلیل القدر انبیاء ؑ منتظر تھے۔ اس جگہ یہ سب انبیاء و ملائکہ مقتدی بنے اور معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے امامت فرمائی۔ اسی نماز کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں جبرئیل الامین نے خمر اور شیر سے بھرے ہوئے دو پیالے پیش کیے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے شیر کا انتخاب فرمایا اور سیر ہو کر پیا۔ تب جبرئیل ؑ نے کہا: "یا رسول اللہ! دودھ کا انتخاب مبارک ہو۔ اگر آپ جامِ خمر پی لیتے تو آپ کی اُمت گمراہ ہو جاتی، لیکن جامِ شیر سے رغبت کا اظہار ہدایت کا سلسلہ اور نیک علامت ہے۔"

یہاں سے پھر سفر شروع ہوا، وہی سواری، وہی رہبر! براق نے آسمان کی جانب پرواز کی اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم)، چشم زدن میں پہلے آسمان پر پہنچ گئے۔ یہاں سے دوسرے، تیسرے آسمان سے ہوتے اور جلیل القدر انبیاءؑ سے ملاقات کرتے ہوئے ہفت آسمان پر نہرِ کوثر دیکھتے ہوئے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ گئے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں سے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے رہبر حضرت جبرئیلؑ نے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا ساتھ چھوڑ دیا اور کہا۔ "یارسول اللہ! اس مقام سے آگے جانے کی ہمت نہیں کر سکتا کیوں کہ یہ مقام وہ ہے جہاں بال برابر بھی آگے بڑھوں گا تو فروغِ تجلّی میرے پَروں کو جلا ڈالےگی۔"

یہ مقام وہ تھا جہاں سے آگے جانا کسی کو بھی نصیب نہ ہوا تھا اور نہ کوئی جا سکتا تھا۔ یہاں سے آپؐ آگے بڑھے اور تمام حجاباتِ نورانی طے کرتے ہوئے ربّ العالمین کے حضور میں حاضر ہوگئے۔ اس موقع پر مہمان اور میزبان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی، کس طرح سے ہوئی، ربِّ کائنات نے جملہ احکام پردے میں رہ کر صادر فرمائے یا دیدار کی عزت بخشی، اس کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں ہے۔ سورۂ اسریٰ سے جن جن امور کا اندازہ ہوتا ہے، خداوندِ عالم کے وہ احکام ہیں جنھیں بنی نوعِ انسان کی بہتری و سلامتی کے لیے بہترین اصول قرار دیا جا سکتا ہے۔ نماز فرض کرنے اور ان تمام احکام کے بعد معلّمِ اعظمؐ کو جنّت اور دوزخ کا مشاہدہ کرایا گیا، نیک و بد انسانوں کے مقام دِکھائے گئے اور انھیں مختلف گناہوں کی سزا پاتے ہوئے دِکھایا گیا۔ ازاں بعد معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم بیت المقدس سے ہوتے ہوئے مسجد الحرام میں واپس آگئے۔

اس سفر کے بارے میں بھی متعدّد آراء موجود ہیں۔

(۱) یہ سفر عالمِ آخرت میں پیش آیا۔

(۲) معراج صرف روح کو ہوئی، جسمِ اطہر بہ دستور اپنی جگہ رہا۔

(۳) آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے بیٹھے بیٹھے روحانی طور پر تمام عالم کا مشاہدہ کیا۔

(۴) عالمِ بیداری میں حضور بہ ذاتِ خود معراج پر تشریف لے گئے۔

اس معاملے میں تمام علماء اپنے اپنے قول کی سچائی ثابت کرنے کے لیے احادیث کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ محدثین و سیرت نگار اس واقعے کی وضاحت اور تفصیل کے لیے جن صحابہؓ کرام کے حوالے سے روایات پیش کرتے ہیں، ان تمام صحابہؓ کرام کی تعداد تیس سے پینتیس تک پہنچ جاتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت مالکؓ بن حفصہ، حضرت ابوذرؓ غفاری، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت عمرؓ بن خطاب، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عبداللہؓ بن عباس، حضرت ابوسعیدؓ خدری، حضرت حذیفہؓ بن یمان اور مزید چند اصحابِ رسولؐ۔ خواتین میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا اسمِ گرامی آتا ہے۔

ان تمام نے مختلف اوقات میں اس واقعے کی تفصیل بیان کی ہے اور ان کی آراء ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہیں۔ ایسے میں لامحالہ نگاہِ تجسس قرآنِ مجید کی طرف جاتی ہے اور قرآنِ حکیم کا جواب ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد الحرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے گئی جس کے گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں تاکہ اسے اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کرائیں۔ بے شک وہی ہے (اللہ) سب کچھ سننے اور دیکھنے والا۔

اس آیتِ مبارکہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت سے یہ واقعہ رونما ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کو عالمِ بیداری میں جسمِ اطہر کے ساتھ اپنے حضور طلب کر لیا کیوں کہ یہی سنتِ الٰہی ہے۔ ابتدا سے ہی اس نے اپنے تمام انبیاءؑ کو ایک مقررہ وقت پر تمام مادّی رکاوٹیں اور درمیانی جملہ حجابات ہٹا کر ان حقیقتوں کا مشاہدہ کرایا جنھیں دیکھنے سے قبل ہی وہ ان پر ایمان لے آئے تھے۔ بہرکیف اس عظیم دعوت سے وہ اخلاقی تعلیم مراد تھی جس پر آئندہ چل کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک پاکیزہ معاشرہ تعمیر کرنا تھا۔ معراج کا زمانہ دراصل وہ زمانہ تھا جب مشرکین، دینِ حق کو پامال کرنے اور آپ

(صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو ناکام بنانے کی ہر کوشش آزما چکے تھے مگر کوئی قوت بھی اسلام کی بلند ہوتی آواز کو نہ روک سکی تھی اور اب یہ آواز دُور دراز پہنچ چکی تھی۔ عرب کا کوئی قبیلہ بھی ایسا نہ تھا جہاں کے لوگوں میں سے دو چار نے دامنِ اسلام میں پناہ نہ لی ہو۔ ہر گھر کے ایک دو فرد دینِ حق کی طرف راغب تھے جس کے سبب مسلمانوں کی ایک خاصی بڑی جماعت بن گئی تھی، لیکن ان کی قوت منتشر تھی۔ ہر جگہ کفر کے نرغے میں گھرے ایک ایک دو دو مسلمان حق کی حمایت کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کو تیار نظر آتے تھے۔ اب انھیں سمیٹنے اور ایک قوت بنا دینے کی ضرورت تھی کیوں کہ بٹی ہوئی قوت متحد ہو کر ہی ناقابلِ تسخیر بنا کرتی ہے۔ بہ الفاظِ دگر تبلیغ کے عظیم فرض کی ادائیگی کے علاوہ اب ایک سیاسی اقتدار بھی لازمی تھا جس کے لیے اخلاق و تمدّن کے کچھ اصول، قاعدے ضوابط اور باقاعدہ ایک لائحۂ عمل مرتب کرنا مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت بن چکا تھا۔ دراصل معراج کا مقصد بھی یہی تھا۔ یہ ضابطہ و قوانین اور کامیاب زندگی گزارنے کے زرّیں اصول سورۂ بنی اسرائیل میں بڑی وضاحت کے ساتھ دیے گئے ہیں جو عین اسی موقع پر نازل ہوئی جب معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے معراج کا ذکر کیا اور کفارِ مکّہ نے انھیں اس طرح سے جھٹلایا کہ بعض بعض مسلمان بھی متذبذب ہو گئے۔ ایسے میں قادرِ مطلق نے خود ہی فیصلہ فرما دیا اور اس آیتِ مبارکہ کی پہلی سورۃ ہی ان تمام اعتراضات کا جواب ہے جو جسمانی سفر پر دلالت کرتی ہے نہ کہ خواب پر! اس فرمان سے مسلمان مطمئن ہو گئے اور منکرین کی تشویش بڑھ گئی۔

# مدینۂ منوّرہ میں اسلام کی ابتدا

(۱۱ نبوی ۔ ۶۲۱ء)

مدینۃ النبی کا اصل اور قدیم ترین نام یثرب تھا ۔ ابتدا میں یہاں یہودی آکر آباد ہوئے جن کی نسلیں پھیلیں اور مدینے کے قرب وجوار پر قبضہ کر کے، چھوٹے چھوٹے قلعے بنا کر سکونت اختیار کرتی گئیں۔ یوں چند نفوس سے خاندان اور خاندانوں سے قبائل بن گئے جن کی تعداد اکیس تک پہنچ گئی۔ ان کی اکثریت نے بستیاں بسائیں اور دولت کمائی ۔ اس وقت یہ سبھی شریعتِ موسوی کے ماننے والے تھے ۔ پھر زمانہ بدلتا گیا، ضرورتیں وسیع ہوتی گئیں اور یہ دین میں تاویلیں گھڑ کے اسے مرضی کے مطابق ڈھالتے گئے یہاں تک کہ بس نام کے یہودی رہ گئے، لیکن اتنا ضرور تھا کہ اہلِ کتاب ہونے کے طفیل ان میں اہلِ علم بھی پائے جاتے تھے اور علم کے شوقین بھی اور بعض تو علم و فضل میں کمال رکھتے تھے جن کی علم دوستی کی بدولت مدینے کے قرب و جوار میں مدارس بھی تھے۔ ان میں "بیت المدارس" کو خاص اہمیت حاصل تھی جہاں قوم یہود کے علماء تربیت کا سبق بھی دیتے تھے اور شعر و ادب کا علم بھی سکھاتے تھے ۔ شروع سے اب تک یہ لوگ کتبِ آسمانی کی بدولت اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ خالقِ کائنات کی جانب سے ابھی ایک پیغمبر اور بھی آنے والا ہے جس کے لیے انھیں یقین تھا کہ وہ انھی میں پیدا ہو گا۔

ان یہودیوں کے علاوہ وہاں بت پرست بھی آباد تھے۔ مدّتیں گزر گئی تھیں جب یمن کا سیلاب "سیلِ عرم" آیا تو یمنی اس بربادی سے بچنے کے لیے وہاں سے نکلے۔ ان کے بہت سے لوگ مدینے میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ ان یمنی باشندوں میں دو سگے بھائی اوس اور خزرج بڑی نمایاں شخصیتوں اور اعلیٰ خصوصیات کے حامل تھے۔ اپنی خوبیوں سے متاثر کرنا اور دوسروں کی ہر اچھی صفت کا اعتراف کرنا ان کی عادت تھی لہٰذا انھوں نے یہودیوں کے علوم و فنون کو پسندیدہ نظر سے دیکھا اور ان میں گھُل مل گئے۔ انھی دو بھائیوں کی نسلیں اوس اور خزراج کہلائیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے قبیلے بنتے گئے جو جنگ جو اور دلیر بھی تھے، مہذّب اور با اخلاق بھی۔ ان میں ایثار کا مادّہ بھی بہ درجۂ اتم موجود تھا، حق اور ناحق کا شعور بھی! لیکن یہودیوں کی کتبِ سماوی کی بدولت وہ علم کے معاملے میں ان لوگوں سے بہت مرعوب تھے۔ بت پرستی ان کا مذہب تھا جس کی کوئی بنیاد نہ تھی، بس بے جان مورتیاں اپنے ہاتھوں سے بنانا اور ان کے سامنے گڑگڑانا! لہٰذا اپنے اس دین سے تو انھیں کچھ نہ ملا تھا لیکن یہودیوں میں بیٹھنے اٹھنے اور ان کی دینی باتیں کانوں میں پڑتے کے سبب اب انھیں بھی کسی پیغمبرِ موعود کا یقین ہو چلا تھا۔ شروع میں ان دو بھائیوں کی نسلیں اتحاد و محبت کے رشتوں میں بندھی رہیں، لیکن جوں جوں ان کی تعداد بڑھی اور یہودیوں پر ان کے اوصاف آشکار ہوئے تو انھوں نے ان رشتوں کو توڑ دیا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی بات ایسی ہوتی جو ان دونوں قبیلوں کو لڑوا دیتی تھی۔ اُن کا دَور وہ دَور تھا جب اپنے اسلاف کے رشتے اور تعلّقات فراموش کر کے وہ برسوں سے خانہ جنگی کا شکار تھے اور آخری جنگ "جنگِ بعاث" نے ان دونوں قبیلوں کی قوّت کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ ان کی دولت، دلیری مروّت اور حوصلہ سبھی اس جنگ کی نذر ہو گئے تھے۔ خاص طور پر اوس جو شکست خوردہ تھے، بُری طرح کمزور ہو کر کوئی حمایت، کوئی سہارا چاہتے تھے۔ اسی سبب ان کا وہ وفد مکّے آیا جس کے ساتھ ایاس بن معاذ آئے تھے جو دینِ اسلام کی قبولیت کا اعلان کیے بغیر لوٹ گئے تھے، لیکن اس

کی محبت اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ قبیلہ اوس کے جوان تھے۔ دوسری شخصیت ان کے مخالف قبیلے کے شاعر سوید بن صامت رضؓ تھے جو نسخۂ لقمانی کو کتابِ آسمانی سمجھتے ہوئے اُسے معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنانے کے لیے آئے، لیکن کلامِ الٰہی سے متاثر ہوکر واپس ہوئے۔ گویا دو مخالف قبیلوں کے دشمن جوان ایک ہی دین کی محبت میں گرفتار ہوکر واپس ہوئے تھے۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ وہ دونوں ہی واپس جاکر دارِ فانی سے کوچ کر گئے، لیکن اس طرح ان دونوں قبائل تک دینِ حق کی آواز پہنچ گئی تھی۔ ہاں یہ بات اور تھی کہ ابھی ان لوگوں نے اسے درخورِ اعتنا تصور نہ کیا تھا، لیکن قادرِ مطلق نے اِس جگہ کو اپنی اس رحمتِ خاص کے لیے منتخب کر لیا تھا جسے دینِ کہتے ہیں اور یہی وقت تھا جو ان کے لیے ہدایت کا پیغام لایا تھا۔

معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ زمانۂ حج میں اِردگرد سے آنے والے معززین کے پاس تشریف لے جاتے اور دینِ حق کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ اس بار بھی وہ کسی اجتماع کے منتظر تھے کہ انھیں معلوم ہوا، بنو خزرج کے کچھ معززین آئے ہوئے ہیں۔ اس وقت ان چند معززین کے آنے کی خبر سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بڑی مسرت محسوس کی اور بہ غرضِ ملاقات ان کے پاس تشریف لے گئے۔ گفتگو کے دوران میں آپ نے ان سے ان کے نام اور نسب دریافت کیے۔ یہ چھ افراد تھے، ابوالہیثم رضؓ بن تیہان، اسعد رضؓ ابنِ زرارہ، عوف رضؓ ابن حارث، رافع رضؓ بن مالک، قطبہ رضؓ بن عامر اور جابر رضؓ بن عبداللہ!

معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مکمل تعارف کے بعد ان کے سامنے دینِ حق پیش کیا تو ان کے قلب نورِ اسلام سے منوّر ہو گئے۔ چند لمحے تو کوئی کچھ نہ بولا، پھر اسعد ابنِ زرارہ نے پہل کی اور بولے: "میرے ساتھیو! یہ وہی نبی ہیں جن کا تذکرہ یہودی کرتے ہیں۔ آؤ کیوں نہ ہم ان کی اطاعت کرنے میں سبقت کریں۔ ایسا نہ ہو کہ یہودی بازی لے جائیں!"

اس مشورے کے بعد ان چھ افراد نے اعترافِ حق کیا۔ ایمان لانے والوں میں پہل کرنے والے اسعد رضؓ ابنِ زرارہ ہی تھے، گویا مدینے کے مسلمانوں میں

سب سے پہلے بہ بانگِ دہل دینِ حق قبول کرنے والے وہی تھے۔ ان چھ آدمیوں کا مسلمان ہونا دراصل انصارِ مدینہ کے باقاعدہ ایمان لانے کی ابتدا تھی۔ یہ سب دولتِ ایمان سے مالا مال ہو کر لوٹے اور ذکرِ حبیب سے اپنی محفلیں سجانے لگے تھے۔

## بیعت عقبۂ اولیٰ۔ ۱۱ نبوی (۶۲۱ء)

یہ سال گزرا اور چند ماہ کے بعد ہی نبوّت کے گیارھویں سال اوس اور خزرج کے بارہ معززین بہ ظاہر طوائفِ کعبہ کے لیے آئے، لیکن دراصل انھیں دینِ حق کی تڑپ کھینچ کر لائی تھی۔ ان بارہ ہستیوں کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے دو تو وہی تھے جو کچھ عرصے قبل ہی دولتِ حق سے مالا مال ہو کر گئے تھے، باقی دس نئے تھے۔ اس بار انھوں نے عقبہ کی گھاٹی میں قیام کیا اور کسی ذریعے سے یہ خبر معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بھیجی جو خود بھی بیرونی علاقوں سے آنے والوں کے منتظر رہا کرتے تھے۔ اس بار دس نفوس کا یہ وفد اسعدؓ ابنِ زرارہ کی سرکردگی میں یہاں آیا تھا۔ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے انھیں شرفِ ملاقات بخشا اور دینِ حق پیش کیا جس کے بعد ان لوگوں نے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) سے مندرجہ ذیل عہد کیا۔

(۱) ہم خدائے واحد ولاشریک کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے۔
(۲) ہم خدا کے نبیؐ کے حکم سے کبھی بھی سرتابی نہ کریں گے۔
(۳) کبھی چوری نہ کریں گے، کسی پر بے گناہ الزام نہ دھریں گے۔
(۴) زنا، جھوٹ اور تہمت سے باز رہیں گے۔
(۵) اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے۔ (اس سے مراد دختر کُشی تھی)

جب مدینے کے معززین یہ عہد کر چکے تو معلّمِ اعظم صلّی اللہ وسلّم نے فرمایا۔
"خوب جان لو کہ اگر تم اس بیعت کو پورا کرو گے تو تمھارے لیے جنّت ہے، وہاں کی راحتیں ہیں اور اگر تم سے کوئی خطا سرزد ہوئی تو اس کی حدِّ شرعی دنیا میں تم پر جاری ہوگی جو اس گناہ کا کفّارہ سمجھی جائے گی اور اگر گناہ کے باوجود خدا نے پردہ پوشی کی، تم پر دنیا میں تمھاری خطا پر حدِّ شرعی نہ لگی تب قیامت کے دن خداوندِ عالم

کو اختیار ہے کہ تمھیں عذاب دے یا بخش دے۔"

یہی بیعت، بیعتِ عقبۂ اولیٰ کہلاتی ہے۔

## المقری بالمدینۃ منورہ

اس بیعت کی تکمیل کے بعد ان معززین نے خواہش ظاہر کی اور کہا "یارسول اللہ! احکامِ خداوندی کے درس کے لیے کسی معلّم کو ہمارے ساتھ بھیج دیجیے جو ہمیں بھی دین کی تعلیم دے اور دوسروں کو بھی۔"

یہ گزارش دربارِ رسالت میں قبول ہوئی اور معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعبؓ بن عمیر کو ان کی دینی تعلیم کے لیے ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔ ان کا فرض اہلِ مدینہ کو احکامِ شریعت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ قبیلۂ اوس اور خزرج کے مسلمانوں کی امامت کرنا بھی تھا۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر جن میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مشابہت موجود تھی، حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کے چچا زاد اور حضرت عبدالمطلب کے بھتیجے تھے۔ وہ اہلِ مدینہ کے اوّلین معلّم بنے۔ انھی کی شبانہ روز کاوشوں سے مدینے میں اسلام کا بول بالا ہوا۔ ان کی میزبانی کا شرف حضرت اسعدؓ بن زرارہ نے حاصل کیا جس کے سبب انھیں خود بھی اہلِ مدینہ کو اس دین کی طرف راغب کرنے کا موقع ملا۔

## پنبہ در گوشِ شیدائی

جس وقت غارِ حرا سے نکلنے والی نور کی کرن مکّے سے نکل کر مدینے کو منوّر کر رہی تھی، اس وقت مکّے کے مشرکین ابھی اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ وہ کچھ اور کر سکتے یا نہیں، لیکن ہر آنے والے کو گھیر ضرور لیتے تھے۔ یہ بیعتِ عقبۂ اولیٰ کے بعد کا ہی زمانہ تھا جب مکّے میں خبر مشہور ہوئی کہ نواحِ یمن کا رئیسِ قبیلہ دوس کا سردار طفیل بن عمرو پہنچنے والا ہے۔ دوس کا جلیل القدر سردار ایک صاحبِ علم انسان اور زود گو شاعر تھا۔ اس کی دانشوری کے چرچے ہوا کرتے تھے۔ دولت و طاقت کے لحاظ سے بھی کوئی مشکل ہی سے اس کی برابری کر سکتا تھا۔ مکّے میں اس کا آنا معمولی بات نہ تھی۔ پھر قریش تو معمولی لوگوں کو بھی گھیر کر اسلام سے برگشتہ کرنا چاہتے تھے، وہ تو بہرحال سردار تھا لہٰذا یہ خبر

سنتے ہی مکّے کے تین مغرور سردار اس کے استقبال کے لیے بڑی ہی شان و شوکت کے ساتھ مکّے سے باہر نکلے۔ اس اخلاق اور وضع داری کے پس پردہ مقصد کچھ اور ہی تھا جس سے وہ زیادہ دیر گریز نہ کر سکے اور رسمی گفتگو کے بعد اسلام کے موضوع پر اس طرح آئے کہ حمزہؓ بن عبد المطلب، عمرؓ بن خطّاب اور اُمّ حبیبہؓ بنتِ ابو سفیان ایسی اہلِ علم ہستیوں کے مسلمان ہو جانے کی خبر کو جادو اور سحر پر محمول کر کے طفیل بن عمرو دوسی کو خوف زدہ کر دیا۔ لمحے بھر کو تو وہ شخص گھبرا گیا۔ مکّی معززین نے کہا تھا کہ ابنِ عبد اللہ آواز سے جادو کر دیتے ہیں، پھر انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ اپنے معبودوں سے انکار کر کے پرانے اور خون کے رشتے توڑ دیتا ہے۔

یہ خبر واقعی خوف زدہ کرنے والی تھی لہٰذا جادو اور سحر سے بچنے اور اس آواز سے محفوظ رہنے کا ایک ہی طریقہ تھا جو اس نے اختیار کر لیا۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ قبیلۂ دوس کا سردار معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی آواز اور کلام سے بچنے کے لیے پنبہ در گوش مکّے میں داخل ہوا۔ صبح و شام وہ باہر نکلتا تو اسی انداز سے کہ کانوں میں روئی بھری ہوتی۔ پکارنے والے پکارتے رہ جاتے مگر وہ سُن نہ سکتا۔ اس وقت ہر چند کہ وہ کئی لوگوں کے مذاق کا موضوع بنا، پھر بھی اس نے کان بند ہی رکھے۔ مبادا آواز کے ذریعے جادو کر دیا جائے، لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا، یا وہ اس سردار کے لیے سرکارِ دو عالم کی غلامی لکھ چکا تھا۔ اس فیصلے کے سامنے اس کا خوف اور مکّی معززین کی تمام کاوشیں نقش بر آب ثابت ہو کر رہ گئیں۔

ایک صبح وہ باہر نکلا تو معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم حرم میں مصروفِ صلوٰۃ تھے۔ یہ کیسی آواز تھی، کیسا کلام تھا جس نے طفیل عمرو دوسی کو ساکت کر دیا۔ اسے یاد آیا کہ وہ آج کان بند کرنا بھول گیا تھا، لیکن قبل اس کے کہ وہ بھاگ کر واپس جاتا، جادو اور سحر کی تمام داستانیں اس کے ذہن سے محو ہو چکی تھیں۔ قلب سے خوف چھٹ گیا تھا اور عقل کہہ رہی تھی۔ طفیل بن عمرو دوسی! ذرا سنو تو یہ کیسی آواز ہے، کیسا کلام ہے؟

طفیل بن عمرو دوسی نے سنا اور جب معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم حرم سے

نکلے تو وہ ان کے تعاقب میں چل پڑا۔ اثنائے راہ میں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے استفسار فرمایا تو اس نے سب کچھ بتا دیا اور آج اتفاق سے جو کلام سماعت سے ٹکرا گیا تھا پھر اسی کو سننے کی آرزو کی۔ اس دن اہلِ مکّہ نے بڑے دکھ کے ساتھ یہ منظر دیکھا کہ قبیلۂ دوس کا دانشور سردار کل تک جس ہستی سے بچنے کے لیے کان بند کیے پھر رہا تھا، لمحے بھر میں کُفر سے اسلام تک کا فاصلہ طے کر کے اسی ہستی کی غلامی پر فخر کر رہا تھا۔

## ابو ذرؓ غفاری

اسی برس ابو ذرؓ غفّاری نے بھی دینِ حق قبول کیا۔ کچھ دن قبل ہی انھوں نے مدینے میں ایک نئے دین اور عظیم رہبر کا چرچا سنا تو پہلے اپنے بھائی کو بھیجا، پھر خود ہی مکّے پہنچ گئے۔ اس وقت تک وہ کسی کو جانتے نہ تھے لہٰذا باہر سے آنے والے دیگر اجنبیوں کی طرح وہ کعبۃ اللہ میں ٹھہر گئے جہاں علیؓ ابنِ ابی طالب نے انھیں مہمان سمجھتے ہوئے گھر چلنے کی دعوت دی اور راہ میں آمد کا مقصد پوچھا تو ابوذرؓ غفاری نے اپنے سفر اور اس کے مقصد کے بارے میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ روداد انھیں سنائی اور اس طرح ان کی وساطت سے ابوذرؓ غفّاری کو معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہونے کا موقع مل گیا اور مسلمان ہو گئے۔

آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے فرمایا" ابوذرؓ! اپنے مسلمان ہونے کی خبر راز میں رکھنا ورنہ اہلِ مکّہ تمھارے دشمن ہو جائیں گے۔"

یہ سنتے ہی ابوذرؓ غفّاری نے بڑے جوش کے عالم میں کہا" یارسولؐ اللہ! خدا کی قسم، میں تو ان کا نرغے میں اعلان کر کے جاؤں گا کہ میں مسلمان ہوں۔"

معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے سکوت فرمایا تو ابوذرؓ غفّاری حرم میں پہنچے اور بہ آوازِ بلند کلمۂ طیّب پڑھنے لگے۔ قریش نے سنا تو جیسے ان کے آگ لگ گئی۔ اوّل تو ہر طاقت سے انکار کر کے محض ایک کا اعلان کرنا ہی، ان کے منشا و مرضی کے خلاف تھا، دوسرے وہ اپنی ناکامی کے سبب آپے سے باہر رہتے تھے۔ اب کچھ اور نہ کر سکے تو حرم میں گھُسے اور ابوذرؓ غفّاری کو مارنے لگے۔ ابوذرؓ غفّاری کا حال یہ تھا کہ کافر انھیں جس قدر زدوکوب کرتے، یہ اتنا ہی زیادہ کلمہ پڑھتے، یہاں تک

کہ عباسؓ بن عبدالمطلب آگئے اور انھیں بچاتے ہوئے بولے "اے قریش! یہ تم لوگوں کو کیا ہوگیا کہ قبیلۂ غفار کے معزز آدمی کو مار رہے ہو! کیا تم بھول گئے کہ اسی قبیلے میں تم کھجوروں کی تجارت کرنے جاتے ہو!"

یہ سنتے ہی مشرکین نے انھیں چھوڑ دیا۔ دوسری صبح پھر حضرت ابوذرؓ غفاری نے حرم میں جاکر کلمہ پڑھنا شروع کر دیا جسے سن کر اہلِ مکّہ جذباتی ہو گئے، لیکن ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ وہ دولتِ اسلام سے مالا مال ہوکر مدینے کی طرف روانہ ہوگئے۔

## بیعتِ عقبۂ ثانی۔ ۱۲ نبوی (۶۲۲ء)

نبوّت کے بارھویں سال مدینے کی جانب سے ایک اور قافلہ آیا جس میں بہتّر مرد اور دو خواتین شامل تھیں۔ یہ لوگ بہ ظاہر تو معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بیعت کے لیے ہی آئے تھے، لیکن درحقیقت وہ آپ کو اپنے علاقے میں چلنے کی دعوت دینے کی غرض سے حاضر ہوئے تھے۔ اپنے دستور کی طرح یہ جماعت بھی عقبہ کے مقام پر ہی آکر ٹھہری۔ چونکہ باقاعدہ بیعت کے ارادے سے یہ دوسری جماعت تھی جو مدینے سے آئی اور عقبہ کے مقام پر فروکش ہوئی اسی سبب اسے بیعتِ عقبۂ ثانی کہا جاتا ہے۔ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو معلوم ہوا تو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) تشریف لائے۔ اس ملاقات کے لیے دن سے زیادہ رات کا وقت مناسب تھا کیوں کہ اس طرح گفتگو کے لیے طویل وقت مل سکتا تھا، دوسرے یہ ملاقات راز رہنا زیادہ بہتر تھی۔ وجہ یہ کہ مشرکین دشواری پیدا کر سکتے تھے۔ ان باتوں کو مدِّ نظر رکھ کر اللہ کے نبیؐ نے یہی وقت مناسب سمجھا اور پہنچ گئے۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو دیکھ کر مشتاقانِ دید میں مسرّت کی لہر دوڑ گئی اور وہ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے گرد جمع ہو گئے۔ احوال پُرسی و رسمی گفتگو کے بعد وہ اصل مقصد پہ آئے تو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) خاموش ہو گئے۔ اس وقت عباسؓ بن عبدالمطلب بھی موجود تھے جو مسلمان نہ ہوئے تھے، لیکن جاں نثاروں میں رہا کرتے تھے۔ وہ اہلِ مدینہ کا مقصد جان کر بولے "اہلِ یثرب! تم جانتے ہو کہ قریش ابنِ عبداللہ کے جانی دشمن ہیں۔ قریش نے انھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اب تم انھیں دعوت دے رہے ہو تو خوب سوچ لو کہ

ان سے عہدِ وفا باندھنا گویا سرخ و سیاہ آندھیوں کو دعوت دینے کے مترادف ہے"!
یہ سن کر اہلِ مدینہ بہ دستور اپنے موقف پر اڑے رہے جس کے واضح معنی یہی تھے کہ انھوں نے تمام مصائب برداشت کرنے اور ہر مخالف قوت سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اللہ کے نبیؐ نے ان کے سامنے دینِ حق پیش کیا جس کا پہلے ہی وہ دل سے اعتراف کر چکے تھے، اب زبان سے اقرار کیا۔
ابتدائی گفتگو مکمل ہو چکی تو معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لینے سے قبل دو سوال کیے۔
(۱) تم اشاعتِ دین میں میری مدد کرو گے؟
(۲) جب میں تمھارے شہر میں آکر آباد ہوں گا تو کیا تم میری اور میرے ساتھیوں کی حمایت اپنے اہل و عیال کے مانند کرو گے؟
یہ دو سوال سننے کے بعد اس جماعت کے معزّزین نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ایسا کرنے کے عوض ہمیں کیا ملے گا؟"
ارشاد ہوا "اللہ اور اللہ کی رضا!"
اس جواب نے انھیں مطمئن و مسرور کر دیا۔ انھوں نے اطمینان سے کہا۔ "یا رسول اللہ! ہمیں آپ کی تمام باتیں قلب و جان سے منظور ہیں، لیکن ہماری آرزو ہے کہ آپ ہماری تسلی فرما دیجیے کہ ہمارا ساتھ تو نہ چھوڑیں گے؟"
یہ سوال ان کی چاہت و عقیدت کی غمازی کر رہا تھا۔ معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں شفقت سے دیکھا اور فرمایا "اب میرا مرنا اور جینا سب تمھارے ساتھ ہے!"
یہ جواب سنتے ہی عاشقانِ رسولؐ باقاعدہ بیعت کرنے لگے۔ اس موقع پر سب سے پہلے معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ مبارک تھامنے والے حضرت براءؓ بن معرور تھے۔ انھوں نے یہ ہاتھ تھاما اور اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے آیندہ کے لیے عہد کرنے اور وحدانیت پر ایمان لا کر امر بالمعروف پر کاربند رہنے کا عزم کرنے لگے۔ ان کے بعد سب نے اسی طرح سے بیعت کی۔
اس وقت اِدھر تو اللہ کے نبیؐ مومنوں سے مصروفِ کلام تھے، اُدھر مشرکین

مکہ کو کچھ سن گن ملی تو اپنی عادت کے مطابق کن سوئیاں لینے لگے۔

یہ گفتگو سنتے سنتے ایک مشرک نے چلا کر خبر دی "اے اہلِ مکہ! ہوشیار رہنا۔ ابنِ عبداللہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر تمھارے خلاف مشورے کر رہے ہیں"

یہ آواز سبھی مومنوں نے سنی۔ بیعت کرنے والوں نے تعجب سے دیکھا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "ان آوازوں پر توجہ نہ دو۔ یہ لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں"

اس وقت عباسؓ بن عبادہ نے دریافت کیا "یارسول اللہ! اگر اجازت ہو تو انھیں سزا دی جائے!"

ارشاد ہوا "نہیں مجھے جنگ کی اجازت نہیں ہے"

بیعت کرنے والی یہ جماعت صبح روانہ ہونے والی تھی لہٰذا وہ زیادہ سے زیادہ دینِ حق کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ اس وقت معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھی میں سے بارہ افراد منتخب فرمائے جنھیں ان کے شہر (مدینہ) میں اشاعتِ دین کا ذمے دار بنا دیا اور نقیب (مبلغین) کا خطاب عطا فرمایا۔ یہ قبیلۂ خزرج کے نو اور قبیلہ اوس کے تین افراد تھے۔ ان کے اسمائے گرامی تاریخ میں محفوظ ہیں اور اس طرح درج ہیں۔

قبیلۂ خزرج: اسعدؓ بن زرارہ، رافعؓ بن مالک، عبادہؓ ابنِ صامت، سعدؓ بن ربیعہ، منذرؓ بن عمرو، عبداللہؓ بن رواحہ، عبداللہؓ بن عمرو، سعدؓ بن عبادہ اور براءؓ بن معرور۔

قبیلۂ اوس: اسیدؓ بن حضیر، سعدؓ بن خیثمہ اور ابوالہیثمؓ بن تیہان۔

صبح جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو قبیلۂ خزاج کے دو جوان منذرؓ بن عمرو اور سعدؓ بن عبادہ چند دن کے لیے مکے ہی میں رک گئے۔ صبح ہونے تک اہلِ مکہ کو معلوم ہوا کہ مدینے سے ایک جماعت آکر واپس ہوگئی ہے تو وہ ہاتھ ملتے رہ گئے۔ وہ اس قبیلے کے عقب میں جانے کی جرأت تو نہ کر سکے مگر ان دو جوانوں کو پکڑ لیا اور مارتے کھینچتے ہوئے حرم تک لے آئے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ انھوں نے آبائی دین ترک کر کے نیا دین اپنا لیا ہے تو اور بھی مشتعل ہو گئے۔ بہ نیت ثواب

ہر فرد انھیں ایک ایک طمانچہ مارنے لگا۔ اس صورتِ حال سے جب شور و غل بلند ہوا تو سب جمع ہو گئے۔ ان میں مطعم بن عدی اور حارث بن امیہ بھی تھے جو کبھی یثرب کے قیام کے دوران میں ان کے زیرِ بارِ احسان رہے تھے لہٰذا پہچان کر آگے بڑھے اور اپنی امان میں لے کر انھیں اس مشکل سے نجات دلائی، پھر یہ بھی اپنے وطن لوٹ گئے۔ قریش نے انھیں چھوڑ تو دیا لیکن پوری جماعت کا مدینے سے آکر دینِ حق قبول کرنا انھیں ہراساں کر گیا تھا۔

## ہجرت کا آغاز اور سفر کی دشواریاں

عقبہ کے مقام پر اس طرح دو مرتبہ بیعت کے بعد مشرکینِ مکہ اسلام کی اشاعت سے خوف زدہ ہو گئے۔ پھر انھیں معلوم ہوا کہ اہلِ مدینہ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دے گئے ہیں جسے انھوں نے قبول فرما لیا ہے۔ اس بات نے ان کے دل اندیشوں سے بھر دیے۔ ان دو قبائل سے یہ معاہدہ دراصل اسلامی ریاست کا سنگِ بنیاد رکھنے کے مترادف تھا۔ بہ الفاظِ دگر اہلِ یثرب نے معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حاکم تسلیم کر لیا تھا اور یہ اسلام کا بول بالا ہونے کی علامت تھی۔ مستزاد یہ کہ کم زور اور منتشر مسلمانوں کو اب ایک باقاعدہ ٹھکانا میسر آ رہا تھا اور ان کی ایک طاقت بننے والی تھی۔ یہ صورت وہ تھی کہ قریش جو بھی کرتے کم تھا۔ نتیجہ یہ کہ انھوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ جو جہاں تھا، اپنی جگہ مصروف ہو گیا تھا اور اُن کی ان کاوشوں کے باعث مکہ مسلمانوں کے لیے ارضی جہنم بن کر رہ گیا۔ یہ دیکھتے ہوئے معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہجرت کی اجازت دے دی۔ تب وہ چھُپ چھُپ کر ترکِ وطن کرنے لگے، لیکن یہ بھی آسان نہ تھا۔ قریش اس وقت بھی پوری قوت آزماتے اور سفر میں طرح طرح سے رکاوٹیں پیدا کرتے چنانچہ اس راہ میں کم و بیش سبھی کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جن میں صہیبؓ رومی، ابوسلمہؓ اور عمرؓ ابن الخطاب کے ہجرت کے خاص انداز تھے جنھیں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

حضرت صہیبؓ رومی عرصہ قبل روم سے مکے میں آکر آباد ہو گئے تھے اور

یہاں رہتے ہوئے ہی اپنی حیثیت بنائی تھی۔ پھر اسلام کی کشش نے انھیں متوجہ کیا تو مسلمان ہو گئے اور اس راہ میں ہر اذیت برداشت کرتے رہے۔ اب ہجرت کا وقت آیا تو وہ مکّے سے نکلنے کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ قریش نے آگھیرا۔

قریش نے کہا "جب تُو مکّے میں آیا تھا تو قلاّش اور مفلس تھا۔ تُو نے یہ تمام دولت یہاں رہتے ہوئے کمائی ہے، اب اسے لے جانا چاہتا ہے!"

یہ سن کر صہیبؓ رومی ٹھہر گئے اور بولے "تمھیں میری دولت سے غرض ہے۔ تمھاری بات درست ہے۔ یہ دولت میں نے یہاں آکر ہی کمائی ہے۔ اب اگر میں یہ سب کچھ تمھیں دے جاؤں تو مجھے جانے دو گے؟"

قریش نے لمحے بھر کو سوچا۔ اس شخص کے دل سے دین کی محبت جدا کرنا تو آسان نہ تھا، پھر اسے روک کر کیا کرتے! لہٰذا دولت کو غنیمت جانا اور بولے۔ "اس صورت میں ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

اتنا سنتے ہی صہیبؓ رومی نے اپنی برسوں کی کمائی ہوئی دولت اور ساز و سامان سب ان کے حوالے کیا اور خالی ہاتھ روانہ ہو گئے۔

دوسرا واقعہ ابو سلمہؓ کا ہے۔ جب انھیں ہجرت کی اجازت ملی تو انھوں نے اپنے بچّے اور بیوی اُمّ سلمہ کو اونٹ پر سوار کرایا۔ اس وقت ان کے سسرالی قبیلے والوں نے انھیں گھیر لیا اور اپنی بیٹی اُمّ سلمہ کو اونٹ سے اتارتے ہوئے انھیں بُرا بھلا کہنے لگے۔ ابھی یہ ردّ و کد ہو ہی رہی تھی کہ ان کے اپنے قبیلے والے بھی آگئے۔ انھوں نے کہا "تمھاری بیوی اور تم اپنا آبائی دین ترک کر کے اب مکّے سے جا رہے ہو، جاؤ، لیکن اپنا یہ معصوم بچّہ ہمارے حوالے کر دو۔ ہم یہ بچّہ نہیں دیں گے۔"

تھوڑی دیر مقابلہ ہوتا رہا، لیکن ان دو قبیلوں کے سامنے ابو سلمہؓ کی ایک نہ چلی۔ انجام کار سسرالی قبیلہ اپنی بیٹی کو لے گیا، ساتھ ہی بچّے کو بھی چھین لیا۔ ابو سلمہ جو ہجرت کا ارادہ کر چکے تھے، ایک لمحہ بھی یہاں رکنے کو تیار نہ ہوئے اور روانہ ہو گئے۔ تقریباً ایک سال وہ تنہائی کا دُکھ سہتے رہے تب اُمّ سلمہ اپنے بچّے کو لے کر مدینے پہنچ گئیں۔

ایسی صبر آزما دشواریاں سبھی کے لیے تھیں، لیکن وہ جنھوں نے کامل تیرہ برس اس دین کی محبت میں کفار کے ہاتھوں اذیتیں برداشت کی تھیں، اب بھی مصیبتوں سے گزر رہے تھے اور یہ دُکھ سہتے ہوئے جسے جب بھی موقع ملتا، روانہ ہو جاتا۔ ان دنوں بھی ان سب کا ایک ہی حال تھا البتہ اس موقع پر عمرؓ ابن الخطاب نے بڑی انفرادیت کا ثبوت دیا۔ جس دلیری کے ساتھ انھوں نے عمر گزاری تھی، جس حوصلے کے ساتھ دینِ حق قبول کیا تھا، اسی جرأت کے ساتھ انھوں نے روزِ روشن میں اعلانیہ ہجرت بھی کی۔ قبیلۂ بنو عدی کے یہ دلیر جوان جس وقت مکّے سے روانہ ہوئے تو انھوں نے اپنے گھوڑے کا رُخ موڑا اور اہلِ مکّہ کی طرف مُنہ کر کے بلند آواز میں کہا: "اے قریش! سن لو، عمرؓ ابن الخطاب یثرب جا رہا ہے۔ جسے اپنی بیوی کو بیوہ اور بچّوں کو یتیم کرانا ہو اس کا راستہ روک لے۔"

اس وقت کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ گھر سے نکلتا اور ان کا راستہ روکتا۔ وہی دلیر جو کمزوروں کو طرح طرح سے روکتے اور ان کا مال اسباب چھینتے تھے، اب سامنے نہ آسکے۔ جو گھر میں تھا گھر میں رہا، جو حرم میں تھا، وہاں سے نہ نکلا اور عمرؓ ابن الخطاب اپنے سفر پہ روانہ ہو گئے۔

الغرض مسلمان جو اپنے فرائض کی ادائیگی میں اب مشرکین کی دخل اندازیوں سے تنگ آ گئے تھے، نہ خدائے واحد کی وحدانیت کا اعلان کر سکتے تھے نہ اس کی بندگی۔ اب اس کی آزادانہ عبادت کے شوق میں عزیز و اقربا، مال و دولت اور وطنِ عزیز کو چھوڑ کر ایک نئی جگہ جا رہے تھے۔ ان میں مکّے کے دانش ور بھی تھے، دولت مند رئیس بھی، جنگجو اور دلیر بھی، کم حیثیت غلام بھی اور اپنے اپنے قبائل کے معززین بھی! لیکن ان سب کا مقصد ایک ہی تھا، اسلام کی سربلندی! جو کفارِ مکّہ کو کسی طور بھی گوارا نہ تھی۔ اب بات محض دینِ حق کی یا معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شخصیت کی نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ بیعتِ عقبۂ اولیٰ اور ثانی ان کے لیے بڑی معنی خیز تھیں۔ اس کے معنی بھی وہ خوب سمجھتے تھے۔ وہ سرگوشیوں میں ایک دوسرے کو سمجھا رہے تھے کہ اہلِ یثرب معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو محض کسی مہمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ امام و آقا اور فرماں رواں کی حیثیت سے مدعو کر رہے ہیں،

یہ دعوت عرب کے مختلف قبائل میں بکھرے ہوئے مسلمانوں کو مجتمع کرنے اور ایک منظم و متمدّن معاشرہ تعمیر کرنے کی ابتدا ہے۔

انھی دنوں اطلاع ملی کہ قبیلۂ اوس اور قبیلۂ عبد الاشہل نے ایک ہی دن میں اسلام قبول کر لیا۔ ایسے میں مشرکین کے اندیشے بڑھ گئے۔ انھیں محسوس ہوا کہ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی قیادت میں رہتے ہوئے مسلمان اب نہ صرف ان کے اندرونی نظامِ حیات میں ہلچل مچا دیں گے بلکہ یقینی طور پر ان کی بیرونی قوّت کو بھی فنا کر دیں گے۔ ان کی (قریش کی) تمام تر خوش حالی کا انحصار تجارت پر تھا۔ بحرِ احمر کے کنارے جو تجارتی شاہراہ یمن سے شام کی طرف جاتی تھی، اُس پر نہ صرف قریش بلکہ عرب کے تمام قبائل کے تجارتی کاروبار اور عیش و عشرت کا دار و مدار تھا۔ یثرب کے مسلمان اسے بہ آسانی مسدود کر سکتے تھے۔ تیرہ برس ان کے ہاتھوں اذیّتیں برداشت کرنے والے مسلمانوں کا اس طرف متوجہ ہو جانا قریش کی شہ رگ پر خنجر رکھ دینے کے مترادف تھا لہٰذا دانش مندی کا تقاضا یہی تھا کہ قبل از وقت ان حالات کے سدِّ باب کے لیے کوئی صورت اختیار کی جاتی۔ اسی کے لیے قریش کے معزّز اور دانش وَر سرداروں نے ایک باقاعدہ اجلاس کا اہتمام کیا تاکہ اس مرتبہ مسلمانوں اور اسلام کے خلاف کوئی ایسی تدبیر سوچ سکیں جو اُن کی قوّت کو پارہ پارہ کر دے۔

## کفر کا اجتماع اور خدا کی تدبیر

مسلمانوں کی مخالفت میں اجلاس کا اہتمام بڑے باقاعدہ اور اعلیٰ پیمانے پر ہو رہا تھا لہٰذا قریش کے تمام قبائل حرکت میں آ گئے تھے۔ اس دعوت کے لیے کارکن جماعتوں کے ہرکارے دوڑ گئے جو خفیہ طور پر قبیلے قبیلے پھر کر یہ پیغام دے رہے تھے۔ اس طرح بہت کم وقت میں تمام قبیلوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ مسلمان یثرب میں اپنی قوّت جمع کرنے کی سوچ رہے ہیں اور ان سب کی قیادت ابنِ عبد اللہ کریں گے لہٰذا اس صورتِ حال کی روک تھام کے لیے دار النّدوہ میں تمام قبائل کے معزّز سردار جمع ہو کر تدابیر سوچ رہے ہیں۔ چونکہ معاملہ سب کا یکساں تھا لہٰذا اس میں شرکت کا فیصلہ سب نے کیا اور وقتِ مقررّہ پر سب جمع ہو گئے۔ جن جن سرداروں نے اس اجلاس میں شرکت کی، تاریخ میں ان کے نام

مندرجہ ذیل درج ہیں۔

قبیلہ بنی مخزوم سے ابوجہل۔

قبیلہ بنو اسد سے ابوالبختری بن ہشام۔

قبیلہ بنو اسد سے زمعہ بن اسود۔

قبیلہ بنو اسد سے حکیم بن حزام۔

قبیلہ بنی عبدالدار سے نضر بن حارث۔

قبیلہ بنو نوفل سے جبیر بن مطعم۔

قبیلہ بنو نوفل سے حارث بن عامر۔

قبیلہ بنو نوفل سے مطعم بن عدی۔

قبیلہ بنو عبد شمس سے ابوسفیان بن حرب۔

قبیلہ بنو عبد شمس سے شیبہ بن ربیعہ۔

قبیلہ بنو عبد شمس سے عقبہ بن ربیعہ۔

قبیلہ بنو جمح سے امیہ بن خلف۔

قبیلہ بنو جمح سے نبیہ بن حجاج۔

قبیلہ بنو جمح سے منبہ بن حجاج۔

مکہ سے ابولہب بن عبدالمطلب۔

اس اجلاس میں سرداری کے فرائض ابوجہل نے ادا کیے۔ قریش کے سرداروں کی یہ مجلس حالات پر غور و فکر کرنے کے بعد اب کسی آخری نتیجے پر پہنچنے والی تھی۔ جب یہ تمام سردار اور بہت سے معززین آکر اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو ابوجہل نے کھڑے ہو کر تیرہ برس کے واقعات دہرائے، اپنی اور دیگر لوگوں کی تشویش کا ذکر کیا اور آخر میں کہا کہ یہ مذہب ابھی تو مکے تک ہی محدود تھا جس کی بدولت ہمیں صرف اپنے اسلاف کے معبودوں کی توہین کا خیال مضطرب کیا کرتا تھا، لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ اب یہ دین اردگرد کے قبائل تک پہنچنے کے علاوہ یثرب تک باقاعدہ پھیل چکا ہے بلکہ یثرب اسلام کی پناہ گاہ بن چکا ہے۔ مسلمان یکے بعد دیگرے وہاں جا رہے ہیں۔ اہلِ یثرب ابنِ عبداللہ پر نہ صرف

یہ کہ ایمان لا چکے ہیں بلکہ انھیں اپنا حکمران تسلیم کر رہے ہیں لہٰذا سب کو جمع کرنے کا مقصد محض آگاہ کرنا ہے کہ اگر یہ قوت جمع ہوگئی تو ہم سب کے نظامِ زندگی میں دشواری پیدا کر دے گی ۔ ابھی تک تو ہم اپنے معبودوں ہی کی حفاظت کر رہے ہیں، پھر کچھ بھی باقی نہ رہے گا لہٰذا کمر بستہ ہو جاؤ، آج اس فتنے کے تدارک کے لیے غور کرو اور مشورہ دو کہ کیا کیا جائے ؟

ابوجہل خاموش ہوگیا۔ اس وقت سبھی محوِ فکر تھے۔ واقعی یہ حالات سب کے لیے ہی یکساں قابلِ فکر و اضطراب تھے ۔ اس وقت دارالندوہ میں بہت سے لوگ جمع تھے بلکہ ابھی تک کسی معاملے پر غور کرنے کے لیے اتنا بڑا اجلاس کبھی نہ ہوا تھا۔ جتنے مفکّرین و مقرّرین تھے، اتنے ہی تماشبین، لیکن سکوت طاری تھا۔ خاصی دیر یہی کیفیت رہی، پھر حارث بن عامر نے کھڑے ہو کر مشورہ دیا "میری رائے میں ایسے شخص کو پابہ جولاں گلیوں اور بازاروں کا چکر لگواؤ تاکہ اس کے چکّر میں آنے والے بھی عبرت حاصل کریں!"

یہ سن کر امیّہ بن خلف بولا " ایسا کرو گے تو اس کے تمام حمایتی کھڑے ہو جائیں گے !"

نضر بن حارث نے کہا " یہ نہیں تو کچھ اور کرو، لیکن اس کا انجام ایسا ضرور ہونا چاہیے کہ لوگ تماشا دیکھیں !"

ابو لہب ابھی تک خاموش تھا، وہ اس موقع پر بولا " ایک بات یاد رکھنا، تماشے کی موت نصف قوم کو مشتعل کر دیتی ہے اور ..."

ابو لہب نے اتنا ہی کہا تھا کہ نضر بن حارث نے طنز کیا " تو اپنے بھتیجے کے لیے کچھ نہیں سُن سکتا! صاف کہہ دے نا، یوں مخالفت کیوں کرتا ہے ؟"

اس لہجے اور طنز پر ابو لہب مشتعل ہو گیا جس کے اظہار میں کھڑا ہونا اور چلّانا ضروری تھا۔ نضر بن حارث اس سے بھی بڑا جھگڑالو تھا لہٰذا دارالندوہ میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ ہر بات کا جواب دوسرے سے زیادہ سخت دیا جاتا اور الفاظ زیادہ سے زیادہ تلخ ہوتے ۔

کچھ وقت یونہی گزرا، پھر ابو سفیان کھڑا ہوا اور بولا " آپس کے جھگڑے

ختم کیے بغیر ہم دشمن پر کیسے قابو پا سکتے ہیں! یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے اور پھر ذاتی رنجشیں ایسے مواقع پہ کیوں دُہراتے ہو!"

سب نے اس بات کو پسند کیا۔ نضر بن حارث اور ابولہب نے بھی خاطر خواہ اثر لیا۔ کچھ دیر کے بعد دونوں ٹھنڈے ہو گئے اور پھر سے مسلمانوں کے خلاف تدبیریں سوچی جانے لگیں۔

ابوسفیان نے خود ہی پُرانی بات نکالی اور کہا "میرے دوستو! ہم گفتگو کر رہے تھے کہ ابنِ عبداللہ کے زور کو کس طرح توڑا جائے؟ ہم ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچے لہٰذا پھر سے غور کیا جائے۔ بتائیے کیا کیا جائے کہ مستقبل کے اندیشوں سے نجات مل سکے؟"

اس سوال کے جواب میں پھر سے گفتگو ہونے لگی، مگر ہر تدبیر میں کوئی نہ کوئی قباحت موجود تھی۔ کسی نے کہا "ایسے انسان کو جو ہر گھر میں اختلاف کا سبب بنا ہوا ہے، کسی سرکش اونٹ پر بٹھا کر علاقے سے باہر کر دیا جائے۔"

اس بات کی مخالفت کرنے والے کے خیال میں نقصان یہ تھا کہ وہ شیریں سخن اور سراپا اخلاق ہستی جہاں بھی جاتی، ہجوم ہو جاتا۔ اس طرح اوّل تو چاہنے والوں میں اضافہ ہوتا رہتا، دوسرے ان کا مقصد محض اپنی جان چھڑانا تو نہ تھا بلکہ اس مسئلے کو ختم کر دینا تھا۔ مختصر یہ کہ اجلاس کئی گھنٹے جاری رہا۔ ان چودہ سرداروں میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا اور دوسرے نے اٹھ کر اس پر عمل کرنے کے نقصانات بیان کیے۔

آخر میں ابوجہل نے کھڑے ہو کر کہا "دوستو! اگر قریش کے تمام قبائل میرا ساتھ دیں تو میرے ذہن میں وہ بات ہے جو اکسیر کا کام دے گی۔"

یہ سنتے ہی تمام سردار اسے اشتیاق سے دیکھنے لگے۔

اس نے کہا "بنو ہاشم کے سوا باقی تمام قبیلوں کا ایک ایک جوان جمع ہو کر ایک دستے کی صورت میں ابنِ عبداللہ کو گھیر کر ختم کر دے۔ مسلمان کسی طور بھی اتنے قبائل سے انتقام لینے کی جرأت نہیں کریں گے اور خوں بہا لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس طرح سے مقصد بھی حل ہو جائے گا اور ہم بھی محفوظ

رہیں گے!!

تدبیر عمدہ تھی لہٰذا سب تعریف کرنے لگے۔ بہت سے کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے اور جوان ایک دستے کی صورت میں تیّار ہونے لگے۔ اِدھر قریش پورے جوش و خروش اور رازداری کے ساتھ آپؐ کو ختم کرنے کی سوچ رہے تھے، اُدھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ پر تمام صورتِ حال آشکار کر کے آیندہ کے لیے حکم صادر فرمایا۔

اِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ۝ وَأَكِيدُ كَيْدًا ۝ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِينَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝

یہ اطلاع اور نرمی اور سہولت سے انھیں نظر انداز کرنے کی ہدایت تو معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو دی ہی گئی تھی مگر جس دن عرب کے یہ چودہ معزز سردار اور ذی مرتبہ رئیس اسلام اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے خلاف اپنے ذہن و دہن کی تمام کاوشیں صَرف کر رہے تھے، اس وقت قادرِ مطلق نے اس محفل میں شریک تمام مغروروں کی تقدیر میں (جنگِ بدر کی) شکست اور بدترین موت لکھ دی تھی۔ انھیں عِلم نہ تھا کہ نبیؐ کے ساتھ استہزا کرنے والوں سے مواخذے کا وعدہ تو اللہ نے خود فرمایا ہے اور اللہ سے کوئی بات چھُپ نہیں سکتی۔

اس شب بڑی راز داری کے ساتھ کفّار کا دستہ اللہ کے نبیؐ کے گھر کو ہر جانب سے گھیر کر ان کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اسی شب آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے علیؓ ابنِ ابی طالب کو طلب کیا، اہلِ مکّہ کی تمام امانتیں ان کے سپرد کیں، اگلی صبح انھیں لوٹا دینے کا حکم دیا اور اپنے بستر پر آرام کرنے کی ہدایت کر کے روانہ ہو گئے۔ یہ عجیب منظر تھا۔ کاشانۂ نبوّت شمشیر بکف دشمنوں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک دو نہیں بلکہ متعدّد نظریں اس دروازے پر مرکوز تھیں۔ تازہ دم جوان ان محافظوں کی طرح چوکس کھڑے ہوئے تھے جو شب خون مارنے والے دشمن پر نگاہ رکھے اپنی فوج کا پہرا دیتے ہیں۔

اللہ کے آخری نبیؐ تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا

اُنذِرَ آبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (یہ قرآن خدائے غالب اور مہربان نے نازل کیا ہے تاکہ تم ان لوگوں کو جن کے باپ دادا کو متنبہ نہیں کیا گیا تھا، متنبہ کر دو وہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں) کا ورد کرتے ہوئے ان کے درمیان سے نکل گئے اور ان غافلوں کو خبر ہی نہ ہو سکی جو پورے ہوش و حواس کے ساتھ انھی پر حملہ کرنے کو تیار کھڑے ہوئے تھے، لیکن وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ کے مصداق ان کے آگے بھی دیوار استادہ تھی اور پیچھے بھی۔ یہ وہ پردہ تھا جو انھیں نظر نہیں آسکتا تھا۔ معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم بہ خیر و عافیت ان کے درمیان سے اس طرح گزر گئے جیسے حضرت داؤدؑ اپنے پلنگ پر ایک پتلا لٹا کر، بکریوں کی کھال کو تکیے کی جگہ سجا کر، اس پر چادر پھیلا کر روشن دان سے نکل گئے تھے اور دشمن انھیں بیمار تصور کرتے ہوئے باہر کھڑا انتظار کرتا رہا تھا یا بالکل اس طرح جیسے جناب موسیٰؑ، عبرانیوں کی بستی میں موجود تھے اور فرعون کے ہرکارے انھیں گھر گھر تلاش کرنے کے بعد اس بستی کے باہر کھڑے ان کے وہاں پہنچنے کے منتظر تھے اور وہ انھی کے درمیان سے گزر کر مدین کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔
آج بالکل اسی طرح معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم منکرین کے سامنے سے سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیات کا ورد کرتے ہوئے نکلے تو قدرت نے ان سب کی آنکھوں میں دھول جھونک دی اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بہ خیر و عافیت صدیقِ اکبر حضرت ابوبکرؓ کے گھر پہنچ گئے۔ اگلی صبح منکرین نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بستر پر علیؓ ابنِ ابی طالب کو پایا تو ناکامی اور بدنصیبی پر بہت جھنجلائے اور یہ غصہ اُن پر اتارا، لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سراغ نہ پا سکے تو مکے کی گلی کوچوں میں کتوں کی طرح بھونکتے ہوئے پھرنے لگے۔

یہ دن انھوں نے یونہی گزارا۔ ان کے اجلاس اور تمام تدبیروں پر پانی پھر گیا تھا۔ اللہ نے انھیں پوری طرح عاجز کر دیا تھا، لیکن وہ اپنی اس عاجزی کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ابھی ان کے ترکش میں ایک تیر اور باقی تھا جو انھوں نے چلا دیا۔ مکے میں بڑے بڑے انعامات کا اعلان کیا گیا جسے

سن کر قریشی جوانوں میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی اور وہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تلاش کرنے کے لیے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔

# الوداع اے وطن

۲۷ صفر (نبوت کا تیرھواں سال) ۵ ستمبر ۶۲۲ء

کاشانۂ نبوی سے روانہ ہونے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ابوبکرؓ صدیق کے گھر پہنچے اور دروازے پر دستک دے کر اجازت طلب کی تو آواز پہچان کر صدیق اکبرؓ نے کہا: "یا رسول اللہؐ! تشریف لے آئیے۔ یہاں اس وقت آپ کی حرم کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔"

اس وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نکاح ہوچکا تھا، لیکن ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اندر تشریف لے گئے اور تمام صورتِ حال سے انھیں آگاہ کیا۔

ہجرت کی خبر سنتے ہی صدیقِ اکبرؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! کیا مجھے بھی ہم رکابی کا شرف حاصل ہوگا؟"

فرمایا: "ہاں تم ساتھ چلو گے۔"

اس اعزاز پر صدیقِ اکبرؓ نے بڑی مسرت محسوس کی۔ یہی وقت تو تھا جس کا وہ عرصۂ دراز سے انتظار کر رہے تھے۔ جب سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اہلِ یثرب کی دعوت قبول کی تھی تب سے ہی ان کی تمام تر توجہ اس سفر کی طرف مبذول تھی۔ چار ماہ سے دو اونٹنیاں تیار کرنے کے لیے انھوں نے قابلِ اعتماد غلام

تعینات کیے ہوئے تھے۔ بہر کیف اس وقت تو گھر سے روانگی ضروری تھی لہٰذا بڑے رازدارانہ طور پر دونوں گھر سے نکلے۔ ابھی ان کی اوّلین منزل غارِ ثور تھی جہاں سے حالات سازگار ہو جانے کے بعد انھیں آگے بڑھنا تھا۔

مکۂ مکرمہ سے پانچ میل دُور بلند و بالا پہاڑ پر واقع اس غار کا راستہ دشوار گزار اور چڑھائی بڑی ہی صبر آزما تھی جسے طے کرنا بہ ذاتِ خود مشکل ترین امر تھا چہ جائیکہ دشمن تعاقب میں ہوں۔ ایسے میں بار بار ٹھوکریں لگ رہی تھیں، پائے مبارک زخمی ہو رہے تھے، لیکن جیسے بھی ممکن ہوا دونوں مسافر اس غار تک پہنچ ہی گئے۔ اللہ کے رسولؐ کے داخل ہونے سے قبل شیدائیٔ رسولؐ نے غار میں قدم رکھا۔ اس وقت یہ غار حشرات الارض کا ٹھکانا تھا۔ مبادا کوئی کیڑا جسمِ اطہر پر تکلیف کا سبب بن جائے، یہ سوچ کر صدّیقِ اکبرؓ نے اس کی صفائی ضروری سمجھی جو ہاتھوں سے کی گئی اور تن کے کپڑے پھاڑ کر درزیں اور روزن بند کیے گئے، پھر آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اس غار میں داخل ہوئے جہاں فی الحال مشرکینِ مکّہ کی نظروں سے بچنے کے لیے قیام کرنا تھا۔

اِدھر اللہ کے نبیؐ غارِ ثور میں پہنچ چکے تھے، اُدھر قریش کے جوان انھیں تلاش کرتے ہوئے صدّیقِ اکبرؓ کے گھر پہنچ گئے۔ ان لوگوں میں سب سے آگے ابوجہل تھا جس کی تدبیر ناکام ہو گئی تھی اور وہ کفّار سے خاطر خواہ تعریف وصول نہ کر سکا تھا۔ اسی جھنجلاہٹ میں اس نے دروازہ زور سے پیٹا۔ اسماءؓ بنتِ ابوبکرؓ صدّیق نے دروازہ کھولا اور مقصدِ آمد دریافت کیا۔

وہ بولا "تیرا باپ کدھر ہے؟"

حضرت اسماءؓ بنتِ ابوبکرؓ صدّیق نے جواب دیا "میں نہیں جانتی۔"

اس لاعلمی کے اظہار پر ابوجہل نے ان کے منہ پر طمانچہ مارا تو ان کے کان کی بالی گر گئی۔ یہ اور اسی قسم کی تمام بدتمیزیاں وہ سب اپنی ناکامی کے احساس کو مٹانے کے لیے ہی کر رہے تھے۔ اُن کے لیے اپنی شکست کا یہ احساس بڑا ہی اذیّت ناک تھا۔ سب تدبیریں اُلٹ ہو گئی تھیں۔ اس وقت وہ یوں پاگل ہو رہے تھے جیسے ان کی عقل ماری گئی ہو۔ بات بھی تو ایسی ہی تھی۔ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم

نے ان کے جملہ قبائل اور مجمع قوت کو زرا لی مات دی تھی۔ ایک طرف مشرکین کی شاطرانہ چالیں تھیں، دوسری طرف ہادیٔ برحق معلمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا تدبّر اور حق کی قوّت پر کامل بھروسا تھا۔

ابوجہل اپنے ساتھیوں کے ساتھ کامل تین یوم جانے والوں کے نقشِ پا ڈھونڈتا رہا، غارِ ثور کے گرد پھرتا رہا، لیکن اللہ تعالیٰ جس منصب پر اپنے نبیؐ کو فائز کر چکا تھا اس کا تقاضا بھی تھا کہ باطل کی تمام قوتیں مغلوب ہو جائیں۔ مشرکین تمام کاوشیں آزمانے کے بعد آخر ناکام لوٹ گئے اور معلمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے ساتھی سمیت غارِ ثور میں چھپے رہے۔

یہ تین یوم کسی آزمائش سے کم نہ تھے۔ کفّار گروہ بنا بنا کر تلاش میں مصروف تھے۔ اس دوران میں وہ غارِ ثور کے سامنے سے بھی گزرے، اتنے قریب سے کہ اس کے عارضی مکینوں نے ان کے اٹھتے ہوئے قدم دیکھ لیے تھے گفتگو کی آواز سن لی تھی۔

اس سے صدّیقؓ اکبر قدرے متفکر ہوئے، مگر اللہ کے نبیؐ نے کہا۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے)

یہ حقیقت بھی تھی کہ اس آزمائش کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان کی تسکین فرمائی۔ ان دنوں صدّیقؓ اکبر کا پورا گھرانا جیسے اسی خدمت پر مامور تھا۔ جب شام ڈھل جاتی اور مشرکین اپنی ناکامی اور بدبختی پر واویلا کرتے آبادی کی طرف لوٹ جاتے تو اسماءؓ بنتِ ابوبکرؓ صدّیق آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے لیے کھانا لے کر آتیں۔ عامر بن فہیرہ، صدّیقؓ اکبر کے غلام بکریاں چرا کر دیر سے لوٹتے اور وہاں ٹھہرتے۔ جب غارِ ثور کے مکیں ان سے بہ قدر ضرورت دودھ لے لیتے، تب وہ واپسی میں بکریوں کا گلّہ لیے قدموں کے نشان مٹاتے ہوئے اس طرح جاتے کہ صبح جب کفّار ان ہستیوں کی تلاش میں نکلیں تو مویشیوں کے نشان کسی کے قدموں کی رہنمائی نہ کر سکیں۔ جب نصف شب گزر جاتی تو عبد اللہؓ بن ابوبکر رسالت مآب کی خدمت میں حاضر ہوتے اور انھیں مکّے کی تمام خبریں سنا دیتے۔

ان دنوں سب سے اہم خبر یہ تھی کہ مکّے میں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو قتل

یا زندہ گرفتار کرنے والے کے لیے سو شتر سرخ کا اعلان کیا جا چکا تھا جس کے لالچ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششیں جاری تھیں۔ تلاش کرنے والوں کی ٹولیاں گلی گلی، کوچہ کوچہ، کوہ کوہ پھر رہی تھیں جو منزل تک پہنچ کر بھی اپنی جستجو میں ناکام ہو کر واپس آ جاتی تھیں۔

ان تین یوم میں ان ہستیوں کی کیفیت کیا تھی، اس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح کیا گیا ہے: "جب انھیں کافروں نے گھروں سے نکال دیا، اس وقت اس غار میں دو ہی نفوس تھے۔ ایسے میں پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دے رہے تھے کہ اندیشہ نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ تو خدا نے ہی انھیں اطمینان بخشا اور ایسے لشکروں سے ان کی مدد فرمائی جو تمھیں نظر نہیں آتے اور کافروں کی بات کو پست کر دیا اور بس بات تو خدا ہی کی بلند ہے اور خدا زبردست اور حکمت والا ہے۔"

تین دن گزرے تو ہر دم دوڑنے والی کفار کی ٹولیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ اب ان کی تلاش صبح سے شام تک جاری رہتی، مگر انھوں نے سڑکوں پر پھرنا اور چھپ چھپ کر ٹوہ لینا چھوڑ دیا تھا۔ تب امن محسوس کرنے کے بعد چوتھی رات کو صدیق اکبرؓ کے گھر سے وہی دو اونٹنیاں لائی گئیں جنھیں پچھلے کئی ماہ سے تیار کیا جا رہا تھا۔ اسی رات یہ مبارک سفر شروع ہوا۔ اسی شب اسماءؓ بنت ابوبکر صدیقؓ سفر کے لیے کھانا بنا کر لائیں جو ایک تھیلے میں رکھا گیا، لیکن اسے باندھنے کے لیے کوئی ڈوری یا رسی لانا بھول گئیں۔ مجبوراً انھیں اپنی کمر کے گرد بندھے ہوئے پٹکے کو کھول کر دو حصے کرنا پڑے، ان میں سے ایک سے کھانا کجاوے کے ساتھ باندھا اور دوسرا پھر کمر کے گرد باندھ لیا۔ تب دربارِ رسالت سے انھیں ذات النطاقین کا لقب عطا ہوا۔

تمام تیاریاں مکمل ہونے کے بعد معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم غارِ ثور سے باہر تشریف لائے اور چار افراد کا یہ قافلہ اس طرح روانہ ہوا کہ ایک اونٹنی پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دوسری اونٹنی پر عامر بن فہیرہ اور عبداللہ بن اریقط سوار ہوئے۔ اس وقت معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم بڑا قلق

محسوس کر رہے تھے۔ اہلِ مکّہ نے انھیں دُکھ دیے تھے، ستایا تھا۔ ان تیرہ برسوں کا ہر لمحہ ان کفّار کے ہاتھوں ایک اذیّت بن کر گزرا تھا۔ اس کے باوجود یہ سرزمین انھیں بڑی عزیز تھی۔ یہ اللہ کا حکم تھا جس کی تکمیل میں وہ ترکِ وطن کر رہے تھے ورنہ یہ آسان بات نہ تھی۔ اس وقت انھوں نے پلٹ کر دیکھا۔ کعبۃ اللہ کی عمارت صاف نظر آ رہی تھی۔ بے جان پتھروں کا یہی وہ گھر تھا جہاں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے قلب کو سکون ملتا تھا۔ یہ سکون اور امن کی جگہ تھی، مگر کفّار نے یہاں بھی اُنھیں سکون سے نہ رہنے دیا تھا۔ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے زمین پر اللہ کے پہلے گھر کو دیکھا، پھر دامنِ سکوت میں پھلتے ہوئے اس شہر کو دیکھا اور فرمایا: "اے مکّہ! تُو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے لیکن تیرے فرزند مجھے رہنے نہیں دیتے۔"

اس وقت ان کے رفیق، ان کے ساتھی کی کیفیت کیا تھی، انھوں نے نہ دیکھا بلکہ سفر شروع کرنے کا حکم فرمایا اور یہ مبارک سفر شروع ہو گیا جسے ہجرت کہتے ہیں۔

## ہجرت کا مقصد

قرآن مجید کی اصطلاح میں ہجرت کے معنی ہیں کہ اگر کسی جگہ مسلمان کے لیے خدا کی بندگی کرنا ممکن نہ ہو تو وہ اس جگہ کو خیر باد کہہ کر کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں وہ بندگی اور عبادت کا فرض ادا کر سکے۔ چنانچہ ارشادِ ربّانی ہے۔

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ ۝ (اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو میری زمین وسیع ہے، بس تم میری ہی بندگی کرو)

خلوصِ نیّت کے ساتھ صرف خدا اور رسولؐ کے لیے نقل مکانی کرنا ہجرت کہلاتی ہے اور یہی ہجرت انبیاء علیہم کی سنّت رہی ہے۔ جب کبھی کسی پیغمبر نے اپنے وطن کو خیر باد کہا، محض دین کی خاطر خیر باد کہا کیوں کہ دیگر تمام احکام کے ساتھ اُن ہستیوں کے دلوں میں مخالفین کا خوف، موت کا ڈر یا مصائب کا اندیشہ نہیں ہوتا تھا بلکہ انھیں صرف حق کی حمایت کا خیال دُور دراز لیے جاتا تھا۔ اب یہی موقع معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو درپیش تھا۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم)

نہ تیرہ سالہ مصائب کے بعد ان سے بچنے کی فکر کر رہے تھے نہ صرف ترکِ وطن کر کے نئی دنیا آباد کر رہے تھے۔ اگر مشکلات سے بچنا ہوتا تو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نجاشی کی حمایت پا کر نبوّت کے پانچویں برس ہی حبشہ کی طرف جا سکتے تھے، لیکن اس وقت حکمِ الٰہی نہ تھا، نہ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو کسی کی حمایت اور حفاظت کی ضرورت تھی۔ اب ہجرت کرنے سے مراد دینِ حق کا بول بالا اور اسے ہر شعبۂ حیات میں داخل کر کے دنیا پر عملی طور پر یہ ثابت کرنا تھا کہ یہ دین ایک ضابطۂ حیات اور ہمہ گیر مذہب ہے جو عبادت، سیاست، معاشرت، معیشت، تجارت الغرض زیست کے اندرونی یا بیرونی ہر معاملے کو ایک دین کی حدود میں داخل کر کے ایک کامل نظامِ حیات مرتّب کرتا ہے۔ یہ سب ثابت کرنے کے لیے اب ایک علیحدہ خطّۂ ارض کی ضرورت تھی جو کسی طور بھی مکّہ نہ تھا کیوں کہ یہاں کی تیرہ سالہ حیاتِ نبوی اور کفّار کی مسلسل ریشہ دوانیاں اس بات کی علامت تھیں کہ وہ لوگ کسی طور بھی اس نظامِ حیات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

قرآنِ حکیم خداوندِ عالم کے احکام کا مجموعہ ہے جس کی تفسیر آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو اپنے عمل سے پیش کرنا تھی اور اب اس کا وقت آ چکا تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ جس دین کے لیے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) وعظ فرماتے تھے، اب اس کے احکام اور اصولوں پر عمل کر کے دنیا کو یہ بتا دیتے کہ وہ دین صرف عقائد و عبادت کا مجموعہ نہیں بلکہ ہر شعبۂ حیات پر محیط ہے اور اسے دیگر مذاہب کی طرح عبادت گاہ تک محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس پر عمل پیرا ہونے والوں کے لیے تو ہر گوشہ عبادت گاہ بن جاتا ہے اور ہر فعل و قول عبادت! لہٰذا اب ہجرت کا وقت آیا تو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے ایک ایسے خطّۂ ارض کا انتخاب فرمایا جہاں کی زبان عربی تھی اور محض اسی صورت میں وہ اس دین اور اس کی تعلیمات کو قلب کی گہرائیوں اور عقل کی وسعتوں سے قبول کر کے اس کے اصولوں پر عمل پیرا ہوتے تو وہ فطرت کے عین مطابق ہوتا اور دینِ حق کے اثرات بھی دیرپا ثابت ہوتے۔ بہ صورتِ دیگر کسی اور علاقے کی طرف ہجرت

کرنے کی صورت میں اس تعلیم کے اثرات اِن اقوام پر نہ مدتوں قائم رہے نہ زبان اور
ہونے کی صورت میں قلب و روح میں رچ بس جانے کے امکانات تھے جیسا کہ
بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ دینِ حق کو قبول کرنے کے باوجود اہلِ حبشہ
اہلِ مدینہ کی طرح ثابت نہ ہوئے۔ نہ انھوں نے اس جاں نثاری کا ثبوت دیا نہ
اشاعتِ دین میں کوئی یادگار مثال قائم کر سکے۔ اس فرق کو معلمِ اعظم صلی اللہ
علیہ وسلم نے روزِ اول ہی سے محسوس کر لیا تھا۔ جب مدینے کے چھ افراد نے
اسلام قبول کیا تو گویا اس کے اصولوں نے اُن کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ وہ
بہانے بنا کر آتے اور بیعت کرتے گئے۔ ان کا جو قبیلہ بھی اس دین کو اختیار
کرتا، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اسی کے چند افراد کو ان کی تعلیمات کا ذمے دار
بنا دیتے اور پھر چشمِ زدن میں ان کی رگوں میں یہ دین خون کی طرح سرایت کر
جاتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے، محسوس کرتے تھے۔ اس فرق کے نتائج دور رس تھے
جو معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی دُور بین نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھے۔ وہاں اسلام
پہنچا اور وہاں کے معززین نے دعوت دی تو معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے
اسی سرزمین کو ہجرت کے لیے منتخب فرمایا اور نبوت کے تیرھویں سال
ربیع الاوّل کے مہینے میں (۱۵ ستمبر ۶۲۲ء) اپنے عظیم سفر کا آغاز کر دیا۔

اس وقت چار نفوس کا یہ قافلہ مکے سے نکل چکا تھا، لیکن خطرہ ابھی ٹلا نہیں
تھا۔ سو شتر سرخ کے لالچ نے مکے کے نوجوانوں ہی کو نہیں معززین کو بھی متوجہ
کر لیا تھا۔ مشرکین مسلسل اس تلاش میں سرگرداں تھے اور اس بات کا اندازہ
ان مسافروں کو تھا لہٰذا تمام شب بہ سُرعت سفر کیا گیا۔ جب صبح ہوئی تو حضرت
صدیقِ اکبرؓ نے ایک محفوظ مقام دیکھ کر معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے قیام کی
گزارش کی جو قبول ہوئی۔ اسی مقام پر بنو خزاعہ کی ایک خاتون کی بکری کا دودھ
دوھ کر پیا۔ تاریخ میں اس خاتون کا نام اُمِّ معبد درج ہے۔ یہاں قدرے آرام
کرنے کے بعد یہ قافلہ پھر روانہ ہوا، لیکن اس مرتبہ انھوں نے سفر کے لیے درمیانی
راستہ ترک کر کے قدرے محفوظ میدان کو منتخب کیا اور اطمینان سے آگے بڑھنے
لگے۔ ابھی تھوڑا علاقہ ہی طے کر پائے تھے کہ انھیں محسوس ہوا، کوئی ان کے

تعاقب میں ہے۔ یہ سراقہ بن مالک، مکے کا ایک بہادر شہسوار تھا۔ وہ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تلاش میں سرگرداں، سر پہ خود اور بدن پر ہتھیار سجائے سینہ تانے چلا آرہا تھا کہ ایک دم ٹھٹھک گیا۔ اصل راستے سے ہٹ کر جانے والے اِن چار افراد کو اس نے دُور ہی سے پہچان لیا۔ سَو شترِ سرخ آنی معمولی چیز نہ تھے کہ وہ نظر انداز کر دیتا اور پھر تلاشِ بسیار کے بعد یہ مطلوبہ ہستی ہاتھ لگی تھی۔ اس نے ادھر دیکھا اور صبا رفتار گھوڑے کی باگ اسی جانب موڑ دی، لیکن ادھر قدم اٹھانے سے قبل ہی یہ گھوڑی گھٹنوں کے بَل گر گئی۔ سراقہ بن مالک نے اسے محض اتّفاق سمجھا اور گھوڑی کو پوری طاقت سے کھڑا کیا۔ اس دَوران میں معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم خود بھی اس کی جانب متوجّہ ہو گئے۔ وہ مالکِ حقیقی سے لَو لگائے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہی نہیں، اس خطرناک لمحے میں ان کے تینوں ساتھی سانس روکے اگلے لمحے کا انتظار کر رہے تھے۔ سراقہ بن مالک کی گھوڑی کھڑی ہوئی اور دو قدم چل کر گری نہیں، تھمی نہیں بلکہ اس بار گھٹنوں تک زمین میں دھنستی چلی گئی گویا کہ زمین نے قدم پکڑ لیے اور پھر اسی لمحے سراقہ بن مالک نے اس ہستی کو پہچان لیا جسے مکّے میں تیرہ برس تک جھٹلا تا رہا تھا۔ اب وہ گھوڑی سے اترا اور خدمتِ اقدس میں پہنچ کر امان طلب کی۔ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اسے معاف فرما دیا اور اسی وقت زمین نے گھوڑی کے پیروں کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ سراقہ نے کہا۔ "یا رسول اللہ ؐ! میں وعدہ کرتا ہوں کہ مکّے سے اِدھر آنے والے ہر حملہ آور کو روکوں گا۔"

اس وعدہ کے ساتھ وہ پلٹا تو معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "سراقہ بن مالک! اس وقت تیری کیا شان ہوگی جب تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن پہنائے جائیں گے!"

تاریخ شاہد ہے کہ جنگِ اُحد میں سراقہ باقاعدہ مسلمان ہوا اور عہدِ فاروقی میں جب مدائن فتح ہوا تو اسے کسریٰ کے کنگن پہنائے گئے۔

اب اللہ کے نبی ؐ کا سفر پھر شروع ہوا اور تھوڑی مسافت کے بعد ایسا

ہی دوسرا واقعہ پیش آیا۔ بریدہ اسلمی جو مکّے سے سو شتر سرخ کی آرزو میں نکلے، مگر چند آیاتِ ربّانی سن کر سب کچھ بھول گئے اور اپنی پگڑی نیزے پر باندھ کر بلند کی جو صلح اور امن کی علامت تھی۔ ان کے ساتھیوں نے انھی کے ساتھ اسلام قبول کیا اور لوٹ گئے۔ پھر یہ مختصر سا قافلہ منزل بہ منزل چلتا رہا اور کوئی بدبختی سے مقابل نہ آسکا۔ بس زبیرؓ بن العوام جو شام کے تجارتی سفر سے واپس آرہے تھے، خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور چند نفیس پارچات پیش کیے جنھیں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے بہ صد شوق قبول فرمایا، پھر کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا۔ چونکہ یہ تمام سفر مکّے اور مدینے کے درمیان عام اور آباد راستے سے بالکل ہٹ کر تھا لہٰذا آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے کہیں طویل قیام نہ کیا۔ ان منزلوں کا ذکر وضاحت کے ساتھ ابنِ ہشام نے کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) عسفان: یہ قیام مکّۂ مکرّمہ سے چھتیس میل کے فاصلے پر ایک چشمے کے کنارے ہے۔

(۲) امبج: معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دوسری منزل یہی تھی۔

(۳) قدید: ایک قصبہ جو اہلِ یثرب کے معبود مناۃ کے سبب اہم تصوّر کیا جاتا تھا۔

(۴) خرار: ایک چھوٹی سی آبادی جہاں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے قلیل وقت کے لیے آرام کیا۔

(۵) ثنیتہ المرہ: قیام کیے بغیر آگے روانہ ہو گئے۔

(۶) مدلجہ لقف: یہاں میٹھے اور ٹھنڈے پانی کے کنویں سے اللہ کے نبیؐ نے پانی نوش فرمایا۔

(۷) مدلجہ محاج: قیام کے بغیر گزر گئے۔

(۸) العبد اجد: یہ عظیم قافلہ یہاں بھی قیام کے بغیر گزرا۔

(۹) العبابید: اس جگہ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم نے قیام فرمایا۔

(۱۰) الفاجہ: سواری گزری۔

(۱۱) بعدہ العرج : گزرے۔

(۱۲) بطن ریم : یہ راستہ اختیار کیا۔

(۱۳) قُبائے : ایک بلند بستی۔ یہاں قیام فرمایا۔

## مسجدِ قُباء

ان تمام منزلوں میں قُبائے کے سوا اب کسی کا نشان بھی نظر نہیں آتا۔ اُس وقت سب سے طویل قیام آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے اسی جگہ فرمایا۔ قُباء مدینے کے جنوب میں ڈھائی میل کے فاصلے پر ایک بلند بستی ہے جسے اس کی بلندی کے سبب عالیہ بھی کہتے ہیں۔ یہ پھلوں اور میوہ دار اشجار سے آراستہ بڑی ہی سرسبز و شاداب زمین ہے۔ اُس زمانے میں قبیلۂ اوس اور خزرج کے چند خاندان آباد تھے۔ ان تمام میں سب سے زیادہ ضعیف العمر مکتوم بن الھدم تھے جو ان تمام گھرانوں کے سردار بھی تصوّر کیے جاتے تھے۔ ان دنوں یہ سب لوگ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا انتظار کر رہے تھے کہ دیکھیں کب پہنچتے ہیں! جن لوگوں نے مقامِ عقبہ پر جا کر بیعت کی تھی، وہ بھی مضطربانہ منتظر تھے، لیکن جو ابھی دیدار سے محروم تھے، ان کی بے تابی بھی قابلِ دید تھی۔ اس دن جونہی یہ مبارک سواری قُباء میں پہنچی تو یہ لوگ دوڑ دوڑ کر جمع ہونے لگے۔ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ سواری کو گھیر لیں۔

آگے آنے والوں میں وہی تھے جو غائبانہ ایمان لے آئے تھے اور دید کو ترس رہے تھے۔ اس وقت چونکہ صدّیقِ اکبرؓ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے ساتھ ہی اونٹنی پر سوار تھے۔ شناخت اور پہچان میں رفعِ اشتباہ کے لیے صدّیقِ اکبرؓ بہ صد احترام کھڑے ہو گئے اور سرِ مبارک پر اپنے دامن کا سایہ کر لیا تاکہ اللہ کے آخری نبیؐ اور نبیؐ کے اوّلین رفیق کا امتیاز نمایاں ہو جائے۔ اس وقت ان تمام مسلمان گھرانوں کے سردار مکتومؓ بن الھدم پیرانہ سالی کے باوجود حاضرِ خدمت ہوئے اور غریب خانے کو عزّت بخشنے کی گزارش کی جسے رسالت مآب نے قبول فرمایا اور انھی کے گھر قیام کیا جو چار یوم کا تھا۔ ان دنوں مسلمان جہاں نماز ادا کیا کرتے تھے، معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اُسی جگہ مسجد کی بنیاد رکھی جو مسجدِ قُباء کہلاتی ہے۔

انھی دنوں علیؓ ابن ابی طالب بھی پا پیادہ سفر کرتے ہوئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے آن ملے۔ اب ان سب کو آگے سفر کرنا تھا۔ قُبا سے آگے دوسری آبادی بنو سالم کا محلّہ تھی۔

**خطبۂ جمعہ** ۱۲ ربیع الاوّل نبوّت کا تیرھواں سال (۲۴ ستمبر ۶۲۲ء)

جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم قُبا سے روانہ ہو کر بنو سالم کے محلّے تک پہنچ پائے تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ اسی دن مسلمانوں پر پہلی مرتبہ جمعے کی نماز فرض کی گئی اور اسی دن پہلی مرتبہ معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا پہلا جمعہ ادا فرمایا۔ بنو سالم کی مسجد میں نماز سے قبل ایک مفصّل خطبہ دیا۔ یہ دن بنو سالم کے مسلمانوں کے لیے عید سے زیادہ مسرور کن تھا۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی آمد کی خبر سنتے ہی لوگ جوق در جوق جمع ہو رہے تھے۔ مستزاد یہ کہ ان کی امامت میں نماز ادا کرنے کی عزّت ملنے والی تھی۔ اس وقت ہر شخص کی کوشش تھی کہ خود خدمتِ اقدس میں پہنچے اور سلام عرض کرے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان شمع رسالت کے گرد جمع ہو گئے۔ نماز کے لیے ایک مختصر سی مسجد اور مسلمانوں کے ہجوم کو معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم شفقت سے دیکھ رہے تھے۔

جب سب جمع ہو گئے تو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے فرمایا: "اے لوگو! کیا میں تمھیں وہ چیز نہ بتا دوں جو دنیا اور آخرت میں باعثِ نجات ہے؟"

ہر جانب سے مسلمانوں کی آوازیں بلند ہوئیں "یا رسولُ اللہ! ارشاد فرمائیے!"

آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے ان کی بات سنی اور دائیں ہاتھ سے اشارہ کیا تو یک لخت خاموشی چھا گئی اور یوں لگا جیسے ذاتِ اقدس کے سوا کوئی موجود ہی نہ ہو۔ تب آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) گویا ہوئے۔ اس وقت آپ کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا جیسے کسی اہم مسئلے سے آگاہ فرما رہے ہوں، انداز ٹھہرا ہوا، ہر لفظ صاف اور واضح، نہ اکتا دینے والی طوالت، نہ تشنہ چھوڑ دینے والا اختصار! لہجے میں نہ درشتی نہ نزاکت بلکہ ہر جملہ، ہر کلمہ قلب میں اترا جاتا تھا۔ وہ خطبہ مندرجہ ذیل ہے۔

مومنو! تمام تعریف خدائے بزرگ و برتر کے لیے ہے۔ میں اسی سے مدد چاہتا ہوں، اسی سے مغفرت طلب کرتا ہوں، اسی سے ہدایت مانگتا ہوں اور

اسی پر ایمان رکھتا ہوں، اس کی ناشکری نہیں کرتا۔ جو شخص بھی اس کی ناشکری (کفرِ احسان فراموشی) کرتا ہے، میں اس سے عداوت رکھتا ہوں۔ لوگو! میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ، اللہ کا بندہ اور رسولؐ ہے۔ اللہ نے اپنے بندے (محمدؐ) کو ایسی حالت میں دینِ حق کی روشنی اور نصیحت دے کر دنیا میں بھیجا جب رسولوں کو آئے ہوئے عرصۂ دراز گزر گیا تھا، علم کی قلت تھی، لوگ گمراہی میں مبتلا تھے، قیامت قریب تھی، دنیا کی مدتِ معینہ تمام ہونے کو تھی (ایسے میں ہدایت آئی) اب جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا، ہدایت یافتہ ہوگا اور جو نافرمانی کرے وہ گمراہ اور خطاکار ہوا اور ضلالت کی انتہا کو پہنچ گیا۔

مسلمانو! میں تمھیں اللہ سے ڈرتے رہنے کی نصیحت کرتا ہوں اس لیے کہ ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان کے لیے بہترین نصیحت یہی ہے کہ وہ اسے اللہ سے ڈرنے کی تلقین اور آخرت کے لیے اچھے کاموں کی ترغیب دے۔ پس تم ہر اس چیز سے بچو جس سے بچنے کا حکم تمھیں خداوندِ عالم نے دیا ہے کیوں کہ اس سے (اللہ تعالیٰ) بڑھ کر تمھارا خیر خواہ نہیں ہے اور اس سے افضل تمھیں نصیحت کرنے والا نہیں ہے لہٰذا جو کوئی شخص اللہ کی خوشنودی کے لیے تقویٰ اختیار کرے، پوشیدہ اور ظاہری امور میں اسی سے اپنا معاملہ درست کرے اور اس کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہو تو اس کا ہر عمل دنیا میں اچھی شہرت اور آخرت میں اس کے لیے ذخیرہ ہوگا جب انسان خود اپنے کیے ہوئے عمل کا محتاج ہوگا۔ جو شخص اس کے برعکس ہوگا (عمل کرے گا) اس کی نسبت وہ آرزو کرے گا کہ کاش وہ اس سے بہت دُور ہوتا۔

اے لوگو! اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے۔ (حساب کتاب اور روزِ حشر کے عذاب سے) اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ اس نے اپنا قول سچّا کر دکھایا جس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ خود ارشاد فرماتا ہے کہ میری بات بدلتی نہیں، نہ میں اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا ہوں۔ پس تم دنیا اور آخرت میں اسی

سے ڈرتے رہو اور جو کوئی اس سے ڈرتا (گناہوں سے بچتا ہے) ہے تو وہ اس کی برائی کی پردہ پوشی کرتا ہے، اسے عظیم کامیابیاں عطا فرماتا ہے۔

اے لوگو! تقوے کا مطلب اللہ کے غضب سے ڈرنا ہے۔ بلاشبہ تقویٰ انسان کے چہرے کو نورانی بناتا ہے۔ پروردگارِ عالم کو راضی اور انسان کے درجات بلند کرتا ہے۔ پس تم اپنا حصہ لو اور اللہ کے معاملے میں کوتاہی نہ برتو۔ اللہ نے تمھیں اپنی کتاب کا علم عطا فرمایا ہے اور تمھارے لیے اپنی راہ مقرر کر دی ہے تاکہ کذب اور صدق کو جان لو لہٰذا اب تم بھی احسان کرو جیسا کہ اللہ نے احسان کیا۔ تم اس کے دشمنوں (کفر و شرک) سے دشمنی رکھو اور اللہ کی راہ میں جہاد کا ایسا حق ادا کرو جو اس کا حق ہے کیوں کہ اس نے تمھیں چُن لیا اور تمھارا نام مسلم (فرماں بردار، اطاعت گزار) رکھا تاکہ تم میں سے جو ہلاک ہو، وہ اعلیٰ مقصد کے لیے اور جو زندہ رہے، وہ اسی کی قوّت و وحدانیت کو تسلیم کرتا رہے یعنی تمھاری زندگی اور موت سب اسی کی خوشنودی کے لیے ہو۔ پس تم پر لازم ہے کہ کثرت سے اس کا ذکر کرو اور آخرت کے لیے عمل کرو۔ جو شخص اللہ کے معاملات میں اس کی مدد (اطاعت) کرتا ہے، اس کے معاملات کو اللہ درست فرما دیتا ہے۔ اس کے لیے کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں بجز اللہ کے۔ وہی سب کا مالک ہے، کسی کو اس پر کوئی اختیار نہیں۔ اس اعلیٰ و عظیم مالک کی مدد کے بغیر کسی میں کچھ کرنے کی قوّت و طاقت نہیں۔

اے لوگو! اپنی جانوں کے لیے جو کچھ ہو سکے (اچھے عمل کی صورت میں) آگے بھیج دو اور خوب جان لو کہ تم میں سے ہر نفس پر موت کی غشی طاری ہونا ہے۔ تم میں سے ہر فرد اپنی بکریوں کو بغیر چرواہے کے چھوڑ جائے گا۔ پھر تمھارا پروردگار تم سے خود گفتگو کرے گا، اس طرح کہ نہ کوئی ترجمان ہوگا اور نہ درمیان میں حائل ہونے والا دربان۔ تب اللہ تم سے سوال کرے گا: "کیا تمھارے پاس ہدایت دینے کے لیے میرا بھیجا ہوا پیغمبر نہیں آیا تھا؟ کیا اس نے تمھیں نیکی اور بھلائی کی تبلیغ نہیں کی؟ کیا میں نے تمھیں مال و دولت دے کر اپنا فضل نہیں کیا؟ اب بتاؤ تم نے اپنے آگے کیا بھیجا؟" یہ سننے کے بعد

بندہ اپنے دائیں اور بائیں دیکھے گا تو اسے کچھ بھی نظر نہ آئے گا۔ پھر وہ اپنے آگے دیکھے گا تب اسے جہنّم کی بھڑکتی آگ کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔

مسلمانو! میں تم سے دریافت کرتا ہوں کہ جب تم سے یہ سوال کیا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟ میں اسی وقت (جب اللہ یہ سوال کرے گا) سے ڈرتا ہوں اور تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ جو کوئی بھی اپنے چہرے کو آگ سے بچانے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ ضرور بچا لے خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعے ہی ہو! اور جس کے پاس یہ بھی نہ ہو وہ اچھی بات ہی کے ذریعے نارِ جہنّم سے بچنے کی کوشش کرے کیوں کہ دربارِ الٰہی میں ایک نیکی کے بدلے دس سے سات سَو گنا تک جزا ملتی ہے۔

مسلمانو! قبل اس کے کہ موت آئے، تم کثرت کے ساتھ توبہ اور ذکرِ الٰہی کیا کرو۔ خلوت اور جلوت میں صدقہ دو اور خدا سے اپنا تعلق جوڑ لو۔ تمھیں اس کا اجر ملے گا۔ تم لائقِ تعریف بنو گے اور تمھیں رزق دیا جائے گا۔

مسلمانو! یاد رکھنا آج اس جگہ، اس ماہ اور اس سال اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ہر فرد پر قیامت تک کے لیے جمعہ فرض کر دیا، جو اس تک آنے کی قدرت رکھیں! لہٰذا جو شخص میری زندگی میں یا میرے بعد اس فریضے کا انکار کرے یا اسے ترک کرے، (جب کہ اس کا امام موجود ہو خواہ عادل ہو یا ظالم) اللہ تعالیٰ اسے کبھی اتفاق و اتحاد کی توفیق نہ بخشے گا۔ اللہ جمعہ ترک کرنے والے کے کاموں میں برکت نہ دے گا۔ اس کی نماز قبول نہ ہو گی، اس کی دعا قبول نہ کی جائے گی۔ اس کی زکوٰۃ قبول نہ ہو گی۔ اس کے وِتر قبول نہ ہوں گے۔ ہاں اگر وہ توبہ کرے تو خدا توبہ قبول کرنے والا ہے، بہ شرطیکہ وہ آیندہ اس فرض کو ہمیشہ ادا کرتا رہے! اور خوب سن لو کہ کوئی عورت کسی مرد کی امام نہ بنے۔ کوئی گنوار کسی مہاجر کا امام نہ بنے، کوئی فاسق کسی مومن کا امام نہ بنے، اِلّا یہ کہ کوئی بادشاہ اسے مجبور کرے جس کی تلوار اور کوڑے کا اسے خوف ہو۔

معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم نے خطبہ تمام کیا۔ اس وقت مسلمانوں کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ کچھ پر رقّت طاری تھی۔ کچھ بے قرار تھے۔ کچھ اشک بار اور توبہ و استغفار

کر رہے تھے۔ ازاں بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نمازِ جمعہ ادا کی۔ وادیٔ رانونا کی مسجد میں یہ پہلا جمعہ تھا۔ کچھ دیر قیام فرمانے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے یثرب کی جانب روانہ ہو گئے۔

**مدینۃ النبی** ۱۲ ربیع الاوّل نبوت کا تیرھواں سال (۲۴ ستمبر ۶۲۲ء)

اہل یثرب کو اس روانگی کا علم ہوا تو پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنے اس عظیم مہمان کی آمد کی تیاری کرنے لگے۔ گزرگاہ صاف کی گئی۔ ہر شخص نے اپنے گھر کو اس طرح سنوارا جیسے آنے والے مہمان اس جگہ قیام کریں گے۔ پھر وہ خود صاف لباس پہن کر، ہتھیاروں سے لیس ہو کر آبادی سے باہر نکل آئے۔ اس وقت ہر فرد کی نظریں اس راستے پر مرکوز تھیں جدھر سے گزر کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو وہاں آنا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ سب جذبات کا سحر بیکراں لیے کھڑے ہیں۔ ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سفر کرتے ہوئے وہاں پہنچے تو تمجید و تقدیس کے کلمات سے فضا گونج اٹھی۔ ان آوازوں سے دلی مسرّتوں کا اظہار آنے والوں کو بھی مسرور کر رہا تھا۔ اس وقت مرد راستے کی دونوں جانب صفیں بنا کر کھڑے ہو گئے اور بچیوں نے دف بجا بجا کر گیت گانا شروع کر دیا۔ گیت کے بول یہ تھے "ہم خاندان بنو نجار کی لڑکیاں ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیسے اچھے ہمسائے ہیں"

ان کی آوازیں دور دور سنائی دے رہی تھیں۔ چونکہ ابھی تک پردے کا حکم نہ تھا لہٰذا خوشی کے اظہار میں معزز خواتین بھی شریک تھیں۔ اہل مدینہ میں سے تقریباً سبھی ان پیش گوئیوں سے واقف تھے جو نبیٔ موعود کے بارے میں مشہور تھیں اور اس وقت اکثر کا موضوع بنی ہوئی تھیں۔ وہ سبھی مسرور تھے کہ آج وہ چاند طلوع ہونے والا تھا جس کے بارے میں سابقہ انبیاءؑ نے کہا تھا کہ فاران (مکہ) کی چوٹیوں سے طلوع ہو گا اور مسلع (مدینہ) والے گیت گائیں گے چنانچہ اس وقت گھروں کی چھتوں سے دیکھتی ہوئی خواتین گا رہی تھیں۔

چودھویں شب کا چاند ہم پر طلوع ہوا جو مردہ کی گھاٹیوں سے نکلا۔
ہم پر خدا کا شکر واجب ہے جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں۔
ہم پر تیرے حکم کی اطاعت فرض ہے اے آنے والے، قابلِ اطاعت چیز لایا ہے۔

اس وقت جن جن کو وہ پیش گوئی یاد آرہی تھی کہ فاران سے آنے والے کے پیچھے سلع کے لوگ گیت گائیں گے، وہ اپنی آوازان آوازوں میں ملانے کی کوشش کر رہے تھے جس کے سبب مدینے کے گلی کوچے پُر مسرت گیتوں سے گونج رہے تھے۔ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم ان پرستاروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایسے میں وہاں ٹھہرنے والا ہر مسلمان دل کے گوشے گوشے آرزو کر رہا تھا کہ اللہ کے نبیؐ اس کے مہمان بنیں۔ اس آرزو کی تکمیل کے لیے وہ بے تابانہ آگے بڑھ بڑھ کر استدعا کرتے۔ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم انھیں دعائیں دیتے، ان کی خوش خلقی پر خوشی کا اظہار کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ اس موقع کے لیے اونٹنی کا قصہ بھی مشہور ہے کہ اس کے بیٹھ جانے کی بنا پر معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ابو ایوبؓ انصاری کے گھر قیام فرمایا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اپنے ننھیالی رشتے داروں میں قیام کے آرزومند تھے لہٰذا بنو نجار کے مختلف خاندانوں کے نام پر قرعہ ڈالا گیا تو خالدؓ بن زید کا نام نکلا۔ وہ ابو ایوبؓ انصاری کے نام سے مشہور تھے لہٰذا معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کے مکان کی نچلی منزل میں سات ماہ قیام فرمایا۔ دیگر مسلمانوں کے لیے اہلِ مدینہ نے اپنے اپنے ساتھ انتظام کیا۔

ابھی تک اس کا نام یثرب تھا۔ اس دن سے اسے مدینۃ النبیؐ کہا گیا جسے اب مدینۂ منوّرہ کہا جاتا ہے۔ اسی دن سے اسلامی تقویم اور سنِ ہجری کی ابتدا ہوئی۔ آج کے دن ہی سے مسلمان اِس قصبے کو اسلام کا مرکز اور اپنی ایک مکمل ریاست تصوّر کرنے لگے۔ اب اجتماعیت کے احساس نے کم زوری و ضعف کے تصوّر کو مٹا ڈالا تھا۔ یہ احساس صرف مہاجرین ہی کو نہیں تھا بلکہ اوس و خزرج کے وہ قبائل بھی اسے محسوس کر رہے تھے جو کل تک مال و دولت اور علم کے اعتبار سے خود کو یہودیوں سے کم تر تصوّر کیا کرتے تھے۔ الغرض معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زیرِ سایہ چند مسلمانوں کا جمع ہو جانا گویا عروجِ اسلام کا پیش خیمہ تھا۔

مسجدِ نبوی ۱ھ (۷، اکتوبر ۶۲۲ء)

ہجرت کے بعد معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے سب سے پہلے جو کام ضروری

تصور کیا، وہ ایک مسجد کی تعمیر تھی۔ بہ ظاہر تو اس کا سبب نماز کے لیے ایک مخصوص اور مقدس جگہ کا انتظام کرنا تھا، لیکن دراصل اب مسلمانوں کو ایک باقاعدہ تعلیمی ادارے اور ثقافتی مرکز کی ضرورت تھی جہاں وہ سب جمع ہوں اور معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم انھیں علم و عمل، اخوت و مساوات، حریت و معاشرت، عدل و انصاف، تقویٰ و پرہیزگاری، صبر و تحمل اور شریعت و محبت کا سبق دے سکیں جیسا کہ اس مسجد کی تعمیر کے بعد ثابت ہوا۔ یہ مسجد محض عبادت گاہ نہیں بلکہ اسلام نے سیاسی اعتبار سے بھی اس کا بڑا اہم مقام متعین کر دیا۔ عبادت و معاملات اور اعمال و ایمان کا اشتراک یہی جگہ ہے جو واضح کرتی ہے کہ مسلمان کا عملِ زندگی اور عملِ آخرت جدا جدا نہیں بلکہ ایمان اور اعمال کا بہت گہرا تعلق ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ قرب و جوار کے ادنیٰ اور اعلیٰ لوگ جمع ہوتے ہیں تو باہمی تعلقات سے اخوت و محبت کے جذبات جنم لیتے ہیں۔ یہ اجتماع نہ صرف شیرازہ بندی اور معاشرتی و ثقافتی نظاموں میں استحکام پیدا کرتا ہے بلکہ فلاح و بہبود کے کاموں کی ترغیب اور باہمی مشورے، خیر و فلاح کی گفتگو اور اعتماد بحال کرنے میں مددگار و معاون ثابت ہوتا ہے۔ مسجد وہ عبادت گاہ ہے جسے باقاعدہ ایک مکمل ادارے کی حیثیت دی گئی ہے جو بہ یک وقت درس گاہ بھی ہو، دارالشوریٰ بھی! عدالت بھی، مہمان خانہ بھی! فلاح و بہبود کا مرکز بھی اور پناہ گاہ بھی!

ہجرت کے فوری بعد مسلمانوں کو ایک ایسے ہی ادارے کی ضرورت تھی جو علم و عمل، معاشرتی اور ثقافتی تمام اداروں کا فرض ادا کر سکے۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے مسجد کی تعمیر کا فیصلہ کیا گیا۔ اس وقت تک مسلمان حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ انصاری کے مکان کے سامنے والے کشادہ احاطے میں نماز ادا کیا کرتے تھے۔ اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اونٹنی اسی جگہ آکر بیٹھ گئی تھی۔ بہرکیف آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس قطعۂ ارضی کے بارے میں دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ یہ زمین دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اسعد رضی اللہ عنہ ابن زرارہ انصاری کے زیرِ تربیت ہیں۔ حضرت اسعد رضی اللہ عنہ ابن زرارہ ہی نے اس زمین کو بہ غرض نماز صاف کیا ہوا تھا۔ معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی

جگہ کو مسجد کے لیے پسند فرمایا تو ان دو یتیم بھائیوں نے قیمت لینے سے انکار کر دیا لیکن معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے قیمت مقرّر فرمانے پر زور دیا۔ اس وقت ایک دو کی نہیں بلکہ کئی صحابہؓ کرام کی آرزو تھی کہ قیمت ادا کر دیں لیکن یہ سعادت ابو ایوبؓ انصاری کے نصیب میں لکھی تھی۔ اس کی قیمت دس دینار مقرّر ہوئی جو انھوں نے ادا کی۔ اس قطعۂ ارضی کا طول سو گز تھا جہاں ایک سادہ سی مسجد اور اس سے ملحق حجرے تعمیر کیے گئے جن کی دیواریں کچّی اینٹوں کی، ستون کھجور کے تنوں کے اور چھت ٹہنیوں اور پتّوں کی تھی۔ اُن دنوں مسلمانوں کی مسرّتوں کا ٹھکانا نہ تھا۔ معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم ہر دم ان کے ساتھ مزدوروں کے لباس میں مصروفِ کار ہوتے۔

اکثر انصار اور مہاجرین اینٹ پتھر ڈھوتے ڈھوتے مل کر گاتے "اے خدا کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے۔ اے خدا مہاجرین اور انصار کو بخش دے"۔ ایسے میں معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی ان کے ساتھ آواز ملاتے جو صحابہؓ کرام کے حوصلوں کو بڑھا دیتی اور وہ آپؐ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتے۔

الغرض اینٹوں کی یہ سادہ سی مسجد مکمّل ہوئی۔ اس وقت اس کا قبلہ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا کیوں کہ ابھی تک تبدیلیٔ قبلہ کا حکم نازل نہ ہوا تھا جب تک یہ حکم نازل نہ ہوا مسلمان اسی جانب رُخ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔

### صُفّہ (اوّلین اوپن یونیورسٹی)

مسجدِ نبوی کی ایک جانب ایک کشادہ چبوترا تھا جسے صُفّہ کہتے تھے۔ صُفّہ کے معنیٰ ہیں ایوان خانہ، دالان جس کی چھت پٹی ہو۔ یہاں جمع ہونے والوں کو اہلِ صُفّہ کہتے تھے جن کے اجتماع کا خاص مقصد تھا۔ چونکہ اسلامی تعلیم ہر شعبۂ حیات پر محیط ہے لہٰذا مسلمان داعی بھی ہے، واعظ بھی، ماہرِ شریعت بھی، محتسب بھی اور معلّم بھی۔ یہی سبب تھا کہ جن جن گھروں میں اسلام پہنچتا گیا وہ دار العلوم بنتے گئے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہر گھر، ہر قبیلے اور ہر خاندان میں ایسے لوگ موجود رہیں جو اشاعتِ علم کا فرض ادا کر سکیں۔ اسی غرض سے حکمِ خداوندی ہے۔

تمام مسلمان تو سفر کر کے (مدینۂ منورہ) نہیں آسکتے لہٰذا ہر قبیلے سے ایک گروہ کو آنا چاہیے تاکہ وہ شریعت اور دین میں تَفَقُّہ حاصل کریں اور واپس جا کر اپنی قوم کو ڈرائیں۔ شاید یہ لوگ بُری باتوں سے اجتناب برتیں۔

اسی مقصد کی تکمیل کے لیے درس گاہ صُفّہ کا اہتمام کیا گیا۔ یہاں زیادہ تر وہ لوگ آتے جن کا کام ہی شب و روز حصولِ علم ہوتا۔ وہ گھریلو پابندیوں سے بے نیاز اور دُنیوی تعلقات سے آزاد ہوتے۔ ان میں سے اکثر لوگ بڑے نادار تھے۔ ان کا لباس محض ایک چادر ہوتا جسے وہ گردن سے باندھ کر چھوڑ دیتے۔ یہ چادر گھٹنوں تک پردے کا فرض ادا کر دیتی تھی۔ یہ لوگ صبح و شام صُفّہ میں موجود ہوتے، لیکن دن کے وقت جنگل سے لکڑیاں بھی کاٹتے جس سے خود بھی فیض اٹھاتے اور دوسروں کو بھی فیض یاب کرتے۔ رات ہوتی تو اسی چبوترے پر لیٹ کر آرام کر لیتے تھے۔ ان طالب علموں کو قاری کہا جاتا تھا۔ درس و تدریس کے لیے رات کا وقت مقرر تھا۔ اہلِ صُفّہ کی تعلیم کے لیے جلیل القدر صحابیؓ موجود تھے۔ عبادہؓ ابنِ صامت ایک بڑے عالم تھے جو اس درس گاہ کے معلمین میں شامل تھے۔ قرآن اور حدیث کے ساتھ ساتھ اہلِ صُفّہ کو تحریر و کتابت کا فن بھی سکھایا جاتا تھا۔ ہجرت کے بعد معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت کی ترویج پر بڑی توجہ فرمائی، یہاں تک کہ جنگِ بدر میں، اسیرانِ بدر میں سے کچھ لوگ فدیہ ادا نہ کر سکے تو انہیں اسی شرط پر آزادی بخشی گئی کہ انصار کے بچوں کو نوشت و خواند کی تعلیم دیں۔ اہلِ صُفّہ جو سیکھ لیتے، وہ سکھانے پر بھی مامور ہو جاتے، گویا اس وقت صُفّہ کی حیثیت ایک عام درس گاہ اور اوپن یونیورسٹی کی تھی۔ ان ہستیوں میں حضرت ابوہریرہؓ بھی شامل تھے۔ بعض اوقات مسجد میں مسلمانوں کی دو جماعتیں بن جاتیں۔ ایک عبادت کرنے والوں کی اور دوسری درس و تدریس کی۔

ایسے ہی ایک موقع پر معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو مسلمانوں کے دو حلقے بنے ہوئے تھے، ایک حلقۂ ذکرِ الٰہی اور دوسرا حلقۂ تدریس۔ معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے لمحے بھر کے لیے رک کر دیکھا اور حلقۂ درس و تدریس میں جا بیٹھے، گویا علم کو ترجیح دی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اہلِ صُفّہ کی تعداد بڑھتی گئی۔

یہ لوگ عموماً رات کو عبادت اور دن میں تلاوت کرتے اور قرآنِ مجید کے ضبط و تدوین کے لیے کتابت کا فن بھی سیکھتے۔ جب کبھی ان کی ضرورت پیش آتی تو دعوتِ اسلام کے لیے دُور دراز کے علاقوں میں بھی بھیجے جاتے تھے۔ غرض کہ وہ دینی خدمات کے لیے خود کو وقف کر چکے تھے۔ مدینۂ منورہ کے قرب و جوار میں جو چھوٹے چھوٹے دستے روانہ کیے جاتے، ان میں اہلِ صُفّہؓ بھی شامل ہوتے۔

غزوۂ احد کے بعد مخالفین نے سر اٹھایا اور سرایا کا سلسلہ شروع کرنا پڑا تو سَو سَو یا ڈیڑھ ڈیڑھ سَو کی نفری میں، اہلِ صُفّہؓ بھی ان میں شامل ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں بیرِ معونہ میں جو ستّر صحابۂ کرامؓ اشاعتِ دین کے لیے گئے تھے اور وہاں شہید کر دیے گئے تھے، ان میں سے اکثر اہلِ صُفّہؓ ہی میں سے تھے۔ الغرض مسجدِ نبوی کے کنارے یہ چبوترا بے مقصد نہیں بنایا گیا تھا بلکہ یہاں مقیم نوجوان صحابۂ کرامؓ معلّم بھی تھے، مجاہد بھی اور بوقتِ ضرورت شہر کے پہرے دار بھی جو قرآنِ مجید کے علم کے ساتھ ساتھ لکھنا پڑھنا سیکھتے اور انھی علوم کی اشاعت کے لیے دُور دراز بھیجے جاتے تھے۔ یہ درس کا ایک مستقل اور وسیع طریقہ تھا جس کے سبب بہت جلد گھر گھر تعلیم عام ہو گئی۔ اس وقت درس گاہِ صُفّہؓ نے وہ کام کیا جو بعد کی قائم ہونے والی بڑی بڑی یونیورسٹیاں بھی نہ کر سکیں۔

## اہلِ بیت کا سفر ۱ھ (۶۲۲ء)

مسجدِ نبوی سے متصل ازواجِ مطہرات کے لیے حجروں کا اہتمام بھی ہوا تھا۔ اس وقت تک صرف حضرت سودہؓ بنتِ زمعہ ازواج میں سے تھیں اور حضرت عائشہؓ صدیقہ سے صرف نکاح ہوا تھا۔ رخصتی ابھی عمل میں نہ آئی تھی اس لیے صرف دو ہی حجرے بنائے گئے جو کچی اینٹوں کے تھے۔ یہ چھ چھ ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لمبے تھے۔ ان کی چھت اتنی اونچی تھی کہ ہاتھ اٹھا کر چھُوا جا سکتا تھا۔ ان حجروں میں روشنی کا اہتمام نہ تھا اور ضروریات کی اشیا بھی مختصر تھیں۔ جب تک مسجد اور حجرے تیار ہوئے، آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) حضرت ابو ایوبؓ کے گھر مہمان رہے۔ یہ قیام سات ماہ رہا۔ یہاں تک کہ اقامتی حصّہ مکمل ہوا تو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے نقلِ مکانی فرمائی اور زیدؓ بن حارثہ کو پانچ سَو درہم اور سواری

کے لیے اونٹ دے کر مکہ روانہ کیا کہ اہل بیت کو لے آئیں۔ اس وقت اہلِ بیت میں اُمّ المومنین حضرت سودہؓ اور دو بیٹیاں اُمّ کلثومؓ اور فاطمہؓ زہرا تھیں۔ اسی زمانے میں صدیق اکبر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے خاندان کو مدینے بلایا اور ہجرتِ مدینہ کے آٹھ ماہ بعد شوّال ۱ھ میں حضرت عائشہؓ صدیقہ کی رخصتی عمل میں آئی۔

## مواخاتِ عامہ ۱ھ (۷، اکتوبر ۶۲۲ء)

ارشادِ ربانی ہے۔

(اے ایمان والو!) اللہ کی جو نعمتیں تم پر ہیں، انھیں یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اللہ نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ تم بہ فضلِ ربی بھائی بھائی بن گئے اور تم تو آگ کے کنارے پر پہنچ گئے تھے۔ اللہ نے ہی تمھیں وہاں سے بچایا اور اللہ اپنی نشانیاں تم پر واضح کر رہا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

ان آیات میں مواخات کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ وہ مواخات نہیں جو خون کے تعلق کی بدولت پائی جاتی ہیں بلکہ اخوت اور محبت کا وہ تعلق مواخات ہے جس کی بنا صرف اسلام نے ڈالی ہے۔ صحابۂ کرامؓ کے درمیان یہی وہ تعلق تھا جو ہر رشتے سے زیادہ برتر و اعلیٰ تھا۔ دو انسان ہزارہا مخالفت اور دشمنی کے باوجود جب دامنِ اسلام میں آتے تو ہر طرح سے اپنے نفع و نقصان، دُکھ، تکلیف اور آرام کو ایک تصوّر کرنے لگتے تھے، لیکن اسلام کا تقاضا تھا کہ علم کے ساتھ عمل بھی شامل ہو۔ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰت کی ہدایت کے پیشِ نظر ایمان و عقیدے کے ساتھ ساتھ اس کا اظہار عمل سے نہ کیا جائے تو ایمان لانا اور نہ لانا برابر ہے۔ جو شخص ایمان لے آئے اور عمل نہ کرے اور جو شخص عمل کرتا رہے اور ایمان نہ لائے، خدا کو ان دونوں میں سے کسی کے عمل کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ معلمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے وعظ و نصیحت کو محض زبانی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی پیش کیا اور اخلاقیات کی مکمل تعلیم اپنے عمل سے دی، چنانچہ دو مسلمانوں کے دلوں میں باہمی الفت و محبت، جو دین کے سبب پیدا ہوئی وہ دائرۂ عمل میں آئی تو اخوت کہلائی۔
اس پر مکّے میں بھی عمل ہوا اور مدینۂ منورہ میں بھی۔

ابنِ اسحٰق سے روایت ہے کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ تَاَخُوّ فِی اللّٰہِ آخَوَینِ آخَرَینِ۔

خدا کی راہ میں بھائی بھائی بن جانے کی یہ ہدایت دینے کے ساتھ ہی آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے توسیعِ محبّت والفت اور وسعتِ اخلاق کے مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی بنیاد رکھی۔ البتّہ قیامِ مکّہ کے دوران میں اس کا مقصد اس تعلّق کی اہمیّت کو واضح کرنا اور یہ بتانا تھا کہ خون کے رشتوں کی بدولت بھائی بھائی ہونا، قانوناً ایک مال میں وارث ہونا، اتنا وسیع نہیں ہوتا جتنا کہ دین کے رشتے میں منسلک ہونے کے بعد محبّت پیدا ہو جانا، وسعت اور اعتماد کے لحاظ سے پاکیزہ اور مقدّس ہوتا ہے۔ اس وقت مواخات کا مقصد ایک اور بھی تھا۔ اسلام کا اوّلین دَور تھا، حق و باطل کے فرق نے ہر گھر میں اور قریبی رشتوں میں جدائی ڈال دی تھی۔ باپ ایمان لے آیا، بیٹا کافر اور بیٹا ایمان لے آیا تو باپ منکر۔ اس وقت صدّیقِ اکبر حضرت ابوبکرؓ جاں نثاروں میں سرِفہرست تھے، لیکن ان کے دوسرے فرزند عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ جنگِ بدر کے بعد تک انکار کرتے رہے۔ دوسری طرف حضرت ابو عبیدہؓ بن الجرّاح اوّلین و سابقین میں شمار کیے جاتے ہیں، لیکن ان کے باپ اسلام کو زک پہنچانے کے لیے میدانِ بدر تک آئے اور بیٹے کے ہاتھوں کیفرِ کردار کو پہنچے۔

مکّے کے ہر گھر میں اقرار اور انکار کی کیفیت طاری تھی جو یقیناً افسردگی کا سبب بنتی تھی۔ ایسے میں مواخات، ان مسلمانوں کے زخموں پر مرہم رکھ دینے کے مترادف تھی اور زبانی و عملی طور پر یہ اعلان کر دینا تھا کہ خون کے رشتے اور وراثت کے سب تعلّق بے بنیاد اور ناقابلِ یقین ہیں لہٰذا ان کے چھوٹ جانے یا منکر ہونے کا دُکھ محسوس مت کرو۔ کرۂ ارض پر قتلِ انسانی کی ابتدا بھائی کے ہاتھوں بھائی کے قتل سے ہوئی۔ پھر جنابِ نوحؑ کا فرزند کافر اور سیّدنا ابراہیمؑ کے والد مشرک و منکر تھے لہٰذا ایسی عظیم ہستیوں کو بھی بہ حضورِ باری تعالیٰ دعائے مغفرت کی اجازت نہ ملی تھی۔ اس کے واضح معنی یہی تھے کہ اصل تعلّق عقیدے اور دین کے سبب ہوتا ہے لہٰذا خدائے واحد کی بندگی کرنے والے ہی آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس کے

اظہار کے لیے گئے ہیں مواخات کرائی جس کا نقشہ تاریخ میں اس طرح ملتا ہے۔

مواخات مکہ

| | |
|---|---|
| معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم۔ | سیدنا علیؓ ابن ابی طالب۔ |
| سیدنا ابوبکرؓ صدیق۔ | سیدنا عمرؓ فاروق۔ |
| امیر حمزہؓ بن عبدالمطلب۔ | جناب زیدؓ ابن حارث۔ |
| زبیرؓ بن العوام۔ | عبداللہؓ ابن مسعود۔ |
| حضرت عثمانؓ بن عفان۔ | حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔ |

مواخات مدینہ منورہ

دوسری مواخات ہجرت مدینہ کے بعد ہوئی جس کا مقصد خون کے اور دین کے رشتوں کے فرق کو واضح کرنا نہیں (یہ وضاحت تو بہت پہلے ہو چکی تھی) بلکہ اس اخوت سے مسلمانوں کی قوت کو استحکام بخشنا ان کے قلوب کو قوی تر کرنا اور قوی کو کم زور کا بازو بنا دینے کے مترادف تھا۔ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ جو انصار جس مہاجر کا بھائی بنا، اس نے اپنے مال و دولت، گھر بار اور مویشیوں میں اپنے مہاجر بھائی کو برابر کا حق دار سمجھا۔ مواخات کے بعد جن انصار نے وفات پائی، ان کا ترکہ مہاجرین کے حصے میں بھی آیا۔ اس موقع کے لیے انصار نے اپنی عظمت کا ثبوت دیا کہ سعدؓ بن ربیع انصاری مواخات کے بعد اپنے مکی بھائی حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو اپنے گھر لے گئے اور ہر شے میں نصف نصف کرنا چاہا تو ان سے دریافت کیا کہ میری دو بیویاں ہیں، ان میں سے جسے کہو، طلاق دے دوں۔ پھر تم اس سے عقد کر لینا۔ لیکن حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے اس بات کو گوارا نہ کیا۔

مہاجرین میں سے اکثر وہ تھے جنھوں نے اپنے انصار بھائی کے مال سے کچھ لینا گوارا نہ کیا اور ہجرت کے فوری بعد تجارت شروع کر دی۔ بہرکیف مواخات نے مہاجرین اور انصار کے درمیان خاص قربت پیدا کر دی۔ وہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں خود کو شامل کرنا اپنا فرض سمجھنے لگے۔ مدینہ منورہ میں مواخات ہجرت سے پانچ ماہ کے بعد ہوئی جو باقاعدہ باہمی حلف کے ذریعے قائم کی گئی۔ حضرت

انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ ہمارے گھر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے دو یا تین مرتبہ مہاجرین اور انصار کے درمیان باہمی حلف کے ذریعے اخوّت قائم فرمائی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ باقاعدہ مواخات کے بعد بار بار یہ عمل ہوتا رہا۔ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ مہاجرین ہجرت کر کے آتے تو معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اس خیال سے کہ میزبانی کا بوجھ کسی ایک انصاری کو برداشت نہ کرنا پڑے، مہاجرین کو کچھ عرصے کے لیے ایک ایک انصار سے منسلک فرما دیتے۔ اس طرح ہجرت کر کے آنے والے بھی خود کو تنہا تصوّر نہ کرتے اور ان کے مددگار بھی بوجھ محسوس نہ کرتے تھے۔

مواخاتِ مدینہ کا نقشہ تاریخ میں اس طرح دیا گیا ہے۔

| مہاجرین | انصار |
|---|---|
| ۱۔ سیدنا ابوبکرؓ صدیق۔ | خارجہؓ بن زید۔ |
| ۲۔ عمرؓ بن الخطاب، فاروقِ اعظم۔ | عتبانؓ بن مالک۔ |
| ۳۔ عثمانؓ بن عفان، ذوالنورین۔ | اوسؓ ابنِ ثابت۔ |
| ۴۔ علیؓ ابنِ ابی طالب۔ | حضور صلی اللہ علیہ وسلّم۔ سلمانؓ فارسی۔ |
| ۵۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔ | سعدؓ بن ربیع۔ |
| ۶۔ ابوعبیدہؓ بن الجراح۔ | سعدؓ بن معاذ۔ |
| ۷۔ طلحہؓ بن عبید اللہ۔ | کعبؓ بن مالک۔ |
| ۸۔ سعیدؓ بن زید۔ | ابیؓ بن کعب۔ |
| ۹۔ زبیرؓ بن العوام۔ | سلمہؓ بن سلافہ۔ |
| ۱۰۔ زید ابنِ حارثہ۔ | اسیدؓ بن حضیر۔ |
| ۱۱۔ بلالؓ بن رباح۔ | ابو رویم الخثعی۔ |
| ۱۲۔ جعفرؓ بن ابی طالب (حبشہ میں مقیم تھے) | معاذؓ بن جبل۔ |
| ۱۳۔ عمارؓ بن یاسر۔ | حذیفہؓ بن الیمان۔ |
| ۱۴۔ مصعبؓ بن عمیر۔ | ابو ایوبؓ انصاری۔ |
| ۱۵۔ ابوذرؓ رداء۔ | سلمانؓ فارسی۔ |

| | |
|---|---|
| ١٦۔ عبیدہؓ اللہ بن الحارث۔ | عمیرؓ بن حمام بن جموع۔ |
| ١٧۔ زیدؓ بن الخطاب۔ | معنؓ بن عدی۔ |
| ١٨۔ وہبؓ بن سعد۔ | سویدؓ بن عمرو۔ |
| ١٩۔ ابو مرثدؓ غنوی۔ | عبادہؓ بن الصامت۔ |
| ٢٠۔ ذوالشمالینؓ عمیر بن عبد | یزیدؓ بن حارث بن قیس۔ |
| ٢١۔ عمیرؓ بن نفلہ۔ | ابو البختریؓ۔ |
| ٢٢۔ عثمانؓ بن مظعون۔ | عباسؓ بن عبادہ۔ |
| ٢٣۔ طلیبؓ بن عمیر۔ | منذرؓ بن عمرو |
| ٢٤۔ ابو حذیفہؓ بن عتبہ۔ | عبادؓ بن بشر۔ |
| ٢٥۔ منذرؓ بن عمرو۔ | ابوذرؓ غفاری۔ |

انصار اور مہاجرین ملاکر مواخات نوّے افراد کے درمیان کرائی گئی، لیکن ان معززین کے مکمل اسماء تاریخ میں نہیں ہیں البتہ ان کے بارے میں ایک چیز توجہ طلب ہے کہ باقاعدہ مواخات ہجرت کے پانچ ماہ کے بعد ہوئی۔ ان انصار میں ان ہستیوں کے اسمائے گرامی بھی موجود ہیں جنھوں نے ہجرت کے دو برس بلکہ اس کے بعد تک اسلام قبول کیا۔ ایک قاری کے ذہن میں یہ بات اعتراض بن کر اٹھتی ہے کہ دوسری ہجری میں مسلمان ہوکر سایۂ رحمت میں آنے والے سلمانؓ فارسی ہجرت کے پانچ ماہ بعد ہونے والی مواخات میں شریک ہوکر ابودرداؓ کے بھائی کیسے بن گئے؟ اس کا جواب یہی ہے کہ مواخات کا سلسلہ دراصل فتح مکہ تک جاری رہا اور مہاجرین کی ہجرت کا سلسلہ بھی اس وقت تک چلتا رہا۔ اس طرح مواخات کا عمل بھی مختلف مقامات پر مختلف اوقات میں دہرایا جاتا رہا، یہاں تک کہ ہجرت کر کے آنے والوں کو آسودگی، خوش حالی میسر آگئی اور مدینے کے منتشر لوگ اسلام کے دامن میں آکر، مواخات کے رشتے میں منسلک ہوکر انصار (مددگار) کے لقب سے معزز ہوئے۔ اوس اور خزرج اور دیگر قبائل کے جملہ امتیازات مٹ گئے۔ کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ وہ صرف انصار کہلائے جانے لگے۔

غرض کہ مواخات اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ (تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں) کی عین تعمیل اور قرآنی حکم کے مطابق پوری انسانیت کے لیے اخوّت و رحمت، محبت و مساوات کا پیغام تھی۔ اسی کے ذریعے مکّے سے ہجرت کر کے آنے والے سینکڑوں مسلمانوں کو مدینے میں آباد کرنا آسان ہو گیا۔ یہ حکم معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا نہیں بلکہ عین حکمِ الٰہی تھا جس پر عمل کرنے سے مسلمانوں کے باہمی تعلقات خاندانی عصبیت اور تفرقوں سے پاک ہو گئے اور ان کے لیے آیندہ کے کام آسان ہو گئے۔ اسی مواخات کی تعریف کرتے ہوئے خداوندِ عالم نے ان دونوں گروہوں کی تعریف اس طرح فرمائی کہ مہاجرین کے لیے ارشاد ہوتا ہے۔

وہ مفلسانِ تارک الوطن ہوا اپنے گھر بار، مال و دولت سے نکال دیے گئے، وہ خدا کے فضل و کرم اور اس کی رضاجوئی کے طلب گار ہیں اور خدا اور خدا کے رسولؐ کے مددگار ہیں، دراصل یہی لوگ سچّے اور ایمان دار ہیں۔ یہ

ابتدائی آیتِ ربّانی ان مہاجرین کے لیے ہے جنھوں نے خدا کی راہ میں سب کچھ چھوڑ کر محض بندگی اور آزاد رہ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے لیے ہجرت کی۔ اس کے فوری بعد کی آیات ان انصار کے لیے ہیں جنھوں نے کشادہ قلبی کے ساتھ اپنے وطن میں آنے والوں کے سُکھ، آرام اور ضروریاتِ زندگی کا اہتمام کیا۔ قادرِ مطلق نے ان کی تعریف اس طرح فرمائی۔

(مدینہ) دارالہجرت میں رہنے والے وہ لوگ جو پہلے سے ایمان لا چکے ہیں (بیعتِ عقبہ میں) وہ ان مہاجرین سے محبّت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو ملتا ہے۔ (بلند مرتبہ) اس سے اپنے دلوں میں خلش (محرومی) محسوس نہیں کرتے بلکہ انھیں اپنی جانوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں خواہ ان کو خود ہی احتیاج ہو (اپنی ضرورت روک کر ان کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں) تو جو اشخاص حرصِ نفس سے بچائے گئے، وہی مراد پانے والے ہیں۔

مہاجرین کی آبادکاری کا اہم مسئلہ حل ہوا جس نے انصار میں نظم و ضبط، اتحاد اور مہاجرین میں قوّت پیدا کر دی تو معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم نے دیگر مسائل کی طرف توجّہ فرمائی۔

## بین الاقوامی معاہدہ ۱ھ (۶۲۲ء)

اس وقت سب سے اہم مسئلہ جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی توجہ چاہتا تھا، وہ اس اسلامی جماعت کے اتحاد کو برقرار رکھنا تھا جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بنائی تھی اور جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح مدینے میں آباد دیگر اقوام سے بھی تھا۔ اس وقت مدینۂ منورہ میں دو قومیں آباد تھیں، بُت پرست اور یہود۔ بُت پرست تو اسلام کے دامن میں آکر مواخات کے رشتے میں منسلک ہو گئے تھے اور ایک برادری بن چکے تھے۔ اب معاملہ تھا یہود کا جو یہاں صدیوں سے آباد تھے۔ یہاں کے پانی کے چشموں اور سرسبز علاقوں کو وہ اپنی جاگیر تصوّر کرتے۔ ایلہ، مقنسا، تبوک، تیما، وادی القرا، فدک اور خیبر میں ان کے قلعے تھے اور خاص مدینۂ منورہ میں ان کے قبائل تھے۔ بنی قینقاع، بنی قریظہ اور بنی نضیر، یہ سب بڑے اعلیٰ نسب اور ممتاز تصوّر کیے جاتے تھے۔ صدیوں سے عرب میں رہنے کے سبب ان کی زبان، لباس اور اندازِ زندگی میں عربی رنگ نمایاں تھا۔ ان میں بڑے بڑے علما بھی تھے اور شاعر بھی، لیکن علم اور مذہب سے زیادہ انھیں اپنے کاروبار سے رغبت تھی اسی لیے معاشی طور پر وہ دیگر عرب قبیلوں سے زیادہ مضبوط و مستحکم تھے چونکہ ان کا تعلق فلسطین اور شام سے تھا اس لیے وہ بہت سے فنون سے واقف تھے، لیکن ان کی توجہ تجارت کی طرف زیادہ تھی۔ غلّہ، چھوارے، پارچہ بافی اور ماہی گیری پر وہ قابض تھے۔ مدینۂ منورہ کے اندر یہودی قبائل زیادہ تر آہن گری اور ظروف سازی کا کام کرتے اور عرب کے بڑے بڑے شیوخ کو سود کی شرط پر قرض دے کر مسلسل اپنی دولت میں اضافہ کرتے تھے چونکہ سود کے کاروبار کا اوّلین تقاضا یہ تھا کہ دو خاندانوں کو الگ الگ رکھ کر اس لین دین کے چکّر کو مضبوط بناتے رہیں لہٰذا اپنے مفاد کی خاطر وہ دو دوستوں، دو خاندانوں کو اور دو قبیلوں کو لڑوانا ضروری سمجھتے تھے اسی لیے بُت پرستوں کے سب قبیلے مصروفِ پیکار رہتے اور اپنی جنگی ضروریات پوری کرنے کے لیے ان یہودیوں سے قرض لیتے۔ یہ صورتِ حال انھیں بُری طرح کمزور اور یہودیوں کو مضبوط کر رہی تھی۔ تھوڑے عرصے قبل ہی اوس اور خزرج کے درمیان جو طویل جنگ ہوئی، جنگِ بعاث! اس میں یہودیوں نے

دونوں طرف کا ساتھ دے کر انھیں پوری طرح فنا کر دیا تھا۔ اس کا اندازہ بڑے لوگوں کو نہیں، لیکن عوام کو خوب ہو چکا تھا لہٰذا ان میں عام طور پر ان یہودیوں کے لیے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ یہی وہ نفرت تھی جو ایمان لانے میں سبقت کا سبب بن گئی اور ایمان لے آنا ان کے تحفظ کا باعث بن گیا۔ جب یہودیوں کو اس صورتِ حال کا اندازہ ہوا تو پانی ان کے سر سے گزر چکا تھا۔ مدینے کے گھر گھر میں اسلام آ چکا تھا۔ جب تک وہ اس کے سدِّ باب کے لیے کچھ سوچتے، معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفسِ نفیس تشریف لے آئے جو خدا کے نائب اور اہلِ مدینہ کے لیے ہادی، امام اور ایک فرماں رَوا کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس وقت اہلِ مدینہ کی حالت یہ تھی کہ کوئی سیاسی قانون، کوئی ضابطہ و قاعدہ نہ تھا۔ ان لوگوں کی کوئی منظم حکومت تھی نہ کوئی عقیدہ تھا جس کی بنیاد پر انھیں متحد کیا جا سکتا۔ ایسے میں اوس و خزرج، قریش کی اعانت حاصل کرنے کے لیے انھیں حلیف بنانا چاہتے تھے اور قریش ہمیشہ کی طرح ان کی درخواست ٹھکرا رہے تھے۔ دوسری طرف مدینۂ منوّرہ کی آبادی کا اکثر حصّہ یہودی سردار عبداللہ بن ابی بن سلول کی بادشاہی تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

ان حالات میں مدینۂ منوّرہ میں اسلام پہنچا اور ایک اسلامی ریاست وجود میں آ گئی جو بلاشبہ اوس اور خزرج ایسے معاشی اور علمی طور پر تباہ شدہ قبائل کے لیے نوزندگی کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن سیاسی بالادستی قائم رکھنے والے یہودیوں اور مدینۂ منوّرہ کی بادشاہی کے خواب دیکھنے والے عبداللہ بن ابی بن سلول کے لیے موت سے کم نہ تھی۔ یہ تمام حالات معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھے۔ انھیں اندازہ ہوا کہ مدینۂ منوّرہ میں بسنے والے یہودی نبیؑ موعود کے منتظر تو تھے لیکن اس بات کے متمنّی بھی تھے کہ وہ انھی میں پیدا ہوں گے اور ان کی کھوئی ہوئی بزرگی بحال کر کے دوسروں کو جھٹلائیں گے اور اسلام حق کو جھٹلانے کے لیے نہیں بلکہ حق کی تصدیق کے لیے آیا تھا۔ جنابِ مسیحؑ اور جنابِ موسیٰؑ پر ایمان لانا اسلام کا لازمی جزو تھا۔ چونکہ ان دونوں مذاہب کے پیروکار دوسرے کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے لہٰذا ان دونوں کو اسلام نے مایوس کر دیا تھا۔ مستزاد یہ کہ عبداللہ بن ابی

ابنِ سلول کی شخصیت دب کر رہ گئی جس کا لازمی نتیجہ مخالفت تھا، مگر اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت اور معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے تدبّر کے باعث اسے کھلم کھلا مخالفت کرنے کی جرأت نہ تھی لہٰذا اندرخانہ مخالفانہ تشہیر شروع ہو گئی۔ انھی چیزوں کو محسوس کرتے ہوئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مسلمانوں کو رشتۂ اخوت میں پرو دینے کے بعد یہودِ مدینہ اور دیگر غیر مسلم عناصر کی جانب خیر سگالی کا ہاتھ بڑھایا۔ اس میں ان سب کی بھلائی بھی تھی اور مسلمانوں کی بھی کیوں کہ مدینۂ منورہ کے حالات بھی اس بات کے متقاضی تھے اور پھر نوزائیدہ اسلامی معاشرے کی سالمیت اور بقا کے لیے بھی یہ منشور ضروری تھا چنانچہ ہجرت کے چند ماہ کے بعد ہی ان تمام خطرات کے سدِّ باب کی خاطر جو اشاعتِ دین اور مسلمانوں کی ترقی میں رکاوٹ بن جانے والے تھے اور ان منتشر اقوام پر قابو پا لینے کے لیے جو علیحدہ علیحدہ مخالفت کے بیج بو رہی تھیں، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ تاریخ میں اس طرح درج ہے۔

۱۔ یہ تحریر ہے محمدؐ النبی کی جانب سے مسلمانوں کے درمیان جو مہاجر یا انصار میں سے ہیں، نیز ان لوگوں کے درمیان جو مسلمانوں کے ساتھ ملے ہوئے اور کاروبار میں ان کے شامل ہیں۔

۲۔ (مسلمان اور غیر مسلم) یہ سب لوگ ایک ہی قوم تصور کیے جائیں گے۔

۳۔ بنی عوف کے یہودی، مسلمانوں کے ساتھ ایک قوم (معاملاتِ کاروبار میں) ہیں۔

۴۔ جو کوئی بھی معاہدہ کرنے والی ان اقوام میں سے کسی کے ساتھ بھی جنگ کرے گا تو اس کے ساتھ سب (معاہدہ کرنے والی اقوام) مل کر جوابی کارروائی کریں گے۔ (انتقام یا بدلہ لیں گے)

۵۔ معاہدہ کرنے والی اقوام کے تعلقات خیر سگالی اور خیر اندیشی کے ہوں گے۔ جنگ کے دنوں میں یہودی، مسلمانوں کے ساتھ مصارف میں شامل رہیں گے۔

۶۔ یہودیوں کی حلیف قوموں کے حقوق یہودیوں کے برابر ہی تصور کیے

جائیں گے۔

۷۔ کوئی شخص بھی اپنے معاہدے کے ساتھ مخالفانہ کارروائی نہیں کرے گا۔

۸۔ ان میں سے جس گروہ پر بھی ظلم ہوگا، باقی تمام شرکا اس کی مدد کریں گے۔

۹۔ مدینۂ منورہ کے اندر کشت و خون کرنا تمام معاہدہ کرنے والی اقوام پر حرام ہوگا۔

۱۰۔ زنہاری بھی معاہد کی طرح تصور کیے جائیں گے۔

۱۱۔ اگر معاہدہ کرنے والی اقوام کے درمیان جھگڑا ہو تو فیصلہ خدا اور رسولؐ کے حکم کے مطابق ہی کیا جائے گا۔

یہ منشور تیار ہوا جس پر بڑے بڑے آدمیوں نے دستخط کیے، گویا اسے منظور کر لیا۔ اس کے واضح معنی تھے کہ معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم کے فیصلے کو قطعی تسلیم کر لینا غیر مسلم اقوام کا خود پر مسلمانوں کی برتری تسلیم کرنے کے مترادف تھا۔ مدینۂ منورہ کی تمام اقوام کے دستخط لینے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے گرد و نواح کے قبائل کو بھی اس معاہدے میں شامل کیا۔ صلح و امن کا یہ اقدام بڑا سود مند تھا جس کے بہ یک وقت تین فائدے تھے۔ اوّل یہ کہ قبائل کے درمیان مسلسل خانہ جنگی میں کمی آئی۔ دوسرا فائدہ یہ کہ امید تھی، دیگر تمام اقوام جو معاہدے میں شریک تھیں، اب مسلمانوں کے خلاف متحد ہونے یا قریش کے بھڑکانے میں آ کر انھیں نقصان پہنچانے سے ہچکچائیں گی۔ تیسرا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان سب کو معاہدے کے بعد مدینے میں ایک بہت بڑی قوت کے موجود ہونے کا احساس پیدا ہو گیا اور معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم کے تدبّر کا یہ بہت بڑا کمال تھا کہ بڑی آسانی کے ساتھ انھیں تمام غیر مسلم اقوام پر مذہبی و ثقافتی تفوق حاصل ہو گیا۔ اب مدینہ اور اطراف مدینہ کے مختلف النسل اور مختلف مذاہب کے لوگ اس معاہدے میں شریک ہونے کے سبب ایک دوسرے کے مددگار و معاون سمجھے جانے لگے۔ ان کے نفع و نقصان، صلح و جنگ ایک ہو گئے۔ ہاں مذہبی معاملات میں وہ سب آزاد تھے۔ معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کے اندرونی اور دینی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہ کر کے ثابت کر دیا کہ دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے۔

یہی وہ چیز تھی جس نے غیر مسلم اقوام کو چونکا دیا، ان کے دلوں سے ان خدشات اور بدگمانیوں کو دُور کر دیا جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف پیدا ہو گئی تھیں۔ یہی اعتماد تھا جس کی بدولت انھوں نے خدا اور رسولؐ کے فیصلوں کو تسلیم کرتے ہوئے معاہدے پر دستخط کیے۔

اس طرح ہجرت کے فوری بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ریاستِ اسلامی کی تاسیس فرمائی اور سنہ ۱ھ میں استحکامِ امن کے لیے باقاعدہ تحریری دستور مرتب فرمایا۔ اس معاہدے اور دستور نے یہ ثابت کر دیا کہ دنیا میں مساوات کا بانی صرف ایک مذہب ہے اور وہ مذہب ہے اسلام جس نے ہر فرد کو شرعاً، قانوناً تمام وہ حقوق عطا کیے جو اس سلطنت میں رہنے والے دوسروں کو حاصل ہوں اور اس کا اوّلین ثبوت خود معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا اور مختلف العقیدہ اقوام کی باہمی رضامندی سے اس ریاست کی بنیاد رکھی۔

## ۱ھ کے چند اہم واقعات

ہجرت کا پہلا سال تمام ہوا۔ اس سال ظہور میں آنے والے دیگر واقعات مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کی ولادت ہوئی۔ زبیرؓ بن العوام، معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپی زاد بھائی اور اسماءؓ بنتِ ابوبکر صدیقؓ کی پہلی اولاد تھے۔ مدّت دراز سے مسلمانوں میں کوئی ولادت نہ ہوئی تھی لہٰذا کفّار نے مشہور کر دیا تھا کہ انھوں نے مسلمانوں پر جادو کر دیا ہے اور ان میں کوئی ولادت نہ ہو گی۔ اب جو یہ ولادت ہوئی تو مسلمانوں نے باقاعدہ خوشی منائی۔ عبداللہ بن زبیرؓ، اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بھانجے تھے جن کی کنیت "اُمّ عبداللہ" تھی۔

۲۔ اسی برس انصار کے دو معزز سرداروں نے وفات پائی۔ یہ حضرت کلثومؓ بن الہدم اور حضرت اسعدؓ بن زرارہ انصاری تھے۔ کلثوم بن الہدم وہ جلیل القدر ہستی تھے جنھیں قُبا میں معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا تھا اور حضرت اسعدؓ بن زرارہ انصاری مدینۂ منوّرہ کی وہ ہستی تھے جنھیں باشعور مَردوں میں سب سے پہلے بیعت کرنے کی سعادت نصیب

ہوئی۔ یہ قبولِ اسلام کے بعد مدینۂ منورہ واپس آئے تو اپنے قبیلے (بنو نجار) کے نقیب مقرر ہوئے۔ انھوں نے ہی یہاں نمازِ جمعہ کا اہتمام کیا اور اپنے قبیلے کو دعوتِ اسلام دی۔ اب ان کے بعد بنو نجار حاضرِ خدمت ہوئے اور عرض کیا۔ "یا رسولؐ اللہ! اب کسی اور کو ہمارا نقیب مقرر کر دیجیے۔"

اس درخواست پر معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال ہوا کہ کسی ایک کو نقیب مقرر کرنے سے دیگر کو اس منصب پر رشک آئے گا۔ یہ سوچ کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بنو نجار کے معززین سے فرمایا "میں تمھارا نقیب ہوں۔"

۲۔ ہجرت کے پہلے سال ہی ولید بن مغیرہ (والدِ خالدؓ بن ولید) اور عاص بن وائل (والدِ عمروؓ بن عاص) نے وفات پائی۔ یہ دونوں اسلام کے بدترین مخالف اور کفارِ قریش کے رئیس تصور کیے جاتے تھے جنھوں نے دولت سے، وقت سے، جان سے اور فرزندوں کی قوت کو استعمال کر کے اسلام کی مسلسل مخالفت کی تھی۔

## مقیم نمازمیں اضافہ۔ ربیع الثانی ۱ھ

ارکانِ دین میں سب سے پہلے نماز ہی فرض ہوئی تھی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ابھی مکے میں ہی مقیم تھے، لیکن بہ استثنائے مغرب کہ اس کی تین رکعتیں پڑھی جاتی تھیں، باقی تمام نمازیں دو، دو رکعات تھیں۔ ہجرتِ مدینہ کے فوری بعد جب مسلمان بندگی کے لیے ہر خطرے اور دشواری سے آزاد تھے تو ظہر، عصر اور عشاء کی نمازیں دو، دو رکعات کا اضافہ کیا گیا اور چار چار رکعات پڑھنے کا حکم دیا گیا البتہ سفر کے دوران میں یہ پابندی نہ تھی بلکہ وہی دو رکعات قائم رہیں جو ابتدا سے پڑھی جاتی تھیں۔

## اذان

نمازوں کے اوقات اور رکعات مقرر ہوئیں تو ابتدا میں مسلمانوں کو طلب کرنے کے لیے کسی کو مقرر کرنا دشوار تھا کہ گھر گھر جائے اور آواز لگائے لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی ایسی علامت بنائی جائے کہ گھر گھر جا کر صدا بلند کرنے کی بجائے مسلمان خود ہی جمع ہو جائیں۔ اس کے لیے مختلف تجویزیں پیش کی گئیں۔

صحابۂ کرام جمع ہو کر اس موضوع پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ اس وقت لوگوں کو جمع کرنے کی کئی صورتیں تھیں۔

آگ: کچھ یہودی آگ روشن کر کے اپنی عبادت کی خبر دیتے اسے دیکھ کر دُور دُور کے لوگ چلے آتے تھے۔

۱. بوق: اس کا ایک نام نرسنگا بھی تھا۔ یہ ایک تیز آواز آلہ ہوتا تھا جس سے یہودی اپنی عبادت کا اعلان کیا کرتے تھے، لیکن معلمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یہ تجویز پسند نہ آئی۔

۲. ناقوس: مسیحی اس سے اپنی عبادت کا اعلان کیا کرتے تھے۔ اس کا ذکر کیا گیا تو یہ بھی طبیعت کو بھانے والی چیز نہ تھی۔

۳. گھنٹی: اس میں ہنگامے کے سوا کوئی پیغام نہ تھا اور اللہ کے نبیؐ طلبیٔ عبادت کے لیے بھی کوئی پیغام چاہتے تھے ایسا پیغام جو دُور دُور اس بات کو پہنچا دے جو ان کے قلبِ مبارک میں تھا اور جسے وہ بار بار کہنا چاہتے تھے کہ اللہ واحد اور عظیم ہے۔

اذان کے لیے دو روایات موجود ہیں۔ اوّل یہ کہ صحابۂ کرام حضرت عمرؓ فاروق اور عبداللہؓ بن زید بن ثعلبہ نے یہ یک شب ایک خواب دیکھا کہ کوئی فرد ناقوس فروخت کر رہا ہے تو یہ صاحب خریدنا چاہتے ہیں۔ تب وہ کہتا ہے کہ طلبیٔ نماز کے لیے میں اس سے اچھی تدبیر بتائے دیتا ہوں۔ ازاں بعد انھیں خواب کے عالم میں ہی اذان کے کلمات بتائے گئے جنھیں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے پسند فرمایا۔ اس موقع کے لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عالمِ رویا میں اذان کے کلمات آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے خود بھی سنے۔

دوسری روایت ہے کہ اذان کے کلمات بہ حکمِ الٰہی یا بہ اجتہادِ نبیٔ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے شروع کیے تھے، محض خواب دیکھنے کے بعد نہیں۔ بہر کیف نماز کے لیے طریقۂ اذان نے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو مطمئن کر دیا۔ یہ کلمات منشائے مبارک کے عین مطابق بار بار خدا کی وحدانیت کا اعلان کرتے تھے اور دن میں پانچ مرتبہ یہ اعلان گویا تبلیغِ دین بھی تھا، عبادت بھی اور طلبیٔ نماز بھی۔

اللہ کے نبیؐ نے اس کا حکم دیا۔ حضرت بلالؓ بن رباح کی آواز چونکہ سب سے بلند اور قلب میں اتر جانے والی تھی للذا یہ خدمت انھی کے سپرد کی گئی جسے سُن کر منکرین نے مذاق اُڑایا۔ جب یہ آواز بلند ہوتی، لوگ ٹھٹول کرتے۔ اسی صورتِ حال پر تنبیہہ کے لیے ارشادِ ربانی ہوا۔" اور جب تم پکارتے ہو نماز کے لیے تو وہ ٹھہراتے ہیں اس کو ہنسی اور کھیل کیوں کہ وہ بے عقل ہیں "۔

## عبداللہؓ بن سلام

یہ یہود کے جلیل القدر عالم تھے جن کی صحبت میں یہود کے بڑے بڑے سردار آتے اور ان کی عزّت کیا کرتے۔ جب معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم مدینہ منورہ تشریف لائے تو حق نے ان کے قلب کو بھی تسخیر کر لیا اور وہ خدمتِ اقدس میں آکر مسلمان ہو گئے، لیکن کسی مصلحت کے تحت یہود سے اپنے اسلام کو راز رکھا۔ ایک دن وہ خدمتِ اقدس میں حاضر تھے کہ یہودیوں کے آنے کی اطّلاع ملی جسے سنتے ہی وہ چھُپ گئے اور عرض کیا۔" یارسولؐ اللہ! ان یہود معزّزین سے ذرا میرے بارے میں دریافت کیجیے"۔

معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کی خوشی پوری کی اور یہود کو جمع کر کے پوچھا۔ "تم لوگوں میں عبداللہؓ بن سلام نام کا ایک شخص ہے، وہ کیسا آدمی ہے؟"

یہ سوال سنتے ہی یہودیوں نے قصیدہ خوانی شروع کر دی اور بولے "جناب! آپ اس کے لیے دریافت کر رہے ہیں! وہ سیّدزادہ ہے، سیّد ہے، علم و دانش، ایمان داری میں ہم سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ ہمارے بہت سے فیصلے وہی تو کرتا ہے"۔

یہ سنتے ہی حضرت عبداللہؓ بن سلام گوشے سے باہر آئے اور بہ آوازِ بلند کہا "اے یہود! اگر تم لوگ مجھے ایسا ہی کہتے ہو تو خدارا میری پیروی کرو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا ایک ہے اور محمّدؐ اس کے بندے اور رسولؐ ہیں۔ اب تم بھی گواہی دو۔ تمھیں اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ توریتِ مقدّس میں اللہ کے رسولؐ کا نام مع اوصاف درج ہے۔ دیکھو میں نے انھیں پہچان لیا۔ اب تم بھی پہچان لو اور ان کی صداقت کی گواہی دو"۔

یہ سنتے ہی یہود معزّزین غصّے میں بھر گئے اور چلّانے لگے "اے عبداللہؓ بن سلام!

تو کاذب ہے، چالاک ہے۔ تو نے ہم سب کو دھوکا دیا۔"

وہ دیر تک چلّاتے رہے۔ جب سب چلے گئے تو حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا "یارسول اللہ! یہ لوگ مخالفت اور دوستی کے لیے انسان کو نہیں، مذہب کو دیکھتے ہیں۔ جو دینِ حق قبول کرے گا اس کے دشمن بن جائیں گے۔"

حضرت عبداللہ بن سلام کی تحریک پر ان کے اہلِ خاندان مسلمان ہوئے۔

اس طرح ہجرت کا پہلا سال گزرا کہ حق کی کشش اہلِ ایمان کو کھینچتی اور اہلِ کفر کو مشتعل کرتی رہی۔

## نئے مسائل و مرحلے

اِدھر ہجرت کے بعد مدینۃ النبی اسلام کا مرکز بن گیا تھا۔ اسلامی دعوت نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ اِردگرد کے تمام قبائل جو دینِ حق قبول کر رہے تھے اس چھوٹی سی بستی کا رخ کرتے جس کے سبب مدینہ منوّرہ میں مسلمانوں کا ایک جتھا بن گیا تھا۔ اُس کے لیے اب باقاعدہ تمدّن، معاشرت، قانون اور سیاست کے اصولوں کی ضرورت تھی جن کا ذکر سورۃ البقرہ میں کیا گیا اور جنھیں عملی طور پر پیش کرنے کے لیے اہتمام کی ضرورت تھی۔ مدینہ منوّرہ مکّے کی طرح دارالکفر تو نہ تھا جہاں منتشر رہ کر چپکے چپکے تبلیغِ دین کی جاتی۔ یہ تو ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست تھی جس کی بنیاد باقاعدہ عمرانی معاہدے پر رکھی گئی تھی، ایسا معاہدہ جس میں مسلم اور غیر مسلم سبھی شریک تھے۔ اب غیر مسلموں کے سامنے بلکہ دنیا کے سامنے، اس دین کو دینِ العمل ثابت کرنے کے لیے عملی زندگی کی مثال پیش کرنا تھی۔

اُدھر مشرکین انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔ مسلمانوں کا بڑھتا ہوا ہر قدم گویا ان کے سینے پر پڑتا تھا۔ انھیں اس معاہدے کی اطلاع ملی، پھر اِردگرد کے قبائل کے مسلمانوں کا وہاں جمع ہو جانا علم میں آیا تو وہ چکرا سے گئے۔ وہ تیرہ برس مسلسل جس دین کے استحصال کی کاوشیں کرتے رہے، جس مٹھی بھر جماعت پر مظالم ڈھانے کے لیے انھوں نے اپنے تمام ذرائع آزمائے، وہی ترقّی کی راہ پر گام زن ہو چکے تھے۔ وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ تبلیغ کر کے اور لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بنا کر اپنی قوّت بڑھا رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے قریش نے بہ بانگِ دہل

مخالفت کی بجائے اب مسلمانوں کو دوسرے انداز سے زک پہنچانے کی کاوشیں شروع کردیں حسب روایات پھر منصوبے بنے، پھر سے محفلیں آراستہ کی گئیں اور طے پایا کہ مدینے کے مقتدر لوگوں سے رابطہ قائم کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی کمزوریوں کو ٹٹولا جائے جن کے سبب اتحاد پیدا ہو سکے۔ ان تجاویز پر عمل درآمد کے لیے وہ سب حرکت میں آگئے۔ نتیجتاً اس فیصلے پر عمل کرنا آسان ہوگیا۔ جس مقتدر ہستی کو وہ خطاب کرسکتے تھے، وہ یہودی سردار عبداللہ بن ابی ابن سلول کی تھی جو معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینے میں آمد سے قبل اپنی بادشاہت کا اعلان کرنے والا تھا اور اب ان کی بڑھتی ہوئی قوت دیکھ کر خاموش ہوگیا تھا۔ نہ جانے مشرکین مکہ اسے اس ناکامی کا احساس دلاکر میدان میں لانا چاہتے تھے یا وہ ان کی نظر میں واقعی ایسا مقام رکھتا تھا کہ وہ اسی کو مکتوب روانہ کرتے۔ بہر حال یہ مکتوب جس پر بڑے بڑے سرداروں کے دستخط تھے، دراصل اہل مدینہ کے نام تھا جسے انھوں نے اپنے محتاط جاسوس کرز بن جابر الفہری کے ذریعے ابن سلول کو بھیجا۔ اس خط میں درج تھا: "اے اہل یثرب! تم نے ہمارے بھاگے ہوئے آدمی اور اس کی جماعت کو پناہ دی ہے۔ اب تم اس سے لڑکر انھیں وہاں سے نکال دو ورنہ معبود اعظم ہبل کی قسم، ہم تم پر اس طرح حملہ کریں گے کہ نہ تمھارے آدمی باقی رہیں گے، نہ عورتوں کی عزت۔ بتاؤ تمھیں کیا منظور ہے؟"

یہ خط لے جانے والے جاسوس کے ذریعے ہی قریش تک اہل مدینہ کے بارے میں بڑی حوصلہ افزا خبر آئی جس نے انھیں کامیابی کے کئی راستے دکھائے۔

## منافقین

اطلاع یہ تھی کہ مکے کی طرح مدینے میں صرف مسلمان ہی نہیں ہیں مذبذب بھی ہیں جو دین حق کو قبول کرتا، سرتا پا بدل جاتا، حمزہ بن عبدالمطلب اور عمر بن الخطاب ایسے لوگوں میں یک لخت انقلاب آگیا تھا۔ پھر وہ دین کی حفاظت اور اپنے دینی بھائی کی خوشی کے لیے جان پر کھیل جاتے تھے، لیکن اہل مدینہ میں دل کی گہرائیوں سے دین حق کو قبول کرنے والوں کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جو محض زبانی ایمان لاتے ہیں۔ اندر سے نہ وہ مسلمانوں کے دوست ہیں اور

نہ مسلمان ہیں بلکہ دونوں جماعتوں سے ملے ہوئے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر محض اپنا مفاد ہوتا ہے۔ یہ محض ایک خبر نہیں، بلکہ بہت بڑی حقیقت تھی۔ مدینۂ منورہ میں انصار ایسے مسلمان بھی تھے جو اسلام پر اپنا مفاد ہی نہیں، زندگی بھی قربان کر دینے کو تیار تھے، لیکن وہ لوگ بھی تھے جن کے دلوں میں نفاق تھا۔

قرآنِ حکیم نے اسی نفاق کو بیماری سے تشبیہہ دی ہے اور فرمایا ہے۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائے ہیں، لیکن درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ اور اللہ پر ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکے بازی کر رہے ہیں، لیکن دراصل وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور اس کا شعور نہیں رکھتے۔ ان کے دلوں میں ایک مرض ہے جسے اللہ نے (ان کی بداعمالی کے سبب) اور بڑھا دیا ہے۔ وہ جھوٹ بولتے ہیں جس کی پاداش میں ان کے لیے دردناک سزا ہے۔

ان منافقین کی بدولت مشرکین کو کامیابی کے آثار نظر آرہے تھے۔ ان میں کٹر قسم کے فتنہ پرداز بھی تھے، سمجھ بوجھ رکھنے والے منافق بھی۔ ان میں وہ مسلمان بھی تھے جو حق اور باطل کے درمیان کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے۔ وہ اپنے کہنہ معبودوں کو ترک کر کے خدائے واحد پر ایمان لے آئے تھے، لیکن جہالت کی تمام باتوں کو سینوں سے لگائے ہوئے تھے۔ یہ سب ہر حیثیت اور ہر مرتبے کے لوگ تھے۔ جس وقت ابن سلول کو قریش کے معزز سرداروں کی جانب سے وہ مکتوب ملا تو اس نے خفیہ طور پر ایسے لوگوں کو طلب کیا جو متذبذب تھے کہ حق و باطل میں سے کس کا فیصلہ کریں؟ فی الحال تو جو ان کے مفاد کی بات کرتا، اسی کے ہو جاتے تھے یا پھر وہ لوگ جو قطعاً دینِ حق کا انکار کرتے، لیکن مسلمانوں کی جماعت میں کمزوریاں ڈھونڈنے جاتے تھے۔ یہ سب جمع ہوئے تو قریش سرداروں کے خط کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے باہمی مشورے کرنے لگے۔ ان سب نے اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق خیالات کا اظہار کیا۔ اس تمام گفتگو کا لبِ لباب یہی سمجھ میں آیا کہ اس وقت ان کے سکون و اقتدار کے لیے سب سے بڑا خطرہ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے۔ جیسے بھی ہو سکے ان سے خلاصی حاصل کر لینا چاہیے اور اس کی بہترین صورت، قوت کا استعمال

ہے۔ اِدھر یہ مشورے ہو رہے تھے، اُدھر اللہ نے اپنے نبیؐ کو منافقین کے ارادوں سے باخبر کر دیا۔

معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "اے اہلِ مدینہ! اس وقت قریش نے وہ چال چلی ہے جو تم لوگوں کے لیے سب سے زیادہ تباہ کن ہے کیوں کہ ان کے کہنے میں آ کر تم جن مسلمانوں سے جنگ کے ارادے کر رہے ہو، ان مسلمانوں میں تمھارے اپنے بھائی بھی شامل ہیں جن کے مقابلے میں قریش تمھارے لیے غیر اور اجنبی ہیں۔ کیا تم غیروں کے ساتھ مل کر اپنوں کو تباہ کر دو گے؟"

یہ ایسی بات تھی جسے سن کر مخالفین کا مجمع منتشر ہو گیا اور وہ لوگ جو محض اپنے مفاد کی خاطر قریش کا ساتھ دینے کو آمادہ ہو رہے تھے، بیٹھ گئے۔ اِن مقتدر لوگوں کی بڑی تعداد ساتھ چھوڑ گئی تو فتنہ پرداز قسم کے منافق رہ گئے۔ وہ بہر حال مقابل آنے کے قابل نہ تھے۔ دوسرے یہ کہ کھُل کر سامنے آ جانا ان کا مقصد نہ تھا کیوں کہ ان میں وہ معززین بھی تھے جو معاہدے میں شریک ہو کر اللہ اور اللہ کے نبیؐ کے ہر فیصلے کو تسلیم کرنے کا عہد کر چکے تھے لہٰذا مدِّ مقابل آ کر اپنی مخالفت کا اظہار کر دینا ان کی مصلحت کے خلاف تھا۔ اس طرح سے وقتی طور پہ یہ خطرہ دب گیا۔

قریش کو اس صورتِ حال کا علم ہوا تو بہت جھنجلائے۔ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مختصر سی تقریر نے ان کی مہینوں کی محنت پہ پانی پھیر دیا تھا مگر جو تیرہ برس کی اَن تھک مخالفتوں کے بعد نہ تھکے تھے، وہ اب بھی دست بردار ہونے کو تیار نہ تھے لہٰذا اِس بار مدینے کے منافقوں سے ساز باز رکھنے کے ساتھ ساتھ قریشِ مکّہ نے مدینے کے یہودیوں کو بھی اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے انھوں نے قاصد مقرّر کر دیے۔ یہ لوگ پیغام رسانی کے ساتھ ہی مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے لیے شرارتیں بھی کرتے اور خفیہ طور پہ مسلمانوں کو دھمکیاں بھی دیتے تھے۔ یہ سب سکون غارت کرنے کے انداز تھے۔

اسی ضمن میں معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے سرداروں کی جانب سے ایک خط ملا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، مکّے سے بچ کر چلے جانے پر مطمئن نہ

ہو جانا۔ ہم تمھاری اس پناہ گاہ میں آکر بھی تمھیں برباد کرسکتے ہیں"۔

اس خط کا جواب روانہ کرنے کی بابت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ قریش کی جانب سے باقاعدہ فساد کی ابتدا ہو گئی۔

## ریاستِ اسلامی پر کفّار کا پہلا حملہ

جب مسلمانوں پر قریش کی ہر دھمکی ناکام رہی اور منافقین کے حوصلے بھی ساتھ نہ دے سکے تو کرز بن جابر الفہری نے نیا انداز اختیار کیا۔ وہ قاصد کا فرض بھی ادا کرتا تھا اور جاسوس کا بھی اور انھی خصوصیات کی بدولت اہلِ مکہ میں سرداروں کے ساتھ نشست پاتا تھا۔ وہ مکے سے سفر کرتا ہوا مدینۂ منورہ آیا۔

اس وقت باہر والے میدان میں انصار و مہاجرین کے مویشی چر رہے تھے۔ کرز بن جابر نے ان پر ہاتھ مارا اور لوٹ کر لے گیا، گویا اہلِ مدینہ پر اپنی دلیری اور بہادری جتا گیا۔

تین سو میل کا فاصلہ طے کر کے آنا اور مویشی لوٹ کر لے جانا واقعی غور طلب بات تھی۔ معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو تعاقب کا حکم دیا، لیکن کرز بن جابر ہاتھ نہ لگا۔ اس وقت تعاقب کا مقصد بھی محض حوصلے کا جواب حوصلے سے دینے کے مترادف تھا ورنہ جنگ کا حکم نازل نہ ہوا تھا۔ یہ واقعہ تاریخ میں بدرِ اولیٰ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد کفّار کی جانب سے ایسی شرارتیں آئے دن ہونے لگیں۔ یہ زمانہ وہی تھا جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینۂ منورہ میں رہ کر مصروف زندگی گزار رہے تھے۔ مسجد کی اور حجروں کی تعمیر، پھر بیرونی قبائل سے معاہدے کرنا، وقت طلب کام تھے لہٰذا ہجرت کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی اور جانب توجہ دینے کو تیار نہ تھے۔ کرز بن جابر ہاتھ نہ آیا تو دوسروں کو ہمت ہوئی اور پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس سے ایک جانب یہ اندازہ ہوا کہ قریش واقعی دینِ حق کو مٹا ڈالنے کے درپے ہیں، دوسری طرف سرایا کی ابتدا انھی حالات کی روک تھام کے لیے ہوئی۔

## سرایا

وہ جنگ جس میں معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم خود مدینۂ طیبہ میں مقیم رہ کر مجاہدین کا دستہ روانہ کرتے، سریہ کہلاتی تھی۔ ہجرت کے بعد گیارہ ماہ یا ایک سال

کے قریب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)، مدینۂ منورہ سے باہر تشریف نہ لے گئے تھے۔ اس دوران میں آپ نئی سلطنت کے انتظام میں مصروف رہے۔ کفار کی شرارتوں کے سدِّ باب کے لیے آپ صحابۂ کرام رضی کی مختصر سی جماعتوں کو روانہ کر دیتے تھے جن کا مقصد جنگ نہ تھا نہ دشمن کو پامال کرنا بلکہ صرف یہ اظہار کرنا تھا کہ مسلمان اردگرد کے دھوکے بازوں سے بے خبر نہیں ہیں۔ درحقیقت اس زمانے میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) قریش کے حملوں کی طرف سے ہردم چوکس رہتے تھے۔ رات کو نیند کے عالم میں بھی آپ بے خبر نہ ہوتے۔ صحابۂ کرام خود بھی یہ کیفیت دیکھتے تو ٹولیوں کی شکل میں مدینے کے قرب وجوار میں نکل جاتے۔ اسی زمانے میں چھوٹی چھوٹی مہمیں اردگرد بھیجی جو سرایا کہلاتی ہیں۔ ان میں سے کسی کو مقابلے کی نوبت آئی اور کسی کو نہیں۔ ان کی تعداد پینتیس[۳۵] سے چھیاسٹھ[۶۶] تک بتائی جاتی ہے جن میں سریۂ حمزہ، سریۂ سعد بن ابی وقاص، سریۂ عبیدہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان سے قرب وجوار کے قبائل کو مسلمانوں کے ہوش مند ہونے کا اندازہ تو ہوا لیکن قریش اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے۔ جب بھی موقع ملتا، وہ مسلمانوں کو پامال کرنے کی حرکتیں کرتے جن کے سبب معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینۂ منورہ میں کسی کو اپنا قائم مقام مقرر کر کے دشمن کے تعاقب کے لیے خود بھی جانا پڑا۔

## غزوات

وہ مقابلہ جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بہ نفسِ نفیس تشریف لے جاتے، غزوہ کہلاتا تھا۔ دراصل معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدس پر لکھنے کے لیے سب سے پہلے غزوات ہی پر توجہ دی گئی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے دمشق میں ایک خاص جامعہ کا اہتمام کیا تھا جہاں اس وقت کے بہت بڑے استاد عاصم بن قتادہ اس فن کا درس دیا کرتے تھے۔ عوام اور امیر کی اسی توجہ کو دیکھتے ہوئے امام زہری نے اسی موضوع پر مفصل کتاب لکھی ہے جس میں غزوات، کا حال درج ہے۔

بہرکیف اس وقت ان مقابلوں میں سرایا یا غزوات کا مقصد معرکہ آرائی نہیں بلکہ محض امن قائم کرنا تھا تاکہ فتنہ پرداز قوتوں کو دبا کر یا ختم کر کے ایک

پُرسکون ماحول پیدا کیا جائے جہاں احکامِ الٰہی کی بجا آوری ہو سکے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ لیسا اوقات ایسی شرارتوں کے سدِّ باب کے لیے جانا اسلام کے لیے سود مند ثابت ہوتا تھا لہٰذا غزوۂ الابوا میں مقابلے کی نوبت نہ آئی بلکہ بنو حمزہ کے سردار مخشی بن عمرو سے صلح ہو گئی، وہ بنو حمزہ جو قریش کے ہم نسب تھے اور کبھی بھی قریش کے آلۂ کار بن کر اہلِ مدینہ کے لیے دشواری پیدا کر سکتے تھے۔ معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی سفر کو غزوۂ الابوا کہا جاتا ہے۔ اسی طرح غزوۂ بواط اور غزوۂ سفوان میں خون خرابہ نہیں ہوا بلکہ قرب و جوار کے مفسدوں پر رعب طاری کر کے اور عوام پر اپنے اخلاق کا اثر قائم کر کے آپؐ لوٹ آئے۔

قریش یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ہجرت کو دوسرا سال شروع ہو چکا تھا لیکن ان کے دلوں سے اسلام کا خیال اور محفلوں سے معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ختم نہ ہو سکا تھا۔ جہاں دو افراد جمع ہوتے، یہی تذکرے ہوتے۔ مسلمانوں کا رنج ان کے لیے راحت اور تکلیف، خوش خبری تھی۔ وہ بے خبر تھے کہ یہ بھی دینِ حق کی بہت بڑی کامیابی اور کشش ہے کہ منکرین کو کسی نہ کسی طرح اپنی جانب متوجہ رکھتا ہے اور وہ جس حق کا اپنی پوری صلاحیتوں سے انکار کرتے ہیں، جس کی نفی کے لیے اپنی لسانی اور عملی، تمام قوتوں کو صرف کر دیتے ہیں، آخر وہ کچھ تو ہے جو اُن کے فکر و عمل پر غالب ہے۔ وہ یہ غور نہ کرتے بلکہ مفسدانہ حرکتوں سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تحمّل کو آزمانا چاہتے تھے۔ وہ اہلِ مدینہ کو مشتعل کرنا چاہتے تھے، لیکن ان پیکرِ تسلیم و رضا کو اللہ کی جانب سے فیصلے کا انتظار تھا۔ آخر یہ فیصلہ بھی ہو گیا اور اسی برس سردارِ مکّہ ابوجہل نے ایک چال چلی۔

قریش کا وہ تجارتی قافلہ جس میں کم و بیش تمام قبائل کے سردار شریک تھے، ابوسفیان بن حرب کی نگرانی میں شام سے واپس آ رہا تھا۔ ابوجہل نے بڑے جذباتی انداز میں یہ مشہور کر دیا کہ اہلِ مدینہ اس قافلے کو لُوٹ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس افواہ نے ان تمام سرداروں کو بھڑکا دیا جن جن کا مال تجارت میں لگا ہوا تھا۔ اس طرح بہ یک وقت کئی قبیلے مسلمانوں سے ٹکرانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ابوجہل یہی چاہتا تھا۔ تیرہ برس تک وہ سب، معبودوں

کے نام پر لڑتے اور تدبیریں کرتے رہے اور اب یہ جوش ٹھنڈا ہو رہا تھا لہٰذا اب اپنا مال لٹ جانے کی خبر سے پھر پُرجوش ہو گئے۔ جتنی جس میں قوت تھی، اس نے صرف کی۔ اس طرح ایک بڑی فوج تیار ہو گئی جس کی عظیم الشان تیاری نے بڑی شہرت پائی۔ اگرچہ اس دوران میں ان کا تجارتی قافلہ بہ خیر و عافیت پہنچ گیا، لیکن مشرکین، اسلام کو پامال کرنے کی دیرینہ تمنائیں بڑھتے ہی رہے۔

اس وقت معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو صورتِ حال کا علم ہوا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مہاجرین اور انصار کو طلب فرمایا۔ اس موقع پر مہاجرین نے مثبت جواب دیے اور اپنی اپنی خدمات پیش کیں جنھیں سن کر معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ مشورہ طلب کیا۔ اس بار پھر مہاجرین نے ان کے حسبِ منشا اور خدا کے فیصلے کے مطابق اسلام کی سربلندی کے لیے خود کو پیش کیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی گفتگو بہ غور سنی اور تیسری مرتبہ پھر مشورہ طلب فرمایا تو صحابہؓ متعجب ہوئے اور انصارِ مدینہ نے اس خطاب کو اپنی جانب محسوس کر کے اندازہ لگایا کہ اللہ کے نبیؐ کیا چاہتے ہیں!

یہ جان کر حضرت سعدؓ بن معاذ انصاری نے تمام انصار کی جانب سے اٹھ کر تقریر کی: "تمام تعریف اس خدائے بزرگ و برتر کے لیے ہے جس نے دینِ حق کی توفیق عطا فرما کر ہم پر رحم کیا اور درود و سلام اسی ہستی کے لیے ہے جو آج ہم میں موجود اور نجات کا باعث ہے۔ یا رسول اللہ! اس وقت آپ شاید یہ خیال فرما رہے ہیں کہ انصارِ مدینہ شہر سے باہر نکل کر آپ کی اعانت کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتے۔ للہ! ایسا تصور بھی نہ کیجیے۔ میں تمام انصار کی جانب سے یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ آپ کسی سے معاہدہ کریں، کسی سے معاہدہ قطع کریں، ہمارے زر و مال اور جان سب آپ ہی کے لیے ہیں جب اور جس وقت منشائے مبارک ہو لے لیجیے۔ جو مرضیٔ مبارک ہو ہمیں عطا کر دیجیے۔ مال کا وہ حصہ جو حضورؐ ہم سے طلب فرمائیں گے، وہی ہمیں سب سے زیادہ محبوب ہوگا۔ یا رسول اللہ! آپ کا حکم ہمارے لیے فرض کے بعد سب کچھ ہے۔ اگر حضورؐ، غمران کے چشمے تک جائیں گے تو یہ خادم آپ کے ساتھ ہوں گے۔ اگر حضورؐ، سمندر میں اتر جانے کا حکم صادر فرمائیں گے تو انصار بہ صد

تعمیل کریں گے۔"

حضرت سعدؓ بن معاذ خاموش ہوئے تو اس وقت ہر فرد اپنے دل میں عقیدت و احترام اور سعدؓ بن معاذ کے لیے خوشی کے جذبات محسوس کر رہا تھا۔ سب متاثر تھے۔ اللہ کے نبیؐ نے بھی اس بات کو پسند فرمایا تھا۔ اسی وقت حضرت مقدادؓ نے کھڑے ہو کر عرض کیا "یا رسول اللہ! خدا کی قسم آپ کے یہ جاں نثار قوم موسیٰؑ کی طرح نہیں ہیں جو آپ کی طلب پر کہہ دیں کہ اَنتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَا اِنَّا ھٰھُنَا قَاعِدُونَ (جا تو اور تیرا خدا دونوں لڑو ہم یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں) ہم تو حضورؐ کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے حاضر رہیں گے اور جہاں ارشاد فرمائیں گے چلیں گے۔"

اس گفتگو کے معنی تھے کہ مہاجرین کی طرح انصار بھی اشارے پر نثار ہو جانے کے لیے تیار تھے۔ ہاں یہ دوسری بات تھی کہ ان کے ذہن میں جنگ کا کوئی تصوّر نہ تھا۔ ابھی تک تو بس قبائل کے درمیان ہی جنگیں ہوا کرتی تھیں جن کا سبب نسلی تفاخر یا معاش کی کمی ہوا کرتا تھا۔ وہ محض اپنی خاندانی بڑائی قائم رکھنے یا مالِ غنیمت لوٹنے کے لیے مقابلے پر آتے تھے۔ اسی سبب ان میں وحشت و بربریت پائی جاتی تھی، لیکن اب موقع ہی اور تھا۔ اب انھیں وہی ضرورت آن پڑی تھی جو موسیٰؑ کو پیش آئی تھی تو انھوں نے اپنے حواریوں سے فرمایا تھا "عزیزو! اپنے لباس اور نقدی کے بدلے ہتھیار خرید لو" بالکل یہی حالت اسلام کو پیش آ گئی تھی۔ فرق صرف حواری اور صحابۂ کرامؓ کا تھا جن کی جانب سے اللہ کے نبیؐ مطمئن ہو گئے تھے۔

اس وقت آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) خوب جانتے تھے کہ اگر اب بھی سابقہ تیرہ برس کی طرح درگزر اور تحمل سے کام لیا تو کفر غالب آ جائے گا کیوں کہ لاتعداد چھوٹی چھوٹی مفسدانہ شرارتیں کرنے کے بعد قریش نے وہ حرکت کی تھی جو کسی طور بھی قابلِ معافی نہ تھی، لیکن اس پر بھی صحابۂ کرامؓ، معلمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) خدا کے فیصلے کے منتظر تھے کہ دیکھیے کیا حکم ملتا ہے! اس وقت صرف آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ہی نہیں بلکہ صحابۂ کرامؓ بھی محوِ فکر تھے کہ ہر چند

اسلام امن و صلح کا پیغام دیتا ہے، لیکن جب کفر حق کو اور حق پرستوں کو مٹانے پر تل جائے تو اسلام کا پیغام کیا ہے؟

ان سب کے ذہنوں میں یہی سوال مچل رہا تھا اور بشریت کا تقاضا بھی یہی تھا۔ انصار تو اس وقت فیصلے ہی کا انتظار کر رہے تھے، لیکن مہاجرین کے جذبات ان سے قدرے مختلف تھے۔ وہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے حکم کے انتظار کے ساتھ ساتھ اس بات کے بھی تمنائی تھے کہ یہ حکم ان کے ان تیرہ سالہ دُکھوں کا مداوا ہو جو انھوں نے اہلِ مکّہ کے ہاتھوں برداشت کیے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو نئے نئے اپنے وطن سے نکل کر آئے تھے، عزیز و اقربا، گھر بار اور (بہت سوں کے) اہل و عیال اور تمام عیش و آرام، سب کچھ چھوڑ آئے تھے۔ محض اس آرزو میں کہ نئے وطن میں آرام سے رہتے ہوئے خدا اور رسولؐ کے احکام کی پیروی کریں گے، لیکن کفّار کی سازشوں کے سبب یہاں بھی زندگی دشوار تھی۔ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم رات کو سکون کی نیند نہ سوتے تھے۔ ہر دم کسی تکلیف وہ شرارت کا اندیشہ رہتا تھا۔ کبھی اہلِ مدینہ سے ساز باز ہو رہی ہے، کبھی یہود کے پاس قاصد آ اور جا رہے ہیں، کبھی قرب و جوار کے سرداروں کو اپنا ہم نوا بنا کر مسلمانوں کو مبتلائے آزار کرنے کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔ کامل چودہ برس کے یہ حالات ایسے تھے جو انھیں مشتعل کر سکتے تھے اور اشتعال کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ وہ اللہ کے نبیؐ سے ایسے فیصلے کی امّید کرتے جو ان کی بندگی میں رکاوٹ ڈالنے والوں کے لیے بھرپور سزا ہوتا اور یہ فیصلہ اللہ کے نبیؐ نے نہیں خود اللہ تعالیٰ نے کر دیا۔

## جنگ کی اجازت

ارشادِ ربّانی ہوا۔

اجازت دی جاتی ہے ان لوگوں کو جن کے خلاف (کفّار کی جانب سے) جنگ کی جا رہی ہے کیوں کہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ لوگ وہ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے صرف اس قصور میں کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب ایک ہے۔

یہ اجازت مسلمانوں کو یوں لگی جیسے کسی نے مژدۂ کامیابی سنا دیا ہو۔ اس

وقت عقیدت سے کچھ کی آنکھیں بھیگ گئیں اور کچھ صحابہ کرام ایک دوسرے کو خداوند عالم کی اس حمایت پر مبارک باد دینے لگے۔ حضرت صہیب رض رومی اور ابو سلمہ جیسی ہستیوں کو محسوس ہوا جیسے ہجرت کی راہ میں جو دکھ برداشت کیے ہیں، ان کی داد نصیب ہو گئی۔ اب وہ سب خدا کی راہ میں جان دینے کو تیار تھے۔ جو محفل میں موجود تھے، وہ دوسروں کو مطلع کرنے جا رہے تھے۔ ایسے میں دربارِ رسالت سے فوج کو تیاری کا حکم ملا۔

## عساکرِ اسلامی

انصار اور مہاجرین میں سے جن ہستیوں کو جنگ کے لیے منتخب کیا گیا یا جو میدانِ جنگ میں جا کر کفار سے لڑنے کے قابل تھے، ان کی تعداد تین سو تیرہ تھی اور وہ بھی صحیح معنوں میں ہتھیاروں سے لیس نہ تھے۔ ان کی پوری فوج میں صرف دو گھوڑے ساٹھ اونٹ اور ساٹھ زرہیں تھیں۔ یہی حال تلواروں اور ڈھالوں کا تھا۔ کسی کے پاس تلوار تھی تو ڈھال نہیں اور کسی کے پاس ڈھال تھی تو تلوار نہیں، لیکن ان کے دل غنی تھے۔ وہ کثرت سے خدا کا ذکر کرنے والے تھے۔ اوّل تو اللہ کا وعدہ تھا کہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْر دوسرے اس خبر نے انھیں چونکا دیا تھا کہ طالوت کے لشکر کی تعداد بھی اتنی ہی تھی، جب وہ جالوت کے مقابلے پر نکلے تھے۔ گویا انھیں بھی طالوت کی طرح فتح نصیب ہونا تھی۔ یہ سوچ کر مسلمان اپنی تعداد پر مطمئن ہو گئے اور جنگ کی تیاری کرنے لگے۔ اس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اصولِ جنگ کے مطابق اس فوج کو ترتیب دیا اور علم اس طرح تقسیم فرمائے کہ مہاجرین کا علم حضرت مصعب رض بن عمیر کو، بنو خزرج کا حباب رض بن منذر کو اور بنو اوس کا علم سعد رض بن معاذ کو عطا فرمایا۔ پھر آپ نے مدینۂ منورہ کے انتظام کا ذمے دار ابو لبابہ بن عبد المنذر رض کو بنایا اور روانگی کا حکم صادر کیا۔ اس زمانے میں چونکہ دخترِ رسول ؐ حضرت رقیہ رض علیل تھیں لہٰذا حضرت عثمان رض غنی اس فوج کے ساتھ شامل نہ ہو سکے تھے، چنانچہ انھیں مدینۂ منورہ ہی میں چھوڑ کر اسلامی لشکر روانہ ہوا اور سفر کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ یہ فوج حق و راستی کا علم بلند کیے اور دل ہی دل میں خدا سے سلامتی کی دعا

کرتی ہوئی بدر کی طرف جا رہی تھی۔

## شیطانی لشکر

ادھر مشرکینِ مکہ اس طرح روانہ ہوئے تھے کہ انھوں نے روانگی سے قبل کعبۃ اللہ میں جا کر اپنے معبودِ باطل سے دعا کی۔ پھر ابوجہل نے اس مقدس گھر میں کھڑے ہو کر دعا مانگی "اے معبود! ہم دونوں گروہوں میں سے جو بہتر ہو اسے فتح عطا کر جو ظلم اور جھوٹ پر ہے اسے رسوا اور ذلیل کر دے"

اس کے بعد یہ لشکر پورے ساز و سامان اور عیش و آرام کے اہتمام کے ساتھ روانہ ہوا جس کی تصویر قرآنِ مجید نے اس طرح کھینچی ہے۔

تم ان لوگوں کے سے ڈھنگ اختیار نہ کرو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے۔ ان کی روش یہ ہے کہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ پس جو کچھ وہ کر رہے ہیں، وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔

کفار کا لشکر مکے سے اپنی تعداد اور سازو سامان پر اتراتا ہوا نکلا۔ ایک ہزار جوانانِ قریش کی یہ فوج برسوں سے اس مٹھی بھر جماعت کو ختم کر دینے پر تلی ہوئی تھی جس نے کبھی اپنے تحمل سے، کبھی تدبر سے ان کے ارادوں کو ناکام بنایا تھا۔ اس وقت ان سب کے دلوں میں آگ لگی ہوئی تھی جس کا اظہار ان کے ہر انداز سے ہو رہا تھا۔ سواری کے لیے سات سو اونٹ اور تین سو گھوڑے تھے ہر سپاہی تمام جنگی اسلحہ سے پوری طرح لیس تھا۔

ابوجہل کی کمان میں یہ لشکر روانہ ہوا جس میں ابولہب کے علاوہ خانوادۂ قریش کے تمام رئیس شامل تھے۔ ابولہب نے اپنی جگہ اپنے قائم مقام کو بھیج دیا تھا۔ اس وقت اس فوج کی بے فکری کا یہ عالم تھا کہ جنگ کے لیے جا رہے تھے مگر اس شان سے کہ گانے بجانے والے بھی ساتھ تھے اور شراب نوشی کے سامان بھی تھے۔ یہ فوج منزل بہ منزل قیام کرتی اردگرد کے عام قبائل پر اپنی دلیری کا رعب جماتی، دولت مندی کے نظارے کراتی ہوئی سفر کر رہی تھی۔ ان میں ہر سردار اپنی جگہ خود کو اہم گردانتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ میری بدولت اس افواج کو کوئی

شکست نہیں دے سکتا۔ ان کے تکبرانہ عمل اور سوچ کا نقشہ قرآنِ مجید میں اس طرح کھینچا گیا ہے۔

ذرا خیال کرو، اس وقت کا جب شیطان نے ان لوگوں کے کرتوت ان کی نظروں میں خوش نما بنا رکھے تھے اور ان سے کہا تھا کہ آج تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا، میں تمہارے ساتھ ہوں۔

اس لشکر کو اثنائے راہ میں معلوم ہو گیا کہ ان کا تجارتی قافلہ بہ حفاظت مکّہ پہنچ گیا ہے۔ ایسے میں ابوسفیان بن حرب اور بنو زہرہ و بنو عدی کے معزّزین نے مشورہ دیا کہ واپس چلیں، لیکن ابوجہل فتح کے نشے میں سرشار نہ مانتا اور یہ فوج آگے بڑھتی گئی۔ چند ایک کے سوا اس فوج کا ہر سپاہی خود کو ناقابلِ تسخیر تصور کر رہا تھا۔ یہ لشکر بار بار اپنے ہتھیاروں اور تعداد پر اطمینان کرتا اور ڈینگیں مارتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ مبالغہ آمیز شاعر اور شراب کے پیالے ان کے تفاخر و تکبّر کو بڑھا رہے تھے۔ منزل منزل رک کر آرام کرنا، سامانِ تعیّش سے دل بہلانا جیسے اس سفر میں ان کا حق بن گیا تھا جس کے سبب قریش کے یہ معزّزین شیطان کا گروہ بن گئے تھے۔ اس طرح انھوں نے یہ طویل سفر طے کیا اور بدر کے میدان میں پہنچ گئے۔

## یوم الفرقان رمضان المبارک ۲ھ (۱۳ مارچ ۶۲۴ء)

بدر کا علاقہ مدینۂ منوّرہ سے اٹھانوے میل کے فاصلے پر تھا۔ دوسری روایت کے مطابق اسّی میل کا فاصلہ تھا اور یہی ان دونوں فوجوں کی منزل تھی۔ کفّار کے لشکر نے اپنے خیال میں ہموار جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈال دیا اور اپنے خیمے اس طرح نصب کیے جیسے عرصۂ دراز گزارنے کے لیے آئے ہوں۔ جس جگہ پر عساکرِ اسلامی نے خیمے لگائے، وہ بھربھری اور ریتلی زمین تھی۔ اونٹ چلتے تھے تو ان کے پیر اور آدمیوں کے قدم ریت میں دھنس جاتے تھے اور قرب و جوار میں کوئی کنواں بھی نہ تھا۔ یہ دیکھ کر حبابؓ بن منذر نے خدمتِ اقدس میں پہنچ کر عرض کیا "یارسول اللہ! کیا اس مقام کا انتخاب وحی کی رُو سے کیا گیا ہے؟"

ارشاد ہوا "نہیں بہ ذریعۂ وحی نہیں۔"

یہ سن کر حضرت حبابؓ بن منذر نے کہا "یارسول اللہ! کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم آگے

بڑھ کر چشمۂ آب پر قبضہ کرلیں اور اِرد گرد کے تمام کنویں بیکار کردیں۔"

اس رائے کو معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے پسند فرمایا اور مجاہدین پانی کے چشمے کے قریب ایسی جگہ آ گئے جو کسی قدر بلندی پر واقع تھا۔ زمین پتھریلی تھی۔ یہاں آکر صحابۂ کرام نے سب سے پہلے ایک سائبان تیار کیا تاکہ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم وہاں بیٹھ کر جنگ کا مشاہدہ کرتے ہوئے انھیں ہدایات دیتے رہیں۔ (اس پر اب مسجدِ عریش واقع ہے) دوسرا کام یہ کیا کہ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے حوض بنا لیے اور پانی جمع کر لیا یہ انتظام اللہ والوں نے کیا، لیکن اسی شب اللہ نے بھی انتظام فرما دیا اور اس قدر بارش ہوئی کہ ان تمام حوضوں میں پانی جمع ہو گیا اور باقی زمین دُھل کر صاف ہو گئی۔ اس بارش کا تذکرہ قرآنِ مجید کی ایک سورۃ میں بھی کیا گیا ہے۔ "اور یاد کرو، جب خدا نے آسمان سے پانی برسا کر تمھیں پاک کر دیا۔"

عرب کا عام رواج تھا کہ بہ وقتِ جنگ دشمنوں پر پانی بند کر دیتے تھے، لیکن معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے جمع کیے ہوئے پانی پر کوئی پابندی نہ لگائی اور کفّار کو پانی پینے کی اجازت دے دی۔

اس رات سب نے آرام کیا، لیکن آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے وہ شب عبادت میں گزاری اور دعا کی "خداوندِ عالم! آج اپنا وعدہ پورا فرما۔ خدایا اگر آج یہ چند نفوس مٹ گئے تو قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہ رہے گا۔"

اس طرح آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) عبادت کرتے رہے اور صبح ہو گئی۔ نمازِ فجر کی ادائیگی جھٹپٹے میں کی گئی۔ پھر شب کے آخری حصّے ہی میں اس مختصر سی فوج کی صف آرائی کی۔ آپؐ نے ایک چھڑی ہاتھ میں لیے ان صفوں کا معاینہ فرمایا، چند ہدایات دیں اور جہاد کی ضرورت پر فصیح و بلیغ خطبہ دیا جس میں اسلام کی راہ میں لڑنے اور شہادت کی موت کی عظمت بیان کی۔ اس وقت مجاہدین کے دل خدا کی عقیدت و محبّت سے بھر گئے۔

عرب کا رواج تھا کہ باقاعدہ جنگ شروع کرنے سے قبل دونوں فوجوں سے ایک ایک بہادر میدان میں آتا اور انفرادی طور پر مقابلہ کرتا تھا۔ اس وقت دونوں فوجیں تحمّل سے کھڑی نظارہ کیا کرتی تھیں۔ اس طرح دو یا تین دلیر مقابلہ کرتے، پھر جنگ

شروع کی جاتی تھی، لیکن اس وقت صورتِ حال مختلف تھی۔ میدان میں آئی ہوئی فوجیں دشمن کو نہیں اپنے ہی خون کے رشتوں کو دیکھ رہی تھیں۔ حمزہؓ بن عبدالمطلب نے عباسؓ بن مطلب کو پہچان لیا تھا۔ صدیقِ اکبر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے فرزند عبدالرحمٰن بن ابوبکر کو دیکھا۔ فاروقِ اعظمؓ کے ماموں موجود تھے۔ ابوعبیدہؓ بن الجراح کے باپ اسلام کو مٹانے کی تمنا میں تلوار لیے کھڑے تھے۔ الغرض جہاں تک نظر جاتی، اپنوں ہی کو دیکھتی۔ اس وقت مسلمان پہل کرنے کی بجائے انتظار کر رہے تھے اور کفار کو ٹکرانے کی جلدی تھی لہٰذا مشرکین کی فوج سے عامر حضرمی میدان میں آیا اور فاروقؓ اعظم کے غلام کے ہاتھوں مارا گیا۔ پھر عتبہ اپنے ایک بھائی اور ایک جوان فرزند کے ساتھ نکلا۔ اِدھر سے حضرت عوفؓ، حضرت معاذؓ اور حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نکلے۔ عتبہ نے ان کی حیثیت اور شان کا اندازہ لگانے کے لیے ان کے نام دریافت کیے اور اپنا ہم پلّہ نہ پاکر مقابلے سے انکار کر دیا۔ تب اسلامی فوج سے معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت پاکر حضرت حمزہؓ، حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح اور حضرت علیؓ میدان میں پہنچے اور تینوں انصار لوٹ آئے۔ اس مقابلے میں تینوں کافر مارے گئے۔ حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح زخمی ہو گئے۔ پھر باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ اس وقت تین سو تیرہ مجاہدین اور ایک ہزار مشرکین کا کوئی مقابلہ نہ تھا لیکن قادرِ مطلق کو اسلام کی تائید منظور تھی۔ عرب کی تاریخ میں یہ پہلی جنگ تھی جس میں دونوں فوجوں کی تعداد، انداز اور جذبات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کفار معبودِ باطل ہبل سے مدد مانگ رہے تھے اور فاخرانہ شعر پڑھتے ہوئے اپنا اور دوسروں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ وہ سب اپنے ہی بل بوتے پر مصروفِ جنگ تھے۔ اُدھر معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ سے مدد مانگ رہے تھے اور مصروفِ جنگ مجاہدین کے لبوں پر آیاتِ قرآنی تھیں جو جذبات میں ہلچل مچا رہی تھیں۔

(اے لوگو!) اپنے پروردگار سے (اپنی خطاؤں کی) معافی مانگو۔ وہ بڑا عفو کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے لگاتار مینہ برسائے گا۔ مال اور بیٹوں سے تمھاری مدد فرمائے گا۔ وہ تمھیں باغ عطا فرمائے گا جہاں تمھارے لیے نہریں

بہتی ہیں۔ وائے لوگو! تمھیں کیا ہوا کہ خدا کا اعتقاد نہیں رکھتے جس نے تمھیں طرح طرح کا پیدا کیا۔

اس وقت مجاہدین خود میں وہ توانائی محسوس کر رہے تھے جس کا ان سے وعدہ تھا لہٰذا ان کے ایمان مستحکم ہو رہے تھے اور وہ مقابلہ کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ کہ عتبہ تو پہلے ہی مارا گیا تھا، اب نصف جنگ کے قریب دو نو عمر مجاہدین کے ہاتھوں ابوجہل بھی مارا گیا اور سردارِ مکہ کے قتل ہونے سے فوج میں سراسیمگی پھیل گئی۔ قدرت نے ان پر خوف طاری کر دیا چنانچہ فوج پراگندہ ہو گئی۔

## نتیجۂ جنگ

اس مقابلے میں مشرکین میں سے ستّر آدمی قتل ہوئے اور اتنے ہی اسیر ہوئے۔ اگر خدانخواستہ انجام اس کے برعکس ہوتا شکست کفّار کی بجائے مسلمانوں کو ہوتی تو مشرک کوئی ظلم باقی نہ رہنے دیتے۔ اس زمانے کا دستور بھی یہی تھا، قانونِ جنگ بھی یہی کہ مفتوحین کسی رحم کے مستحق تصور نہ کیے جاتے تھے۔ فاتحین ان کے ساتھ ہر زیادتی روا رکھنے کو اپنا حق سمجھتے تھے، ان کے جس فرد کو جب اور جہاں پاتے تہِ تیغ کر دیتے تھے، لیکن یہ اسلام تھا جس نے دنیا کو مہربانی و کرم کے معنی سکھا دیے تھے، ہر چند کہ مسلمانوں کا جوشِ انتقام اور ان کے ہاتھوں برسوں اذیتیں برداشت کرنا اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ ان سے اپنے تمام دکھوں کا بدلہ لیتے جس کی معمولی سے معمولی صورت بھی قتل تھی، لیکن اسلام دینِ محبت ہے اور انسان کو محبت ہی کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام پارسائی اور نیکی کا دین ہے اور انسان کو اسی کی تلقین کرتا ہے۔ یہ صرف دینِ حق ہے جس نے غیروں کے لیے بھی انصاف، محبت اور نیکی کا حکم دیا ہے یہ غیر مذہب والوں سے بھی نیکی کرو اور پورا پورا انصاف کرو۔ اللہ تعالیٰ انصاف و نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

مسلمان احکامِ خداوندی کی پوری پوری پابندی کرنے والے تھے۔ یہ ستر اسیر معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائے گئے۔ یہ وہی لوگ تھے جو مکے میں اللہ کے نبیؐ کو اذیتیں دیا کرتے، ان پر آوازے کستے اور سنگ برساتے تھے۔ آج وہ سوچ رہے تھے کہ فیصلے کا دن ہے، لیکن یہ کسی سردار، کسی بادشاہ کے دربار

کا نہیں، اللہ کے آخری نبیؐ کا فیصلہ تھا۔ اس وقت سہیل بن عمرو سامنے لایا گیا تو مسلمانوں نے اسے پہچان لیا۔ یہ مکے کا بہترین مقرر تھا جو اسلام اور معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایسی تقریریں کرتا تھا کہ کفار کے دل میں ہلچل مچ جاتی تھی۔

اسے دیکھ کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا "یا رسولؐ اللہ! اس دشمنِ خدا کے نیچے کے دو دانت اکھڑوا دیجیے، پھر آپ کے خلاف بول نہ سکے گا"۔

معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر میں اسے مثلہ کروں گا تو خدا اس کے بدلے میں میرے اعضا بگاڑ دے گا"۔

اس حکم کے معنی تھے کہ عرب کی مثلہ کرنے والی پرانی رسم کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ انھی قیدیوں میں عباسؓ بن عبدالمطلب بھی تھے، وہ طویل القامت اسیر جن کے جسم پر کسی کا لباس نہ آتا تھا۔ تب عبداللہؓ بن عبداللہ اپنے والد عبداللہ بن ابی ابن سلول کا لباس لائے جو عباسؓ بن عبدالمطلب کو پہنایا گیا۔ انھی قیدیوں میں معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے داماد ابوالعاص بھی تھے۔ فوری طور پر تو ان تمام اسیروں کو دو دو چار چار کر کے صحابۂ کرام میں تقسیم کر دیا گیا اور بہتر سلوک کرنے کی ہدایت دی گئی جس پر مجاہدین اور دیگر تمام مسلمانوں نے عمل کیا۔ مدینۂ منورہ واپس آنے کے بعد باہمی مشورے سے اسیرانِ جنگ کا فدیہ مقرر ہوا لیکن اب صورتِ حال یہ تھی کہ معززین اور رئیس تو رقم ادا کر سکتے تھے لیکن بہت سے اس حالت میں نہ تھے۔ طے یہ پایا کہ جو قیدی لکھنا پڑھنا جانتے ہوں، دس دس بچوں کو نوشت و خواند کی تعلیم دے دیں، بہ عوض فدیہ تسلیم کر لیا جائے گا اور جو نادار ہیں، اس فن سے بھی آشنا نہیں، انھیں یونہی آزادی عطا کر دی جائے۔ اس فیصلے نے اسیروں میں سے بہت سے لوگوں کو اس تعلیم کی طرف متوجہ کر دیا۔ فوری طور پر اس کے دو اثرات ہوئے۔ ایک تو یہ کہ نئی تعلیم اور یہ انوکھا قانون دُور دُور تک موضوع بن گیا، دوسرا مدینۂ منورہ کے وہ لوگ جو ابھی تک معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا مخالف تصور کر رہے تھے، قیدیوں کے معاملے میں اس عدیم المثال اخلاق پر ان کے قریب آ گئے۔ یوں بہ تدریج مسلمانوں میں اضافہ ہو گیا۔

## سورۃ الانفال

جنگِ بدر چونکہ اسلام اور کفر کے درمیان پہلی جنگ تھی لہٰذا مسلمان، جہاد اور اس سے پیدا شدہ حالات سے ناواقف تھے۔ اس وقت ان لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جو جنگ کے پُرانے اصولوں کو ہی اصول تصوّر کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ کفّار کو شکست دینے کے بعد مسلمانوں میں سے بہت سے لوگوں نے خود کو فاتح تصوّر کر لیا۔ اس جنگ میں چودہ مسلمان شہید ہوئے تھے۔

اس فتح کو مختلف لوگ، مختلف انداز میں دیکھ رہے تھے۔ اوّل وہ لوگ جو اس فتح کو تائیدِ ایزدی گردانتے ہوئے معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے گرد جمع تھے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے تھے۔ دُوم وہ جو کفّار کے تعاقب میں روانہ ہو گئے تھے اور تیسرے وہ جو مالِ غنیمت کی طرف بھی متوجہ تھے اور قیدیوں کی طرف بھی۔ جنگ کے بعد وہ سب خود کو اجرِ عظیم اور مالی فائدے کا حق دار تصوّر کر رہے تھے جو بشریّت کے تقاضے کے خلاف نہ تھا۔ نہ ان دعوؤں سے ان کی عظمت پر فرق آسکتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ سب گروہ جب اپنے اپنے دعوے پیش کر رہے تھے اور قریب تھا کہ ان کے دعوے تلخی کی صورت اختیار کر جاتے، ایسے میں خداوندِ عالَم نے حق و باطل کے درمیان اس اوّلین جنگ پر خود تبصرہ فرمانا ضروری سمجھا۔ سورۂ الانفال اس جنگ کی تفصیل ہے جس کی ابتدا ہی اس بات سے ہوتی ہے۔

(اے محمدؐ) یہ لوگ آپ سے انفال (مالِ غنیمت) کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو آپ ان سے کہہ دیجیے کہ انفال تو اللہ اور اس کے رسولؐ کے ہیں پس یہ لوگ اللہ سے ڈریں اور آپس کے تعلّقات درست رکھیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہیں۔

دس رکوع پر مشتمل یہ سورت نہ صرف مسلمانوں کے لیے بہت بڑی اخلاقی اصلاح تھی بلکہ اس میں بڑی تفصیل کے ساتھ جنگِ بدر کا حال بیان کیا گیا تھا اور واضح کر دیا تھا کہ کفر و حق کے درمیان یہ جنگ حق کی فتح کا بہت بڑا پیش خیمہ تھی۔

اسی جنگ نے مشرکین و موحدین کے درمیان مقابلے کی کیفیت پیدا کر دی۔ وہ مقابلہ یا جنگ جو دونوں قوموں کے درمیان مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور عسکری سطح پر فتح مکہ تک لڑی گئی، یہاں تک کہ قدرت نے اسلام کو جملہ عرب پر محیط اور کفر کو مغلوب کر دیا۔ اسی جنگ کو قرآن مجید میں "یوم الفرقان" کہا گیا ہے۔ اس کے بعد ہی مسلمانوں کو احساس ہوا کہ اسلام ایک قوت اور مسلمان ایک طاقت ور قوم ہیں۔ مدینہ جو کل تک وہ خطۂ ارض تھا جسے خداوندِ عالم نے دعوتِ حق کی تخم ریزی کے لیے منتخب فرمایا تھا، اس جنگ کے بعد اسلام کا مرکز بن گیا۔ اس سورت کے نزول کے بعد مسلمان تہذیب اور امن سے آشنا ہو گئے تھے لہٰذا فوائد سے ہٹ کر ان کی نظریں مقصد پر مرکوز ہو گئیں اور یہ مقصد اللہ کی رضا اور خوشنودیٔ رسول تھا۔ وہ سب اس کے حصول میں کوشاں ہو گئے۔ اب ان کا ہر لمحہ دینِ حق کی اشاعت و محبت میں صرف ہونے لگا۔

## تحویلِ قبلہ۔ شعبان ۲ ہجری (۶۲۴ء)

ہجرتِ مدینہ کے بعد معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ یہ تمام وقت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس طرح گزارا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خود بھی اندازہ نہ ہوتا کہ کس چیز کا انتظار فرما رہے ہیں، کیا چاہتے ہیں! لیکن ان کے جذبات اور کیفیات کا اظہار خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ارشاد ہوا۔

(اے نبیؐ!) آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لیجیے ہم پھر اسی قبلے کی جانب آپ کا رُخ پھیر دیتے ہیں جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ (خانۂ کعبہ) آپ مسجدِ حرام کی طرف رُخ پھیر لیے اور اب جہاں کہیں بھی ہوں اسی کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھا کیجیے۔

جس دن یہ حکم نازل ہوا معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بشرؓ بن براء کے گھر دعوت پر مدعو تھے۔ بعد طعام ظہر کا وقت ہوا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) صحابۂ کرامؓ کے ساتھ (مسجدِ ذو القبلتین میں) نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ تیسری رکعت میں تھے کہ یہ آیتِ مبارکہ بہ ذریعۂ وحی نازل ہوئی۔ اس وقت آپ

(صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی اقتدا میں صحابۂ کرام کی جو جماعت موجود تھی، آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے رُخ بدلتے ہی کعبے کی طرف رُخ پھیر کر نماز پڑھنے لگی۔ اس کے بعد مدینۂ منوّرہ میں اس حکم کے لیے عام منادی کرائی گئی۔

"خبردار ہو جاؤ قبلہ بدل کر کعبے کی جانب کر دیا گیا ہے۔"

یہ خبر جب اور جہاں جہاں پہنچتی گئی، مسلمان اپنا قبلہ بدلتے گئے۔

اس وقت ایک دو نہیں، لاتعداد تنگ نظروں نے اعتراضات کیے عوام ہی نہیں اس میں علماء بھی شامل تھے، لیکن ان معترضین کے اعتراضات کا جواب دینے کی ضرورت معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم کو پیش نہ آئی کیوں کہ انھی کے بارے میں ارشاد تھا۔

نادان لوگ ضرور اعتراض کریں گے کہ انھیں (اللہ کے نبیؐ) کیا ہوا کہ جس قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، اس سے یکا یک پھر گئے۔ تو آپ ان سے کہہ دیجیے کہ مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ جسے اللہ چاہتا ہے، سیدھی راہ دِکھا دیتا ہے اور اسی طرح تو ہم نے (مسلمانوں کو) اُمّتِ وسطہ بنایا ہے تاکہ وہ دنیا کے لوگوں پر گواہ ہوں اور رسولؐ ان کی گواہی دیں۔

اس آیت مبارکہ کے واضح معنی یہی تھے کہ تحویلِ قبلہ کا حکم یہود کو دنیا کی امامت سے معزول کر کے اُمّتِ محمّدیہ کو پیشوائی دینا اور عظیم منصب پر فائز کرنے کا اعلان تھا۔ یہ مسلمانوں کی سرفرازی تھی۔ اوّل تو یہ اعلان ہی مخالفین کے دلوں میں آگ لگا دینے کو کافی تھا۔ ابھی تک مسلمان بیت المقدس کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھتے تھے تو یہودی سمجھتے تھے کہ وہ شریعتِ موسوی کا احترام کر رہے ہیں لہٰذا وہ ظاہری طور پر اس معاہدے پر کاربند تھے جو اُن سے کیا گیا تھا۔

## سُود

اب تحویلِ قبلہ کے حکم اور اعلان کے ساتھ ہی اسلام نے ان عقائد کی مخالفت کی جو شریعتِ موسوی کا حصّہ نہ تھے بلکہ یہودیوں نے اپنے فیض و نفع کے لیے گھڑ لیے تھے۔ ان میں سرِفہرست سُود تھا۔ اب اسلام نے اعلانیہ طور پر اسراف اور

سُود کو حرام قرار دے دیا۔

(اے نبیؐ کہہ دیجیے ان سے) جو لوگ سُود کھاتے ہیں، ان کا حال اس شخص ایسا ہوگا جسے شیطان نے چھو کر پاگل کر دیا ہو اور اس حالت میں ان کے مبتلا ہو جانے کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ تجارت بھی تو آخر سُود ہی ایسی چیز ہے حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سُود کو حرام قرار دیا ہے۔ اب اس شخص کو اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچے، وہ آئندہ کے لیے سُود خوری سے باز آجائے تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالے، مگر جو اس حکم کے بعد بھی اس حرکت کو دُہرائے، وہ جہنمی ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔

بہ بانگِ دہل یہ وہ اعلان تھا جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور وہ منافقت جو دلوں میں چھپی ہوئی تھی، ظاہر ہونے لگی۔ سُود ہی تھا جس نے اس قوم کو خوش حالی بخشی تھی۔ اس کی بدولت اسلام نے انھیں پاگل اور مجنون اور جہنمی قرار دے دیا تھا لہٰذا وہ مسلمانوں کے ہی نہیں، اسلام کے بھی دشمن ہو گئے اور اس کی ابتدا بنو قینقاع کی جانب سے ہوئی۔

## بنو قینقاع

اس وقت مدینۂ منورہ میں یہودیوں کے تین قبیلے آباد تھے۔ بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ۔ یہ سب تجارت کرتے تھے اور سود کے باعث مدینے کے معاشی وسائل پر قابض اور گرد و نواح میں بڑے مقبول تھے۔ ان لوگوں میں علم بھی بہ درجۂ اتم موجود تھا۔ ان کی الہامی کتب میں وہ سب کچھ درج تھا جو ہو رہا تھا، وہ خواہ مخواہ ہٹ دھرمی کر رہے تھے۔ ان کے اسی علم اور جان بوجھ کر انکار کی گواہی قرآن مجید نے اس طرح دی ہے۔

یہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی تھی، خوب جانتے ہیں کہ یہ حکم ان کے رب ہی کی جانب سے ہے اور برحق ہے، لیکن اس کے باوجود وہ جو کچھ کر رہے ہیں، اللہ ان سے غافل نہیں ہے۔

غرض کہ اُن کے من گھڑت عقائد و اعمال کی مخالفت ہوئی تو انکار پر اتر آئے اور پھر وہ حالات پیدا ہوئے جنھوں نے یہودیوں کی شرافت کا پردہ چاک

کر دیا۔ جنگِ بدر کے بعد ایک دن ایک مسلمان خاتون بنو قینقاع کے بازار میں سودا خریدنے گئیں تو یہودی جوان اس سے نازیبا حرکت کرنے لگے اور چونکہ ان کی غیر شریفانہ حرکتیں بین الاقوامی معاہدے کی شرائط کے بالکل خلاف تھیں، لہٰذا ایک انصار مشتعل ہو گیا۔ پہلے انھوں نے زبانی نصیحت کی، پھر سختی سے روکا مگر جھگڑا طول کھینچتا گیا۔ اس جھگڑے میں شرپسند یہودی انصار کے ہاتھ سے مارا گیا اور بنو قینقاع کے بازار کے یہودی دکان داروں نے مل کر انصار کو شہید کر دیا۔ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو سوقِ بنی قینقاع میں تشریف لے گئے۔ اس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس جھگڑے کو اتفاقی حادثہ تصور کرتے ہوئے ارادہ کر رہے تھے کہ مدینۂ منورہ کے شہری مملکت کے دستور کے مطابق (جیسا کہ معاہدے میں درج تھا) صدرِ مملکت کی حیثیت سے ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دیں، لیکن یہودی جو عرصۂ دراز سے بھرے ہوئے تھے، آج چھلک اٹھے اور ارد گرد سے بدگوئی کرنے لگے۔ ایک نے کہا: "آپ ہمیں قریش مت سمجھیے جو بدر میں ہار گئے۔ ہم بتا دیں گے کہ کیا چیز ہیں!"

اوّل تو یہ جملہ ہی نقضِ عہد کا اعلان تھا، مستزاد یہ کہ اس کہنے والے کو مجمع کی تائید نصیب ہوئی جو صریحاً علامتِ جنگ تھی۔ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبوراً مقابلے کا اعلان کیا اور مسلمان تیار ہو گئے۔ اس موقع پر بنو قریظہ اور بنو نضیر خاموش رہے۔ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم، مدینۂ منورہ میں ابو لبابہؓ بن المنذر کو اپنا قائم مقام بنا کر صحابۂ کرامؓ کے ایک دستے کے ساتھ بنو قینقاع کی آبادی کی طرف بڑھ گئے۔ اس وقت لشکر کے پیش رو حمزہؓ بن عبد المطلب تھے۔ بنو قینقاع نے جونہی اس دستے کے آنے کی خبر سنی، قلعہ بند ہو گئے اور عساکرِ اسلامی نے محاصرہ کر لیا۔ یہ ماہِ شوال کی آخری تاریخیں تھیں۔ محاصرہ پندرہ دن رہا، یہاں تک کہ بنو قینقاع جو خود کو قریش سے زیادہ دلیر ثابت کرنا چاہتے تھے، محاصرے سے تنگ آ کر گڑگڑانے لگے اور ذی القعدہ کے وسط میں خدمتِ اقدس میں گزارش کی کہ اللہ کے نبیؐ ان کے حق میں جو فیصلہ بھی صادر فرمائیں گے، وہ دل و جان سے منظور کریں گے، لیکن محاصرے سے نجات دے دی جائے۔

اس وقت اللہ کے نبیؐ نے فیصلہ کیا۔ بنو قینقاع اپنے اہل و عیال کے ساتھ مدینے سے نکل جائیں۔"

اس حکم کے بعد محاصرہ اٹھالیا گیا اور سات سَو افراد (یہودی) اپنے اہل و عیال کے ساتھ مدینۂ منورہ سے نکل کر سرحدِ شام کی طرف اذرعات کے مقام پر جا کر آباد ہوگئے۔ ان کے مال و متاع سے اللہ کے نبیؐ نے خمس نکال کر مالِ غنیمت کے طور پر مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ اس طرح یہودیوں کی ایک بڑی تعداد، مدینۂ منورہ سے اپنے دل میں انتقام کی آگ اور سینوں میں مخالفت کا جذبہ دبائے ہوئے چلی گئی جس کے باعث ان کی زندگی اِردگرد کی یہودی بستیوں میں دینِ حق کے خلاف اشتعال پھیلانے کے لیے وقف ہوگئی۔ یہ واقعات جنگِ بدر کے فوری بعد پیش آئے۔

## کچھ خانگی معاملات

جن دنوں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بیرونی مسائل نے گھیرا ہوا تھا، ان دنوں نجی زندگی کے لاتعداد معاملات بھی درپیش تھے جو خانگی ہونے کے باوجود حیاتِ مقدس کا ایک اہم حصہ ہونے کے باعث امت کے لیے اتنے ہی اہم ہیں جتنے دیگر حالات لہٰذا انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

### رقیہؓ بنتِ رسولؐ کی وفات۔ رمضان المبارک ۲ھ

جس وقت مدینۂ منورہ میں فتح (بدر) کی خوش خبری پہنچی تو مسلمانوں کی وہ جماعت جو وہاں موجود تھی اور حضرت عثمانؓ غنی، حضرت رقیہؓ بنتِ رسولؐ کو دفن کر رہے تھے۔ یہ اللہ کے نبیؐ کی وہ بیٹی تھیں جنھوں نے ہجرت فی سبیل اللہ کی سنت دو مرتبہ ادا کی تھی۔ پہلی بار نبوت کے پانچویں برس حبشہ کی طرف اور دوبارہ مدینۂ منورہ کی جانب ہجرت فرمائی تھی۔ اب چند یوم چیچک کے مرض میں مبتلا رہ کر وفات پا گئی تھیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سخت صدمہ ہوا، لیکن راضی بہ رضا تھے اور خود ہی رنج کرنے والوں کو صبر کی تلقین فرما رہے تھے۔

### حضرت فاطمۃؓ الزہرا کی شادی۔ ذی الحجہ ۲ھ۔

ایک جوان بیٹی کے صدمے کو برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ آپ (صلی اللہ

علیہ وسلم) کو ابھی ایک اہم فرض اور بھی ادا کرنا تھا اور وہ فرض تھا حضرت فاطمۃ الزہرا رضی کی شادی کا۔ چند ہی ماہ گزرے تھے کہ اس کا اہتمام کرنا پڑا۔ اس وقت ان کے لیے متعدد رشتے موجود تھے۔ ان رشتوں کے متعلق سن کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سکوت اختیار کر جاتے، یہاں تک حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یہ تحریک کی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت فاطمہ رضی کی مرضی دریافت کی جس پر وہ خاموش ہو گئیں۔ تب خاموشی کو رضا جان کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ رشتہ قبول کر لیا۔ پھر یہ شادی ہوئی جو محض فرض کی ادائیگی ہی نہیں بلکہ سادگی، پاکیزگی اور تقدس کی بہترین مثال تھی۔ جہیز کے طور پر چمڑے کا گدا جس میں روئی کی بجائے کھجور کے پتے بھرے ہوئے تھے، ایک چھاگل، مشک، دو چکیاں، مٹی کے دو گھڑے اور ایک چارپائی عطا فرمائی۔ (اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی والدہ حضرت فاطمہ بنت اسد زوجۂ ابوطالب حیات تھیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ ہی رہا کرتی تھیں اور اپنی وفات تک ان کے ساتھ رہیں)

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت فاطمۃ رضی الزہرا کو رخصت کرنے کے بعد ان کے گھر تشریف لے گئے تو باہر رک کر اندر جانے کی اجازت طلب کی اور اپنے دستِ مبارک سے اس گھر اور گھر کے مکینوں پر پانی چھڑکا، کچھ نصیحتیں فرمائیں اور واپس آ گئے۔

## حضرت زینب رضی بنت رسول ص کی واپسی

جنگ بدر کے موقع پر اسیرانِ جنگ کے ساتھ ابوالعاص (دامادِ رسول ص) بھی اسیر ہوئے تھے۔ معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیے کا اعلان فرمایا تو آزاد ہو کر جانے والوں نے یہ خبر حضرت زینب رضی کو بھی سنائی جو خود تو مدت ہوئی مسلمان ہو چکی تھیں، لیکن فی الحال مکے ہی میں مقیم تھیں اور اس وقت فدیے میں دینے کے لیے ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ تب انھوں نے برسوں تیل کا دبا ہوا وہ ہار ہی بطور فدیہ بھیج دیا جو انھیں جہیز میں دیا گیا تھا۔ معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ ہار دیکھا، صحابۂ کرام کے مشورے سے اسے واپس کیا اور ابوالعاص کو آزادی دیتے ہوئے فرمایا "زینب رضی کو مدینے بھیج دینا۔"

بہرحال جنگِ بدر نے کفر اور شرک کا فیصلہ کر دیا تھا لہٰذا اب نبیؐ کی مسلمان بیٹی مشرک شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ نبیؐ کا نہیں، خدا کا حکم تھا جس کی تفصیل تو بعد میں اتری لیکن احتیاط ابھی سے بہتر تھی۔ ابوالعاص کافر ہونے کے باوجود اس حکم کی پابندی پر مجبور تھا لہٰذا مکے جانے کے بعد اُس نے سیدہ زینبؓ کو ہجرت کی اجازت دے دی اور یہ بیٹی سفرِ ہجرت میں ہبار بن الاسود کے ہاتھوں زخم کھا کر سایۂ پدری میں آ گئیں۔ اس وقت اللہ کے نبیؐ کی نظروں سے ان کے اندرونی و بیرونی، جسمانی و روحانی زخم پوشیدہ نہ تھے، لیکن ہر صورتِ حال کو برداشت کرنا تھا۔ مہاجرین اور انصار کے ہزار ہا معاملات کے ساتھ ساتھ یہی وہ خانگی معاملات تھے جنھیں اللہ کے نبیؐ نظر انداز نہ کر سکتے تھے۔ غم بھی تھے، خوشیاں بھی، مسائل بھی، منافقین سے معاملات بھی اور مسلسل کفر و حق کا مقابلہ بھی، لیکن یہ بھی منصبِ نبوت کی ایک شان تھی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نجی مصائب میں گھرے ہونے کے باوجود ہر لمحہ وعظ و نصیحت میں ہی مصروف رہتے تھے۔

## احکامِ شرعیہ کا نزول

روزہ ۲ھ۔

اسی برس روزہ فرض کیا گیا اور اللہ کے نبیؐ نے اسے باقاعدہ رکھنے کا اہتمام کیا۔ ارشادِ ربانی ہوا۔

ماہِ رمضان وہ مہینا ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو انسانوں کے لیے سراپا ہدایت کی دلیلیں اور حق و باطل میں فاروق بن کر آیا، تو جو اس رمضان کو پائے وہ اس ماہ کے روزے رکھے۔ جو بیمار ہو یا سفر میں، وہ دوسرے میں رکھ لے کیوں کہ خدا آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور (روزہ اس لیے) فرض ہوا تاکہ تم خدا کے اس ہدایت دینے پر اس کی بڑائی کرو اور شکر بجا لاؤ

## خطبۂ رمضان المبارک۔ شعبان ۲ھ۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم ملنے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس

مبارک ماہ کی فضیلت پر ایک خطبہ دیا جو تاریخ میں اس طرح درج ہے "مسلمانو! تم پر ایک مبارک مہینا سایہ فگن ہو رہا ہے۔ ایسا مہینا جس میں ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اللہ نے اس ماہ کے دنوں میں روزہ رکھنے کو فرض قرار دیا ہے اور اس ماہ کی راتوں میں کھڑے رہنے کو نفل۔ جو شخص اس ماہ میں نیکی کر کے تقربِ الٰہی حاصل کرنا چاہے تو وہ ایسا ہے جیسے دیگر مہینوں میں فرائض کی ادائیگی کے بعد تقرّبِ الٰہی حاصل کر لیا۔ جو شخص اس ماہ میں کوئی فرض ادا کرے تو وہ ایسا ہے جیسے دیگر مہینوں میں ستّر فرائض ادا کر لیے۔ یہ صبر کا مہینا ہے اور صبر کا ثواب جنّت ہے۔ یہ غم خواری کا مہینا ہے جس میں مومن کا رزق زیادہ کر دیا جاتا ہے۔ جو شخص اس ماہ میں کسی روزہ دار کو افطار کرائے تو یہ گناہوں کی مغفرت اور آگ سے نجات کا سبب ہوگا اور اسے روزہ دار کے روزے کا اس طرح سے ثواب ملے گا کہ خود روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی نہ آئے گی۔ یہ ثواب اسے بھی ملے گا جو دودھ، کھجور یا تھوڑے سے پانی سے روزہ افطار کرائے گا اور جو روزہ دار کو سیر کر دے تو اللہ اسے حوضِ کوثر سے مشروب پلائے گا جس کے بعد کبھی پیاس نہ لگے گی۔ یہ وہ مہینا ہے جس کا اوّل حصّہ رحمت، دوسرا حصّہ مغفرت اور تیسرا نجات (آگ سے نجات) ہے جو اس میں اپنے غلام کا کام آسان کرے گا، خدا اس کی مغفرت کرے گا، اسے نجات دے گا۔

## صدقۃ الفطر

اسی برس صدقۂ عید الفطر کا حکم جاری ہوا اور دیگر تمام اقوام سے مختلف انداز میں عید، تہوار کے طور پر نہیں بلکہ یوم شکر کے طور پر منائی گئی۔ رمضان مبارک کے روزے اور عید الفطر کا حکم تحویلِ قبلہ کے فوری بعد ہی دیا گیا، گویا صحیح رُخ پر نماز کی ادائیگی کے بعد یہ احکام نازل ہوئے۔

## ابو رافع یہودی

اس برس یہ فتنہ پرداز یہودی قتل کیا گیا کیوں کہ یہ مدینۂ منورہ کے مضطرب اور بے قرار شر پسندوں کا سرغنہ تھا۔ آئے دن انھیں مسلمانوں کے خلاف

میدان میں لے آتا۔ کبھی شر پسند نصف شب کو ہجوم اور شور و غل کرتے، کبھی بلوا کرتے اور اس کے ہجویہ شعروں کو بلند آواز سے گاتے۔ ان دنوں اس کی شاعری کا موضوع اسلام اور مسلمان ہی تھے۔ وہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہجو میں شاعری کر کے خوب داد لیتا اور مسلمانوں کو تنگ کیا کرتا تھا۔

جب یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہوگئی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: "اہلِ ایمان میں سے کون ہے جو اس کا خاتمہ کرے؟"

یہ سنتے ہی سالمؓ بن عمیر بدری حاضر ہوئے اور اس کے قتل کی اجازت طلب کی۔ یہ بڑے مشہور صحابی تھے جو نہ صرف جنگِ بدر میں بلکہ بیعتِ عقبۂ ثانی میں بھی شریک تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انھیں اجازت دے دی۔ وہ تلوار لے کر روانہ ہوئے اور ابو رافع یہودی کو اس کے گھر میں جا کر قتل کر دیا۔ اس طرح مدینۂ منورہ سے ایک فتنہ پرداز شاعر کا خاتمہ ہو گیا جس کے ساتھ شر پھیلانے والے بہت سے افراد ٹھنڈے ہو گئے۔

## اہلِ مکہ کا جنون

ادھر تو معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم ان مصروفیات میں تھے، اُدھر اہلِ مکہ بھی اشتعال و انتقام میں یہودیوں سے کم نہیں، کچھ زیادہ ہی تھے جس کے باعث ایک نیا محاذ تیار ہو رہا تھا۔ فوج ہی نہیں بلکہ عوام میں بھی جوش کا عالم تھا۔ کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس کا کوئی فرد اس جنگ میں قتل یا اسیر نہ ہوا ہو۔

جب شکست خوردہ فوج مکے پہنچی تو گھر گھر کہرام مچ گیا۔ مکے کے بڑے بڑے بہادر رئیس، ابوجہل اور امیہ بن خلف ایسے لوگ جنگِ بدر میں مارے گئے تھے۔ اب ان کا سردار ابوسفیان بن حرب تھا لہٰذا عرب کے قدیم رواج کے مطابق شکست خوردہ قوم کا سردار ہونے کی صورت میں اس نے بدر سے واپس ہوتے ہی خانۂ کعبہ میں جا کر (معبودِ باطل) ہبل کی قسم کھائی اور سر پر خاک ڈال کر عہد کیا: "ہبل! گواہ رہنا، میں جب تک مسلمانوں سے اس شکست اور بربادی کا بدلہ نہ لے لوں گا، غسل نہ کروں گا۔"

ادھر وہ کعبے میں قسمیں کھا رہا تھا، اُدھر مقتولین کے اقربا میں صفِ ماتم

بجھی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ساری طاقتوں سے غموں کا اظہار کرتے اور اگر کسی وقت غم کا جذبہ کم ہوتا تو یہودی شعراء کے المیہ کلام انھیں چین نہ لینے دیتے۔ بنو قریظہ اور بنو نضیر جنھوں نے خاموش تماشائی کی طرح بنو قینقاع کی جلاوطنی دیکھی تھی، اس وقت تو رعب یا مصلحت کے تحت مقابل نہ آسکے، لیکن انھوں نے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے نیا انداز اختیار کیا۔ وہ یہ کہ میدانِ بدر میں قتل ہونے والے رئیسوں کی الم ناک موت کا آنکھوں دیکھا حال نظموں کی صورت میں لکھ کر مکّے پہنچاتے یا خود لے جاتے۔ وہاں وہ سب کعبے کے اندر جمع ہو کر اس دردناک انداز میں یہ مرثیے گاتے کہ مقتولین کے وارث غصّے سے دیوانے ہو کر مسلمانوں کے خلاف زہر اُگلنے لگتے۔ ایسی ہی حالت میں صفوان بن امیّہ اور عکرمہ بن ابوجہل نے اپنے اپنے باپ کا بدلہ لینے کی قسم کھائی۔ عمیر بن وہب کا بیٹا اسیر بن کر مدینۂ منوّرہ ہی میں رہ رہا تھا۔ وہ چشمِ تصوّر سے اپنے بیٹے کو قیدیوں ایسی اذیتیں برداشت کرتے ہوئے دیکھتا تو مچل جاتا۔ اس نے اس راہ میں مرمٹنے کی قسم کھائی۔ ابوسفیان بن حرب کا کوئی اپنا باپ، بھائی یا بیٹا تو قتل نہیں ہوا تھا لیکن اس کی بیوی ہندہ کے باپ عتبہ کا قتل حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اب ہندہ کا ہر وقت گریہ و ماتم اسے مشتعل کر رہا تھا لہٰذا ان دنوں ہر لمحہ، ہر فرد جیسے سراپا قہر بنا پھر رہا تھا۔ ابوسفیان نے تو بدلہ لینے کی قسم کھائی ہی تھی لیکن ہر نفس جدا جدا اس آگ میں جل رہا تھا۔ صفوان کی حالت اپنے باپ امیّہ کے غم میں دیوانوں ایسی ہو رہی تھی۔ ایک دن اس نے سنا کہ عمیر بن وہب کعبے کی دیوار کے سائے میں بیٹھا ہر وقت گریہ کرتا ہے۔ اپنے قیدی بیٹے کی یاد نے اسے نیم پاگل کر دیا ہے۔ صفوان بن امیّہ نے اسے فائدہ مند پا کر مکّے کی آبادی سے دُور چلنے کی دعوت دی اور راستے میں بولا: "اس گریے سے بہتر ہے کہ یثرب جا کر اس شخص کا قصّہ پاک کر دو جو میرے باپ اور تمھارے بیٹے کی بربادی کا سبب ہے۔"

عمیر بن وہب پھر رونے لگا۔ اس نے کہا: "ابنِ امیّہ! میں مقروض ہوں لہٰذا مر نہیں سکتا۔ میرے بعد قرض خواہ میرے کنبے کو تنگ کریں گے، اس خیال سے

خاموش ہو جاتا ہوں ورنہ میں یثرب جاکر اس انسان کو قتل کر دیتا جو ان حالات کا باعث بنا ہے۔"

صفوان بن امیہ نے سوچا کہ وقت غنیمت ہے، اسے اس کام پر آمادہ کر لیا جائے۔ یہ سوچ کر اس نے ہمدردی سے کہا "معزز عمیر بن وہب! اگر صرف قرض ادا ہونے کی بات ہے تو تمھارا قرض میں ادا کرتا ہوں۔ جب تک تم یثرب سے واپس آؤ گے، تمھارے کنبے کا بوجھ بھی میں برداشت کروں گا۔ تم اپنا کام کرو۔"

یہ سنتے ہی عمیر بن وہب راضی ہو گیا، پھر بڑی رازداری سے عمیر بن وہب نے اپنی تلوار کی دھار کو تیز کرایا، اسے باقاعدہ زہر میں بجھوایا اور ایک تیز رفتار اونٹ لے کر سفر پر چل پڑا۔ ادھر صفوان بن امیہ نے مکّے میں اعلان کیا کہ میں خود سفر پر جانے کی حالت میں نہیں ہوں لہٰذا میں نے عمیر بن وہب کا قرض ادا کر کے اس کے کنبے کی کفالت کا ذمہ لیا ہے اور اسے انتقام لینے کے لیے روانہ کر دیا ہے۔ اس اعلان کو سنتے ہی اہلِ مکّہ کسی اچھی خبر کی امید میں وقت گزارنے لگے۔

ادھر عمیر بن وہب مدینہ منورہ پہنچ گیا، لیکن شہر کی حد میں داخل ہوتے ہی پکڑا گیا۔ کسی نے تیزی سے جا کر مسجدِ نبوی میں خبر کر دی "یارسول اللہ! عمیر بن وہب مسلح ہو کر آیا ہے۔"

ارشاد ہوا "اسے آنے دو۔"

عمیر بن وہب کو دربارِ رسالت میں لایا گیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دریافت کیا "ابنِ وہب کیسے آئے ہو؟"

"اپنے بیٹے کی خبر لینے۔۔۔" عمیر بن وہب نے جواب دیا "جو آپ کے پاس قید ہے۔"

اور یہ تلوار کیوں ساتھ لائے ہو؟"

عمیر بن وہب ایک دم جواب نہ دے سکا۔ جس ہستی کے قتل کے ارادے سے آیا تھا، وہ تو سامنے ہی موجود تھی، لیکن وہ بُری طرح گھبرا گیا تھا۔

شاید وہ کوئی بہانہ بناتا کہ معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا "اچھا یہ بتا دے

کہ تو اور صفوان بن امیہ مکے کی آبادی سے الگ کھڑے اس دن کیا بات کر رہے تھے جس دن صفوان بن امیہ نے تیرا قرض ادا کرنے کا وعدہ اور کنبے کی کفالت اپنے ذمے لی تھی؟ اسی دن تو نے میرے قتل کا ارادہ کیا تھا!"

اس وقت عمیر بن وہب کے ہاتھ سے تلوار گر گئی۔ اس نے جس بات کا یقین چودہ برس تک نہیں کیا تھا، اب مان گیا اور کہا "یارسول اللہ! اس راز کی بات کو اللہ کا نبیؐ ہی جان سکتا ہے۔"

اس وقت معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کرام سے فرمایا "اسے دین کی تعلیم دو اور اس کے فرزند کو آزاد کردو۔"

یہ نعمت حاصل ہونے کے بعد عمیر بن وہب نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مکے واپس جانے اور وہاں کے لوگوں کو تبلیغ دین کی دعوت دینے کی اجازت طلب کی اور لوٹ آیا۔ جب وہ مکے میں داخل ہوا تو لوگ اس کے گرد جمع ہوگئے۔

صفوان بن امیہ نے کہا "مجھے یقین ہے ابن وہب کامیاب آیا ہے۔"

اس وقت اہل مکہ اپنے اپنے مقتولین کا غم بھول کر اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ جب سب آگئے تو اس نے کہا "ہاں میں کامیاب واپس آیا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ خدا معبودِ حقیقی ہے اور . . ."

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ بہت سے لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ جب وہ کافی مار کھا چکا تو کسی نے کہا "اے اہل مکہ! ایک آدمی کو مارنے پر اپنی قوت کیوں ضائع کرتے ہو! اپنی اپنی قسمیں پوری کرنے کی تیاری کرو!"

اہل مکہ کو پھر اپنے غم یاد آگئے۔

اسی واقعے کے دوران میں یا اس کے فوری بعد واقعۂ بدر کے دو ماہ بعد ابوسفیان نے اپنی قسم پوری کرنے کا ارادہ کیا۔

### غزوۂ سویق ذی الحجہ ۲ھ (جون ۶۲۴)

اس بار ابوسفیان پچھلے تمام تجربات سے ہٹ کر کوئی نیا تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ فوج کے بغیر اور بغیر کسی تیاری کے شب کے اندھیرے میں اس نے مسلمانوں کو پامال کرنے کا منصوبہ بنایا۔ قریش کے دو سو شتر سوار جو اسی کی طرح انتقام کی آگ

میں چل رہے تھے، اس کے ساتھ ہو لیے۔ اعلانِ سفر کیے بغیر ابوسفیان روانہ ہو گیا۔ یہ تمام سفر اس نے بڑی تیزی سے طے کیا اور مدینۂ منورہ سے ایک منزل کے فاصلے پر ٹھہر گیا۔ یہاں اس نے اپنے شتر سواروں کو رُکنے کی ہدایت دی اور مسلمانوں کے بارے میں مزید گفتگو کے لیے حُیَی بن اخطب سے ملنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ حُیَی بن اخطب نے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ تب ابوسفیان نے سلام بن مشکم کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے مکّے کے اس معزز سردار کو بہ صد احترام مہمان رکھا۔ وہ رات ابوسفیان نے بنی نضیر کے اس سردار کے گھر گزاری۔ سلام بن مشکم نے مسلمانوں کے خلاف بہت سی معلومات بہم پہنچائیں۔ صبح ہونے سے قبل ابوسفیان وہاں سے روانہ ہوا اور مدینۂ منورہ کے ایک حصّے پر حملہ کر کے سوئے ہوئے ایک انصاری کو شہید کر دیا۔ وہ کھجوروں کے نخلستان میں آگ لگاتا ہوا بھاگ رہا تھا کہ مسلمان بیدار ہو گئے۔ ابوسفیان مدینے سے نکل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا، لیکن معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم کو اطلاع ملی تو فوری تعاقب کا حکم دیا۔ دو سَو صحابیوں کی جماعت آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے ساتھ تھی۔ اس موقع پر مسلمانوں نے دُور دُور تلاش کیا، لیکن ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ پانچ یوم مدینۂ منورہ سے باہر رہنے کے بعد اللہ کے نبیؐ لوٹ آئے، لیکن کوئی مشرک ہاتھ نہ آیا۔ ابوسفیان کی قسم پوری ہو گئی تھی۔ اب اسے رُکنے اور مسلمانوں پر دوبارہ حملہ کرنے کی ضرورت نہ تھی، البتّہ واپسی میں اسے فرار ہونے کی اس قدر گھبراہٹ تھی کہ مدینۂ منورہ سے بھاگتے ہوئے اپنے سویق کے بورے پھینک گیا جو مجاہدین کے ہاتھ لگے اسی لیے اس غزوے کو "غزوۂ سویق" کہتے ہیں۔

اس غزوے نے بہ یک وقت دو کام کیے۔ اوّل تو قریش اور یہودی دونوں جو مسلمانوں کو جنگِ بدر کے بعد تھکا ہوا تصوّر کر کے غفلت میں حملہ کر دینے کو آسان سمجھ رہے تھے، اس تعاقب سے جان گئے کہ مسلمان غافل نہیں ہیں اور دوسری جانب خود مسلمان بھی فتح کے بعد اس گمان میں تھے کہ دشمن پٹ کر گیا ہے، اب جرأت نہ کرے گا، انھیں بھی اندازہ ہو گیا کہ دشمن جتنا بھی کمزور ہو، اس کی جانب سے مطمئن ہو جانا خطرناک ہے۔ اب اگر وہ آرام سے رہنا بھی چاہتے تو رہ نہ سکتے۔ معلّمِ اعظم

صلی اللہ علیہ وسلم تو پہلے ہی پُر سکون نیند ترک کر چکے تھے، اب مسلمانوں نے بھی باقاعدہ پہرا دینا اور رات کو دُور دُور کی خبریں لانا شروع کر دیں۔ یہی زمانہ تھا جب عبداللہ بن ابی ابنِ سلول نے جنگِ بدر کی کامیابی کے بعد بہ ظاہر اسلام قبول کر لیا تھا لیکن اندر سے وہ مرتد رہا۔ مسلمانوں کو یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ اس کے قلعہ نما مکان میں منافقین کی محفلیں جمتی ہیں، اسلام کے خلاف گفتگو ہوتی ہے۔ اس کے باوجود جب وہ خدمتِ اقدس میں آتا تو خود کو مسلمان ہی ظاہر کرتا۔ مدینۂ منورہ میں ایسے عناصر کی کمی نہ تھی۔ جنگِ بدر میں اہلِ ایمان کو فتح نصیب ہوئی تھی، لیکن وہ بھڑوں کے چھتّے کو چھیڑ دینے کے مترادف تھی۔ اِدھر گرد و پیش کی قوتیں محتاط ہو گئیں۔ اندر کی وہ اقوام جن سے معاہدہ ہوا تھا، مفتوحین کی ہمدرد بن رہی تھیں۔ خصوصاً بنی قینقاع کے مدینۂ منورہ سے چلے جانے کے بعد بنو قریظہ اور بنو نضیر اندر اور باہر کے دشمنوں سے ساز باز کرنے لگے۔ ان کی محفلیں کبھی عبداللہ بن ابی ابنِ سلول کے ساتھ جمتیں، کبھی مشرکینِ مکّہ کے ساتھ مل کر تدبیریں سوچا کرتے جس کے سبب یہ چھوٹی سی اسلامی ریاست خطرے میں پڑ گئی تھی۔ خود معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کو بھی ہر لمحے اندیشہ تھا۔ صحابۂ کرام کی یہ کوشش ہوتی کہ ہر دم آپ کے ساتھ رہیں، یہاں تک کہ رات کو بھی آپ آرام کرتے تو مسلّح ہو کر ہی لیٹتے کہ کب کسی دشمن کا مقابلہ کرنا پڑ جائے۔ یہ واہمہ نہیں حقیقت تھی کہ مدینۂ منورہ کے قرب و جوار کے مفسد آئے دن شرارتیں برپا کرتے جنھیں سن کر مجاہدینِ اسلام حرکت میں آجاتے اور کبھی معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی پیش قدمی فرماتے۔ بارہا جنگ کی نوبت نہ آتی، لیکن انھیں سفر کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ تیسری ہجری کی ابتدا میں ایسے سفر بارہا درپیش آئے۔

**قرارۃ الکدر۔ محرم ۳ھ (جولائی ۶۲۴ء)**

غزوۂ سویق سے واپس آئے زیادہ دن نہ ہوئے تھے۔ قبیلۂ سلیم اور قبیلۂ غطفان کے شر پسند فساد پر آمادہ تھے اور قرارۃ الکدر پر جمع ہو رہے تھے۔ یہ ایک آب گیر تھی جو مدینۂ منورہ سے چھیانوے میل کے فاصلے پر عراق کی جانب تھی۔ جونہی یہ خبر ملی تو معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش قدمی کا حکم دیا۔ اس وقت دو سو مجاہدین

آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے ساتھ تھے۔ رائتِ لشکر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عطا ہوا اور مدینۂ منورہ کے انتظام کے لیے عبداللہ بن مکتوم رضؓ کو چھوڑ کر اس سفر کے لیے روانہ ہوگئے۔ یہ طویل سفر طے کرنے کے بعد جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) اس آبِ گیر کے نزدیک پہنچے تو دیکھا بہت سے مویشی چر رہے تھے اور کوئی نہ تھا البتہ ایک چرواہا یسیار ان مویشیوں کا نگہبان تھا۔ معلوم ہوا کہ قبیلۂ سلیم اور غطفان کے معزز سردار سلم بن منصور اور غطفان بن سعد یہاں جمع تو ہوئے تھے لیکن اسلامی فوج کی پیش قدمی کی خبر سن کر بھاگ گئے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے مجاہدین کو بلند اور نشیبی علاقوں میں گشت لگانے اور شرپسندوں کو تلاش کرنے کا حکم دیا، لیکن ہزار جستجو کے باوجود وہ ناکام ہی واپس آئے۔ تب کچھ دیر قیام فرمانے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) مویشیوں اور ان کے چرواہے کو لے کر لوٹ آئے جہاں آکر ان مویشیوں کو مالِ غنیمت کے طور پر تقسیم کر دیا اور غلام کو آزادی دے دی۔ (کچھ مدت کے بعد ہی وہ مسلمان ہوگیا) اس طرح اس سفر میں پندرہ یوم صرف ہوئے۔ اب خیال تھا کہ کچھ اندرونی امور کی جانب توجہ دیں، نجی اور ان بیرونی مسائل کو دیکھیں جنھیں حل کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ تبھی ایک اور سفر کی ضرورت پیش آگئی۔

## غزوۂ ذی امر۔ (ربیع الاوّل ۳ھ دسمبر ۶۲۴ء)

ایک دن آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) مدینۂ منورہ کے ایک بازار سے گزر رہے تھے کہ کسی نے کچھ عرض کرنے کی اجازت مانگی۔ معلوم ہوا کہ وہ نجد کی طرف سے آنے والا ایک مسافر ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے توجہ دی تو نو وارد نے اطلاع دی کہ نجد کے ایک مقام ذو امر ثعلبہ اور محارب کے کچھ لوگ متحد ہو کر مدینۂ منورہ کو گھیر لینا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے اور ان سب کا سردار دعثور بن الحارث نامی ایک مفسد رئیس ہے۔ معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم واپس تشریف لائے اور حسبِ معمول مشورہ طلب کیا۔ طے پایا کہ دعثور بن الحارث کو پیش قدمی سے قبل ہی جا کر گھیر لیا جائے۔ اس فیصلے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے چار سو پچاس مجاہدین ساتھ لیے۔ مدینۂ منورہ کے انتظام کے لیے حضرت عثمانؓ کو اپنا قائم مقام بنایا اور روانہ ہوگئے۔ دشمن کے علاقے میں پہنچ کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم)

نے دُور دُور تک تلاش کیا، بالائی اور نشیبی علاقے، پہاڑیاں اور بستیاں سب میں گشت لگایا لیکن نہ دعثور بن الحارث ملا اور نہ ثعلبہ اور محارب کے لوگ، یہاں تک کہ دس یوم قیام کے بعد واپسی کا حکم دیا اور روانہ ہو گئے۔ اس سفر سے مدینۂ منورہ کی طرف آتے ہوئے اثنائے راہ میں ایک دن بارش ہونے لگی جس کے سبب سب کے کپڑے بھیگ گئے اور وہ طرح طرح سے خشک کرنے لگے۔ ایسے میں، آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے بھی اپنا بالائی لباس اتار کر ایک درخت پر لٹکا دیا اور اسی درخت کے نیچے آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک دشمنِ دین کا ادھر سے گزر ہوا تو وہ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو پہچان کر ٹھٹک گیا اور دبے قدموں سرہانے کی طرف آیا، پھر ایک دَم اپنی تلوار کھینچ کر بولا "اس وقت کون ہے جو مجھ سے آپ کو بچا سکے؟"

آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے اس کی جانب دیکھا اور بڑے اطمینان کے ساتھ فرمایا۔

"میرا اللہ!"

یہ جواب سن کر اللہ کے حکم سے اس مفسد پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ ہاتھ سے تلوار گر گئی۔

آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے اُٹھ کر وہی تلوار اٹھائی اور اس سے دریافت کیا۔

"اب کون ہے جو تجھے میرے ہاتھ سے بچائے؟"

اس سوال پر علاقۂ نجد کا یہ معزز چوکڑی بھول گیا اور گھبرا کر بولا "کوئی نہیں!"

اتنا سنتے ہی معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تلوار والا ہاتھ نیچے کر لیا اور فرمایا "تجھے بھی اللہ ہی بچانے والا ہے جو سب کا مالک و خالق ہے!"

اس ایک لمحے میں دھوکے سے وار کرنے والے اس سردار کی دنیا ہی بدل گئی۔ اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔

پھر وہ جہاں جہاں جاتا اسلام کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔

اس غزوے میں نہ مقابلہ ہوا نہ مالِ غنیمت ملا اور نہ مسلمانوں کا کوئی نقصان ہوا البتہ کچھ لوگ دینِ حق کی طرف مائل ہو گئے۔ اس زمانے میں ایسے واقعات تعجب خیز نہیں تھے۔ لوگ دشمن بن کر سامنے آتے اور دوست بن کر لوٹتے تھے۔

ایسے سفر قدرت کو اسی غرض سے کرانے ہوتے تھے کہ جن جن علاقوں سے اللہ کے نبیؐ گزریں، وہاں صرف حُسنِ اخلاق کے ذریعے اسلام پہنچ جائے۔ نجد سے واپسی کے ایک ماہ بعد ہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بحران کی طرف جانا پڑا۔

## غزوۂ بحران ۔ جمادی الاوّل ۳ھ (اکتوبر ۶۲۴ء)

ان دنوں بحران کے علاقے میں قبیلۂ بنو سلیم آباد تھا۔ کسی نے خبر دی کہ بنو سلیم بحران کے علاقے میں زور شور سے تیاریاں کر کے اسلام کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ ان دنوں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی دشمن کو مدینے کی طرف آنکھ اٹھانے کی اجازت نہ دیتے تھے لہٰذا ہر بار پیش قدمی فرماتے۔ انھیں مرعوب کرتے، اپنے اخلاق و اطوار سے دینِ حق کا پرچار کرتے اور واپس آجاتے۔ اس بار بھی عبداللہؓ بن اُمِّ مکتوم کو اپنا قائم مقام بنا کر تین سو صحابۂ کرامؓ کی جماعت کے ساتھ روانہ ہوئے لیکن اپنی پرانی عادت کے تحت شرپسند آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطلاع ملتے ہی منتشر ہو گئے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہاں بھی دس یوم قیام فرمایا۔ آپ نے اس علاقے میں کئی بار گشت کیا، متعدد افراد کو دینِ حق کی طرف مائل کیا اور مدینۂ منوّرہ لوٹ گئے۔ اس زمانے میں غزوات و سرایا کی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے جن کا عموماً ایک ہی انجام ہوتا تھا کہ اسلامی لشکر کی خبر سن کر دشمن بھاگ جاتے تھے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اسلامی دستوں کو دُور دُور تک سفر کرنے اور حالات کو بہ چشمِ خود دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ بہر حال جنگِ بدر کے بعد کا یہ زمانہ اضطراب کا بھی تھا اور مصروفیت کا بھی۔ اس مرتبہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جب اپنے سفر سے لوٹے تو مدینۂ منوّرہ کے اندر ایک پرانا مسئلہ نئے انداز سے درپیش تھا جسے فوری توجہ دینے اور حل کرنے کی ضرورت تھی۔

## کعب بن اشرف ۔ ربیع الاوّل ۳ھ (ستمبر ۶۲۴ء)

یہ یہودی سردار ابتدا ہی سے اسلام کا مخالف اور مسلمانوں کا دشمن تھا۔ شروع میں وہ یہ ذکر بھی سننا گوارا نہ کرتا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم مستقلاً مدینۂ منوّرہ میں آگئے۔ اب اُسے اور اسی کی طرح دوسرے سرداروں کو اپنی حیثیت خطرے میں محسوس ہوئی تو اس نے یہودی علماء اور دیگر معززین کو جمع کر کے عہد کیا

کہ آخری سانس تک اس دین کی مخالفت کریں گے۔ ابھی وہ یہود کے اندر خانہ کچھ کر گزرنے کی سوچ رہے تھے کہ جنگِ بدر کا معرکہ پیش آگیا۔ تمام یہودی سرداروں کی دلی تمنا تھی کہ مسلمان ہار جائیں، لیکن تائیدِ ایزدی شامل تھی کہ مشرک پامال ہوگئے۔ اس وقت کعب بن اشرف نے پہلا کام یہ کیا کہ ان مشرکین سے ہمدردی کے پردے میں ان کے دلوں میں انتقامی جذبات بھڑکانا شروع کر دیئے۔ یہ کام وہ مسلسل کر رہا تھا اور معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم ان بداعمالیوں کے باوجود طرح دے رہے تھے۔ انھی دنوں غزوۃ الکدر کے لیے انھیں مدینۂ منورہ سے پندرہ یوم کے لیے باہر جانا پڑا۔ اب جو سفر سے واپس آئے تو معلوم ہوا کہ کعب بن اشرف کے قاصد مکے سے مدینۂ منورہ اور مدینے سے مکے کا سفر کر رہے ہیں۔ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے معلومات کرائیں تو تصدیق ہوگئی کہ اندر خانہ یہود اور مشرکینِ مکہ میں اتحاد ہو رہا ہے جو کسی اہم سازش کا پیش خیمہ تھا۔ یہ حالات وہ تھے جن کے تحت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینۂ طیبہ کے شہری دستور و آئین کے مطابق مفسد عناصر کو سزا دینے کے مجاز تھے۔ وقت کا تقاضا بھی یہی تھا جسے مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجلسِ مشاورت منعقد کی۔ اس مجلس میں متفقہ رائے سے فیصلہ ہوا کہ اسلام کا بڑا دشمن جو ایک مسلسل فتنے کا سبب تھا، سزائے موت کا مستحق ہے۔

کعب بن اشرف کے بچپن کے ساتھی اور رضاعی بھائی محمدؓ بن مسلمہ نے بھی اس فیصلے کی بھرپور تائید کی اور کہا "یا رسول اللہ! جو شخص آپ کو کامل تین برس سے دھوکا دے رہا ہے، اُسے موت ہی کی سزا ملنی چاہیے!"

معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام پر انھی کو مامور کر دیا۔ انھوں نے اس فرض کو بہ حُسن و خوبی ادا کیا۔ اس طرح ہجرت کے تیسرے برس کے آغاز میں اس دشمنِ دین کا خاتمہ ہو گیا، لیکن جو بیج وہ بو گیا تھا، اُسے اکھاڑنا آسان نہ تھا، وہ بہ تدریج جڑ پکڑ رہا تھا جس کی آبیاری یہودی اور مشرکینِ مکہ کر رہے تھے۔ اس سے ایک بڑی ہولناک جنگ کی بنیاد مضبوط ہو رہی تھی۔ کعب بن اشرف مر گیا تھا، لیکن اس کے اشعار اہلِ مکہ کے دلوں میں زندہ تھے۔ انھی کو دہرا دہرا کر وہ دیوانے ہوئے جاتے تھے جس کا نتیجہ تمام قبائل کا اتحاد تھا۔ ان سب نے دل

کھول کر چندہ دیا اور مسلمانوں سے باقاعدہ ٹکرانے کی تیاریاں شروع ہوگئیں، قیمتی ہتھیار خریدے گئے۔ تمام قبائل میں منادی کرادی گئی کہ جو فرد جس طرح چاہے، اپنی خدمات پیش کرسکتا ہے۔

## قریش کی تیاریاں

اس اعلان نے مشرکین میں نئی روح پھونک دی۔ وہ لوگ جن کے اقربا جنگِ بدر میں قتل ہوچکے تھے یا وہ لوگ جو اپنے اسیروں کو آزادی دلانے کے لیے اپنے مال و متاع سے ہاتھ دھو چکے تھے، اب اس نقصان کا ازالہ کرنے کے لیے پھر سے تیاریاں کرنے لگے۔ اس بار تجارتِ شام کا پچاس ہزار مشقال سونا اور ایک ہزار اونٹ جنگ کے لیے وقف تھے۔ ان پانچ ہزار بہادرانِ قریش میں دو ہزار آٹھ سو پیادے اور تین ہزار سوار تھے۔ سامانِ عیش و عشرت کے ساتھ مکہ اور اطرافِ مکہ کے نچھے ہوئے شاعر آباء و اجداد کے دلیرانہ قصے سنا کر جذبات میں ہلچل مچانے کے لیے موجود تھے۔ ان سب کے علاوہ اس بار ایک اور بات کا اہتمام بھی کیا گیا تھا، وہ یہ کہ عرب کے قدیم رواج کے مطابق ثابت قدم رہنے کے لیے خواتین کی ایک بڑی تعداد بھی ساتھ تھی۔ ان خواتین میں اکثریت ان کی تھی جن کے قرابت دار جنگِ بدر میں کام آگئے تھے۔ انھوں نے یہ سال گریہ و زاری کرکے گزارا تھا اور اب آتشِ انتقام سے جل رہی تھیں۔ ان خواتین کے نام تاریخ میں اس طرح درج ہیں۔

۱۔ ہندہ بنتِ عتبہ، زوجۂ ابوسفیان بن حرب۔
۲۔ برزہ بنتِ مسعود ثقیف کے رئیس کی بیٹی۔
۳۔ ریطہ، زوجۂ عمروؓ بن العاص۔
۴۔ خناس، حضرت مصعبؓ بن عمیر کی والدہ۔
۵۔ اُمِّ حکیم، عکرمہ بن ابوجہل کی بیوی۔
۶۔ فاطمہ بنتِ ولید، خالدؓ بن ولید کی بہن۔
۷۔ مسلافہ بنتِ سعد۔

فوج کی تیاری کے بعد سپہ سالارِ اعظم ابوسفیان بن حرب نے ایک موثر تقریر

کی جس میں پندرہ برس کے حالات دُہرانے کے بعد جنگِ بدر میں دلیروں کی موت کو ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیتے ہوئے آیندہ کے لیے عہد کیا کہ جیسے بھی ممکن ہوگا، اس کا ازالہ کیا جائے گا۔ اس تقریر کے اختتام پر باقی تمام سرداروں نے یہ عہد دُہرایا، اس وقت عورتیں بھی پُرجوش ہورہی تھیں۔ انھوں نے خود اپنے اپنے طور پر اپنے اقربا کا انتقام لینے اور مسلمانوں کو پامال کرنے کی قسمیں کھائیں۔ خناس اپنے بیٹے مصعبؓ بن عمیر کو مکّے واپس لانے کی تمنائی تھی۔ سلافہ کے دو فرزند جنگِ بدر میں کام آئے تھے، عتبہ کی بیٹی ہندہ سردارِ فوج کی بیوی ایک خاص مقصد اور شان سے فوج کے ساتھ تھی۔ اس نے اپنے غلام جبیر بن مطعم کو آزادی کی شرط پر اس لیے فوج کے ساتھ رکھا تھا کہ وہ اس کے باپ عتبہ کے قاتل (حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب) کو قتل کرے گا۔ الغرض سب عورتیں اپنے جوش کا اظہار کرتی ہوئیں مردوں کو جوش دلاتی جارہی تھیں۔

## مجاہدینِ اسلام

اس زمانے میں خبر رسانی کی خدمت پر حبابؓ بن المنذر، حضرت انسؓ بن مالک اور حضرت مونسؓ مامور تھے جو یہ تمام خبریں معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے گوش گزار کرتے تھے۔ ان کے علاوہ عبّاسؓ بن عبدالمطّلب جو ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے اور مکّے میں مقیم تھے، کفّار کے بارے میں ایسی خبریں مدینۂ منوّرہ پہنچا دیتے تھے۔ اس بار بھی انھوں نے مشرکینِ مکّہ کے ارادوں اور عظیم الشّان تیاریوں سے باخبر کرنے کے لیے ایک تیز رَو قاصد خدمتِ اقدس میں بھیجا جس نے یہ طویل سفر صرف تین یوم میں طے کیا۔ ان ذرائع سے یہ خبریں معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ملیں تو آپؐ نے حسبِ سابق مجلسِ مشاورت طلب کی۔

مدینۂ منوّرہ میں مقیم مسلمان ان دنوں معاشرتی استحکام کے لیے کوشاں اور دین کی تبلیغ میں مصروف تھے۔ بیرونی انتشار کے باوجود یہود کی قوّت مدینۂ منوّرہ سے گھٹتی جارہی تھی۔ خاص طور پر مسلمانوں کا سیاسی نظام مضبوط ہورہا تھا اور عسکری قوّت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ دشمنانِ دین سے یہی صورتِ حال برداشت نہ ہوتی تھی۔ مسلمانوں کی ہر کامیابی اور دینِ حق کی اشاعت میں ہر اضافہ

قریش کے دلوں کی آگ کو بھڑکاتا اور یہودیوں کی ہمدردیاں جلتی پر تیل کا کام دیتی تھیں۔ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا خوب اندازہ تھا۔ اب انھوں نے نئی صورتِ حال کے سدِ باب کی خاطر مہاجرین اور انصار سے مشورہ طلب کیا اور بربنائے مصلحت اس میں عبداللہ بن ابی ابنِ سلول کو بھی شریک کر لیا۔ وہ بھی طاقت ور افراد میں سے تھا۔ وہ بس رسمی انداز میں حاضرِ خدمت ہوتا تھا۔ اس کے طرزِ سلوک کو جاننے کے بعد مسلمان بھی اس سے اسی طرح ملتے تھے۔ ان مشوروں کے دوران میں سبھی نے اظہارِ رائے کیا۔

اس وقت مہاجرین و انصار کی اکثریت اس بات پر متفق تھی کہ مشرکینِ مکہ کو سلطنتِ اسلامی کے قریب نہ آنے دیا جائے بلکہ باہر ہی نکل کر جنگ لڑی جائے۔ عبداللہ بن ابی ابنِ سلول اس رائے کے حق میں نہ تھا مگر اکثریت کی رائے دیکھتے ہوئے معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے زرہ پہن لی اور فیصلہ ہوا کہ مدینے سے باہر مقابلہ کیا جائے گا۔ اس تمام فوج کی تعداد ایک ہزار تھی۔ فیصلے کے بعد مجاہدین اسلحۂ جنگ سے آراستہ ہو کر روانہ ہوئے تو اثنائے راہ میں عبداللہ بن ابی ابنِ سلول نے تین سو دلیروں کی اپنی فوج کو علیحدہ کر کے واپسی کا اعلان کر دیا۔

بظاہر تو وہ معمولی سے اختلافِ رائے پر لشکر سے الگ ہو گیا تھا لیکن دراصل یہ پہلا موقع تھا جب اس نے کھلم کھلا منافقت کا اظہار کیا۔ اگرچہ یہ گھڑی بڑی آزمائش کی تھی۔ ایسے میں فوج کا ایک بڑا حصہ کٹ جانا باعثِ تردد تھا۔ لیکن اللہ کے نبیؐ نے صبر کیا اور باقی ماندہ سات سو مجاہدین کو لیے آگے بڑھ گئے۔ ان سات سو میں بھی ایک ٹولی وہ تھی جو منافقین کی ساتھی اور برائے مصلحت مسلمانوں کے ساتھ رہ گئی تھی۔ مسلمانوں میں سے چند نو عمر تھے جنھیں محض شوق اور جذبہ دیکھتے ہوئے جنگ میں شرکت کی اجازت دی گئی تھی اس طرح یہ فوج اپنے سے کئی گنا زیادہ فوج کے مقابلے کے لیے روانہ ہوئی۔ آخر سات شوال ۳ھ کو اُحد کے سرخ پہاڑ کے دامن والے طویل و عریض میدان میں ایک مرتبہ پھر کفر و اسلام مدِ مقابل آ گئے۔

اُحد، مدینۂ منورہ سے شمال کی جانب تین میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ کا نام

ہے۔ اس مقابلے کے لیے یہی میدان منتخب ہوا۔ معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے صف آرائی کے وقت اُحد کو پشت پر رکھا اور اس جانب ایک درّے پر جدھر سے دشمن کے حملے کا احتمال تھا، پچاس تیر اندازوں کا دستہ متعین فرما دیا۔ آپ نے انھیں ہدایت دی کہ صورتِ حال کچھ بھی ہو، تم یہاں سے ہرگز نہ ہٹنا! اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مصعبؓ بن عُمیر کو علَم عنایت کیا، زبیرؓ بن العوام کو افسر رسالہ مقرّر کیا اور حمزہؓ بن عبدالمطلب کو اُس دستے کی کمان عطا کی جو زرہ پوش نہ تھا۔ ازاں بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کچھ ہدایات دیں اور جہاد کی فضیلت پر روشنی ڈالی۔

اِدھر مسلمان صف بندی میں مصروف تھے، اُدھر ابوسفیان اپنی فوج کی صفیں بنا رہا تھا۔ اس فوج کے بڑے بڑے سردار، خالدؓ بن ولید، (میمنے پر)، عکرمہ بن ابوجہل (میسرے پر)، صفوان بن امیہ، (سوار دستے کا رئیس) اور عبداللہ بن ربیعہ (تیر انداز دستوں کے افسر) تھے۔ اس فوج کا علَم طلحہ کے پاس تھا۔ اس طرح اسلحہ جنگ سے آراستہ یہ فوج بڑی شان و شوکت سے کھڑی تھی۔

ابھی جنگ کا آغاز نہ ہوا تھا لہٰذا وقت گزارنے کے لیے یا مَردوں کو جوش دلانے کی خاطر قریش کی معزز خواتین دف پر وہ شعر پڑھ رہی تھیں جو شعراء نے آج ہی کے لیے کہے تھے۔ ان کی آوازیں مَردوں تک پہنچ رہی تھیں۔ دیر تک یہی کیفیت رہی۔ پھر مشرکینِ مکّہ کی جانب سے آغازِ جنگ ہوا۔

ابوعامر نے میدان میں آ کر مُبارِز طلب کیا تو اس کے جواب میں حضرت علیؓ صف سے نکلے۔ اس وقت ابوعامر نے جھپٹ کر حملہ کرنا چاہا، مگر علیؓ کے پہلے ہی وار میں خاک پر لوٹ گیا۔

اس کے بعد دونوں جانب سے دلیر میدان میں آئے اور باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ قریش کے بارہ علَم دار، مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے، لیکن چونکہ ان کی تعداد زیادہ تھی اس لیے ایک کی جگہ دو دو، تین تین دلیر آتے گئے۔ اس طرح دونوں فوجوں کے بہادر جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے رہے اور مقابلہ ہوتا رہا۔ ہر حملے میں مسلمانوں کا پلّہ بھاری ہی نظر آ رہا تھا اور خود مسلمانوں سے زیادہ مشرکین یہ بات

محسوس کر رہے تھے۔

نصف دن کی لڑائی کے بعد ہی کفّار کی ہمّت پست ہو گئی۔ نفسیاتی طور پر حوصلہ ہار دینے والوں کو شکست دینا دشوار نہیں ہوتا۔ یہی چیز اس وقت مشرکینِ مکّہ پر صادق آئی۔ یوں بھی سابقہ شکست نے انھیں مسلمانوں کی دلیری سے مرعوب کر دیا تھا۔ اب بھی انھیں لگا کہ مسلمان ہی غالب آ رہے ہیں۔ ان کا یہ خیال درست تھا۔ اس بار جو گھمسان کا رن پڑا تو قریش حوصلہ ہار گئے اور پلٹ پلٹ کر بھاگنے لگے۔ یہ دیکھ کر مسلمان جو جنگِ بدر میں انھیں پراگندہ کر چکے تھے، اس وقت یہ بھول گئے کہ دشمن کو پراگندہ کر کے چھوڑ دینا اتنی ہی خطرناک غلطی ہے جتنی عقب سے جھپٹنے والے حملہ آور کو نظر انداز کر دینا۔ قریش کے متعدد دلیر قتل ہوئے۔ حوصلہ بڑھانے والی خواتین حواس کھو بیٹھیں۔ شعراء جدھر کو منہ اٹھا، بھاگ اٹھے۔ علم بردار کے ہاتھ کٹ گئے تو وہ علم کو سنبھالتے سنبھالتے خود بھی گر گیا اور علم بھی۔ قریش کے دلیر میدان سے بھاگنے لگے۔

ایسے میں کچھ مجاہدین ان کا تعاقب کرنے اور کچھ سامانِ حرب سمیٹنے لگے۔ یہ دیکھتے ہی وہ پچاس تیر انداز جنھیں معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے پشت والے درّے پر مقرر کیا تھا، ان کی ہدایت بھول کر مالِ غنیمت لوٹنے لگے۔

یہ صورتِ حال وہ تھی جس نے جنگی چالوں کے ماہر خالدؓ بن ولید کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ خالدؓ بن ولید جو ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے اور فتح کی علامت بن کر کفّار کی فوج کے ساتھ جایا کرتے تھے، اس وقت بھی میدان چھوڑتے چھوڑتے رک گئے۔ یہ درست تھا کہ حربی قابلیت میں عرب قبائل میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ اسی پر یقین کرتے ہوئے قریش کے چند جوانوں نے ان کا ساتھ دیا۔ میدانِ جنگ کا چکر کاٹ کر وہ اس درّے پر پہنچ گئے اور عقب سے اتنا شدید حملہ کیا کہ مسلمان بوکھلا گئے۔ اس طرح مسلمانوں کی ذرا سی غفلت کی بدولت ان کی فتح شکست میں بدل گئی۔

میدان میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ مشرکین جو پلٹ کر بھاگ رہے تھے، لوٹ آئے۔ اب یہ موقع غنیمت تھا۔ دونوں فوجیں بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے سے الجھ گئی تھیں۔ اس بار قریش کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا نقصان

زیادہ ہوا۔ مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ نہ انھیں ایک دوسرے کی خبر تھی اور نہ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ ایسے میں کفار کی تمام تر توجہ صرف آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف تھی۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی قوت آپ ہی ہیں لہٰذا آپ ہی کو نشانہ بنا رہے تھے۔

ایسے میں معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ان کے گرد صرف گیارہ جاں نثار رہ گئے تھے۔ جو جہاں تھا، کفار کے نرغے میں گھر کر مصروفِ مقابلہ تھا جو صحابہ رضؓ کرام اس وقت موجود تھے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کفار کے حملوں سے بچانے کے لیے نثار ہو جانے کو تیار تھے۔ مشرکین کے ایک گروہ کی پوری توجہ اسی جانب تھی۔ وہ تاک تاک کر پتھر برسا رہے تھے۔ ایسے میں حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ نے اپنے ہاتھ سے سپر کا کام لیا اور اس قدر پتھر اپنے ہاتھ پر روکے کہ بازو شل ہو گیا۔ اسی وقت ابنِ قمیہ سب کو دھکیلتا ہوا نزدیک آیا اور تلوار کا بھرپور وار کیا۔ اس ضرب سے خود کی دو آہنی کڑیاں رخسارِ مبارک میں اتر گئیں۔ تکلیف کی شدت سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پسینا آ گیا۔

اب ہر جانب سے تلواریں بلند ہو رہی تھیں اور مجاہدین یہ وار خود پر لینا چاہتے تھے۔ طلحہؓ بن عبیداللہ بیکار بازو کے باوجود سامنے آ گئے۔ ابو دجانہؓ نے چہرۂ انور کی حفاظت کرنا چاہی۔ ابو طلحہؓ نے اپنی سپر سے آنے والے وار روکے۔ اس وقت ان سب جاں نثاروں کی کوشش تھی کہ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے درمیان میں رکھ کر پہاڑ پر چڑھ جائیں کیوں کہ اس وقت وہی محفوظ جگہ تھی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بچانے کی کوشش میں کئی صحابہؓ زخمی ہو گئے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پھر بھی زخموں سے نہ بچ سکے۔ ان حملوں سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ زخمی اور دندانِ مبارک شہید ہو گئے۔ زخموں سے خون جاری تھا۔ اس صدمے سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) گر گئے۔

یہ دیکھتے ہی کفار نے نعرہ بلند کیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) شہید ہو گئے۔ اس بات نے مسلمانوں میں افراتفری پیدا کر دی۔ کسی نے ہتھیار پھینک دیے، کوئی دوڑتے ہوئے آپ کو تلاش کرنے لگا اور کچھ اشتعال میں آ کر مشرکین کی صفیں اُلٹ دینے کو تیار ہو گئے۔ الغرض جو جہاں تھا مر جانے کو تیار تھا۔ سب کے دل میں ایک ہی

بات تھی کہ حضور نہیں رہے تو ہم کیوں زندہ رہیں!

یہ سوچ کر چند نے تلواریں بلند کیں اور کفار میں گھس گئے تاکہ ماریں اور مر جائیں۔ بڑی دیر غم والم کی کیفیت طاری رہی، پھر ایک دم کعب رضؓ بن مالک کی نظر آپ پر پڑی تو وہ چلّائے "مسلمانو! خوش ہو جاؤ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم یہاں موجود ہیں"

مسلمان یہ سنتے ہی اُدھر جمع ہونے لگے۔ اس دوران میں صحابۂ رضؓ کرام آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو پہاڑ پر لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت زبانِ مبارک پر یہ دعا تھی "اے خدا! میری قوم کو بخش دے، وہ نہیں جانتے"

آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے زخمی ہونے کی خبر خواتین تک پہنچی تو حضرت فاطمہ رضؓ خدمت میں پہنچیں، زخم دھوئے اور چٹائی جلا کر ان میں بھری تو خون تھم گیا۔ اس وقت آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) شدّتِ درد سے بے حال تھے۔ خود کی کڑیاں رخسارِ مبارک میں گڑی ہوئی تھیں جنھیں امین الامّت حضرت ابو عبیدہ رضؓ بن الجرّاح نے اپنے دانتوں سے پکڑ کر کھینچا تو ان کے دو دانت ٹوٹ گئے۔

یہ وقت بڑی ہی آزمائش کا تھا۔ ایسے میں صحابۂ رضؓ کرام سے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی تکلیف دیکھی نہ جاتی تھی۔

کسی نے کہا "یا رسولؐ اللہ! آپ مشرکین کو بد دعا دیجیے"

اللہ کے نبیؐ نے فرمایا "میں لعنت کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا"

جاں نثار صحابی آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو بہ حفاظت پہاڑ پر لے آئے تھے اور آپ کو آرام پہنچانے کی تدبیریں کر رہے تھے۔

ادھر بڑی دیر تک ابو سفیان کو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم)، صدّیق رضؓ اکبر اور فاروقِ رضؓ اعظم نظر نہ آئے تو اسے اضطراب ہوا۔ پہلے اس نے ارد گرد دیکھا مگر یہ ہستیاں نظر آئیں نہ ان کے جسم ہی ملے۔ تب وہ پہاڑی تک چڑھ آیا اور بلند آواز میں کہا۔

"کیا یہاں محمّد بن عبداللہ ہیں؟"

یہ آواز معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور صحابۂ رضؓ کرام تک آئی تو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے اشارے سے روکا کہ کوئی جواب نہ دے لہٰذا سکوت رہا۔ ابو سفیان بن حرب

کچھ دیر جواب کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے زور زور سے صدیقِ اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ کو آوازیں دیں۔ اس بار بھی جواب کی اجازت نہ ملی تو صحابۂ کرامؓ خاموش رہے۔ ابوسفیان نے مکرّر اور سہ کرر پکارا مگر جواب نہ پاکر خوشی سے بے قابو ہوگیا اور کہا "سب کے سب ہی مارے گئے۔"

اس وقت معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "جواب دو!"

تب فاروقِ اعظمؓ نے زور سے کہا "او دشمنِ خدا! یہ تینوں اشخاص تجھے ذلیل کرنے کے لیے زندہ ہیں۔"

ابوسفیان نے جواب سن کر لمحہ بھر توقف کیا، پھر نعرہ بلند کرتے ہوئے چلّایا "اے ہبل! تو اونچا رہ!"

"خدا اونچا اور بلند ہے۔" حضرت عمرِ فاروقؓ نے زور سے جواب دیا۔

"ہمارے پاس عزّیٰ دیوی ہے تمھارے پاس نہیں۔" ابوسفیان نے پھر کہا۔

"خدا ہمارا آقا و مالک ہے، تمھارا کوئی مالک و آقا نہیں۔" حضرت عمرِ فاروقؓ نے بھی زور سے کہا۔

اس کا جواب ابوسفیان کے پاس نہ تھا۔ لمحہ بھر وہ سوچتا رہا، لیکن واقعی مشرکین کا آقا اور مالک کوئی نہ تھا لہٰذا اب اس نے بات بدلی اور بولا "آج یومِ اُحد، یومِ بدر کے برابر ہو گیا آیندہ برس پھر لڑائی کا وعدہ ہے۔"

آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے اشارے پر حضرت عمرِ فاروقؓ نے جواب دیا۔ "ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں۔"

یہ سن کر ابوسفیان مکّے کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس وقت معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت علیؓ کو ایک دستۂ فوج کے ساتھ اس کے پیچھے جانے کا حکم دیا کہ اندازہ کریں، مشرکین کا رُخ کس جانب ہے! انھوں نے واپس آکر اطلاع دی کہ مشرکین کا رُخ مکّے ہی کی جانب ہے۔

اس جنگ میں ستّر صحابۂ کرامؓ شہید ہوئے اور چالیس مشرکین انجام کو پہنچے۔ ان کی تدفین کے بعد معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مجاہدین کو ایک شب آرام کا موقع دیا۔ اس وقت واقعی سبھی زخموں اور تھکن سے چور تھے۔ پھر آپ (صلّی اللہ

علیہ وسلم) نے فرمایا: "ابو سفیان! مدینہ منورہ پر بہ آسانی حملہ کر سکتا ہے لہٰذا تعاقب ضروری ہے"!

یہ حکم سنتے ہی ستر مجاہدین پر مشتمل مسلمانوں کی ایک جماعت آٹھ شوال کو مدینہ منورہ سے نکلی اور ابو سفیان بن حرب کے تعاقب میں روانہ ہو گئی۔ یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خیال ہی نہیں بلکہ حقیقت تھی کہ ابو سفیان نے مقام روحا تک ہی سفر کیا تھا کہ اسے مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کا خیال آیا اور وہ رک گیا۔ وہ پلٹ کر حملہ کرنے کے بارے میں مشورے کرنے لگا، لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ اسی دن قبیلہ خزاعہ کا رئیس معبد خزاعی معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر واپس ہوا تو اس نے خبر دی کہ مسلمان مقام حمراء الاسد تک آ گئے ہیں اور پورے ساز و سامان سے آرہے ہیں۔ یہ سنتے ہی ابو سفیان نے اپنا سفر پھر شروع کر دیا اور مشرکین کی تمام فوج مکے لوٹ گئی۔ کفار کے تعاقب میں اس مختصر سے سفر کو بھی مورخین نے سریہ قرار دیا ہے جب کہ اس میں نہ فوجوں کا آمنا سامنا ہوا اور نہ مقابلے کی صورت پیش آئی۔

## جنگِ اُحد میں خواتین کا کردار (نرسنگ کی ابتدا)

اس جنگ میں مسلمان اور مشرک دونوں جانب کی خواتین نے شرکت کی اور اپنے اپنے طرزِ عمل سے جنگ کے مقصد اور اپنے عقیدے کے حق و باطل ہونے کا اظہار کر دیا۔

ادھر مسلمان خواتین میں حضرت عائشہ رضی صدیقہ، اُم سلیمؓ، اُم سلیطؓ، اُم عمارہؓ، حضرت صفیہؓ اور حضرت فاطمۃ الزہرہؓ تھیں جو حوض سے پانی کی مشکیں بھر بھر کر لاتیں، مجاہدین کو پلاتیں اور جب وہ زخمی ہو جاتے تو پانی پلانے کے علاوہ ان کے زخم دھو کر خون روکنے اور زخم باندھنے کی تدبیریں بھی کرتیں۔ ان میں سبھی جوان نہ تھیں بلکہ اُم سلیمؓ، اُم سلیطؓ اور حضرت صفیہؓ تو جوان جوان بیٹوں کی مائیں تھیں۔ اُم سلیمؓ کے فرزند انسؓ بن مالک، اُم سلیطؓ کے فرزند ابو سعید خدری اور حضرت صفیہؓ کے فرزند زبیرؓ بن العوام اس جنگ میں شریک تھے، لیکن ان خواتین نے جوان خواتین کی طرح مشکیں بھرنے، تیر سمیٹ سمیٹ کر دینے اور زخمیوں کو پانی پلانے کی ان تھک خدمت کی بلکہ عام حملے کے وقت دشمن کا مقابلہ بھی کیا۔

جس وقت معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے حضرت اُمِّ عمارہ رضہ نے کفّار کی تلواروں اور تیروں کو روکنے کے لیے خود بھی تیر چلائے تھے اور ابن قمیہ کا مقابلہ کرتے ہوئے زخمی ہو گئی تھیں۔ اس وقت دنیا کی کسی قوم میں یہ دستور نہ تھا کہ خواتین ہر شعبے میں یہاں تک کہ میدانِ جنگ میں بھی مَردوں کے شانہ بہ شانہ کام کریں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی، بیماروں کی دیکھ بھال اور خدمت کا پہلا کام مسلمان خواتین نے انجام دے کر یہ مثال قائم کر دی اور دیگر اقوام کو نئی راہ دکھائی۔ حضرت صفیہ رضہ بنتِ عبدالمطلب نے اپنے بھائی حضرت حمزہ رضہ بن عبدالمطلب کا مثلہ کیا ہوا جسم دیکھا لیکن نہ روئیں۔ انھوں نے نہ گریہ کیا، نہ شور بلکہ دعائے مغفرت کی اور لوٹ آئیں۔ الغرض جنگِ اُحد میں مسلمان خواتین نے صبر و تحمّل، محنت و مشقّت اور انسانی ہمدردی کی بہترین مثال قائم کی۔

برخلاف ان کے مشرکینِ مکّہ بھی اپنی خواتین کو میدان میں لائے تھے جنھوں نے محض جوش دلانے اور انتقام کی آگ بھڑکانے کے لیے ہندہ بنتِ عتبہ، برزہ بنتِ مسعود، اُمِّ حکیم اور ریطہ کے گیتوں کی آواز دُور دُور سنائی دے رہی تھی۔ جب طبلِ جنگ بجا تو مشرکین کی جانب سے اعلانِ جنگ کے لیے ان خواتین نے دَف پر گانا شروع کیا اور گاتے گاتے میدانِ جنگ میں آ گئیں۔

ہم فلک پر چمکنے والے تاروں کی بیٹیاں، قالینوں پر چلنے والی حسینائیں ہیں۔ اگر تم دشمن سے جنگ کرو گے تو ہم تمھارے ہیں اور اگر پیٹھ دکھاؤ گے تو ہم الگ ہو جائیں گے۔

مشرکین کے ساتھ آنے والی چودہ خواتین تھیں جو مختلف مقامات پر اس طرح گا گا کر ان کی ہمتیں بڑھا رہی تھیں۔ علاوہ ازیں عام حملے کے وقت مسلمانوں کی لاشوں کو مثلہ بنا، ان کے جسم کے عضو، ناک، کان کاٹ کر ان کے ہار بناتا اور اپنے گلے میں پہن کر ایک دوسرے کو دکھانا ان کا مشغلہ تھا۔ ہندہ بنتِ عتبہ زوجہ ابوسفیان نے حضرت حمزہ رضہ بن عبدالمطلب کی لاش پر جا کر ان کا پیٹ چاک کیا، کلیجہ نکالا اور چبا گئی۔ اس وقت جب وہ کلیجہ چبا رہی تھی تو بہت سی عورتیں گیت گا رہی تھیں "آج بدر کا انتقام پورا ہو گیا۔"

پھر ہندہ نے کلیجہ اُگل دیا۔

الغرض کفّار کی عورتوں نے اپنے طرزِ عمل سے اپنے مقصد اور نیت کا اظہار کر دیا۔ بے رحمی اور شقی القلبی کی اس سے بدتر مثال شاید ہی کوئی اور ہو۔

## سورۂ آلِ عمران

سورۂ آلِ عمران کے آخری سات رکوع اسی غزوے کے بارے میں ہیں۔

جب مجاہدین پلٹ کر مدینے آئے تو افسردہ تھے۔ منافقین جو اس شکست پر مسرور تھے، بہ ظاہر ہمدردی کرتے ہوئے زخموں پر نمک چھڑک رہے تھے۔ جو جان بوجھ کر اس جنگ میں شریک نہ ہوئے تھے، اب آتے اور ظاہرداری کے انداز میں کہتے "ہمیں علم نہ تھا کہ اہلِ مکہ اتنی تعداد میں آجائیں گے ورنہ ہم بھی ساتھ دیتے"۔

یہ سب استہزا کرنے اور مسلمانوں کو شکست کا احساس دلانے والے طریقے تھے جو مجاہدین کو پشیمان بھی کر رہے تھے اور غمگین بھی۔ اس وقت معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم خود بھی زخموں سے چور چور، تھکے ہوئے اور دل شکستہ تھے۔ ایسے میں ان جلیل القدر صحابۂ کرام کی بھی کمی نہ تھی جو متعجب ہوتے کہ آخر تمام کوششوں کے باوجود ایسا کیوں ہوا؟ ان سب کیفیات کا علاج اور سوالات کا جواب ایک ہی تھا۔

"(اے نبیؐ) دل شکستہ نہ ہوں، نہ غم کیجیے۔ غلبہ تمھیں ہی ہے اگر تم مومن ہو۔ بے شک اس وقت تمھیں چوٹ لگی ہے، لیکن (یہ کیوں بھول رہے ہو) اس سے قبل ایسی ہی چوٹ تمھارے مخالف کو بھی تو لگ چکی ہے۔ (خوب جان لو) یہ زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں اور تم لوگوں پر یہ وقت اس لیے لایا گیا ہے کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سچے مومن کون ہیں اور ان راست گو لوگوں کو وہ چھانٹ لینا چاہتا تھا کیوں کہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں"۔

سورۂ آلِ عمران مختلف اوقات میں نازل ہوئی، لیکن اس کے آخری سات رکوع غزوۂ اُحد کے بعد ہی نازل ہوئے جن میں اس غزوے کا مفصّل حال ہے۔ نیز مسلمان اور منافقین کی پہچان کرا دینے کے بعد مسلمانوں کی ان تمام کمزوریوں کا ذکر ہے جو ہزیمت کا باعث بن گئی تھیں۔ بہرکیف یہ زمانہ معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم کے

لیے خاصا دشوار تھا۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو اس وقت دو بڑے فرائض کی ادائیگی درپیش تھی۔

۱۔ اس نئے اسلامی معاشرے کی نشوونما جو ہجرتِ مدینہ کے بعد وجود میں آیا تھا، اس کا مرکز تو مدینۂ منوّرہ تھا لیکن اس کا تعلّق دُور دراز کے قبائل سے تھا۔ ان سب جگہوں پر جہالت کے کہنہ طریقۂ زندگی کو مٹا کر وہاں خداوندِ عالم کے احکام کے تحت اسلامی اصول رائج کرنا تھے جو صرف معبودانِ باطل کو مٹا کر خدائے واحد کی عبادت کرنا نہیں تھا بلکہ مذہبی، اخلاقی، تمدّنی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی، ہر شعبۂ حیات میں انقلاب لے آنے کے مترادف تھے۔

۲۔ اسلام کی اصلاحی قوّت کے ساتھ بہ یک وقت مشرکینِ عرب، منافقین اور یہودی، تمام قبائل کا اس خوب صورتی کے ساتھ مقابلہ کرنا تھا کہ علم اور جہالت، حق اور باطل کا فرق نمایاں ہو جائے اور ان مخالف و مزاحم قوتوں کے دلوں کو حق مسخر کر لے۔

اب اصلاحِ معاشرہ میں مشکل یہ تھی کہ تمام مشرک قبائل، منافقین کے گروہ اور یہودی قبائل کے طرزِ عمل جُدا جُدا تھے۔ مشرکین کے مذہبی تصورات ہی غلط تھے۔ لاتعداد معبود ان کی زندگی تھے۔ مکّے میں تیرہ برس اور اب ہجرت کے دو برس بعد بھی کشمکش مخالفت کا سبب بنتی رہی۔ منافقین حقّ و باطل کے بین بین تھے جہاں اپنا مفاد پاتے، اُدھر جھک جاتے تھے اور یہود اپنی تمام بُرائیوں کو اپنی شریعت کا حصّہ تصوّر کرتے ہوئے صرف اسی کی حمایت چاہتے تھے۔ ایسے میں بہ یک وقت ان سب کی اصلاح و ہدایت کا کام سفرِ طائف کی مشکلات سے کم مشکل نہ تھا، لیکن اس موقع کے لیے صاف اور واضح حکم دے دیا گیا تھا۔

اے ایمان والو! صبر سے کام لو۔ باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ۔ حق کی خدمت کے لیے کمربستہ ہو جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اُمید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔

معاشرے کی اصلاح و تنظیم کے لیے سابقہ برس سورۃ البقرہ نازل کی گئی تھی، لیکن اب معاشرے کو اس سے زیادہ وضاحت کی طلب تھی۔ ابھی تک مسلمان علیحدہ

علیحدہ احکامِ خداوندی کی پابندی اور معلمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے احکام کی بجا آوری کرتے تھے۔ انھیں دینِ حق کے طریقے پر اجتماعی زندگی سنوارنے اور خود کو نمونہ بناکر پیش کرنے کی ضرورت تھی لہٰذا خاندان کی تنظیم کے اصول سمجھائے گئے۔ وراثت کے قانون مقرر ہوئے۔ تعزیری قوانین کی ابتدا کے ساتھ خاندانی جھگڑوں میں صلح و صفائی کے طور طریق سکھائے گئے۔ ہمدردی، محبت، طہارت اور پاکیزگی کے انداز بتائے گئے۔ الغرض حرام اور حلال کے قانون کے ساتھ عورت اور مرد کے باہمی حقوق واضح کیے گئے چنانچہ ارشاد ہوا۔

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کرکے اسی جان سے تمھارا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد، عورتیں دنیا میں پھیلائے۔ (اے لوگو) اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق طلب کرتے ہو اور قرابت کے رشتے و تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ خداوندِ عالم تم پر پوری پوری نگرانی کرتا ہے۔ (اے لوگو) یتیموں کے مال ان کو واپس کردو۔ اچھے مال کو بُرے سے نہ بدلو اور ان (یتیموں) کے مال اپنے مال کے ساتھ ملاکر نہ کھاؤ۔ یہ بہت بڑے گناہ کی بات ہے۔

اصلاحِ معاشرہ اور اس کے نظم کا کام جاری تھا۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے نجی معاملات بھی توجّہ طلب تھے۔ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم ایک شعبے کے لیے دوسرے شعبۂ زندگی کو نظر انداز کرنے کے عادی نہ تھے لہٰذا عبادات و معاملات، ایمان و عمل کے تمام امور ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ اللہ کے نبیؐ سبھی امور کو انجام دیتے تھے۔

## کچھ خانگی معاملات

اُسی برس، یعنی ہجرت کے تیسرے سال آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے اُمّ المومنین حضرت حفصہؓ سے نکاح کیا جن کے پہلے شوہر جنگِ بدر میں شہید ہوگئے تھے۔ یہ نکاح مصالحِ دینی کے تحت منفعت بخش تھا۔ اس تعلّق کے سبب آیندہ چل کر زمانۂ خلافت میں ترویجِ حدیث اور تعلیمِ نسواں کے متعدّد

کام ہوئے۔ اسی برس دخترِ رسولؐ، حضرت اُمِّ کلثوم کا نکاح حضرت عثمانِؓ غنی سے ہوا۔ ان دنوں حضرت رقیہؓ کی وفات کے باعث حضرت عثمانؓ غنی تنہا رہا کرتے تھے۔

ایک دن معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے انھیں بلا کر فرمایا "ابنِ عفان! یہ جبرئیلؑ موجود ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر کا حکم ہے کہ میں اپنی دوسری بیٹی تمھارے نکاح میں دے دوں۔"

حضرت عثمانِؓ غنی یہ سن کر خاموش ہوگئے، گویا اللہ اور اللہ کے نبیؐ کی منشا ہی ان کی مرضی تھی۔ اس طرح یہ نکاح ہوا اور "ذوالنورین" کا خطاب ملا۔

اسی برس نصف رمضان المبارک میں حضرت حسنؓ کی ولادت ہوئی۔ تب معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ساتویں دن عقیقے کے مینڈھے ذبح کیے اور بالوں کے برابر چاندی کا صدقہ دیا۔

اسی زمانے میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے منہ بولے بیٹے زیدؓ بن حارث کا نکاح اپنی پھوپی زاد بہن حضرت زینبؓ سے کیا۔ خاندانِ ہاشمی کے اکثر افراد اس نکاح کے خلاف تھے۔ خود حضرت زینبؓ کا قول تھا کہ میں نسب میں اس شخص (زید) سے بہتر ہوں۔ یہی خیال ان کے والدین کا بھی تھا لیکن اس وقت جب وہ لوگ یہ پیغام رد کر دینے کو تیار تھے تو ارشادِ خداوندی ہوا۔

کسی مردِ مومن اور کسی زنِ مومن کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو وہ اس معاملے میں خود فیصلہ کریں اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔

یہ حکم سنتے ہی حضرت زینبؓ بنتِ جحش اور ان کے تمام اقربا بلا تامّل اس نکاح پر رضامند ہوگئے۔ تب اپنے منہ بولے بیٹے اور غلام حضرت زیدؓ بن حارث کی طرف سے معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دس دینار اور ساٹھ درہم مہر ادا کر کے یہ نکاح پڑھایا اور حضرت زینبؓ بنتِ جحش محض خوشنودیٔ خداوندی اور منشائے رسولؐ پر رخصت ہو کر زیدؓ بن حارث کے گھر چلی گئیں۔

## کفّار کے حوصلے (داعیانِ اسلام کی شہادت)

غزوۂ اُحد کے بعد مشرکینِ مکّہ، یہودی قبائل اور مدینۂ منوّرہ کے مارِ آستین

منافقین کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے۔ اب انھوں نے اسلام کو زک پہنچانے اور مسلمانوں کو پامال کرنے کے لیے نئے انداز اختیار کیے۔ اس کا پہلا اظہار اس طرح ہوا کہ غزوۂ اُحد کے دو ماہ بعد ہی محرم الحرام ۴ھ میں قبیلۂ بنو اسد نے مدینۂ منوّرہ پر حملہ کرنے کی مکمل تیاری کی۔ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مخبروں کے ذریعے معلوم ہوا تو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے اس حملے کی روک تھام کے لیے ابوسلمہؓ کی زیرِ کمان ڈیڑھ سو مجاہدین کا دستہ روانہ کیا۔ قبل اس کے کہ بنی اسد کے شر پسند مدینۂ منوّرہ تک آتے، ابوسلمہؓ کی فوج ان کے سر پر پہنچ گئی اور قطن کے مقام ہی سے یہ لوگ خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے۔ سارا ساز و سامان مسلمانوں کے ہاتھ آگیا جسے لے کر وہ مدینۂ منوّرہ لوٹ آئے۔

اِدھر چھوٹے چھوٹے چھاپا مار دستے تیاری کرتے اور مسلمان دستوں کی آنے کی خبر سن کر راہِ فرار اختیار کر لیتے، اُدھر جنگِ احد کے بعد قریش بھی اندر خانہ سازش کر رہے تھے۔ انھی دنوں طلحہ جو جنگ میں مارا گیا تھا، اس کی بیوی سلافہ نے اعلان کیا کہ جو کوئی بھی عاصمؓ بن ثابت (طلحہ کے قاتل) کو موت کے گھاٹ اتار دے گا، اسے ایک سو شتر انعام دے گی۔ اس دعوت کا تعلق قبائلِ عضل اور قارہ سے تھا۔

یہ اعلان سن کر سات آدمی جو چال بازی اور حربہ آزمائی میں ہر طرح سے کامیاب تصوّر کیے جاتے تھے، مدینۂ منوّرہ کی جانب روانہ ہوئے اور خدمتِ اقدس میں آکر عرض کیا: "یا رسول اللہ! ہمارے دونوں قبیلے عضل اور قارہ مسلمان ہونا چاہتے ہیں اور ہمیں کسی معلّم کی ضرورت ہے جو ہم سب کو دین کی تعلیم دے سکے!"

یہ گزارش سن کر معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے چھ جلیل القدر صحابیؓ ان کے ساتھ بھیج دیے۔ اتفاق کی بات تھی کہ ان صحابۂ کرام میں حضرت عاصمؓ بن ثابت بھی شامل تھے جن پر سلافہ زوجۂ طلحہ نے انعام مقرر کیا تھا۔ ان تمام صحابۂ کرام کے اسمائے گرامی تاریخ میں اس طرح درج ہیں۔

۱۔ مرثدؓ بن ابی مرثد غنوی

۲۔ خالدؓ بن بکر لیس

۳۔ حبیبؓ بن عدی

۴۔ عاصمؓ بن ثابت، فاروقِ اعظم کے نانا
۵۔ زیدؓ بن دثنہ
۶۔ عبیداللہؓ بن طارق

جس وقت یہ کبار صحابہؓ، مدینۂ منورہ سے نکلے تو قریش کے دو سَو جوان ان کے منتظر تھے۔ اس وقت انھیں اندازہ ہوا کہ یہ قریش اور ان قبائل کی سازش ہے، اگرچہ چھ معلمین اور دو سَو شرپسندوں کا مقابلہ ناممکن تھا لیکن قریش کے جوانوں نے ان میں سے چار کو شہید کر دیا۔ وہ حبیبؓ بن عدی اور زیدؓ بن دثنہ کو پکڑ کر مکّے لے گئے۔
یہ واقعہ مقامِ رجیع پر پیش آیا لہٰذا اسی نام سے مشہور ہے۔ اہلِ مکّہ نے ان دونوں صحابہؓ کو خرید لیا پھر ایک کو اذیتیں دے دے کر شہید کر دیا اور حبیبؓ بن عدی کو پھانسی پر لٹکا دیا۔

انھیں پھانسی دینے سے قبل اہلِ مکّہ نے دریافت کیا کہ کوئی آرزو بیان کرو تو انھوں نے جواب دیا: "مجھے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت دے دی جائے۔"

معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ واقعہ سنا تو بہت رنج ہوا۔ یہ واقعہ صفر چار ہجری میں پیش آیا۔

## سریہ بیرِ معونہ

ابھی اس واقعے کو چند دن ہی گزرے تھے کہ اسی ماہ میں بنی عامر کے سردار ابوبراء نے خدمت میں آکر درخواست کی: "یارسولُ اللہ! مجھے اپنے قبیلے میں اشاعتِ دین کے لیے کچھ مبلغ درکار ہیں۔ کیا آپ کچھ مبلغین کو ہمارے قبیلے میں بھیج کر احسان کریں گے؟"

معلّمِ اعظم صلّی اللہ وسلّم نے اس سردار کی درخواست پر ایک تبلیغی وفد روانہ کر دیا جو ستّر جوانوں پر مشتمل تھا اور منذرؓ بن عمرو ان کے سردار تھے۔

اس وقت آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ابوبراء عامر بن مالک سے فرمایا: "مجھے اندیشہ ہے کہ وہاں کے لوگ بھی میرے آدمیوں کے ساتھ غداری نہ کریں!"

یہ سنتے ہی ابوبراء نے عرض کیا: "یارسولُ اللہ! اس کا ذمّے دار میں ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا!"

ہر طرح سے اطمینان کرنے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ وفد روانہ کیا۔ ان میں اکثریت انصار کی تھی جو درس گاہِ صُفّہ سے علم حاصل کر کے اشاعتِ دین کا کام کیا کرتے تھے۔ جب یہ لوگ مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر بیرِ معونہ کے مقام پر پہنچے تو اچانک بنی سلیم کے قبائل، عُصیہ، رعل اور ذکوان نے ان واعظانِ اسلام کو نرغے میں لے کر قتل کر دیا۔ ان میں صرف کعبؓ بن زید کسی طرح بچ کر خدمتِ اقدس میں واپس آئے۔ ان پے در پے حالات نے مسلمانوں کو بڑا دل شکستہ کیا۔

بنی عامر کا سردار عامر بن مالک ان ستر واعظین کو اپنی حفاظت کا وعدہ کر کے لے گیا تھا جن میں سے اُنہتر کی بے رحمانہ شہادت کا سبب وہی تھا۔ اس قبیلے (بنو عامر) کے حلیف بنو نضیر تھے جو ابھی تک مدینہ منورہ میں عیش کی زندگی گزار رہے تھے۔ اندر خانہ فساد برپا کرنا اور مدینہ منورہ کی باتیں دُور دُور پھیلانا ان کا کام تھا۔ معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوچا کہ بنو عامر کے اس فریب سے بنو نضیر کو آگاہ کر کے ان سے گفتگو کی جائے۔ یہ سوچ کر آپ، یہودیوں کے اس قبیلے کی طرف روانہ ہو گئے۔

## بنو نضیر کی جلاوطنی۔ (ربیع الاول ۴ھ اگست ۶۲۵ء)

جس وقت معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم، بنو نضیر سے گفتگو کے لیے تشریف لے گئے تو ان کے ہر گھر میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ واعظانِ اسلام کی شہادت ان کے لیے مسرت بخش تھی۔

بہ ظاہر ان کے معزّزین نے معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنی اور بولے۔

"آپ جو فیصلہ بھی کریں گے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

اپنی اس حمایت کا اظہار کر کے انھوں نے معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو سایہ دار جگہ بٹھا دیا پھر وہ ایک جگہ جمع ہوئے اور مشورہ کرنے لگے کہ یہ موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا، انھیں (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ٹھکانے لگا دینا چاہیے۔ اس فیصلے کے بعد انھوں نے اپنے ایک دلیر عمرو بن حجاش کو دیوار کے عقب میں چھپا دیا کہ وہاں سے ایک بڑا پتھر لڑھکا کر آپ کو ختم کر دے۔ انھوں نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو شہید کرنے کی سازش تیار کی تھی اور کوئی لمحہ جاتا تھا کہ، یہ سازش کامیاب ہو جاتی کہ اللہ کے نبیؐ

کو اس کی خبر ہو گئی۔ وہ بہ عجلت اس جگہ سے اس طرح اٹھ گئے جیسے کسی ضرورت کے لیے اٹھے ہوں اور دوبارہ واپس آنے یا بنو نضیر کے معززین سے گفتگو کرنے کی بجائے مدینۂ منورہ تشریف لے گئے۔

اس وقت مسلمان ہر جانب سے خطروں میں گھرے ہوئے تھے۔ جنگِ اُحد میں ان کی ہوا اُکھڑ چکی تھی، سخت جانی اور مالی نقصان بھی برداشت کر چکے تھے۔ ایسے میں دشمن انھیں کم زور تصوّر کرتے ہوئے گھیر لینا اور مزید نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ بیرونی مخالفین سے زیادہ خطرناک یہ اندرونی دشمن تھے۔ یہ لوگ شروع سے اسلام کی راہ میں مزاحم تھے۔ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم ہمیشہ ہی ان سے تحمّل کا برتاؤ کرتے اور ان کی چھوٹی چھوٹی خطاؤں کو معاف فرماتے رہے، لیکن اب اس خطرناک سازش کے بعد رحم کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس پر بھی اللہ کے نبیؐ نے عجلت نہ فرمائی۔ بنو نضیر نے آپ کے چلے جانے کو مصروفیت سمجھا تھا۔ وہ اب نئے انداز سے آپ کو پھانسنا چاہتے تھے۔ اس بار انھوں نے پیغام بھیجا کہ آپ اپنے تیس آدمیوں کو لے کر آجائیے، ہم بھی اتنے ہی آدمی لے آئیں گے۔

اس کے جواب میں معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اس ملاقات سے قبل ایک معاہدہ ہونا چاہیے مسلمان اب اعتماد نہیں کر سکتے۔

ادھر بنو نضیر اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے درمیان یہ پیغام رسانی ہو رہی تھی، اُدھر سے عبداللہ بن ابی ابنِ سلول نے بنو نضیر کی پیٹھ ٹھونکی اور انھیں حوصلہ دلایا کہ کسی معاہدے اور ملاقات کی ضرورت نہیں ہے، میری دو ہزار فوج تمھاری مدد کے لیے ہر دم تیار ہے۔ پھر بنو قریظہ بھی تمھارے مددگار رہوں گے اور مشرکینِ مکّہ تو ہیں ہی مسلمانوں کے دشمن۔

یہ حوصلہ ملتے ہی بنو نضیر نے معاہدے والی شرط ٹھکرا دی۔ یہ انکار سننے کے بعد آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم)، بنو قریظہ سے ملے اور ان سے تجدیدِ معاہدہ کی گفتگو کی تو وہ راضی ہو گئے۔

یہ دیکھتے ہوئے بنو نضیر نے ایک نئی چال چلی اور انھیں پیغام بھیجا کہ ہم معاہدے کے لیے تیار ہیں، لیکن آپ اس گفتگو کے لیے صرف تین آدمیوں کے ساتھ آئیے۔

معلمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم جو مقابلہ اور تشدّد نہ چاہتے تھے۔ اس بات پر راضی ہو گئے۔ طے پایا کہ بنو نضیر اپنے تین عالِم اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اپنے تین ساتھی لے کر آجائیں اور ان کے درمیان بات چیت ہو جائے۔ اگر ان کے تین علماء، دینِ حق کو تسلیم کر لیں گے تو وہ (بنو نضیر) بھی ایمان لے آئیں گے۔

یہ سن کر معلمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک بار پھر تحمّل و ضبط سے کام لینا چاہا، لیکن قبل اس کے کہ آپ اس تدبیر کو عملی جامہ پہناتے آپ کو معلوم ہوا کہ اس دعوت کے لیے یہودی ہتھیار بند تیار ہیں تاکہ آپ جب تین نفوس کے ساتھ جائیں تو وہ قتل کر دیں۔ یہ جان کر معلمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے پیش قدمی کا حکم صادر فرمایا اور مدینے میں عبداللہ بن مکتوم رضؓ کو اپنا قائم مقام بنا کر رائتِ لشکر حضرت علیؓ کو عطا فرمایا اور بنو نضیر کی طرف روانہ ہو گئے۔

بنو نضیر، بنو قینقاع کی طرح قلعہ بند ہو گئے۔ ابھی تک انھیں اپنے مضبوط قلعے اور احباب سے بڑی توقّعات وابستہ تھیں جو تمام تر غلط ثابت ہوئیں۔ نہ بنو قریظہ ہی نے ان کی مدد کی اور نہ عبداللہ بن ابی ابنِ سلول اپنی دو ہزار فوج کے ساتھ باہر نکلا۔ انھیں اسلام کی اعلانیہ مخالفت کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس کا اندازہ بنو نضیر کو اب ہوا تھا لیکن پھر بھی قلعہ بند ہو کر وہ خود کو محفوظ تصوّر کر رہے تھے۔ اس طرح کامل چودہ دن گزر گئے معلمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے قلعے کو تسخیر کرنے کی ایک نئی صورت آزمائی اور قلعے کے گرد نخلستان کے بارے میں حکم صادر فرمایا کہ اسے کاٹ ڈالا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور ابھی چند درخت ہی کٹے تھے کہ بنو نضیر کے یہودی برداشت نہ کر سکے اور صلح پر آمادہ ہو گئے۔ کھجور کے یہی درخت تھے جن کے بارے میں ارشادِ ربّانی ہے "(اے نبیؐ!)، آپ نے لینتہ (ایک خاص کھجور) کے جو درخت قطع کرائے اور جو رہنے دیے وہ سب اللہ کے حکم ہی سے تھا، محض اس لیے کہ خدا فاسقوں کو رسوا کرے۔"

یہ ان کی رسوائی ہی تھی کہ اسلام کو زک پہنچانے کی اتنی تدبیریں کر کے بھی ناکام رہے اور اپنی حفاظت کے لیے قلعہ بند ہوئے تو بھی محفوظ نہ رہ سکے اور صلح کی تمنّا کرنے لگے۔ اللہ کے نبیؐ نے ان سے صلح کرنے کی بھی وہی شرط رکھی جو اُن سے

قبل بنو قینقاع سے رکھی تھی، یعنی یہ کہ مدینہ چھوڑ کر چلے جائیں۔ اس وقت نہ ان کے حمایتیوں کو سامنے آنے کی جرأت ہوئی نہ ان کے احباب کو البتہ معلم اعظمؐ نے خود اتنی رعایت فرمائی کہ وہ جلا وطنی کے وقت ضرورت کا جو بھی سامان چاہیں لے جا سکتے ہیں چنانچہ وہ اونٹوں پر سامان لاد کر مدینۂ منورّہ سے نکل گئے۔ اس طرح مضافاتِ مدینہ کا پورا وہ حصّہ جو بنو نضیر کے پاس تھا، ان کے قطعاتِ اراضی، باغات، گڑھیاں اور مال مویشی مسلمانوں کو مل گئے اور وہ بد عہد اسلام کے دشمن خیبر کے نواح میں جا کر آباد ہو گئے۔

بنو نضیر کے سردار کا نام حیّ ابنِ الخطب تھا اور اس قوم کے دوسرے رئیس سلام بن مشکم اور کنانہ بن الربیع تھے۔ یہ لوگ اس وقت جان بچانے اور اہل و عیال کو لے جانے ہی کو غنیمت تصوّر کر رہے تھے، لیکن مدینۂ منورّہ سے نکلتے ہی ان کے دل نفرتوں سے بھر گئے۔ یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے رہے اور آگے جا کر یہی نفرت ایک بہت بڑی جنگ کا پیش خیمہ بن گئی۔

اس طرح اسلام اور کفر کے درمیان مقابلے ہوتے رہے اور جنگِ اُحد کے دوران میں جو تاثر قائم ہوا تھا اور جسے مسلمانوں نے اپنی شکست تصوّر کر لیا تھا، اب مٹنے لگا۔ یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا عزم اور تدبر تھا کہ جہاں کہیں کفار جمع ہو کر اسلام کے خلاف تدبیریں کرتے، مخبر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو آگاہ فرما دیتے۔ بنو نضیر کی سرکوبی کے دوران میں اطلاع ملی کہ قبیلہ بنی غطفان کے دلیر بھی مقابلے کے متمنّی ہیں۔ معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم انھیں بھی محروم کرنے کو تیار نہ تھے لہٰذا مجاہدین کے چار سَو کے لشکر کے ساتھ روانہ ہوئے اور ذات الرّقاع کے مقام پر انھیں جا لیا۔ اس اچانک حملے نے انھیں حواس باختہ کر دیا، وہ یک جا ہونے کے باوجود مقابلے کی جرأت نہ کر سکے اور جان بچانے کے لیے پہاڑوں میں منتشر ہو گئے۔ ان کا مال و اسباب مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ مسلمان لوٹ آئے اس وقت بنی غطفان کے چند جوان جو اسلام کی طرف مائل ہو گئے تھے، رازدارانہ طور پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ملے۔ ان میں نعیمؓ بن مسعود مشہور صحابی ہوئے۔ معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اس کامیابی کے بعد واپس آئے، لیکن اس زمانے میں تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور

صحابۂ کرام کو لمحہ بھر کے لیے بھی سکون اور چین نہ تھا کیوں کہ صرف یہی ایک شعبہ تو نہ تھا جس پر آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) توجہ فرماتے۔

## نئی تدابیر

ہجرت سے لے کر غزوات و سرایا اور اندرونی و بیرونی مخالفین سے مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ مسلم معاشرے کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں اصلاح کا کام مسلسل جاری تھا۔ سورۃ البقرہ اور سورۃ النساء میں مسلمانوں کے لیے وراثت، تبنّیت (گود لینا)، تعدادِ نکاح، طلاق، معیشت و معاشرت اور حرمت کے قوانین نافذ فرما دیے گئے تھے۔ اس سال شراب حرام کی گئی، معیشت و معاشرت اور دیگر معاملاتِ زندگی کے لیے نئے ضابطے نافذ کیے گئے۔ مدتِ دراز سے یہ لوگ جن بُرائیوں کا شکار تھے، جب ان کے خلاف احکامِ خداوندی نازل ہوتے تو مسلمان مہاجرین اور انصار تو انھیں دل سے قبول کر لیتے، لیکن منافقین اور مرتد تاویلیں پیش کرتے ہوئے اس انداز سے سوال کرتے کہ سننے والے بھی شک میں پڑ جاتے۔ اس طرح افواہوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ غزوۂ بدر اور اُحد کے بعد یتیم اور بیوہ عورتوں کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ یتیم مال دار بچے، یتیم غریب بچے جو ذمے داری بن گئے تھے، ان سب کے بارے میں احکام پر آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اس چھوٹی سی بستی میں باقاعدہ عمل کرا رہے تھے اور خود عملی نمونہ پیش کر رہے تھے۔ جنگِ اُحد کے بعد ستّر صحابہؓ کی شہادت نے شہداء کی میراث، یتیموں اور لاوارثوں کے مفاد کے تحفّظ کا سوال پیدا کر دیا تھا جن کے لیے احکام نازل ہوئے۔ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم انھیں نافذ کراتے گئے۔ انھی احکام پر عمل کرنا مسلم معاشرے کی تعمیر اور درستی تھی۔ اس وقت وراثت کے حقوق متعیّن کرنے کے لیے سب سے اہم حکم تبنّیت کی جاہلانہ رسم کا خاتمہ تھا۔ اس دور کا رواج تھا کہ لاولد لوگ کسی کے بیٹے کو متبنّیٰ کر لیتے تھے اور ان کا خاندان اسے بالکل صلبی بیٹے کی حیثیت دیا کرتا تھا۔ اس کے حقوق اس قدر تھے کہ اس بیٹے کی مطلقہ یا بیوہ (مثل بہو کے تصوّر کی جاتی تھی) چنانچہ یہ جاہلانہ رسم وراثت کے معاملے میں بھی بہت سی بُرائیاں پیدا کر دینے کا باعث تھی۔ اسلام سے قبل معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے کم سن غلام زیدؓ بن حارث کو آزاد کر کے اپنا بیٹا

بنا لیا تھا۔ یہاں تک کہ اہلِ مکہ انھیں ابنِ محمدؐ کہا کرتے تھے۔ بعد ازاں ان کی بے پناہ خصوصیات دیکھ کر آپ نے اپنی پھوپی زاد زینبؓ بنتِ جحش سے ان کی شادی کر دی تھی۔ وہ زیدؓ بن حارث کو کم تر تصوّر کیا کرتی تھیں۔ اس طرح ان دونوں کے درمیان تلخیاں بڑھتی گئیں۔ حضرت زیدؓ بن حارث خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے اور حقیقتِ حال بیان کرتے۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) انھیں شائستگی سے سمجھا دیتے۔ اسی کا ذکر قرآنِ حکیم میں اس طرح کیا گیا ہے: "اے نبیؐ! یاد کرو وہ موقع جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر!"

اس وقت کوئی بات بھی کارآمد نہ ہوئی۔ ایک برس کے اندر ہی اندر طلاق تک نوبت پہنچ گئی اور حضرت زینبؓ بنتِ جحش طلاق لے کر واپس آ گئیں۔ اب وہ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے مُنہ بولے بیٹے کی مطلقہ بھی تھیں اور یہی زمانہ تبنیّت کے خاتمے کا تھا۔ دیگر بُری رسموں کی طرح اسلام نے اس بُری رسم کو بھی ختم کر دیا تھا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ اوّل تو زینبؓ بنتِ جحش آپ کی پھوپی کی بیٹی تھیں جن کی شادی آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی مرضی و منشا بلکہ حکم سے ہوئی تھی اور وہ شادی ناکام ہو چکی تھی۔ دوسرے تبنیّت کی جاہلانہ رسم کے خاتمے کے لیے خود آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے عملی طور پر ثبوت پیش کیا اور تیسری مگر سب سے اہم بات یہ کہ یہ شادی منشائے خداوندی تھی جس کے بارے میں ارشادِ ربّانی ہے: "جب زید اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس (مطلقہ خاتون) کا آپ سے نکاح کر دیا تاکہ مومنوں پر اپنے مُنہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں تنگی نہ رہے۔"

گویا یہ خداوندِ عالم کا حکم تھا جو وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا کے مصداق عمل میں آنا ہی تھا۔ یوں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے زینبؓ بنتِ جحش سے نکاح کیا۔

یہ واقعہ وہ تھا جس نے منافقینِ یہود اور مشرکینِ مکہ سبھی کو معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خلاف زبان دراز کرنے کا موقع دے دیا۔ دشمنی تو انھیں اسلام اور اسلام کی مسلسل ترقی سے تھی، لیکن اب دلوں کا حسد اور جلن نکالنے کے لیے طعن

اور بہتان کی ایک مہم شروع ہو گئی۔ اس کی ابتدا تو منافقین ہی نے کی تھی لیکن اسے کمال تک لے جانے میں یہود اور مشرکین بھی کم نہ تھے۔ اس سلسلے میں عجیب و غریب قصے گھڑے گئے۔ دراصل یہ بھی دشمنی کا ایک انداز تھا۔ چوری چھپے نقصان پہنچانا، بہ بانگِ دہل ہزل گوئی کرنا اور جب بس نہ چلے تو بدنام کرنا۔ یہ سب دشمنوں ہی کے طریقے ہیں، سو سب طریقے آزمائے جا رہے تھے اور یہ بات تو اُچھالا کے لیے بہت بڑی تھی کہ متبنّیٰ کی مطلقہ سے نکاح کر لیا۔ وہ لوگ جو تبنیت پر ایمان رکھتے تھے، اس واقعے کو خوب اچھالنے لگے، لیکن معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم کو وہ کام مکمّل کرنا تھا جس کا حکم ملا تھا۔ اللہ کے ہر حکم کو عمل میں لانا تھا خواہ کچھ بھی ہو جاتا یا پھر قدرت خود ہی اس ماحول کو مزید احکام کے لیے تیار کر رہی تھی۔ بہرحال وقت گزرتا گیا لوگ دلوں کی بھڑاس ناشائستہ الفاظ کی صورت میں نکالتے گئے، اور اللہ کے نبیؐ صبر و تحمّل کے ساتھ صورتِ حال کا مقابلہ کرتے رہے کیوں کہ خود خداوندِ عالم نے صبر کی تلقین فرمائی تھی اور ارشاد تھا "اے نبیؐ! اللہ سے ڈرتے رہیے اور کفّار اور منافقین کی اطاعت نہ کیجیے۔ حقیقت میں اللہ ہی علیم و حکیم ہے۔ ہاں اطاعت اور پیروی اس بات کی کیجیے جس کا اشارہ رب کی طرف سے دیا جا رہا ہے۔ اللہ تو ہر اس بات سے باخبر ہے جو لوگ کرتے ہیں۔ پس آپ اللہ پر توکّل کیجیے، وہی وکالت کرنے والا ہے۔ اللہ نے کسی شخص کے دھڑ میں دو دل نہیں رکھے اور نہ اس نے ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو، ماں بنا دیا ہے اور نہ مُنہ بولے بیٹوں کو حقیقی بیٹا بنا دیا ہے۔"

یہ آیاتِ ربّانی مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے تھیں، لیکن کفّار جو ان پر ایمان نہ ہی رکھتے تھے، ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے اور شکوک و شبہات پیدا کرتے رہے۔ یوں کافی وقت گزر گیا۔ تب مخبروں نے کفّار کی کچھ تیاریوں کے بارے میں اطلاعات دیں جن میں اہم ترین تیاری ابوسفیان کی تھی۔

## بدر الموعوده

آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم، اور صحابۂ کرام کو یاد تھا کہ جنگِ اُحد سے واپسی پر ابوسفیان نے اعلانیہ کہا تھا کہ آیندہ برس ہمارا تمھارا پھر مقابلہ ہو گا اور معلّمِ اعظم صلّی اللہ

علیہ وسلم نے اسے قبول کیا تھا۔ اب جنگِ اُحد کو ایک برس ہو گیا تھا اور اللہ کے نبیؐ اپنے وعدے سے پھرنے والے نہ تھے۔ از خود پیش قدمی کرنا بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عادت نہ تھی، لیکن انھی دنوں افواہ پھیلی کہ ابوسفیان بڑی تیاری کے ساتھ مقابلے پر آنے والا ہے۔ تب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی جہاد کا اعلان فرما دیا اور پندرہ سَو مجاہدین کے ساتھ بدر کے مقام پر پہنچ گئے۔ اُدھر سے واقعی یہ افواہ درست تھی کیوں کہ ابوسفیان دو ہزار دلیروں کے ساتھ مکّے سے نکلا، لیکن مرالظہران تک آتے آتے اس کی رائے بدل گئی۔ وہ مقابلے پر آنے کی ہمت نہ کر سکا اور اس جگہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کامل آٹھ یوم تک اس کا انتظار کیا۔ اس دوران میں آپ اردگرد کا چکّر لگاتے اور مجاہدینِ اسلام بھی خرید و فروخت اور تجارت کے لیے میل جول بڑھاتے اور کاروبار کرتے رہے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مجاہدین نے یہ وقت مصروف رہ کر گزارا، دوسرے قرب و جوار کے علاقوں پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تشریف لے آنے کے بعد بھی مسلمانوں کی قوّت اور حوصلہ موضوعِ گفتگو بنا رہا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد وہ واقعہ پیش آیا جس نے یہ واضح کر دیا کہ اسلام کی قوّت کی برابری عرب کے قبائل نہیں کر سکتے اور جو کوئی بھی مقابل آئے گا مُنہ کی کھائے گا۔

## دَومتہ الجندل۔ ربیع الاوّل ۵ھ (اگست ۶۲۶ء)

یہ عرب اور شام کی سرحد پر تجارتی لحاظ سے بڑا اہم مقام تھا۔ یہاں سے شام، مصر اور عراق کے تجارتی قافلے گزرتے تھے لہٰذا یہ جگہ لُوٹ مار کے لیے بھی مناسب تھی۔ اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہاں کے لوگ قافلوں کو لوٹتے اور مسافروں کو تنگ کیا کرتے تھے۔ یہاں کے سردار کا نام اکیدر بن عبدالملک تھا جو مذہباً عیسائی اور ہرقل کا اطاعت گزار تھا۔ اُن دنوں مسلمان تجارت کے لیے جاتے تو اکیدر کے آدمی انھیں ستاتے اور لُوٹ مار کرتے۔ معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حالات کی خبر ملی تو سرکوبی کا فیصلہ کیا اور ایک ہزار صحابۂ کرامؓ کی جماعت کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

جس وقت مسلمان منزل بہ منزل سفر کرتے ہوئے دومۃ الجندل تک پہنچے تو اکیدر یا اس کے آدمی مقابلے پر آنے کی جرأت نہ کر سکے اور علاقہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ایک شخص اور چند مویشیوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا، لیکن پورے شمالی عرب پر اسلام اور مسلمانوں کی قوت کا سکہ جم گیا۔ یہ سفر تقریباً چوبیس پچیس دن کا تھا۔ یہاں بھی مقابلے کی نوبت نہ آئی۔ دشمن مرعوب ہو کر بھاگ گیا اور مسلمان مدینۂ منورہ لوٹ آئے۔ اس زمانے میں محض آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سکون غارت کرنے کے لیے منافقین نئی نئی خبریں پھیلاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دو مرتبہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دشمن کی آمد کی خبر ملی اور دونوں مرتبہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مجاہدین کے ساتھ مدینۂ منورہ سے نکلے، لیکن مقابلہ نہ ہوا کیونکہ دشمن سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اسی زمانے میں معتبر ذرائع سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اطلاع ملی کہ حارث بن ابی ضرار مسلمانوں کے خلاف تیاریاں کر رہا ہے۔

**بنی مصطلق** (غزوۂ مریسیع) شعبان ۵ھ (جنوری ۶۲۷ء)

بنو خزاعہ، قریش کا حلیف قبیلہ تھا جس وقت قریش اور یہود کی متفقہ سازشیں تمام قبائل میں آگ لگا رہی تھیں، اس وقت بنو خزاعہ بھی جوش میں آگئے۔ اس قبیلے کی سب سے ممتاز شاخ بنو المصطلق تھی۔ اسے حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے ہونے پر فخر تھا۔ یہ لوگ مقام مریسیع (مدینۂ منورہ سے نو منزل کے فاصلے) پر آباد تھے۔ حارث بن ابی ضرار اس خاندان کا سردار تھا۔ اس نے مسلمانوں کے خلاف زبردست تیاریاں کیں۔ یہ خبر مدینۂ منورہ تک پہنچی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے ذرائع سے مزید معلومات حاصل کیں اور صحابۂ کرامؓ کو تیاری کا حکم صادر فرمایا۔ اس موقع پر مدینے کے منافق عبداللہ بن ابی ابن سلول کی جماعت بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ تھی۔ اس مرتبہ مدینۂ منورہ میں زیدؓ بن حارث کو چھوڑا گیا۔ مہاجرین کا علم صدیق اکبر حضرت ابوبکرؓ کے پاس تھا۔ انصار کا علم حضرت سعدؓ بن عبادہ کو عطا ہوا۔ اس فوج کی روانگی بڑی خاموشی اور رازداری کے ساتھ عمل میں آئی، لیکن مریسیع کے مقام پر پہنچتے پہنچتے راز نہ رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جونہی حارث بن ابی ضرار کو مسلمانوں کی

آمد کی اطلاع ملی، اس کے بیشتر سپاہی گھبرا گئے۔ اس کے باوجود انھوں نے اور مریسیع کے باشندوں نے دلیری کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ فریقین کا مقابلہ مریسیع کی آب گیر پر ہوا جس میں دشمن کو شکستِ فاش ہوئی اور چھ سَو افراد اسیر ہوئے۔ ان میں سردارِ قبیلہ حارث بن ابی ضرار کی دختر جویریہؓ بھی تھیں۔ مالِ غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ملیں۔

واقعات کے لحاظ سے یہ جنگ اہم نہیں لیکن نتائج کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ دوسرے اس جنگ میں چند واقعات نے غیر معمولی شہرت پائی۔

واقعات یہ ہیں، عبداللہؓ بن عبداللہ کی گزارش، جویریہؓ بنتِ حارث اور واقعۂ افک۔

(ا) حضرت عبداللہؓ بن عبداللہ: یہ مدینے کے منافق عبداللہ بن ابی ابنِ سلول کے فرزند تھے جو باپ کے ہم نام تھے اور باپ جس قدر اسلام دشمن تھا یہ اتنے ہی دین کے شیدائی تھے۔ جس وقت فوج مدینے سے روانہ ہوئی تو بہت سے منافق مالِ غنیمت کے لالچ میں ساتھ آگئے۔ ان کا اصل مقصد موقع ملتے ہی فتنہ بپا کرنا اور افواہیں پھیلانا بھی ہوا کرتا تھا۔ اثنائے راہ میں پانی کے ایک چشمے پر انصار اور مہاجرین میں اختلافِ رائے ہوا تو عبداللہ بن ابی ابنِ سلول کو ایک خوب صورت موقع مل گیا۔ اس نے انصار کو مزید بھڑکانے کی کوشش کی اور کہا: "تم نے تو یہ مصیبت خود بلائی ہے، اب بھی ہاتھ اٹھا لو تو نکل جائیں گے۔"

یہ بات چند صحابہؓ نے بھی سن لی۔ اس وقت فاروقِ اعظمؓ اس بات کے طالب تھے کہ منافق کی گردن اُڑا دینے کا حکم صادر کیا جائے تو وہ اُڑا دیں۔

معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے سُنا تو فرمایا: "کیا تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ کفّار یہ چرچا کرنے لگیں کہ محمدؐ بن عبداللہ اپنے ساتھیوں کی گردن اُڑاتے ہیں؟" صحابۂ کرامؓ خاموش ہو گئے۔ اِدھر یہ سب ہو رہا تھا، اُدھر حضرت عبداللہؓ بن عبداللہ کو کسی نے اطلاع دی کہ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) عبداللہ بن ابی ابنِ سلول کے قتل کا حکم جاری کرنے والے ہیں۔

یہ سنتے ہی وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسولؐ اللہ!

آپ جانتے ہیں کہ میں دل سے ایمان لایا ہوں اور اپنے والد کا بھی خدمت گزار ہوں۔ اب اگر ایسی صورتِ حال پیش آئی ہے تو للہ اس قتل کا حکم مجھی کو دیجیے، میں ابھی سر کاٹ کر لاتا ہوں۔ آپ میرے والد کے قتل کا حکم کسی اور کو دیں گے تو میں برداشت نہ کرسکوں گا۔ ہوسکتا ہے کہ عزت کے سبب اور محبتِ پدری سے مجبور کر میں اپنے باپ کے قاتل کو قتل کردوں۔"

یہ گزارش بڑی عجیب تھی۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے بڑے تحمّل کے ساتھ فرمایا: "اطمینان رکھو ایسا نہیں ہوگا۔"

آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مہربانی کا مظاہرہ کیا۔

(۱۱) جویریہؓ بنت حارث: یہ سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں جو مالِ غنیمت میں قیدیوں کے ساتھ آئی تھیں۔ حارث بن ابی ضرار شکست کھا کر روپوش ہوگیا تھا۔ جنگ کے بعد اسیرانِ جنگ تقسیم کیے گئے تو جویریہ، ثابتؓ بن قیس کے حصّے میں آئیں۔ یہ انھیں اپنا ہم مرتبہ نہ پا کر مکاتیب کی درخواست کرنے لگیں۔ مکاتیب کچھ رقم لے کر چھوڑ دینے والی رقم ہوتی تھی جسے حضرت ثابتؓ بن قیس نے منظور کرلیا، لیکن جویریہؓ کے پاس رقم نہ تھی۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں سے چندہ مانگا جو نہ ملا۔ اپنے سرپرستوں کے بارے میں معلوم کرنا چاہا تو کوئی سراغ نہ ملا۔ تب وہ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پاس حاضر ہوئیں اور اپنا مسئلہ بیان کیا۔ اس موقع کے لیے تاریخ میں دو روایات ہیں۔ ایک یہ کہ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مکاتیب کی رقم ادا کر کے انھیں آزادی دلائی اور دوسری یہ کہ حارث بن ابی ضرار نے خود حاضرِ خدمت ہو کر زرِ فدیہ ادا کر کے انھیں آزادی دلائی اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے ان سے نکاح کرلیا۔ پھر حارث بن ابی ضرار بھی اسلام کی طرف مائل ہو کر ایمان لے آیا۔ یہی وہ جنگ تھی جس میں مسلمانوں نے اُمّ المومنین حضرت جویریہؓ بنت حارث کے اعزاز اور معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تقلید میں اپنے اپنے قیدیوں کو آزاد کردیا جس کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے لوگ اس دین کی طرف مائل ہو گئے اور جو مائل نہ ہوئے وہ بھی دشمن نہ رہے۔

(۱۱۱) واقعۂ افک: (افک۔ تردید کرنا) اس جنگ کا تیسرا سب سے اہم واقعہ،

واقعہ افک تھا جسے خود جنابہ عائشہ رض صدیقہ نے بیان فرمایا کیوں کہ یہ انھی سے متعلق ہے۔ اس میں منافقین نے ان پر تہمت لگائی لہٰذا اس کی بہترین راوی وہ خود ہیں۔ وہ فرماتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ جب آپ سفر پر جانے لگتے تو قرعہ ڈال کر فیصلہ کرتے کہ کون سی بیوی ساتھ جائے گی! غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر قرعہ میرے نام نکلا اور میں آپ کے ساتھ گئی۔ جنگ سے واپسی پر جب ہم مدینۂ منورہ کے قریب پہنچے تو ایک منزل پر رات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ کیا۔ ابھی رات کا کچھ حصہ باقی تھا کہ کوچ کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ اس وقت میں اُٹھ کر رفع حاجت کے لیے گئی۔ جب پلٹنے لگی تو قیام گاہ کے قریب پہنچتے پہنچتے مجھے علم ہوا کہ میرے گلے کا ہار ٹوٹ کر کہیں گر گیا ہے۔ میں اسے تلاش کرنے لگی۔ اتنے میں قافلہ روانہ ہوگیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ میں کوچ کے وقت اپنے محمل میں بیٹھ جایا کرتی تھی اور چار آدمی اسے اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ ہم عورتیں اس زمانے میں غذا کی کمی کے باعث ہلکی پھلکی ہوا کرتی تھیں۔ میرا محمل اٹھاتے وقت لوگوں کو یہ محسوس ہی نہ ہوا کہ میں اس میں نہیں ہوں۔ وہ بے خبری میں خالی محمل اونٹ پر رکھ کر روانہ ہوگئے۔ میں جب ہار لے کر پلٹی تو وہاں کوئی نہ تھا۔ آخر اپنی چادر اوڑھ کر وہاں لیٹ گئی اور دل میں سوچ لیا کہ آگے جاکر جب یہ لوگ مجھے نہ پائیں گے تو خود ہی ڈھونڈتے ہوئے آجائیں گے۔ اسی حالت میں مجھے نیند آگئی۔ صبح کے وقت صفوانؓ بن معطل سلمی اس جگہ سے گزرے جہاں میں سو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پہچان گئے کیوں کہ پردے کا حکم آنے سے پہلے وہ مجھے بارہا دیکھ چکے تھے۔ (یہ صاحب بدری صحابیوں میں سے تھے۔ انھیں صبح دیر تک سونے کی عادت تھی اس لیے پڑے سوتے رہ گئے تھے اور اب اٹھ کر مدینے جارہے تھے) مجھے دیکھتے ہی انھوں نے اونٹ روک لیا اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ"۔ پھر بولے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی بیوی یہاں رہ گئیں"!

اس آواز کے ساتھ ہی میری آنکھ کھُل گئی اور میں نے اٹھ کر اپنے مُنہ پر چادر ڈال لی۔ انھوں نے مجھ سے کوئی بات نہ کی اور اپنا اونٹ لاکر میرے پاس بٹھا دیا، پھر الگ ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔ میں اونٹ پر سوار ہوگئی اور وہ نکیل پکڑ کر روانہ ہوگئے۔ دوپہر کے وقت ہم نے لشکر کو جا لیا جب کہ وہ ابھی ایک جگہ جاکر ٹھہرا ہی تھا۔ لشکر والوں کو ابھی علم نہ ہوا تھا کہ میں پیچھے ہی رہ گئی ہوں۔ اسی پر بہتان لگانے والوں نے بہتان لگا دیے جن میں پیش پیش عبداللہ بن ابی تھا، مگر میں اس سے بے خبر تھی کہ مجھ پر کیا کیا باتیں بن رہی ہیں۔ مدینۂ منورہ پہنچ کر میں بیمار ہوگئی اور ایک ماہ کے قریب پلنگ پر پڑی رہی۔ شہر میں اس بہتان کی خبریں اُڑ رہی تھیں۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے کانوں تک بھی یہ بات پہنچ گئی تھی، مگر مجھے کچھ علم نہ تھا البتہ جو چیز مجھے کھٹکتی تھی، وہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وہ توجہ میری طرف نہ تھی جو بیماری کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ آپ گھر میں آتے تو بس گھر والوں سے پوچھ لیا کرتے "کَیفَ تِیکُم" (کیسی ہیں یہ؟) آپ مجھ سے خود کلام نہ کرتے اس سے مجھے شک ہوتا کہ ضرور کوئی بات ہے۔ آخر آپ سے اجازت لے کر میں اپنی والدہ کے گھر چلی گئی تاکہ وہ میری تیمارداری کر سکیں۔ ایک رات میں حاجت کے لیے مدینے کے باہر گئی۔ اس وقت گھروں میں بیت الخلا نہیں ہوتے تھے۔ ہم لوگ جنگل جایا کرتے تھے۔ میرے ساتھ مسطح رضؓ بن اُثاثہ کی ماں بھی تھیں جو میرے والد (ابوبکرؓ صدّیق) کی خالہ زاد تھیں (اس پورے خاندان کی کفالت حضرت ابوبکرؓ صدّیق کیا کرتے تھے) راستے میں انھیں ٹھوکر لگی تو بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا: "غارت ہو جا مسطحؓ"۔

میں نے کہا: "اچھی ماں ہو جو بیٹے کو کوس رہی ہو اور بیٹا بھی وہ جس نے جنگ بدر میں حصّہ لیا ہے"!

انھوں نے کہا: "بٹیا! کیا تجھے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں ہے؟"

اس کے بعد انھوں نے سارا قصّہ سنایا کہ اختراع پرداز لوگ میرے متعلق

کی باتیں کر رہے ہیں۔ منافقین کے علاوہ خود مسلمانوں میں سے جو لوگ اس فتنے میں شامل ہو گئے تھے، ان میں مسطحؓ بن اثاثہ، حسانؓ بن ثابت اور حمنہؓ بنتِ جحش نے بھی نمایاں حصّہ لیا تھا۔ یہ داستان سن کر میرا خون خشک ہو گیا اور وہ حاجت بھی بھول گئی جس کے لیے آئی تھی۔ پھر میں سیدھی گھر گئی اور رو رو کر رات کاٹی۔

میرے پیچھے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اسامہؓ بن زید اور علیؓ ابنِ ابی طالب کو طلب کیا اور ان سے مشورہ طلب کیا۔

اسامہؓ بن زید نے میرے حق میں کلمۂ خیر کہا اور عرض کیا "یا رسولؐ اللہ بھلائی کے سوا آپ کی بیوی میں ہم نے کوئی چیز نہیں پائی۔ یہ سب کچھ کذب اور باطل ہے جو اُڑایا جا رہا ہے"۔

علیؓ نے کہا "یا رسولؐ اللہ! عورتوں کی کمی تو نہیں ہے۔ آپ اس کی جگہ دوسری بیوی کر سکتے ہیں اور اگر تحقیق کرنا چاہیں تو خدمت گار لونڈی کو بلا کر حالات دریافت فرمائیں"۔

خدمت گار لونڈی کو بلایا گیا اور پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے کہا "اس خدا کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں نے ان میں کوئی بُرائی نہیں دیکھی جس پر حرف رکھا جا سکے۔ بس اتنا عیب ہے کہ میں آٹا گوندھ کر کسی کام کو جاتی ہوں اور کہہ جاتی ہوں کہ بی بی ذرا خیال رکھنا، مگر وہ سو جاتی ہیں اور بکری آٹا کھا جاتی ہے"۔

اس تحقیق کے بعد اسی دن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خطبے میں فرمایا۔ "مسلمانو! کون ہے جو اس شخص کے حملوں سے میری عزّت کو بچائے جس نے میرے گھر والوں پر الزامات لگا کر مجھے اذیت پہنچانے کی حد کر دی۔ بہ خدا، میں نے نہ تو اپنی بیوی میں کوئی بُرائی دیکھی ہے نہ اس شخص میں جس کے متعلق تہمت لگائی جا رہی ہے۔ وہ تو کبھی میری غیر موجودگی میں میرے گھر بھی نہیں آیا"۔

اس بہتان کی افواہیں کم و بیش ایک ماہ شہر میں اُڑتی رہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سخت اذیت میں مبتلا رہے۔ میں روتی رہی۔ میرے والدین انتہائی

پریشانی اور رنج و غم میں مبتلا رہے۔ آخر کار ایک روز حضورؐ خود تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھے۔ اس پوری مدت میں آپ کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔ میرے والدین نے محسوس کیا کہ آج کوئی فیصلہ کن بات ہونے والی ہے اس لیے وہ دونوں بھی پاس آ کر بیٹھ گئے۔

حضورؐ نے فرمایا "عائشہ رضؓ! مجھ تک تمہارے متعلق یہ خبریں پہنچی ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو امید ہے کہ اللہ تمہاری براءت ظاہر فرما دے گا اور اگر تم واقعی کسی گناہ میں مبتلا ہوئی ہو تو اللہ سے توبہ کرو اور معافی مانگو۔ بندہ جب اپنے گناہ کا معترف ہو کر توبہ کرتا ہے تو اللہ معاف کر دیتا ہے۔"

اتنا سنتے ہی میرے آنسو خشک ہو گئے۔ میں نے اپنے والد سے کہا "آپ رسولؐ اللہ کی بات کا جواب دیں۔"

وہ بولے "بیٹی میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

میں نے اپنی والدہ سے کہا تو وہ بولیں "میں حیران ہوں کہ کیا کہوں!"

اس پر میں نے کہا "آپ لوگوں کے کان میں ایک بات پڑ گئی ہے اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے۔ اگر میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں اور اللہ گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں تو آپ لوگ نہ مانیں گے۔ اگر خواہ مخواہ میں ایسی بات کا اعتراف کروں جو میں نے نہیں کی اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کی تو آپ لوگ مان لیں گے۔" اس وقت میں نے حضرت یعقوبؑ کا نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر یاد نہ آیا۔ آخر میں نے کہا "ایسی حالت میں میرے لیے اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ وہی بات کہوں جو یوسفؑ کے باپ نے کہی تھی کہ فَصَبْرٌ جَمِیلٌ" یہ کہہ کر میں لیٹ گئی اور دوسری جانب کروٹ لے لی۔

اس وقت میں اپنے دل میں کہہ رہی تھی کہ اللہ میری بے گناہی سے واقف ہے اور ضرور حقیقت کھول دے گا۔ مگر یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میرے حق میں وحی نازل ہو گی جو قیامت تک پڑھی جائے گی۔ میں اپنی ہستی کو اس سے بہت کم تر تصور کرتی تھی کہ اللہ میری جانب سے بولے گا۔ ہاں مجھے گمان تھا کہ شاید حضورؐ کوئی خواب دیکھیں گے اور اللہ میری

براءت فرمائے گا۔

یکایک حضورؐ پر وہ کیفیت طاری ہوئی جو وحی نازل ہونے سے قبل طاری ہوتی تھی، یعنی سخت جاڑے کے زمانے میں بھی چہرۂ مبارک سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ اس وقت ہم سب خاموش ہو گئے۔ میں تو بالکل بے خوف تھی البتہ میرے والدین کا بُرا حال تھا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ یہاں تک کہ یہ کیفیت دُور ہوئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پُرمسرت لہجے میں فرمایا "خوش ہو جاؤ عائشہؓ! خدا نے تمہاری براءت فرما دی" اس کے بعد حضورؐ نے دس آیات سنائیں۔

ارشادِ ربانی تھا "جو لوگ بہتان گھڑ لائے ہیں، وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولا ہیں۔ اس واقعے کو (اے نبیؐ) آپ اپنے حق میں شر نہ سمجھیے، یہ تو آپ کے لیے خیر ہی خیر ہے جس نے اس میں (عیب لگانے میں) جس قدر حصہ لیا اُس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا اور جس شخص نے اس (بہتان) کی ذمّے داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا، اس کے لیے تو عذابِ عظیم ہے اور جب آپ نے یہ بات سنی تو اسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریحاً بہتان ہے! پھر وہ لوگ (بہتان باندھنے والے) اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ کیوں نہ لائے اور اب جب کہ وہ گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں"

یہ واقعہ قرآن کی وہ گواہی تھی جس نے اس غزوے کو اہم ترین بنا دیا اور یہ وہ ہولناک الزام تھے جو منافقین نے اللہ کے نبیؐ پر اور دوسرا ان کی زوجۂ محترمہ پر لگایا۔ ایک بہت بڑا اتہام عقدِ زینبؓ کے موقع پر اور دوسرا ناقابلِ برداشت بہتان حضرت عائشہ صدیقہؓ پر لگایا گیا۔ ان منافقین کا مقصد دراصل آپؐ کو دوسرے انداز سے شکست دینا تھا۔ مقابلے کی تاب نہ تھی تو وہ غیر اخلاقی حملے کرنے لگے یہ چونکہ ایک بڑی ہی ہولناک بات تھی لہٰذا اس کا جواب اللہ کے نبیؐ نے نہیں بلکہ خود اللہ نے دیا۔ یہ جواب جرائم کی سزا کا حکم سنانے کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اصلاح و تعمیر کے لیے قانونی اور اخلاقی تدابیر بھی تجویز کر دیتا ہے جو محض اس وقت کے لیے نہیں

تھیں جب واقعۂ افک سے مدینۂ منورہ میں اضطراب چھایا ہوا تھا بلکہ یہ قانون قیامت تک کے لیے ہے۔

سورۃ النور اسلامی معاشرے کی اصلاح و تعمیر کے لیے ایک مکمل قانون ہے۔ اس کے ساتھ ہی منافقین اور مومنین کی واضح نشانیاں بیان کردیں تاکہ معاشرے میں اہلِ ایمان اور منافق کی پہچان ہوسکے۔

اب منافقین خود کو چھپا نہ سکتے تھے۔ خداوندِ عالم نے بڑی ہی تفصیل کے ساتھ انھیں بے نقاب کیا تھا۔ دوسرے ان کی یہ تدبیر بھی ناکام ہوگئی تھی۔ اس بہتان سے وقتی طور پر ہلچل تو مچی لیکن حق و باطل کا فیصلہ بھی ہوگیا۔ ایک طرح سے وہ تحریکِ اسلام کی ترقی و عروج کو روکنے میں قطعی طور پر ناکام ہو رہے تھے۔ جو کوشش انھوں نے جنگِ بدر کے وقت سے شروع کی تھی، اس میں ہر بار انھیں ناکامی اور مسلمانوں کو کامیابی ہو رہی تھی۔ ہر بار وہ مکمل تیاری کے بعد ہی مقابل آرہے تھے۔ ہر محاذ پر ہر انداز سے مقابلہ کرنے کے بعد اس بار انھوں نے سابقہ تمام ناکامیوں کا بدلہ لینے کے لیے تیاری کی اور کفر کی تمام قوتیں مسلح ہوگئیں۔

## جنگِ احزاب (خندق) شوال ۵ھ (مارچ ۶۲۷ء)

مسلمانوں کے لیے یہ زمانہ بڑا پُر آشوب تھا۔ کئی طرف سے دشمنوں نے گھیرا ہوا تھا۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر، مدینۂ منورہ سے نکل کر دُور دراز کے علاقوں میں آباد تو ہو گئے تھے، لیکن ان کی تمام تر توجہ مسلمانوں ہی پر مرکوز تھی۔ اب ان کا کام ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کے خلاف اردگرد کی بستیوں کے یہودیوں کو اور مدینۂ منورہ میں موجود بنو قریظہ کو ہر طرح سے اُکسا رہے تھے۔ دوسری طرف قریش کی دشمنی جیسے وقت کی ضرورت بن گئی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کی ترقی کی رفتار بڑی تیز ہے۔ مشرق میں نجد اور شمال میں دومتہ الجندل تک مسلمانوں کے اثرات اُن کے لیے بڑے تشویش انگیز تھے۔ ان کے لیے یہ تجارتی شاہراہوں کا وہ مقام اتصال تھا جس سے گزر کر تجارتی قافلے شام اور عراق جاتے تھے، لیکن اب مسلمانوں کی وجہ سے یہ راہیں مسدود ہوچکی تھیں۔ محض اسی بنا پر اقتصادی اعتبار سے قریش کو بہت نقصان برداشت کرنا پڑ رہا تھا لہٰذا اس بار انھوں نے اتحاد کو ضروری سمجھا۔

یہ اس طرح ہوا کہ سب سے پہلے یہودی سردار سلام بن مشکم، حیی بن اخطب اور کنانہ بن ربیعہ مکے پہنچے۔ انھوں نے اسلام، مسلمانوں اور ان تمام حالات پر تفصیلی گفتگو کے بعد قریش کو اپنی امداد کا پورا پورا یقین دلایا۔ ازاں بعد ان سرداروں اور ابوسفیان نے بہت سے قبائل کا دورہ کیا اور بہت سے قبائل کو پیغام بھیجے۔ اس وقت جن قبائل نے لبیک کہا، ان میں بنو غطفان، بنو اسعد، بنو سلیم اور بنو سعد کا ذکر سب مورخین نے کیا ہے۔ ان سب کے اتحاد سے دس ہزار فوج تیار ہو گئی جو بہترین اسلحۂ جنگ سے آراستہ اور جوش وخروش کے لحاظ سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اطلاعات ملیں تو دشمن کے اتحاد، تیاری، تعداد اور ولولوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے حسب دستور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ ہر پہلو سے حالات جانچنے اور جنگِ اُحد کے نتائج کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے طے پایا کہ شہر کے اندر رہ کر ہی جنگ کی جائے۔ اس دوران میں خواتین اور بچّوں کو قلعے میں محفوظ کر دیا جائے۔

اس وقت تک ایک مخصوص انداز ہی میں جنگ لڑی جاتی تھی، لیکن اب حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فارسی نے خندق کھود کر شہر کے دفاع کا مشورہ دیا۔ اس موقع کے لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نبیؐ کو بذریعۂ وحی یہ ہدایت ملی تھی۔

بہر کیف خندق کھود کر شہر کی حفاظت کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ مسلمان تن دہی سے اس کام میں مصروف ہو گئے۔ بیس بیس گز زمین کو دس دس صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت نے کھودا اور مسلسل اکیس یوم کام کیا۔ اس خندق کی گہرائی اور چوڑائی کے بارے میں کسی تاریخ میں وضاحت نہیں ملتی البتّہ قیاس آرائی کی گئی ہے کہ یہ دس گز چوڑی اور پانچ سے دس گز تک گہری تھی۔

مدینۂ منوّرہ کا صرف شمال مغربی علاقہ ایسا تھا کہ دشمن بہ آسانی حملہ کر سکتا تھا لہٰذا اس کی حفاظت کے لیے میدان میں خندق کی ضرورت تھی۔ یہ کام مکمل ہوا تو شوّال کے آخری عشرے میں مسلمانوں کی خواتین اور بچّوں کو قلعے میں محفوظ کر دیا گیا۔ معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کے آرام اور حفاظت کی طرف سے ہر طرح

اطمینان کرنے کے بعد عبداللہ بن مکتوم کو مدینۂ منورہ میں اپنا قائم مقام بنایا اور تین ہزار مجاہدین کے ساتھ جبل سلع پر مقیم ہو گئے۔ مدینۂ منورہ کی مختلف اطراف میں جہاں جہاں سے خطرہ ہو سکتا تھا، وہاں وہاں فوجی دستے متعین کر دیے گئے۔

اللہ کے نبیؐ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس چھوٹی سی بستی کی حفاظت کے لیے خود بھی مزدوروں کی طرح کام کر رہے تھے، بھوک، پیاس اور بے آرامی کی اذیتیں سہتے ہوئے بھی خوش تھے۔

اِدھر تو یہ کیفیت تھی، اُدھر کفر اس بار اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ بڑھتا آ رہا تھا۔ فوج کی کمان ابو سفیان کے ہاتھ میں تھی۔ دس ہزار کی تعداد اس بار کامیابی کا یقین لیے بڑھتی آ رہی تھی۔ ستائیس شوّال کو کفار نے دارالاسلام کا محاصرہ کر لیا۔

دونوں جانب کے دلیر اپنے اپنے مورچوں پر ڈٹ گئے اور ایک دوسرے پر تیر برسانے لگے۔ جنگ کی ابتدا ہی میں ایک موقع ایسا آیا کہ مخالفین میں سے چند سواروں نے خندق پار کر کے اس جانب آنا چاہا۔ مسلمانوں نے تیر برسا کر انھیں روک دیا۔ وہ لوگ اس وقت رک تو گئے لیکن موقع دیکھتے رہے اور آخر ایک بار جدھر سے خندق کی چوڑائی قدرے کم تھی، سواروں نے اسے پار کر لیا۔ اسی وقت حضرت علیؓ نے انھیں دیکھا تو آگے بڑھ کر ان کے واپس جانے کی جگہ پر قبضہ کر لیا جس کے سبب ان کی واپسی کی راہ مسدود ہو گئی۔ اس وقت تین ہزار مجاہدین دس ہزار کے لشکر کو روکنے کے لیے مصروف تھے۔

حضرت علیؓ خندق پار کر کے آنے والے تینوں سواروں کے مقابلے میں تنہا تھے۔ کافی دیر مقابلہ جاری رہا۔ تب ان میں سے ایک کو فرار ہونے کا موقع مل گیا، دوسرا حضرت علیؓ کے ہاتھوں قتل ہوا اور تیسرا خندق میں جا گرا۔ حضرت علیؓ کے وار نے اسے بھی دائمی نیند سلا دیا۔ اس کے بعد دشمن کو خندق پار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

اس مقابلے کے دوران میں بنو قریظہ خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔ اگرچہ معاہدے کی رُو سے انھیں مسلمانوں کے ساتھ مل کر شہر کا دفاع اور مسلمانوں کا ساتھ دینا تھا، لیکن مصرفیت اور جنگ کی ابتدا میں انھوں نے خود کو غیر جانب دار ظاہر کیا۔ پھر جونہی جنگ شروع ہوئی تو انھوں نے اندر خانہ تیار ہونے والی سازش

کے تحت کھلم کھلا کفر کا ساتھ دیا اور بڑھ چڑھ کر دشمنوں کی مدد کی۔ یہ وقت مسلمانوں کے لیے بڑا ہی صبر آزما اور کٹھن تھا۔ پرستارانِ توحید کو بہ یک وقت دو محاذوں پر جنگ لڑنا پڑ رہی تھی۔

انھوں نے محسوس کر لیا کہ شرک کی تمام قوتیں جمع ہو کر مقابل آگئی ہیں اور عقب سے مدینۂ منورہ میں مقیم یہودی معاہدے کی خلاف ورزی پر اتر آئے ہیں لہٰذا یہ جنگ دو طرفہ لڑی جا رہی تھی۔

اِدھر مسلمان، مشرکین سے مصروفِ پیکار تھے، اُدھر قلعے میں محفوظ خواتین، بچے اور چند مسلمان اندرونی دشمن سے مقابلہ کر رہے تھے۔ شروع میں کفار نے جنگ لڑنے کے لیے یہ طریقِ کار طے کیا کہ مشہور جنگ جو قسم کے سردار باری باری ایک ایک دن اپنے دستے لے جا کر لڑیں گے۔ اس طرح سے خالدؓ بن ولید، ابوسفیانؓ، عمروؓ بن العاص اور انھی ایسے دوسرے دلیر ایک ایک دن اپنی فوج لے جا کر لڑتے رہے، لیکن خندق عبور نہ کر سکے لہٰذا پوری قوت سے پتھر اور تیر برسا کر دل کی بھڑاس نکالنے لگے۔ اس طریقۂ جنگ سے بھی انھیں لگا کہ قوت کا زیاں ہے۔ وہ اس طرح خندق عبور کر سکتے ہیں نہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اب ایک ایک دن جنگ کرنے کی بجائے سب نے متحد ہو کر حملہ کر دیا اور خندق جہاں سے کم چوڑی تھی وہاں سے گھوڑے مہمیز کر کر کے ان کے بہادر مسلمانوں سے اُدھر جا کر لڑنے لگے۔

وہ قلعہ جہاں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خواتین اور بچوں کا انتظام کر آئے تھے بنو قریظہ کی آبادی سے نزدیک تر تھا لہٰذا کفر کا ساتھ دینے کے لیے بنو قریظہ کے یہودیوں نے اسی کو منتخب کیا۔ انھیں اندازہ ہو چکا تھا کہ اسی جانب حفاظت کا کوئی بہتر انتظام ہے نہ مدافعت کرنے والے۔ ان کے نزدیک اسلامی دفاع کا یہ کم زور پہلو تھا جہاں سے وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے کچھ جوان اِدھر متوجہ ہوئے اور حملے کا موقع و محل دیکھنے کے لیے قلعے کے پھاٹک تک پہنچ گئے۔ اس وقت ان میں سے ایک پر حضرت صفیہؓ بنتِ عبدالمطلب کی نظر پڑ گئی۔ انھوں نے ایک چوب اس کے سر پر ماری جس سے اس کا سر پھٹ

گیا۔ پھر انھوں اس کا سر کاٹ کر قلعے کے پیچھے پھینک دیا۔ یہودی جو یہ سمجھ رہے تھے کہ مسلمانوں کی تمام جمعیّت مخالفین سے مصروفِ جنگ ہے، یہ سمجھے کہ فوج کا ایک بڑا حصّہ قلعے کی حفاظت کے لیے بھی موجود ہے لہٰذا دوبارہ جراٗت نہ کر سکے۔

بنو قریظہ کی اس بدنیّتی سے معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم بے خبر نہ تھے اور پھر یوں بھی خبر رسانی کا انتظام بہت اعلیٰ تھا جس وقت آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو معلوم ہوا کہ بنی قریظہ بدعہدی پر آمادہ ہیں تو انصار کے معزز سردار سعدؓ بن عبادہ اور سعدؓ بن معاذ کو انکشافِ مآل کے لیے روانہ کیا اور ہدایت کی کہ اگر بنو قریظہ وفاداری پر آمادہ نظر آئیں تو یہ خبر سب کے سامنے سنا دینا، اگر وہ مخالفین ایسا مظاہرہ کریں تو صرف مجھے ہی اطلاع دینا تاکہ مسلمانوں کے حوصلے پست نہ ہوجائیں۔

یہ صاحبان واپس آئے تو انھوں نے موجبِ حاکمِ اعلیٰ اشارتاً جواب دیا جس کا مطلب تھا کہ بنو قریظہ نے بدعہدی کا ثبوت دیا ہے۔

یہ خبر کسی نہ کسی طرح عام ہوگئی۔ اس وقت صالحین کی ایک جماعت (جس میں انصار اور مہاجرین دونوں ہی موجود تھے) کے سوا مسلمانوں میں بھی ایک اضطراب پھیل گیا جسے منافقین کی سرگرمیاں ہوا دے رہی تھیں۔ انھوں نے سب سے پہلے یہ نفسیاتی حربہ آزمایا اور اس بات کو ہوا دینے لگے کہ مسلمانوں کے اہل و عیال اس قلعے میں ہیں جو بنو قریظہ کے علاقے سے نزدیک ہے اور بنو قریظہ معاہدہ توڑ رہے ہیں۔ اس بات نے مسلمانوں کو سراسیمہ کر دیا۔ بہت سے ایسے بھی تھے جنھیں جنگ سے زیادہ اپنے اہل و عیال کی پریشانی تھی۔ یہ وقت اللہ کے نبیؐ کے لیے شدید آزمائش کا تھا۔ صرف صادق و اہلِ ایمان ہی تھے جنھوں نے آنکھ نہ بدلی تھی ورنہ اکثر تو مقابلے سے کنارہ کشی کر رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے انصار اور مہاجرین کے معززین سے مشورے کے بعد اپنے خیال کا اظہار کیا کہ اس وقت بنی غطفان سے صلح کی بات چیت کر کے انھیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ مدینۂ منوّرہ کے باغات کے پھلوں میں سے ایک تہائی حصّہ لے کر چلے جائیں۔

اتنا سنتے ہی انصار کے معزز سردار سعدؓ بن عبادہ اور سعدؓ بن معاذ نے عرض

کیا "یا رسول اللہ! کیا (بنو غطفان سے) صلح و شرائط کا یہ حکم خدا کی جانب سے ہے یا آپ کی اپنی خواہش ہے کہ ایسا کیا جائے؟"

ارشاد ہوا "میں تم لوگوں کو اس بحران سے بچانے اور جنگ کی مشکلات سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسا کر رہا ہوں کیوں کہ مجھے اندازہ ہے کہ عرب کی تمام طاقتیں متحد ہو گئی ہیں۔ میں انھیں توڑنا چاہتا ہوں۔"

یہ سننے کے بعد انصار کے معززین نے عرض کیا "یا رسول اللہ! اگر آپ صرف ہماری خاطر یہ معاہدۂ صلح کر رہے ہیں تو اسے ختم کر دیجیے۔ خدا کی قسم بنو غطفان تو ایک حبّہ خراج ہم سے اس وقت بھی وصول نہ کر سکے جب ہم مشرک تھے۔ اب تو ہمیں اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی حمایت اور طاقت نصیب ہے۔ کیا اب ہم انھیں خراج دیں گے! اب ہمارے اور ان کے درمیان صرف تلوار ہی فیصلہ کرے گی!"

اِدھر یہ گفتگو ہو رہی تھی اور معاہدے کے اس کاغذ کو چاک کیا جا رہا تھا جس میں بنو غطفان سے صلح کرنے کی شرط درج تھی، اُدھر اسی وقت نعیمؓ بن مسعود حاضرِ خدمت ہوئے۔ انھیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پہچان لیا۔ یہ قبیلۂ بنو غطفان کے وہ جوان تھے جو اس پر حملے کے دوران میں اسلام سے متاثر ہو کر ساتھ آ گئے تھے۔ ابھی کسی کو ان کے مسلمان ہونے کی خبر نہ تھی۔ انھوں نے کہا۔ "یا رسول اللہ! میں ابھی تک کفّار کی نظروں میں ان کا ساتھی ہوں۔ میں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کیا۔ کیا میں وہی خدمت کر سکتا ہوں جو منافقین نے بہت سے مسلمانوں کو ورغلا کر کی ہے؟"

اس وقت اکثر صحابۂ کرامؓ پھوٹ ڈالنے کو گناہ تصور کر رہے تھے، لیکن معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اَلْحَرْبُ خُدْعَۃ" (جنگ کی حالت میں دھوکا دینا جائز ہے)

یہ سنتے ہی نعیمؓ بن مسعود چلے گئے۔ سب سے پہلے اس رات انھوں نے بنو قریظہ کے معززین سے ملاقات کی اور خود کو ان کا ساتھی ظاہر کرتے ہوئے بولے۔ "بھائی! تم تو قریش اور بنو غطفان کا ساتھ دے کر خود اپنے لیے دشواری پیدا کر رہے ہو۔ وہ لوگ تو چلے جائیں گے، لیکن تمھیں تو جنگ کے بعد بھی مسلمانوں کے

ساتھ رہنا ہے۔ اگر تم قریش کی مدد کرنا ہی چاہتے ہو تو پہلے اطمینان کر لو۔ ان سے کہو کہ پہلے اپنے چند آدمی یرغمال کے طور پہ دے دیں تاکہ وہ تمھیں بے یار و مددگار نہ چھوڑ جائیں۔"

بات چونکہ معقول تھی لہٰذا بنو قریظہ اس پر غور و فکر کرنے اور قریش کے چند آدمی بہ طور یرغمال رکھنے کے متعلق فیصلے کرنے لگے۔

یہاں سے واپسی میں نعیمؓ بن مسعود قریش اور بنو غطفان میں پہنچے اور کہا "کیا تم لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ بنو قریظہ اور مسلمانوں کا خفیہ معاہدہ ہو گیا ہے اور اب بنو قریظہ نے کہا ہے کہ وہ کسی نہ کسی بہانے تمھارے چند آدمی بلا کر مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے۔ اب تم ذرا ہوشیار رہنا۔"

قریش اور بنی غطفان دونوں محتاط ہو گئے اور بنو قریظہ کو آزمانے کے لیے اپنا ایک قاصد ان کے پاس بھیجا اور کہا کہ کل صبح بھرپور حملہ کرنا ہے، تیار رہنا۔

جواب میں بنو قریظہ نے جو شک میں پڑ چکے تھے، روزِ سبت کا بہانہ کرتے ہوئے کہا کہ کل ہم جنگ نہیں کر سکتے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے شرط رکھی کہ اپنے چند آدمی ہمارے اطمینان کے لیے ہمیں دے دو۔

اس شرط نے قریش اور بنو غطفان کو چونکا دیا۔ انھیں نعیمؓ بن مسعود کی ہر بات سچ محسوس ہونے لگی۔ اس طرح سے یہ جنگی چال بڑی کامیاب رہی۔

اِدھر تو یہ انسانی تدبیر کفّار میں پھوٹ ڈال رہی تھی، اُدھر قدرت نے اس کی تکمیل کے اسباب پیدا کر دیے۔ انھی دنوں موسم نے وہ شدّت اختیار کی کہ کفّار کے انتظام درہم برہم ہو گئے۔ اس موقع کے لیے خود خداوندِ عالم نے فرمایا: "اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کے اس احسان کو جو اس نے ابھی ابھی تم پر کیا ہے۔ اس وقت جب (کفّار کے) لشکر تم پر چڑھ آئے تھے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیجی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں۔ اللہ اس وقت سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے جب (دشمن) اوپر اور نیچے (ہر جانب) سے تم پر حملہ آور ہوئے۔ جب خوف اور دہشت سے آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آ گئے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت ایمان والے خوب آزمائے گئے اور ہلا مارے گئے۔"

اس طرح باہمی نا اتفاقی، آفاتِ ارضی و سماوی سے تنگ آکر کفر کا یہ ریلا میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ یہ محاصرہ چوبیس یوم جاری رہا اور جنگ ختم ہوگئی۔ یہ جنگ دو وجوہ سے بڑی اہم تصور کی گئی۔ اوّل یہ کہ مسلمانوں نے یہ جنگ وقت کے تقاضوں کے مطابق بڑے ہی منظم اور ترقّی یافتہ انداز میں لڑی اور اتنے طویل محاصرے کے باوجود ان کا کوئی نقصان نہ ہوا البتّہ سعدؓ بن معاذ زخمی ہوگئے۔ دوسرے یہی وہ جنگ تھی جس میں کفّار کی مجتمع قوّت اسلام کے مقابل آئی اور ہمیشہ کے لیے اس کی کمر ٹوٹ گئی۔ انھوں نے یقین کر لیا کہ ملّتِ اسلامیہ اب ایک ناقابلِ تسخیر قوّت ہے۔ ایسے میں وہی لوگ جو کل تک قریش کو عرب کی سب سے بڑی سیاسی طاقت تصوّر کرتے تھے، اب معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیثیت کو تسلیم کرنے لگے۔

جب دشمن راتوں رات بھاگ گئے (کفر کی تمام طاقتیں منتشر ہوگئیں) اور مسلمان دوسری صبح بیدار ہوئے تو میدان صاف تھا۔ اس وقت معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "مسلمانو! اب قریش تم پر کبھی چڑھائی نہ کرسکیں گے۔ ہاں تم ان پر چڑھائی کروگے۔"

جنگِ احزاب ختم ہوئی اور مسلمانوں نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔ ایسے میں معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم گھر گئے۔ حضرت جبرئیلؑ نے اللہ کا حکم سنایا۔

"یارسولؐ اللہ! ابھی ہتھیار نہ کھولیے ابھی ایک معاملہ باقی ہے۔"

یہ حکم سنتے ہی آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے یہ اعلان کرا دیا۔ اس وقت اللہ اور رسولؐ پر ایمان رکھنے والے جہاں جہاں تھے، خدمتِ اقدس میں آنے لگے۔ یہ معاملہ تھا بنو قریظہ کا۔

## بنو قریظہ

بنو قریظہ نے دورانِ جنگ میں خواتین کے قلعے پر حملے سے اپنے شر پسند اور فسادی ہونے کا اظہار کرکے گویا پہلی ہجری کا معاہدہ کالعدم کر دیا تھا جو معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مدینۂ منوّرہ میں آباد تمام اقوام سے کیا تھا اور ان میں بدعہد اقوام میں سے اب بنو قریظہ ہی یہاں آباد تھے جن کے باعث یہ جنگ سب سے زیادہ خطرناک ہوگئی تھی لہٰذا اب بیرونی دشمنوں سے فارغ ہوتے ہی آپ (صلّی اللہ

علیہ وسلم، ان مار ہائے آستین کی طرف متوجہ ہو گئے۔

آپؐ نے سب سے پہلے حضرت علیؓ کو مقدمتہ الجیش کے طور پر روانہ ہونے کا حکم دیا۔ جس وقت علیؓ ایک دستۂ فوج کے ساتھ بنی قریظہ کی گڑھیوں تک پہنچے تو وہ سمجھے کہ علیؓ ابن ابی طالب جنگ میں ان کے کرتوتوں کے سبب انھیں دھمکانے کے لیے آئے ہیں لہٰذا وہ اپنے گھروں کی بالائی منزل پر چڑھ گئے اور ہزل گوئی کرنے لگے۔ یہ گالیاں اسلام اور مسلمانوں سبھی کو تھیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہم اس دین اور اس کے لانے والے ہی کو نہیں مانتے لہٰذا کسی فیصلے کے پابند نہیں۔ وہ صلح کے تمام راستے خود بند کر کے مقدمتہ الجیش کے ساتھ بدتمیزی کر رہے تھے کہ اسی وقت معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم اسلامی لشکر کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔

بنو قریظہ قلعہ بند ہو گئے اور مجاہدین نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ تب ان کے حواس باقی نہ رہے اور وہ قلعہ بند ہو کر مشورے کرنے لگے۔ اس محاصرے کی مدّت پندرہ یوم، پچیس یوم یا ایک ماہ بتائی جاتی ہے۔ یہ محاصرہ بہت سخت تھا۔ دوسرے بنو قریظہ فساد تو بپا کر سکتے تھے لیکن اب مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کی ہمّت نہ رکھتے تھے لہٰذا بڑے غور و خوض کے بعد انھوں نے درخواست پیش کی کہ ہمارا فیصلہ قبیلۂ اوس کے سردار حضرت سعدؓ بن معاذ سے کرایا جائے۔ وہ جو بھی حکم دیں گے ہمیں منظور ہو گا۔

اس درخواست کے پس پردہ یہ مصلحت کارفرما تھی کہ بنو اوس کسی زمانے میں بنو قریظہ کے حلیف اور دوست تھے چنانچہ انھیں امید تھی کہ حلیف قبیلے کے سردار ان کے ساتھ رعایت برتیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ انھیں بھی مدینہ منوّرہ سے نکل جانے کا حکم مل جائے گا۔

اگرچہ یہ بڑی ہی ناگوار سی بات تھی لیکن معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اسے منظور فرما لیا اور حضرت سعدؓ بن معاذ کو طلب کیا جو جنگ احزاب میں زخمی ہو گئے تھے۔ انھیں یہ بات پسند نہ تھی کہ اللہ کے نبیؐ کی موجودگی میں کوئی اُن سے فیصلہ طلب کرے اور پھر ایسی حالت میں کہ بنو قریظہ اسلام اور اسلام کے قوانین و احکام سے صریحاً انکار کر رہے تھے۔

حضرت سعدؓ بن معاذ نے ان کا فیصلہ انھی کی کتاب توریت کے مطابق کر دیا۔ توریت کی رُو سے معاہدہ کرنے کے بعد بدعہدی کرنے اور بغاوت کرنے والوں کی سزا یہ تھی کہ ان کے بالغ مرد قتل کر دیے جائیں۔ عورتیں اور بچے لونڈی، غلام بنا لیے جائیں اور مال و اسباب مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

اس فیصلے پر عمل کیا گیا تو جس وقت مسلمان بنو قریظہ کی گڑھیوں میں داخل ہوئے ان کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ بنو قریظہ اگر جنگِ احزاب ابھی بند نہ ہوتی، تو مسلمانوں پر عقب سے ٹوٹ پڑنے کی مکمل تیاری کر چکے تھے۔ ان کے پاس بے شمار جنگی اسلحہ تھا۔ تلواریں، ڈھالیں، زرہیں اور ضروریات کی بے شمار چیزیں، وہ سب مسلمانوں پر ہی استعمال کرنے والے تھے۔ یہ سب سامان مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ شراب ضائع کر دی گئی۔ یہ علاقہ فساد سے پاک ہو گیا اور مکمل طور پہ مدینہ منورہ اسلامی مرکز بن گیا۔

## احکامِ شرعیہ

اسی برس سورۃ الاحزاب اور سورۃ النّور کے وہ حصّے نازل ہوئے جن میں ان غزوات (جنگِ احزاب اور بنو قریظہ) کے تبصرے کے علاوہ معاشرتی اصلاح کے لیے کچھ اور قوانین نافذ کیے گئے۔ مسلمان عورتوں کو پردے کا حکم دیا گیا۔ نبیؐ کے گھر میں غیر مردوں کی آمد و رفت پہ پابندی اور اہلِ ایمان کو حکم کہ وہ دشمنوں ایسی عادتوں سے اجتناب برتیں (دشمن عیب لگاتے، چغلیاں کرتے اور چہ میگوئیاں کیا کرتے تھے) یعنی یہ باتیں اہلِ ایمان کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

طلاقِ ظہار: اسی برس طلاقِ ظہار کو غیر مؤثر قرار دیا گیا۔ اس سے قبل اہلِ عرب غصّے کی حالت میں بیوی کو طلاقِ ظہار دے دیتے تھے۔ اس کا کفّارہ مقرّر ہوا۔

تیمّم: تیمّم کا حکم نازل ہوا۔ مسلمان جب غزوات کے لیے جاتے تھے تو پانی میسّر نہ آتا تھا لہٰذا اجازت دی گئی کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں غسل اور وضو کی بجائے تیمّم کر لیا جائے۔

مختصر نماز: نماز کو مختصر کر کے پڑھنے کا حکم بھی اسی سال ملا۔ سفر کے دوران میں پوری نماز کی جگہ دو رکعت پڑھنا قصر کہلاتا ہے۔

اس دوران میں جب کہ احکامِ شرعیہ کو عملی صورت دینے کے اہتمام ہو رہے تھے

متعدد سرایا پیش آئے۔ اطراف کے لوگوں نے کچھ شرارتیں کیں اور فساد بپا کیے تو آپؐ نے صحابۂ کرام کو دستے دے دے کر ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ یہ سرایا، سریہ عبداللہ بن عتیک، سریہ محمد بن سلمہ، سریہ عکاشہ بن محصن، سریہ ذی القصہ، سریہ بنو ثعلبہ، سریہ وادی القریٰ، سریہ امّ القرفہ، سریہ عبداللہ بن رواحہ اور سریہ عمرو بن اُمیہ پر مشتمل ہیں۔ ان کی کوئی جنگی حیثیت نہ تھی، لیکن تاریخ میں ان کا ذکر موجود ہے۔ علاوہ ازیں دو مرتبہ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) خود تشریف لے گئے۔

اِن دنوں یہی مصروفیات تھیں۔ بنو قریظہ کے بعد مدینۂ منورہ پاک ہو چکا تھا۔ مسلمان بحرانی حالت سے گزرنے کے بعد اب قدرے پُرسکون ہوئے تھے۔ قریش اور یہودی منافقین سبھی باری باری اسلام کے مقابل آ کر شکست کھا چکے تھے اور اب کسی کو سر اٹھانے کی ہمّت نہ تھی لہٰذا اس جانب سے اطمینان ہوا تو مسلمانوں کو اپنے اطمینان کا وہ زمانہ یاد آیا جس سے مقدّس گھر کعبۃ اللہ کی یادیں وابستہ تھیں۔ وطن کی یاد بھی تھی اور پھر زیارتِ کعبہ کو بھی عرصہ گزر چکا تھا چنانچہ طے پایا کہ مکّے کی طرف سفر کیا جائے۔ یہ آرزو دل سے لبوں تک آئی تو معلم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا منشا پا کر صحابۂ کرام کی ایک جماعت اس کے لیے تیار ہو گئی۔

## صلحِ حدیبیہ۔ ذی القعدہ ۶ھ (مارچ ۶۲۸ء)

مسلمانوں کے لیے یہ سفر سب سے زیادہ مسرّت بخش تھا۔ وہ مدینۂ منورہ سے جب بھی نکلتے کفر کے مقابلے کے لیے ہی نکلتے تھے۔ اب ہجرت کے چھ برس بعد یہ موقع نصیب ہوا تھا کہ اللہ کے نبیؐ کی معیت میں اللہ کے گھر کی زیارت کے لیے جا رہے تھے۔ خوشی جتنی بھی ہوتی کم تھی۔ چودہ سَو مسلمان اس طرح تھے کہ ان کے ساتھ قربانی کے اونٹ اور نیاموں میں تلواروں کے سوا کچھ نہ تھا اور عربوں میں شمشیر بہ کف ہونے کے معنی مسلح ہونا نہیں بلکہ تلوار شانے سے جدا نہ کرنا مردانگی تصوّر کی جاتی تھی اسی لیے اسے امتیاز کے طور پر ضروری سمجھا اور سفر شروع کر دیا۔ اس وقت ان میں وہ لوگ بھی تھے جو چھپ کر اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ وہ لوگ بھی تھے جو اس قدر ستائے گئے تھے کہ وہاں سانس لینا دشوار تھا، لیکن دل امنگوں سے بھرے ہوئے اور نظریں اس مقدّس گھر کو دیکھنے کے

لیے بے قرار تھیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے دستور کے مطابق چند جوانوں کو آگے روانہ کر دیا تھا تاکہ وہ قریش کے حال سے آگاہ کر دیں۔

عرب کے بین الاقوامی قانون کے مطابق بدترین مجرموں کو بھی حج سے نہ روکا جاتا تھا اور ایامِ حج میں حدودِ حرم میں کشت و خون جائز نہ تھا۔ اسی گمان میں مسلمان بے فکر و بے اندیشہ چلے جا رہے تھے لیکن جونہی یہ پرستارانِ توحید نواحِ مکہ میں پہنچے، ان کے مخبروں نے اطلاع دی کہ قریش ادائیگیٔ فریضۂ حج کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں بلکہ آمادۂ مقابلہ ہیں۔

اس وقت وہ ایک طویل سفر طے کر کے مقامِ حدیبیہ تک پہنچ چکے تھے اور مکۂ مکرمہ صرف ایک منزل کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ یہاں ایک کنواں ہے جس کے سبب یہ گاؤں بھی اسی نام سے مشہور تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسی جگہ خیمہ زن ہونے کا حکم صادر فرمایا، قریش کے سرداروں کی طرف اپنا سفیر روانہ کیا اور پیغام بھیجا کہ مسلمان جنگ کے لیے نہیں بلکہ زیارت کعبہ اور قربانی کے لیے آئے ہیں۔ یہ سن کر قریشی سردار سفیر کو گھیر کر آپس میں بحث کرنے لگے۔ کافی دیر اسی کیفیت میں گزر رہی۔ آخر طے ہوا کہ قریش کی جانب سے گفتگو کے لیے عروہ بن مسعود جائے۔ یہ سن کر عروہ بن مسعود ثقفی دربارِ نبوی میں آیا اور قریش کی جانب سے گفتگو کی جو بہت گستاخی اور بدتمیزی پر مشتمل تھی۔ یہ اندازِ گفتگو صحابہؓ کو شدید ناگوار ہوا، لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نہایت تحمل سے اسے برداشت کیا۔ اس وقت دربارِ نبوی کا نقشہ ایسا تھا کہ عروہ بن مسعود متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور اس نے واپس آ کر قریش سے اس عقیدت و محبت کا اس طرح ذکر کیا کہ وہ لوگ بھی متعجب ہوئے بغیر نہ رہے، لیکن یہ بات چیت ناکام رہی۔ قریش نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سفیر کو گھیر لیا۔ اس کے اونٹ کو مار ڈالا اور کسی طرح سے یہ سفیر اپنی جان بچا کر بھاگ آئے۔ اوّل تو یہی سب کچھ اخلاق کی حدود اور بین الاقوامی قانون کو توڑ دینے کے مترادف تھا، مستزاد یہ کہ اسی دوران میں انھوں نے اپنا ایک دستہ روانہ کیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گرفتار کر لیا جائے۔ یہ دستہ پوری شان کے ساتھ مکے سے نکلا، لیکن صحابۂ کرامؓ

کی نظروں میں آگیا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر اُسے گرفتار کر لیا اور دربارِ نبوی میں لے گئے۔ اگرچہ یہ شر انگیز لوگ ہر قسم کی سزا کے مستحق تھے، لیکن آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے عفوو درگزر سے کام لیا اور ان سے بھی یہی کہا کہ ہمارا مقصد جنگ نہیں، طوافِ کعبہ اور قربانی ہے۔ یہ دستہ واپس گیا، لیکن بڑی دیر تک قریش کی جانب سے کوئی جواب نہ آیا۔ تب اللہ کے نبیؐ نے اس مرتبہ حضرت عثمانؓ غنی کو سفیر کی حیثیت سے اہلِ مکّہ کے پاس روانہ کیا۔ وہ اپنے ایک قرابت دار ابان بن سعید کی پناہ میں مکّے پہنچے، مگر قریش نے انھیں نظر بند کر لیا اور مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے لیے افواہ پھیلا دی کہ وہ قتل کر دیے گئے۔ قریش کا مطلب تو محض مسلمانوں کو بھڑکا کر جنگ کرنا تھا لیکن معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس خبر سے دِلی صدمہ پہنچا۔ مسلمانوں میں بڑے جوش کا عالم تھا۔ وہ محض عبادت کے لیے یہاں تک آئے تھے اور دشمن جھگڑے کی ابتدا کر رہے تھے۔

## بیعت رضواں

معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "خونِ عثمانؓ کا بدلہ ضروری ہے!" پھر آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ببول کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور جملہ صحابۂ کرام سے قصاصِ عثمانؓ کی بیعت لینے لگے۔ اس وقت ان تمام مؤمنین نے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے دستِ مبارک پر ہاتھ رکھ کر جاں نثاری کی بیعت کی۔ اس واقعے کا نام بیعت الرضواں ہے۔

سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے اسے بیعتِ رضواں قرار دیتے ہوئے فرمایا:

"(اے نبیؐ!) خدا اس وقت مسلمانوں سے راضی تھا جب وہ درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے، سو خدا نے جان لیا جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں تھا تو خدا نے ان پر تسلّی نازل فرمائی اور انھیں فتح بخشی۔"

ابھی یہ بیعت مکمّل ہوئی تھی اور مسلمان آیندہ کے لیے کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ دوسری خبر ملی کہ حضرت عثمانؓ بہ قیدِ حیات ہیں اور ان کی شہادت کی خبر افواہ تھی۔ اس وقت آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو اطمینان ہوا، لیکن معاملہ ابھی اپنی جگہ ہی تھا۔ کوئی اور قدم اٹھانے سے قبل ہی یہ قدم خود قریش نے

اُٹھایا۔ انھوں نے سوچا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بات چیت کی جائے، لیکن اس طرح کہ اپنی ناک اونچی رہے اور مسلمان ان کی بات ماننے پر مجبور ہو جائیں۔

## شرائطِ صلح حدیبیہ

اس وقت سہیل بن عمرو کو اس معاملے کا مختار بنا کر بھیجا گیا۔ معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو صلح و امن میں کبھی بھی تامل نہ ہوا تھا اور اب جب کہ قریش نے خود ہی دستِ صلح بڑھایا تو کیسے جھٹک دیتے! اس گفتگو کے لیے پیغام آیا تو اللہ کے نبیؐ نے فوراً منظور فرمایا۔ اس موقع پر سہیل بن عمرو سے بڑی طویل گفتگو ہوئی جسے کچھ ردّو بدل کے بعد اللہ کے نبیؐ نے مان لیا اور طے پایا کہ اسے احاطۂ تحریر میں لایا جائے۔ ارشاد ہوا "صلح نامہ تیار کیا جائے۔"

اس حکم کی تعمیل کے لیے منشائے مبارک پا کر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے کاغذ اور قلم سنبھالا اور قاعدے کے مطابق لکھنا شروع کیا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔"

یہ دیکھتے ہی سہیل بن عمرو نے اعتراض کیا اور بولا "علیؓ ابنِ ابی طالب! تم جانتے ہو ہم رحمٰن کو نہیں مانتے لہٰذا یہ لفظ مت لکھو۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو یہ بات سخت ناگوار گزری، لیکن تحمّل سے بولے۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

سہیل بن عمرو نے جواب دیا "بِسمک اللّٰھم لکھو ہم صدیوں سے اپنے خطوط اور تحریروں کی ابتدا میں یہی لکھتے ہیں۔"

یہ دو لفظ چونکہ زمانۂ جاہلیت میں رائج تھے لہٰذا فطری طور پر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ہاتھ رُک گیا اور انھوں نے فیصلہ طلب نظروں سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب دیکھا تو ارشاد ہوا۔ "علیؓ! ابنِ عمرو جیسے کہتے ہیں ویسے ہی لکھو۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے تعمیلِ حکم کی اور صلح نامے کی تحریر لکھنا شروع کی۔ اب اسمِ گرامی کے بعد "رسول اللہ" لکھا تو سہیل بن عمرو پھر چونک اٹھا۔ اس نے اعتراض کیا۔ "ابنِ ابی طالب! اگر ہم محمدؐ بن عبداللہ کو رسول اللہ مانتے تو پھر

جھگڑا ہی کیوں کرتے! للذا عہد نامے سے اس لفظ کو بھی کاٹ دو۔"

یہ سنتے ہی صحابۂ کرام مشتعل ہو گئے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس لفظ کو نہ کاٹ سکے۔ یہ کام ناممکن تھا اس وقت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "علیؓ! اس لفظ کو کاٹ دو۔"

مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس حکم کی تعمیل کے لیے خود کو تیار ہی نہ کر سکے۔ تب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود اپنے دستِ مبارک سے اس لفظ پر قلم پھیر دیا، پھر صلح نامہ مرتب ہوا جس کی شرائط تاریخ میں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مسلمان اس برس واپس جائیں، اگلے برس حج کی غرض سے آئیں اور صرف تین یوم حرم میں قیام کریں۔

۲۔ اگلے برس جب آئیں تو تلوار کے سوا ان کے پاس کوئی ہتھیار نہ ہو اور اسے بھی نیام میں رکھیں۔

۳۔ مکۂ مکرمہ میں جو مسلمان ہجرت کرنے سے رہ گئے ہیں، انھیں مدینے ساتھ لے کر نہیں جائیں گے بلکہ وہ ہمیشہ مکے ہی میں رہیں گے۔

۴۔ قریش میں سے اگر کوئی شخص اسلام قبول کر کے مدینے جائے گا تو مسلمان اسے فوراً واپس کر دیں گے، لیکن اگر کوئی مسلمان مدینہ چھوڑ کر مکے آجائے گا تو اہلِ مکہ اسے واپس نہیں کریں گے۔

۵۔ عرب قبائل کو پوری پوری آزادی ہوگی کہ وہ دونوں میں سے (اہلِ مدینہ یا اہلِ مکہ) جس کے ساتھ بھی پسند کریں، معاہدۂ وفاداری کر سکتے ہیں۔ قریش کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

۶۔ یہ صلح دس برس کے لیے طے پائی ہے۔ (یہاں دونوں فریقوں میں سے کوئی ایک اگر درمیان میں بدعہدی کا مرتکب ہو تب اور صورت ہوگی)

صلح نامہ تیار ہوا تو مسلمانوں کو محسوس ہوا کہ یہ کڑی شرائط ان کی شکست پر دلالت کرتی ہیں۔ اس وقت صحابۂ کرام کو تامل تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے تو اپنے خیالات کا اظہار بھی کر دیا۔ "یا رسول اللہ! یہ سب تسلیم کر لینا ہماری کھلی شکست ہوگی۔" ان سب کے انداز کو سمجھنے کے باوجود اللہ کے نبیؐ نے سکوت فرمایا۔ پھر کسی کو

بھی لب کشائی کی جرأت نہ ہوئی اور معاہدے پر فریقین کے دستخط ہو گئے۔

## عملی نمونہ

اس وقت مسلمان اظہارِ خیال کی ہمّت نہ کر سکے، لیکن ملول تھے۔ صلح نامے کی تمام شرطیں ہی کفّار کے حق میں تھیں، لیکن ایک شرط تو بہت ہی کڑی تھی اور اس سے زیادہ سخت اس کا عملی نمونہ تھا۔

## ابو جندلؓ

ابو جندلؓ، ابنِ سہیل بن عمرو جو مسلمان ہو گئے تھے، ان دنوں اسی خطا کی سزا میں سختیاں برداشت کر رہے تھے۔ اس وقت کسی نہ کسی طرح سے بھاگ کر خدمتِ اقدس میں آ گئے۔ ابھی وہ پہنچے ہی تھے کہ ان کے باپ سہیل بن عمرو نے اُٹھ کر ایک طمانچہ ان کے مُنہ پر مارا تو وہ گڑگڑانے لگے: "یارسول اللہ! کیا میں پھر کافروں میں مصیبتیں اٹھانے کے لیے چلا جاؤں؟"

یہ سنتے ہی مسلمان اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بے چین ہو گئے، لیکن جو معاہدہ ابھی ہوا تھا، اس کی خلاف ورزی نہ کر سکے۔ وعدے کی پابندی اسلام کا سبق تھا۔

دنیا میں کسی انسان کی راست بازی و صداقت کا اندازہ اس کے ایفائے عہد ہی سے لگایا جاتا ہے۔ سچائی کی سب سے بڑی شہادت اس کی ثابت قدمی دیتی ہے اور یہ ایسی پرکھ، ایسی پہچان ہے جہاں اچھے اچھے صاحبِ کردار لوگوں کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں، لیکن یہ اللہ کے آخری نبیؐ تھے جنھیں دنیا کو اخلاقیات کا درس دینا تھا لہٰذا انھوں نے مضطرب ہو جانے کے باوجود معاہدے کی پابندی کو اس طرح سے نبھایا جس کی مثال نہیں ملتی۔ معاہدہ ہو جانے کے بعد اس ایفائے عہد کا پہلا ثبوت ابو جندلؓ تھے جن کا جسم زخموں سے چور تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی کیفیت کا اندازہ کر لیا تھا، لیکن وہ انھیں مدینۂ منورہ میں پناہ نہیں دے سکتے تھے لہٰذا سہیل بن عمرو انھیں لے گیا، وہ لوٹا دیے گئے۔

## ابو بصیرؓ

اس معاہدے کے بعد مکّے سے فرار ہو کر خدمتِ اقدس میں آنے والے دوسرے فرد ابو بصیرؓ تھے جو کفّار کے ہاتھوں اذیتیں سہہ سہہ کر تنگ آئے تو موقع ملتے

ہی مدینۂ منورہ کی راہ لی، لیکن یہ خبر عام ہوئی تو ان کے عقب میں قریش نے اپنے آدمی دوڑائے تاکہ اللہ کے نبیؐ عہد کی پابندی کریں تو ٹھیک ہے ورنہ جنگ چھیڑ دی جائے، لیکن اللہ کے نبیؐ نے پھر ایفائے عہد کا ثبوت دیا اور ابوبصیرؓ کو قریشی نمائندوں کے حوالے کر دیا۔ ابوبصیرؓ نے بھی اطاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قریش کے ہرکاروں کے ساتھ لوٹ جانا مناسب سمجھا، لیکن اثنائے راہ میں ایک کو مار ڈالا اور دوسرے کی گرفت سے بچ کر ساحلِ بحر کی جانب چلے گئے اور مقامِ عیص میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کے بعد مکّے سے جس قدر مسلمان کفار کے ہاتھوں اذیتیں برداشت کرتے اور جان بچا کر بھاگتے وہ مدینۂ منورہ جانے کی بجائے عیص کا رخ کرتے اور ابوبصیرؓ کے ساتھ شریک ہو جاتے۔ ایسے میں مکّے کے نمائندے کچھ بھی نہ کر سکتے کیوں کہ معاہدہ یہ تھا کہ مدینۂ منورہ جانے والوں کو واپس کیا جائے گا۔ اللہ کے نبیؐ کہیں اور فرار ہو کر جانے والوں کے ذمّے دار تو نہ تھے۔ یہ نوآبادی مسلمانوں کی پناہ گاہ بن گئی تھی جہاں ان کی خاصی تعداد جمع ہو گئی۔ تب انھیں گزر بسر کے لیے لازماً کسی کام کی ضرورت تھی لہٰذا انھوں نے قریش کے تجارتی قافلوں پر چھاپے مارنا شروع کر دیے۔ نتیجہ یہ کہ ان کے ہاتھوں آئے دن قریش کا کوئی نہ کوئی قافلہ لُٹ جاتا اور وہ داد فریاد بھی نہ کر سکتے۔ اس طرح قریش جو صلح نامۂ حدیبیہ کے بعد خود کو فاتح تصوّر کر رہے تھے، اب سب سے زیادہ کڑی شرط کے باعث خود ہی ہراساں ہو رہے تھے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کیا جائے کہ اس بار ایک خاتون نے راہِ فرار اختیار کی۔

**اُمِّ کلثومؓ بنت عقبہ:** آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عبادت میں رخنے ڈالنے والے اسلام کے بدترین دشمن عقبہ بن ابی معیط کی بیٹی نے دین قبول کیا تو اس نے مظالم کی انتہا کر دی۔ وہ کسی نہ کسی طرح بھاگ کر مدینۂ منورہ پہنچیں تو عقبہ بن ابی معیط نے اپنے فرزندوں کو ان کے پیچھے بھیجا کہ صلح حدیبیہ کی شرط کی رُو سے انھیں مدینۂ منورہ سے لے آئیں اور موت کے گھاٹ اتار دیں۔ وہ دونوں خدمتِ اقدس میں پہنچے اور صلح حدیبیہ کی وہ شرط یاد دلائی جس کی رُو سے ابوجندلؓ اور ابوبصیرؓ واپس کر دیے گئے تھے، لیکن اس بار یہ فیصلہ اللہ کے نبیؐ نے نہیں خود

اللہ تعالیٰ نے فرمادیا اور ارشاد ہوا: " اے ایمان والو! جب تمھارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو تم ان کو جانچ لو۔ اللہ ان کے ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اگر تمھیں معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہیں تو انھیں کافروں کے حوالے مت کرو۔"

وحیٔ الٰہی کے بعد آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے فرمایا: " عقبہ کے فرزندو! صلح نامے میں یہ شرط مردوں کے لیے تھی، عورتوں کے لیے نہیں۔ نہ تم لوگوں نے اِس وقت اس بات کی وضاحت کی تھی لہٰذا ہم نے مَردوں کو تمھارے حوالے کر دیا تھا، عورت کو نہیں کر سکتے۔ یہی خداوندِ عالَم کا فیصلہ ہے۔"

**تنسیخِ شرط:** اس وقت کفّار ناکام ہی لوٹ گئے۔ ابو بصیرؓ کی نوآبادی اور اس ناکامی نے انھیں بے حد ہراساں کیا۔ عقبہ بن ابی معیط کی دختر تو ایک گھر کا معاملہ تھیں، لیکن ابو بصیرؓ اور ان کے ساتھی تمام قریش قبائل کے لیے دشواری بن رہے تھے۔ ایسے میں اس شرط کی تنسیخ کے سوا کوئی اور صورت نہ تھی لہٰذا چند معزّزینِ قریش خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور اس شرط کی پابندی ختم کر دینے کی درخواست کی جس کے بعد ابو بصیرؓ کی جماعت مدینۂ منوّرہ میں آ کر آباد ہوئی۔ تب قریش کے تجارتی قافلے محفوظ ہو گئے۔

وہی صحابۂ کرامؓ جو اس وقت ملول اور افسردہ ہو رہے تھے، ان شرائط کو اپنی توہین پر دلالت کرتے تھے، اسی صلح کے دوررس اثرات دیکھ کر مطمئن ہو گئے۔ یہ کفّار سے زیادہ مسلمانوں کے لیے سودمند تھی۔ اس کے فوری بعد دو فائدے ہوئے۔

پہلا فائدہ یہ کہ اس صلح کے موقع پر غیر مسلم قبائل کو دونوں میں سے کسی فریق سے بھی آزادانہ تعلّقات رکھنے کی اجازت تھی لہٰذا وہی قبیلے جو قریش سے مرعوب ہو کر مسلمانوں سے میل جول کرنے اور ان کے پاس آنے میں تکلّف کرتے تھے، اب ملتے تو اسلام کی فطری کشش انھیں اس دین کی طرف لے آتی۔ وہ مسلمان ہو جاتے ورنہ دوست اور حمایتی بن جاتے۔ دونوں صورتوں میں مسلمانوں کا حلقہ وسیع ہو رہا تھا۔

دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ معاہدہ دس برس کے لیے ہوا تھا۔ مسلمان جو ہجرت

سے اب تک جنگ و جدل میں مصروف تھے، ایک جنگ کے ہتھیار نہ کھولنے پاتے تھے کہ دوسری کا حکم مل جاتا تھا۔ ایک شر پسند گروہ کی سرکوبی سے واپس ہوئے تو دوسرے کی اطلاع مل گئی۔ خود قریش مسلسل ریشہ دوانیاں کر رہے تھے۔ ان حالات کے تحت انھیں تبلیغ کے لیے وقت نہ ملتا تھا، لیکن دس سالہ معاہدے نے انھیں توحید کی منادی کا وقت دے دیا۔ اب معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفسِ نفیس قبائل میں جاتے اور دینِ حق کا ذکر کرتے۔ کچھ قبیلوں نے اسلام قبول کیا اور کچھ نے دوستی کا معاہدہ، تعلقات میں وسعت ہوئی۔ لوگ بے جھجک اسلام کی طرف آنے اور عام طور پر اس کا ذکر کرنے لگے۔ اس طرح ایک معمولی سی رعایت جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قریش کو دی تھی اور جس پر خود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھی ملول تھے، اسلام کے لیے زبردست فائدے کا سبب بن گئی تھی۔ مورخین نے صلح حدیبیہ کو سیاسی تدبیر کا شاہکار تسلیم کیا ہے۔ اس سے معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاملہ فہمی، دور بینی اور تدبر کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ مسلمانوں کے لیے ایک زبردست فتح تھی اور اللہ تعالیٰ نے بھی اسے فتحِ مبین قرار دیا۔

## سلاطین کو دعوتِ اسلام۔ محرم الحرام ۷ھ (۶۲۹ء)

صلح حدیبیہ کے بعد کا زمانہ منادیٔ حق کا زمانہ تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مخالفین کی ریشہ دوانیوں سے سکون ملا تو اس جانب توجہ فرمائی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اسلام کوئی علاقائی مذہب تو نہ تھا کہ محض عرب ہی تک محدود رہتا۔ اسلام کی تعلیمات تو ساری دنیا کے لیے تھیں اور ہیں۔ ان تعلیمات کا مقصد دنیا بھر کو توحید سے روشناس کرا کے ایک صالح نظام قائم کرنا تھا۔ اصلاح و ہدایت کے جو مدارج خداوندِ عالم نے مقرر فرمائے تھے، (اپنی ذات، گھر، خاندان، قبیلہ، قوم اور پھر کُل عالم)، ان میں اب دیگر اقوام کو شامل ہونا تھا۔

چھ ہجری تک عرب کا زیادہ تر حصہ نعمتِ توحید سے مالا مال ہو چکا تھا۔ تب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فیصلہ کیا کہ حجاز سے متصل ممالک کے حکمرانوں کو دعوتِ

حق دی جائے جن میں ممتاز سلاطین بھی تھے اور باجگزار حکمراں بھی۔ ان لوگوں کے لیے اسلام کی دعوت انفرادی نہ تھی بلکہ اجتماعی تھی۔ اگرچہ اس سے قبل بھی غیر اقوام کے افراد نے اسلام قبول کیا تھا جن میں صہیبؓ رومی، بلالؓ حبشی، عدّسؓ نینوائی اور سلمانؓ فارسی قابلِ ذکر ہستیاں ہیں، لیکن اب معاملہ فرماں رواؤں کو دعوتِ حق دینے کا تھا جنھیں حق کا پیغام دینا ان کی پوری قوم کو دعوت دینے کے مترادف تھا گویا یہ تبلیغ و ہدایت کا اعلیٰ ترین درجہ تھا۔

اس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابۂ کرامؓ کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا اور اس خیال کا اظہار فرمایا۔

## انگشتریٔ رسولؐ

ملوکِ عجم کو دعوت کا مقصد جان لینے کے بعد صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ملوکِ عجم کسی بھی مکتوب کا جواب اس وقت تک نہیں دیتے اور نہ مکتوب کو قبول کرتے ہیں جب تک کہ اس پر روانہ کرنے والے کی مُہر نہ ہو۔"

یہ سننے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قدرے غور کیا، پھر لوہے کی ایک انگوٹھی بنوانے کا حکم صادر فرمایا۔ انگوٹھی تیار ہو کر سامنے آئی اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے انگلی میں پہنا تو حضرت جبرئیلؑ نے کہا "یا رسولؐ اللہ! آہنی انگشتری نہ پہنیے!"

یہ حکم دوبارہ دیا گیا۔ اس بار تانبے کی انگوٹھی تیار ہوئی۔

اس بار پھر حضرت جبرئیلؑ تشریف لائے اور بولے "یا رسولؐ اللہ! تانبے کی انگشتری نہ پہنیے۔"

اب تیسری بار پھر حکم دیا گیا اور چاندی کی انگوٹھی بنوائی گئی۔ تب حضرت جبرئیلؑ نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے پہنا۔ اس انگشتری کا نقش سطروں میں اس طرح مکمل ہوتا تھا کہ پہلی سطر میں "اللہ" دوسری میں "رسول" اور تیسری میں "محمدؐ" لکھا ہوا تھا، یعنی عبارت آخری سطر سے شروع کی جاتی تھی۔ اس کے بعد تمام مکتوب و احکام پر اسی سے مُہر کی جاتی تھی، "اللہ رسول محمدؐ"۔

اس مرحلے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مختلف حکمرانوں کے نام خطوط

تیار کیے جن کی عبارت ان کے مقامی حالات اور سابقہ عقائد کے مطابق تھی۔ ان میں سے ہر حاکم کو اللہ کی وحدانیت کا سبق اور شرک سے اجتناب کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔ انھیں جن سفراء کے ذریعے روانہ کیا گیا، ان کے لیے بھی احتیاط برتی گئی کہ جو سفیر جس ملک میں جائے، وہاں کی زبان و مذہب اور تہذیب و ثقافت سے پوری طرح واقف ہو تاکہ وہاں جاکر اسلام کی تبلیغ کر سکے۔ ان ممالک کی تفصیل تواریخ میں اس طرح سے درج ہے۔

۱۔ حضرت وحیہؓ کلبی۔ ہرقل، قیصر روم کی جانب بھیجے گئے۔
۲۔ عبداللہؓ بن خذافہ۔ خسرو پرویز، ایران کی جانب بھیجے گئے۔
۳۔ حاطبؓ بن بلتعہ۔ عزیز مصر، مقوقس کی جانب بھیجے گئے۔
۴۔ عمروؓ بن امیہ۔ بادشاہ حبش نجاشی کی جانب بھیجے گئے۔
۵۔ سلیطؓ بن عمرو۔ رئیس یمامہ، ہوذہ بن علی کی جانب بھیجے گئے۔
۶۔ شجاعؓ بن وہب۔ رئیس سرحدِ شام، حارث غسانی کی جانب راوانہ کیے گئے۔
۷۔ حارثؓ بن عمیر۔ شاہ بصریٰ، شرجیل بن عمرو غسانی کی جانب بھیجے گئے۔

## مکتوبات

۱۔ نامۂ مبارک۔ قیصرِ روم کے نام۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے جو خدا کا بندہ اور رسول ہے، یہ ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیس اعظم ہے۔ اس کو سلامتی ہو جو ہدایت کا پیروکار ہے۔ ازاں بعد اے بادشاہ! میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر تم اسلام کی اس دعوت کو قبول کرتے ہو تو تمھارے لیے سلامتی ہے اور اللہ تعالیٰ تمھیں دگنا اجر عطا فرمائے گا (اپنا اور قوم کا) ورنہ اہل ملک کا گناہ بھی تم پر ہوگا۔

اے اہلِ کتاب! میں تمھیں ایسی بات کی طرف بلاتا ہوں جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے، (وحدانیت) یعنی ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور ہم میں سے کوئی بھی کسی باطل قوت کو اپنا معبود تسلیم نہ کرے۔

اگر تم حق کی ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتے تو گواہ رہنا کہ ہم حق کی ان تمام باتوں کو

تسلیم کرتے ہیں۔

## قیصر کی تحقیق اور جواب

اس دعوت نامے کے بارے میں جان کر قیصر نے چند عربوں کو طلب کیا جو اس وقت تجارت کی غرض سے وہاں موجود تھے۔ ان میں ابوسفیان بن حرب سے ایک طویل گفتگو کی جو نبوت اور نبیؐ کے بارے میں تھی اور تاریخ میں اس طرح سے درج ہے۔

قیصر: تمھارے ملک میں جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، اس کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان: نجیب الطرفین، شریف ترین۔

قیصر: اس کے خاندان میں یہ دعویٰ کسی اور نے بھی کیا تھا؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: یہ دین کس مرتبے کے لوگوں نے قبول کیا ہے، امیر یا غریب؟

ابوسفیان: غریب۔

قیصر: ان کی تعداد بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے؟

ابوسفیان: بڑھ رہی ہے۔

قیصر: اس شخص (نبیؐ) نے کبھی جھوٹ بھی بولا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: وہ اپنے عہد کی پابندی کرتا ہے یا خلاف ورزی؟

ابوسفیان: ابھی تک تو خلاف ورزی نہیں کی۔ دیکھیں اب نئے معاہدے پر قائم رہتا ہے یا نہیں!

قیصر: تم لوگوں نے کبھی اس سے جنگ کی ہے یا نہیں؟

ابوسفیان: ہاں جنگ ہوتی رہی ہے۔

قیصر: نتیجہ کیا رہتا ہے؟

ابوسفیان: کبھی ہم غالب آئے کبھی وہ۔

قیصر: اس کی تعلیم کیا ہے؟

ابوسفیان: وہ سکھاتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو، نماز پڑھو، پاکیزگی اختیار کرو، عہد کی پابندی کرو، سچ بولو۔

اس تمام گفتگو کے بعد قیصرِ روم کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا "وہ شریف النفس اور اعلیٰ ہے۔ پیغمبروں کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ اعلیٰ خاندان سے ہوں۔ اس کے خاندان میں کوئی اور نبی نہیں ہوا۔ کوئی بادشاہ نہیں ہوا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا اسے نبوّت کا شوق اور بادشاہت کی ہوس ہے۔ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ جو شخص انسانوں سے دروغ گوئی نہیں کرتا، وہ خدا پر جھوٹ کیوں باندھے گا! اس کی پیروی کرنے والے غریب ہیں۔ پیغمبروں پر اوّلین ایمان لانے والے غریب ہی ہوا کرتے ہیں۔ اس کا دین ترقّی کر رہا ہے۔ صدق کی یہی علامت ہے کہ لوگ بہ تدریج اسے اختیار کرتے ہیں۔ وہ ایک خدا کی عبادت اور نیکی کی ہدایت دیتا ہے۔ یہی نبوّت کی علامات ہیں"۔

یہ گفتگو سن کر مسیحی علماء چراغ پا ہو رہے تھے۔ قیصر کو ان کا بھی خیال تھا۔ اس کے نزدیک یہ نبوّت اور دعویٰ نبوّت حقیقت تھا لیکن قوم کا خوف بھی طاری تھا۔

اس نے اسی لیے اعتراف تو کیا مگر ایمان نہ لایا اور حضرت دحیہ کلبی اور ان کے ساتھیوں کو رخصت کرتے ہوئے بولا "مجھے یہ تو معلوم تھا کہ ایک اور نبیؐ کا ظہور ہونے والا ہے، لیکن یہ وہم و گمان نہ تھا کہ وہ ظہور عرب میں ہوگا۔ اگر میں وہاں جا سکتا تو خود ان کے پاؤں دھوتا"۔

گویا اس نے سفیرِ دربارِ رسولؐ کو عزّت و احترام کے ساتھ رخصت کر دیا، لیکن تاج و تخت کی محبّت غالب آ گئی۔

## نامۂ مبارک بہ نام خسرو پرویز

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم۔

محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی جانب سے جو اللہ کا بندہ اور رسول ہے۔

یہ خط کسریٰ کے نام جو رئیسِ فارس ہے۔ ازاں بعد ہر اس شخص کے لیے سلام جو مذہب کا پیرو کار ہو اور خدا اور خدا کے پیغمبر پر ایمان لائے اور

اس بات کی گواہی دے کہ معبود صرف ایک ہے جس نے مجھے تمام دنیا کے لیے پیغمبر مقرر کر کے بھیجا تاکہ ہر زندہ شخص کو خدا کا خوف دلائے۔

تو اے بادشاہ! اگر تم نے یہ دین قبول کیا تو تمہارے لیے سلامتی ہی سلامتی ہے اور اگر تم نے اس دین سے انکار کیا تو مجوسیوں کا گناہ بھی تمہاری ہی گردن پر ہوگا۔ (قوم شرک کرتی رہے تو حساب بادشاہ کو دینا ہوگا)

## خسرو پرویز کا جواب

اس زمانے میں خطوط اس طرح تحریر کیے جاتے تھے کہ سب سے پہلے بادشاہوں کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ اس خط کا آغاز خدا کی تعریف اور رسولؐ کے ذکر سے ہوا تھا لہٰذا خسرو پرویز مشتعل ہو گیا۔ اس نے جھپٹ کر نامۂ مبارک کو چاک کرتے ہوئے کہا: "میری حدود میں رہتے ہوئے مجھے اس طرح مخاطب کرتا ہے؟" ازاں بعد اس نے یمن کے حاکم باذان کو حکم دیا: "حجاز میں مقیم نبوّت کے اس مدّعی کو پکڑ کر میرے دربار میں حاضر کیا جائے!"

ان واقعات کی اطلاع اور نامۂ مبارک کے چاک ہونے کی بابت آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو معلوم ہوا تو فرمایا: "اللہ نے اس کا ملک پارہ پارہ کر دیا!"

حاکم باذان کو کسریٰ کا حکم ملا تو اس نے اپنے دو آدمی اس کام کے لیے روانہ کیے۔ یہ دونوں سفر کرتے ہوئے مدینۂ منوّرہ پہنچے اور کسریٰ کا حکم سناتے ہوئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو دریافت کرنے لگے۔ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم کو معلوم ہوا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے انھیں طلب کیا۔

دربارِ رسالت میں جا کر باذان کے ان قاصدوں نے کہا: "ہمارے شہنشاہِ کسریٰ نے ملک باذان کو اور باذان نے ہمیں آپ کی گرفتاری پر مامور کیا ہے۔ اب آپ کے حق میں یہی بہتر ہے کہ چلیے ورنہ کسریٰ عدول حکمی کی صورت میں آپ کے ملک کو لوٹ لے گا اور قوم کو برباد کر دے گا۔"

اس پیغام سے صحابۂ کرام کو سخت طیش آیا اور منافقین مزے لے لے کر ایک دوسرے کو یہ واقعہ سنانے لگے، لیکن اللہ کے نبیؐ نے ان دونوں قاصدوں کو مہمان رکھا اور جواب دینے کے لیے دوسرا دن مقرر فرمایا۔ یہ رات سب نے

بڑی بے تابی سے گزاری۔ اُسی شب آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو الہام ہوا کہ خسرو پرویز کے بیٹے نے اسے قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا ہے لہٰذا دوسرے دن آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے یہ خبر ان دو قاصدوں کو سنائی۔ یہ دونوں حیران و پریشان واپس ہوئے۔

واپس جا کر انھوں نے یمن کے حاکم کو سفر کی داستان اور یہ خبر سنائی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا کیوں کہ یہ واقعہ درست تھا۔ اس طرح کسریٰ خسرو پرویز کی حکومت مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی۔

## نامۂ مبارک بہ نام عزیزِ مصر مقوقش اور جواب

خداوندِ عالم کی وحدانیت اور اپنی رسالت کا ذکر کرتے ہوئے تیسرا خط آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے عزیزِ مصر مقوقش کو تحریر کیا جس نے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے سفیر حاطبؓ بن بلتعہ کو بہ حد عزّت و احترام رکھا، اس نامۂ مبارک کو بہ غور سنا اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی نبوّت کی تائید کرتے ہوئے اس نامے کا جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی دو لڑکیاں (ماریہ قبطیہ اور سیرین قبطیہ) لباس کے لیے قیمتی کپڑا اور سواری کے لیے ایک خچر روانہ کیا۔ یہ دونوں لڑکیاں سگی بہنیں تھیں اور خدمتِ اقدس میں آنے سے قبل ہی حاطبؓ بن بلتعہ کی تعلیم سے مسلمان ہو چکی تھیں۔ یہ مصر میں بہت باعزّت تصوّر کی جاتی تھیں اور قبط بن حام بن نوحؑ کی اولاد سے تھیں۔ بہر حال عزیزِ مصر نے اسلام قبول نہ کیا، لیکن اہلِ مصر کی جانب سے عزّت اور پیغام بھیج کر دربارِ رسالت سے صلح جو یانہ تعلق جوڑ لیا۔

## نامۂ مبارک بہ نام نجاشی

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

یہ خط اللہ کے رسول محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی جانب سے نجاشی اصحم شاہِ حبشہ کے نام ہے۔ میں اس خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کرتا ہوں جو بادشاہ ہے، پاک ہے، سلامتی اور امن دینے والا ہے۔ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ عیسیٰؑ روح اللہ ہیں اور اس کا وہ کلمہ ہیں جو اس نے مریم صدّیقہ کی طرف ڈالا اور عیسیٰؑ

کو اپنی روح اور پھونک سے اسی طرح پیدا کیا جس طرح آدمؑ کو اپنی روح اور پھونک سے پیدا کیا تھا۔

میں تمھیں اللہ کے دین کی دعوت دیتا ہوں جو یکتا ہے اور شرک سے بری ہے۔ میں تمھیں دعوت دیتا ہوں، اس کی اطاعت کے کاموں میں تعاون کی۔ تم لوگ میری پیروی کرو اور قرآن پر ایمان لاؤ جو میرے پاس اللہ کی جانب سے آیا ہے۔ بلاشبہہ میں اللہ کا رسولؐ ہوں۔ میں اپنے چچا زاد جعفرؓ بن ابی طالب کو تمھارے پاس بھیج رہا ہوں جن کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت ہے۔ جب یہ لوگ (دعوتِ اسلام لے کر) پہنچیں تو تم لوگ سرکشی چھوڑ کر اس دین میں داخل ہو جاؤ جس کی دعوت میں تمھیں مع لشکر کے دے رہا ہوں۔ میری خیر خواہی قبول کرو۔ میں نے تمھاری بھلائی کے لیے ہدایت کی ہے۔ ہدایت کی پیروی کرنے والوں پر سلامتی ہو۔

## نجاشی کا جواب

اس دعوت کے جواب میں نجاشی نے ایک موءدبانہ خط روانہ کیا اور حبش میں موجود حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کے ہاتھ پہ بیعت کی اور اپنے فرزند کو ساٹھ حبشیوں کے ساتھ ایک کشتی میں سوار کرا کر مدینۂ منورہ کی طرف روانہ کیا جو اثنائے راہ میں ڈوب گئی اور یہ سفیر اور سامان سب ضائع ہو گیا۔

## نامۂ مبارک بہ نام شرجیل بن عمرو

شاہِ بصریٰ شرجیل بن عمرو قیصر کا ماتحت تھا اور عرصۂ دراز سے دینِ مسیحی کا پیروکار تھا۔ اس کے نام نامہ گیا تو از حد چراغ پا ہوا اور غصے کی حالت میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے روانہ کردہ سفیر حضرت حارثؓ بن عمیر کو شہید کر دیا اور پیغام ٹھکرا دیا۔ ازاں بعد اسی کے تصاص میں جنگِ موتہ عمل میں آئی تھی۔

## نامۂ مبارک بہ نام رئیسِ یمامہ (ہوزہ بن علی)

رئیسِ یمامہ کو تبلیغی مراسلہ ملا تو اس نے بڑی وضاحت کے ساتھ جواب دیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقصد کی تعریف کی اور کہا کہ ان سے کہنا کہ آپ کی باتیں دل نشیں ہیں، مجھے پسند آئیں۔ اگر حکومت میں میرا بھی حصہ رکھیں تو میں

اقتدا اور پیروی کے لیے تیار ہوں۔

یہ گفتگو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بڑی ناگوار محسوس ہوئی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: "زمین کا ایک ٹکڑا بھی ہو تو نہ دوں گا۔"

بہرحال تبلیغی مراسلے رؤسائے عرب کو بھی روانہ کیے گئے۔ ان میں سے بعض نے اسلام کی حقیقت معلوم کر کے اسلام قبول کر لیا، لیکن جہاں ان مکتوبات کی ترسیل متعدد اقوام کے راہِ راست پر آنے کا سبب بن گئی، وہاں اسی دعوتِ حق کو گستاخانہ انکار کرنے کی بدولت بہت سے راندۂ درگاہ ہوئے اور شام و ایران سے اس طرح مخالفت شروع ہوئی جو برسوں پر محیط نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ فاروقِ اعظمؓ کے عہدِ خلافت میں ان دو ملکوں کی فتوحات نے اس کا خاتمہ کر دیا۔

## مکے کی عسکری اور سیاسی قوت قدموں میں

یہی زمانہ تھا جب آفتابِ اسلام کی روشنی عرب کی حدود سے باہر نکلی جس سے قبولِ خیر کی استعداد رکھنے والے لوگوں کے قلب منور ہونے لگے اور یہی زمانہ تھا جب اسلام نے ان لوگوں کے قلب فتح کر لیے جو صلح حدیبیہ تک مسلمانوں کو زک پہنچانا اور اسلام سے انکار کرنا اپنی فتح تصور کرتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے بعد کا زمانہ تھا جب ایک دن خالدؓ بن ولید نے مکے سے نکل کر مدینۂ منورہ کی جانب سفر شروع کیا تو اثنائے راہ میں عمروؓ بن العاص سے ملاقات ہو گئی جو خود بھی مصروفِ سفر تھے۔ انھوں نے دریافت کیا: "ابنِ ولید، کدھر کا مقصد ہے؟"

خالدؓ بن ولید بولے: "اسلام کی طرف جاتا ہوں۔"

عمروؓ بن العاص نے کہا: "اپنا بھی کچھ یہی ارادہ ہے۔"

اس طرح قریش کے دو جلیل القدر افراد جن میں ایک صاحبِ علم اور ایک صاحبِ سیف، ایک ناقابلِ تسخیر سیاست داں اور دوسرا ناقابلِ شکست جنگجو، اس صلح کے فوری بعد دربارِ نبوی میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔ اس طرح اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں میں برابر اضافہ ہوتا رہا اور وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ ایک سال گزر گیا اور صلح نامے کی اوّلین شرط

کے مطابق ادائیگیٔ عمرہ کا وقت آگیا۔

## عمرۃ القضا ۔ ذی القعدہ ۷ ہجری (مارچ ۶۲۹ء)

معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا کہ جو حضرات صلحِ حدیبیہ میں شریک تھے، سب عمرے کے لیے تیار رہیں۔ یہ سنتے ہی مسلمان تیار ہونے لگے۔ انھیں صرف تین دن قیام کرنا تھا اور شرائط کی رُو سے ہتھیار لیے بغیر جانا تھا۔ لہٰذا مدینۂ منورہ میں سباعؓ بن عرطفہ کو اپنا قائم مقام بنا کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مکے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت مسلمانوں میں بڑے جوش کا عالم تھا۔ اہلِ مکّہ میں عام خیال یہی تھا کہ شاید وطن سے دُور جا کر جنگوں کی مصروفیات اور مدینۂ منورہ کی آب و ہوا نے مسلمانوں کو کمزور کر دیا ہوگا۔ اس بنا پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حکم صادر فرمایا کہ مسلمان دورانِ طواف میں ابتدا کے تین پھیرے اکڑتے ہوئے چلیں لہٰذا مسلمانوں نے شروع کے تین چکّر اکڑتے ہوئے اور باقی چار معمول کے مطابق لگائے۔ یہ سنّت آج تک ادا کی جاتی ہے۔ جس وقت مسلمان مکّے میں داخل ہوئے تو مشرکینِ مکّہ شہر خالی کر کے پہاڑوں پر چلے گئے۔ تب مسلمانوں نے بہ اطمینان عمرہ کیا، قربانی کی اور عمرے کے دوسرے تمام رُکن ادا کیے۔ یہ تین یوم بڑے ہی مصروف گزرے۔ جن کے اقرباء وہاں موجود تھے، ادھ ملتے رہے۔

تیسرے دن مشرکینِ مکّہ نے پیغام بھیجا کہ شرط کی رُو سے تین یوم ہونے والے ہیں، اب لوٹ جاؤ۔ یہاں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا اور تیسرا دن تمام ہوتے ہی مکّے سے روانہ ہو کر مقام سراف یا سرف میں آگئے جو مکّے سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں ابورافع، امّ المومنین حضرت میمونہؓ کو مکّے سے لے کر پہنچے۔ یہاں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک رات گزاری اور صبح ہونے سے قبل ہی روانہ ہو گئے۔

اس طرح عمرۃ القضا ادا ہوگیا۔ اس عمرے کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ فتحِ خیبر کے بعد ہوا۔ بہرکیف ہجرت کا چھٹا برس مسلمانوں کے لیے بڑی بڑی کامیابیاں لے کر آیا تھا۔

## کافر بیوی کے بارے میں حکمِ خداوندی

اس سال کافر عورتوں کے بارے میں واضح حکم نازل ہوا کہ وہ مسلمان مردوں کے نکاح میں نہیں رہ سکتیں۔ اس وقت بہت سے مسلمان وہ تھے جن کی بیویاں کافر تھیں اور ہجرت کر کے نہیں آئی تھیں اور اکثر مسلمان عورتوں کے شوہر کافر تھے لہٰذا واضح حکم دیا گیا۔

نہ وہ (کافر مرد مسلمان عورتوں کے لیے) حلال ہیں اور نہ وہ (مسلمان مرد کافر عورتوں) ان کے لیے جائز ہیں۔ جو کچھ انھوں نے ان پر خرچ کیا ہے ادے دیجیے اور (تم لوگوں پر) کچھ گناہ نہیں ہے کہ ان کے مہر ادا کر کے ان سے نکاح کر لو۔ اور کافر عورتوں کی ناموس کو اپنے قبضے میں مت رکھو۔ (کافروں کی طرف لوٹا دو) اور جو کچھ تم نے ان پر خرچ کیا ہے، ان سے طلب کر لو اور جو کچھ انھوں نے ان پر خرچ کیا ہے وہ تم سے طلب کریں۔ یہ خدا کا حکم ہے جو تم میں فیصلہ کیے دیتا ہے۔ اگر تمھاری عورتوں میں سے کوئی عورت کافروں کے پاس چلی جائے (اور اس کا مہر وصول نہ ہوا ہو) تب تم ان سے جنگ کرو اور جو غنیمت ملے، اس میں سے انھیں (جن کی عورتیں چلی گئی ہیں) اتنا دے دو جتنا کہ انھوں نے خرچ کیا ہو اور خدا سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

اس حکم کے بعد مسلمانوں نے اپنی کافر بیویوں کو مہر ادا کر کے طلاق دے دی اور مسلمان عورتوں سے نکاح کر لیے۔ اس طرح ہر گھر پاکیزگی و طہارت کا نمونہ بن گیا، لیکن جب صلح حدیبیہ کی شرائط منسوخ ہوئیں، کافران پر قائم نہ رہے تب کافر عورتوں کو مہر ادا کرنے کا حکم بھی موقوف ہو گیا، یعنی مسلمان مردوں کی کافر بیویاں کوئی امید نہ رکھیں وہ ہر طرح خسارے میں رہیں گی۔ اس طرح کفر اور اسلام کا ہر تعلق قطع ہو گیا۔

### غزوۂ خیبر (محرم ۷ھ مئی ۶۲۸ء)

خیبر شمالی عرب میں دو سو میل کے فاصلے پر متعدد مضبوط قلعوں پر مشتمل ایک بستی تھی۔ جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بنو نضیر کو جلا وطن کیا تو وہ یہاں آ کر آباد ہو گئے اور اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے اردگرد کے یہودیوں کو مسلمانوں

کے خلاف بھڑکانے لگے۔ جس زمانے میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہجرت کے چھٹے برس گئے، قریشِ مکہ نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حج سے روکا اور مسلمان حج کیے بغیر مشرکینِ مکہ سے صلح کر کے مدینۂ منورہ واپس آگئے تو ان تمام یہودیوں نے انھیں کم زور تصور کرتے ہوئے پر پرُزے نکالنا شروع کر دیے۔ اِدھر ان کے سردار حیی بن اخطب کنانہ بن ابی حقیق اور سلام بن مشکم دیگر قبائل سے سازباز میں مصروف تھے، اُدھر ان کے جوان ریشہ دوانیاں کر رہے تھے۔ کبھی وہ مدینۂ منورہ کی چراگاہ سے مویشی لوٹ لیتے، کبھی بے امنی پھیلاتے۔ یہ سب حرکتیں معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں سے چھپی نہ تھیں۔ کچھ وقت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) انھیں برداشت کرتے رہے، لیکن جب حد سے گزر گئیں، دوسرے ان کے سرداروں کا دیگر قبائل سے سازباز کا علم ہوا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی گوشمالی کا فیصلہ کیا اور پندرہ سو رفیقوں کے ساتھ خیبر کی جانب روانہ ہو گئے۔

ان دنوں یہودیِ خیبر کے معزز سردار بنو غطفان کے ساتھ مل کر اسلام کی قوت کو توڑ دینے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم بہ عجلت تمام روانہ ہوئے۔ پہلا قیام رجیع کے مقام پر کیا، دوسری منزل خیبر تھی جہاں یہودیوں کے آٹھ قلعے تھے، النطاۃ، العصب، ناعم، الزبیر، اُبی، النذار، القموص، الوطیح اور سلالم۔ ان میں القموص سب سے مضبوط تصور کیا جاتا تھا۔ یہاں بیس ہزار فوج ہر دم تیار رہتی تھی چنانچہ اہلِ خیبر جنھیں اپنی قوت پر بڑا فخر تھا، جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ علاوہ ازیں اس وقت انھیں بنو غطفان کی جانب سے قوی توقعات تھیں۔ وہ بھی اپنا ایک لشکر روانہ کر رہے تھے۔ مسلمان فوج کی آمد کی اطلاع ملی تو انھوں نے اپنا لشکر واپس بلا لیا۔ اِدھر مطمئن ہونے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اہلِ خیبر کی طرف توجہ دی۔

**قلعۂ ناعم:** سب سے پہلے آپؐ نے آگے بڑھ کر قلعۂ حصن ناعم کا حصار کر لیا۔ اس حملہ آور فوج کے سردار محمود بن مسلمہ تھے جو اپنے دستے کے ساتھ بڑی بہادری سے لڑ رہے تھے۔ پانچ یوم انھوں نے پوری جاں فشانی سے مقابلہ کیا۔ ایک دن موسم بہت سخت تھا اور وہ مقابلہ کرتے کرتے تھک گئے تھے، ایسے میں

قدرے سستانے کے لیے قلعے کی دیوار کے سائے میں لیٹ گئے۔ یہ موقع کنانہ بن ربیعہ یہودی کے لیے بڑا قیمتی تھا۔ وہ تیزی سے گیا اور چکی کا پاٹ قلعے کی فصیل کے اوپر سے اس طرح ان پر پھینکا کہ وہ سانس بھی نہ لے سکے اور شہید ہو گئے۔

اس کے بعد اس دستے کی قیادت ان کے بھائی محمدؓ بن مسلمہ کو سونپی گئی۔ اس وقت دشمن کی تعداد ان سے بہت زیادہ تھی اور وہ قلعہ بھی بہت مضبوط تھا، لیکن محمدؓ بن مسلمہ نے بڑی جاں نشانی کا ثبوت دیا اور قلعہ ناعم فتح ہو گیا۔

اس فتح نے نفسیاتی طور پر مسلمانوں کو پُر امید اور یہودیوں کو اندیشوں کا شکار کر دیا تھا۔ پھر مسلمان آگے بڑھتے اور درمیانی قلعے سر کرتے گئے۔ یہودی زیرِ زمین راستوں سے اپنی تعداد اور اپنی قوت دوسرے قلعوں میں منتقل کرتے گئے۔ دراصل ان کی پناہ گاہ خیبر کا مضبوط ترین قلعہ القموص تھا جسے فتح کرنا گویا خیبر کو فتح کرنا تھا۔ آخر اس کی باری آئی۔ اس وقت یہاں تمام فوج اور خیبر کے معزز سردار اپنے اپنے کنبوں کے ساتھ جمع ہو گئے تھے۔ کنانہ بن ابی حقیق کا پورا کنبہ یہیں مقیم تھا اور اس کا بہادر ترین جنگجو سردار مرحب بھی! اس قلعے کی حفاظت کے وہ انتظام کیے گئے تھے کہ تمام یہودی اسے ناقابلِ تسخیر تصور کر رہے تھے۔ اس کا فتح کرنا دشوار ہی نہیں، ناممکن کام نظر آتا تھا۔

اندر محفوظ یہودیوں میں عام خیال یہی تھا کہ مسلمان اسے کبھی بھی فتح نہ کر سکیں گے، لیکن مسلمان، جو خداوندِ عالم کے بھروسے پر کفر کی سرکوبی کے لیے نکلے تھے، انھیں ایسی کوئی تشویش نہ تھی۔ ایک طریقۂ جنگ سے کامیابی نہ ہوتی تو وہ دوسرا طریقہ اختیار کر سکتے تھے۔ دوسرا ناکام ہو جاتا تو مقابلے کا تیسرا انداز موجود تھا۔ الغرض ہر رخ اور ہر انداز سے انھیں یہ جنگ جیتنا تھی۔

اس قلعے کی فتح کے لیے ایک دو نہیں متعدد روایتیں مشہور ہیں۔ مختصر یہ کہ اس قلعے کی فتح کو دشوار تصور کرتے ہوئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نیا اندازِ جنگ اختیار کیا۔ آپؐ ہر روز صحابہؓ کرام میں سے کسی کی کمان میں ایک دستۂ فوج روانہ کرتے جو پوری جاں نشانی سے یہودیوں کو تھکا کر اور مقابلہ کر کے شام کو لوٹ آتا۔ دوسرے دن دوسرا دستہ میدان میں جاتا۔ اس طرح سے بیس یوم گزر گئے اور یہ

حکم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ملا۔ مرحب جو ایک بھاری پہلوان اور تجربے کار جنگجو تھا، قلعے کے دفاع کی خاطر میدان میں آیا، لیکن اس مرتبہ اس کی پیش نہ گئی۔ اللہ تعالیٰ کو فتح و نصرت منظور تھی اور یہودیوں کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا لہٰذا چند جھڑپوں اور مقابلوں کے بعد مرحب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھوں مارا گیا اور قلعۂ القموص فتح ہو گیا۔ اب دو قلعے باقی تھے جو اتنے مستحکم نہ تھے لہٰذا اس کے نصف وقت میں وہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ آ گئے۔

اب مکمل طور پہ خیبر اور اہلِ خیبر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رحم و کرم پر تھے۔ ان کے ترانوے اور سو کے درمیان آدمی مارے گئے تھے۔ نقصان کا حساب کرنا ہی کیا، سبھی کچھ تھا جسے مسلمان فتح کر چکے تھے۔ اس غزوے میں اتنا طویل وقت صرف ہوا جو کسی بھی غزوے میں صرف نہیں ہوا تھا۔ پوری آبادی کو زیر کرتے اور چھپی ہوئی تمام قوتوں کو سامنے لانے میں مکمل دو ماہ صرف ہوئے۔ اب اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) چاہتے تو ان مسلسل سازشوں کی سزا دے سکتے تھے، لیکن دورانِ جنگ میں جو کچھ ہوا، سو ہوا اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کسی پر تشدد کرنا پسند نہ آیا۔ یہودیوں نے درخواست پیش کی کہ مفتوحہ علاقہ نصف پیداوار کی ادائیگی کی شرط پر انھی کے پاس رہنے دیا جائے۔ اسے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قبول فرمایا، لیکن ادھر اللہ کے نبیؐ ان پر مہربانیاں فرما رہے تھے، اُدھر ابھی سازش جاری تھی۔

ایک یہودی عورت زینب بنتِ حارث نے دعوت کے اہتمام کی آڑ لے کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کھانے میں زہر ملا دیا۔ اللہ کے نبیؐ کو تو بر وقت اس کی خبر ہو گئی لیکن بشرؓ بن براء پہ یہ زہر کام کر گیا لہٰذا جنگ کے فیصلے کے بعد خیبر کے انھی دو نفوس کو سزا دی گئی۔ سردار کنانہ بن ابی حقیق کو محمود بن مسلمہ پہ چکی کا پاٹ گرانے کے جرم میں قتل کر دیا گیا اور زینب بنتِ حارث کو بشرؓ بن براء کی شہادت کی ذمے داری پہ سزائے موت دی گئی۔

مالِ غنیمت سے خمس نکالنے کے بعد باقی اشیا کی تجارت کی گئی جس کے منافع کو اٹھارہ حصوں میں بانٹ کر ہر حصے کو سو سو کے دستے پر تقسیم کر دیا گیا۔

پھر خیبر کی زمین کو دو حصوں میں تقسیم فرما کر ایک حصّے کو صرف مہمات اور جنگوں کے اخراجات کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور دوسرے حصّے کو فوج میں تقسیم کر دیا گیا۔

## اُمّ المومنین حضرت صفیہؓ

اسیرانِ جنگ میں کنانہ بن ابی حقیق کی زوجہ اور حیّی بن اخطب کی دختر زینب بھی مالِ غنیمت کے طور پر آئیں۔ ان کے باپ، بھائی، شوہر سبھی جنگ میں کام آ گئے تھے اور وہ تنہا تھیں۔ آپ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) نے انھیں صفیہؓ کا خطاب دے کر ان سے نکاح کر لیا اور وہ اُمّہات المومنین میں شامل ہو گئیں۔

## جعفرؓ بن ابی طالب

جنگ کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ آپ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) مال و اسیران کے فیصلے ہی فرما رہے تھے کہ مہاجرینِ حبشہ کی ایک جماعت حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی سرکردگی میں خیبر پہنچی تو آپ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) نے بے پناہ خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا: "میں اندازہ نہیں کر سکتا کہ ان دو خوشیوں میں سے میرے دل کو کس خوشی نے زیادہ مسرور کیا ہے۔ خیبر کی فتح نے یا جعفرؓ بن ابی طالب کی آمد نے!"

## فدک کی اطاعت

خیبر کی فتح اور دشمنوں کی پسپائی کا حال عام ہوا تو اہلِ فدک کو تشویش ہوئی اور انھوں نے بہ عجلت تمام خدمتِ اقدس میں پیغام بھیجا کہ ہمیں اور ہمارے اہل و عیال کی جانوں کو امان دی جائے۔ اس درخواست کو آپ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) نے قبول فرمایا اس طرح وہ نصف اراضی کی شرط پر مطیع ہو گئے۔ یہاں سے آپ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) آگے روانہ ہوئے۔

## وادی القریٰ

تیما اور خیبر کے درمیانی اس بستی میں یہودی آباد تھے اور مقابلے کے لیے تیار۔ اس وقت آپ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) جنگ کا ارادہ نہ رکھتے تھے۔ خیبر کی فتح کے بعد اس علاقے کو جرأت بھی نہیں ہونا چاہیے تھی، لیکن اسلام دشمنی نے انھیں پاگل کر دیا تھا۔ جونہی آپ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) اس علاقے میں پہنچے تو یہودیوں نے تیر اندازی شروع کر دی جس سے آپ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) کے غلام مدعم شہید

ہو گئے۔ تب آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے مقابلے کا حکم صادر فرمایا تو اہلِ وادی القریٰ تاب نہ لا سکے اور صلح کی درخواستیں کرنے لگے لہٰذا آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے خیبر کی شرائط کے موافق ہی ان سے صلح کر لی۔ ان فتوحات کے بعد آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ہر خطرے سے مطمئن ہو کر واپس مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔

## احکام شرعیہ

اس سال متعدد احکام نازل ہوئے، یعنی لونڈیوں کے لیے احکام، گدھے اور خچر حرام کیے گئے۔ درندوں کا گوشت ممنوع قرار دیا گیا۔ پنجہ دار پرندوں کے گوشت کی ممانعت کی گئی اور سورۂ تحریم نازل ہوئی۔

**سورۂ تحریم:** اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیز کو خود پر حرام کر لینے کی تنبیہہ۔

واقعہ یہ تھا کہ امّ المومنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنتِ جحش کے پاس کہیں سے شہد آیا۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) جاتے تو وہ شہد پیش کرتیں اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) وہاں معمول سے زیادہ وقت صرف کر دیتے۔ یہ بات باقی دوسری ازدواجِ مطہرات کے لیے باعثِ رشک تھی لہٰذا انھوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ جب آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ان کے پاس آئیں تو باری باری سب یہ احساس دلائیں کہ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے مُنہ سے مغافیر کی بو آتی ہے۔

چونکہ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) حد درجہ نفیس مزاج تھے لہٰذا مغافیر کی بو والی بات طبیعتِ مبارک پر گراں گزری اور فرمایا "اب میں کبھی اسے (شہد) استعمال نہ کروں گا۔ میں نے قسم کھالی ہے"

آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے ازدواجِ مطہرات کے سامنے یہ بات کہی جو خدا کو پسند نہ آئی اور ارشاد ہوا "اے نبی! تم اس چیز کو خود پہ کیوں حرام کرتے ہو جسے خدا نے تم پر حلال کیا ہے۔ کیا صرف اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو اس لیے؟"

اس سورت میں آگے ازداجِ مطہرات کے لیے تنبیہہ کی گئی ہے اور انھیں ان کی ذمے داریوں کا احساس دلایا گیا ہے، یعنی کہ نبیؐ سے اس کی نجی زندگی میں ایک حلال کی ہوئی چیز کو ترک کروینے کا جو فعل سرزد ہوا، وہ معمولی بات نہ تھی۔ آیندہ چل کر خدا کی حلال کی ہوئی چیز کو دوسرے لوگ بھی خود پر اس لیے حرام کر لیتے کہ نبیؐ نے

ایسا کیا تھا اور یہ بات آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نبوت کے ذمے دار ترین منصب کے لیے قطعاً مناسب نہ تھی۔ اس موقع پر خداوندِ عالم نے نبیؐ سے حرام اور حلال کرنے کے اختیارات چھین کر ثابت کر دیا کہ خدا کی منشا کے خلاف نبیؐ کے اختیارات کچھ بھی نہیں ہیں۔

## سریۂ موتہ جمادی الاوّل ۸ھ

فتحِ خیبر ہر فکر اور خطرے کو مٹا کر مسلمانوں کو مطمئن کر چکی تھی لہٰذا فقہی احکام پر عمل اور منادیٔ حق کرنے کے ساتھ فوری طور پر جس معاملے پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے توجہ دی، وہ حارثؓ بن عمیر کی شہادت تھی؛ اسی کے سبب سریۂ موتہ وقوع میں آیا۔ اگرچہ اہمیت کے لحاظ سے اس جنگ کا تذکرہ یہاں بے محل ہے کیوں کہ اس میں معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود شرکت نہیں فرمائی، لیکن واقعات اور سلسلے کی رُو سے اُس کا یہی مقام تھا۔

ہجرت کے چھٹے برس آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مدینۂ منورہ کے شمال میں سرحدِ شام کے قریب حاکمِ بصریٰ شرجیل بن عمر غسانی کے پاس دعوتِ حق کے لیے اپنے سفیر حارثؓ عمیر کو روانہ کیا تھا۔ انھوں نے مراسلۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دیا تو وہ غصّے سے بے قابو ہو گیا اس نے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حارثؓ کو شہید کر دیا تھا۔ اس کا انتقام لینے کے لیے معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے فرزند زیدؓ بن حارثؓ کی کمان میں تین ہزار مجاہدین روانہ کیے اور فرمایا کہ زیدؓ بن حارثؓ شہید ہو جائیں تو جعفرؓ بن ابی طالب اس فوج کی کمان سنبھال لیں۔ وہ شہید ہو جائیں تو عبد اللہؓ بن رواحہ جنگ کا علم سنبھالیں اور اگر وہ بھی کام آجائیں تو مسلمان متفقہ فیصلے کے بعد جسے پسند کریں، سرداری کے لیے منتخب کر لیں۔

ایک لاکھ کے مقابلے میں تین ہزار مجاہدین نے جنگ لڑی۔ یہ انوکھی جنگ تھی جو موتہ کے مقام پر لڑی گئی اور تینوں سپہ سالاران جنگ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کے متفقہ فیصلے سے جنگ کا علم خالدؓ بن ولید نے سنبھالا جس میں انھوں نے غیر معمولی شجاعت کے اظہار کے بعد دربارِ رسالت سے سیف اللہ کا خطاب پایا۔ مسلمان ہونے کے بعد یہ ان کی پہلی جنگ تھی جس میں انھوں

نے کفار کے دلوں پر ہیبت طاری کردی، کامیاب و کامراں کوٹے اور رومی و شامی فوجیں بل کھاتی رہ گئیں۔ موتہ کے مقام پر مسلمانوں کے ہاتھوں پسپا ہونے کے بعد ان کی دلیری اور بہادری پر زبردست ضرب پڑی تھی لہٰذا وہ اندرخانہ اپنی قوت بڑھاکر مسلمانوں سے انتقام کی تیاری کرنے لگے، لیکن معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھی ان امور کی طرف توجہ دینا تھی جو سامنے آ گئے تھے اور وہ مسئلہ تھا دو قبائل کا۔

## بنو خزاعہ، بنو بکر

یہ دو قبیلے پرانے رقیب چلے آرہے تھے۔ جس وقت حدیبیہ کے مقام پر مشرکین و موحدین کے درمیان دس برس کے لیے صلح کا معاہدہ ہوا تو ایک شرط یہ بھی تھی کہ عرب قبائل فریقین میں سے کسی سے بھی دوستی کے لیے آزاد ہیں۔ قریش کو کوئی اعتراض نہ ہوگا، اس وقت بنی خزاعہ نے معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو لامحالہ بنی بکر کو ان کے مخالفین کی دوستی اختیار کرنا تھی۔ اس طرح وہ دونوں دو الگ طاقتوں کے حلیف بن گئے، لیکن ان کی اپنی دیرینہ دشمنی بدستور قائم رہی۔ جن دنوں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خیبر میں مصروف تھے تو کسی نے اُن کی اِس پُرانی رقابت کو ہوا دی اور انھیں مشتعل کردیا۔ اس طرح یہ دونوں قبیلے پھر آمادۂ پیکار ہوگئے اور تلواریں نکل آئیں۔ یہ دیکھتے ہی قریش اپنے حلیف قبیلے بنو بکر کی حمایت کے لیے میدان میں اتر آئے۔ یہ دو قوتیں جمع ہوئیں تو بنو خزاعہ کو شکست ہوگئی۔ انھوں نے اس جنگ یا شکست سے بچنے کے لیے بھاگ کر حرم شریف میں پناہ لی، لیکن قریش کے مفسدوں نے انھیں وہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ جو ہاتھ لگا، وہ اسے تہِ تیغ کرنے لگے۔ تب بنو خزاعہ کے نمائندے عمرو بن سالم نے اپنی حلیف قوت سے مدد طلب کرنے کے لیے مدینۂ منورہ کا سفر کیا اور دربارِ رسالت میں حاضر ہوکر تمام حالات تاجدارِ مدینہ کے گوش گزار کیے۔ شرائط کی رُو سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس بات کا پورا پورا حق تھا کہ جس طرح سے قریش نے اپنے حلیف بنو بکر کی حمایت کے لیے دس سالہ امن معاہدے کی شرائط توڑ کر قتل دخون کی ابتدا کی تھی، گویا معاہدہ توڑ دیا تھا اسی طرح آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اپنے حلیف

قبیلے بنو خزاعہ کی حمایت کر سکتے تھے، لیکن آپؐ جذبات میں آکر مشتعل ہونے والے نہ تھے لہٰذا بڑے تدبر کے ساتھ حالات پر غور کر کے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قریش کے پاس اپنا قاصد روانہ کیا اور ایک شرائط نامہ بھیجا۔

## سہ شرائط

اس شرائط نامے میں درج تھا کہ ان میں سے اہلِ مکّہ کسی ایک شرط کو قبول کرلیں۔ وہ شرائط یہ تھیں۔

۱: بنی خزاعہ کے تمام مقتولوں کا خوں بہا ادا کر دیں۔

۲: بنو بکر کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں۔

۳: یہ اعلان کر دیں کہ معاہدۂ حدیبیہ ٹوٹ گیا۔

جس وقت مدینۂ منورہ سے قاصد یہ شرائط نامہ لے کر پہنچا تو قریش حسبِ عادت الجھنے لگے۔ ہر کوئی دوسرے کی بات رَد کر کے اپنی منوانا چاہتا اور دوسرا اس کی نفی کرتا۔ بنو خزاعہ کا خوں بہا ادا کرنا انھیں منظور نہ تھا اور بنو بکر سے اپنے تعلقات قطع کرنا بھی انھیں گوارا نہ تھا۔ ان دو باتوں پر وہ سب اَڑ گئے تھے۔ اب تیسری شرط باقی رہ گئی تھی جس پر انھوں نے غور ہی نہ کیا اور اشتعال میں آکر اسی کو منظور کر لیا۔ مدینۂ منورہ کا قاصد دربارِ نبویؐ میں اطلاع لے کر واپس آگیا۔

ادھر یہ خبر آئی کہ معاہدۂ حدیبیہ ٹوٹ گیا، اُدھر قاصد کو روانہ کرنے کے بعد قریش کے سرداروں کو اپنے اس غلط فیصلے کا احساس ہوا تو وہ بے حواس ہو گئے۔ انھیں یاد آیا کہ ایک اتفاقی غفلت کے سبب محض جنگِ احد میں مسلمانوں نے ان سے ہزیمت اٹھائی تھی ورنہ ہر مقابلے میں اُنھی کا پلّہ بھاری تھا اور اب فتحِ خیبر کے بعد تو وہ تمام عرب پر چھا گئے تھے۔ ان کے برعکس اب قریش کی اپنی معاشی اور عسکری حالت تباہ ہو چکی تھی۔ اب وہ تجارت اور شان و شوکت میں زوال پذیر تھے۔ ایسے میں معاہدۂ حدیبیہ توڑنے کا اعلان کرنا گویا جنگ کو دعوت دینا تھا اور جنگ بہر صورت انھی کے لیے تباہی تھی۔ یہ تمام حالات انھیں سوچنے پر مجبور کر رہے تھے۔ پھر بڑے غور و خوض کے بعد طے پایا کہ قریش کے معززین میں سے کوئی مدینے جائے، صلح کی بات کرے اور جنگ

کو قبل از وقت ہی روک دے۔

## تجدیدِ عہد کی کاوشیں

اس فیصلے کے بعد ابوسفیان بن حرب نے خود مدینۂ منورہ جاکر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معاہدۂ حدیبیہ کی تجدید کے لیے گفتگو کرنا مناسب سمجھا اور سفر کرتا ہوا مدینۂ منورہ پہنچ گیا، لیکن مختلف انداز سے گفتگو کرنے اور صلح پر آمادہ کرنے کے باوجود آپ معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اس عہد کی تجدید پر راضی نہ ہوئے۔ جو لوگ ایک عہد کی پابندی نہ کر سکے، ان سے دوسرا عہد کرنا وقت کا زیاں تھا اور کچھ بھی نہیں لہٰذا ابوسفیان مایوس ہو کر چند اور صحابہؓ کی طرف متوجہ ہوا کہ شاید کوئی سفارش کام آجائے، لیکن کسی کو لب کشائی کی جرأت نہ تھی۔ یوں بھی دل کی گہرائیوں سے صحابۂ کرامؓ قریش سے کوئی معاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ پھر اللہ اور اللہ کے رسولؐ کا فیصلہ انھیں دل و جاں سے منظور تھا جس کا وہ انتظار کر رہے تھے۔ اس طرح یہ کوششیں بار آور ثابت نہ ہوئیں اور ابوسفیان اپنی دخترِ امّ حبیبہؓ سے ملاقات کر کے مکّے لوٹ گیا۔

## جنگی راز فاش ہو گیا

ابوسفیان کے لوٹ جانے کے بعد معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّۂ معظمہ پر لشکر کشی کی تیاری کا حکم صادر فرمایا، مگر بڑی رازداری کے ساتھ اس کا علم چند صحابہؓ کے سوا کسی کو بھی نہ تھا کہ کس جانب روانگی ہونے والی ہے البتّہ فوج روانگی کی تیار کر رہی تھی۔ اسی زمانے میں مکّے کی ایک مغنیہ امداد طلب کرنے کے لیے مختلف قبیلوں میں گئی تو مدینۂ منورہ بھی آئی۔ یہ عورت کچھ عرصے قیام کے بعد مکّے واپس جانے والی تھی۔

ابھی وہ مدینۂ منورہ سے روانہ ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو مطلع فرمایا کہ وہ جاسوسہ ہے، اس کی خبر لو۔ یہ علم ہو جانے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت مقدادؓ بن اسود کو اس کے عقب میں دوڑایا اور حکم دیا کہ جو تحریر اس عورت کے پاس ہے، اگر وہ آسانی سے دے دے تو اسے چھوڑ دینا، اگر نہ دے تو قتل کر دینا۔

جس وقت یہ تینوں جلیل القدر صحابہؓ بارہ میل کا سفر طے کر کے وہاں پہنچے تو عورت مکر گئی، لیکن سختی کرنے پر اس کی چوٹی کے نیچے سے ایک خط ملا جو بعجلت تمام خدمتِ اقدس میں لایا گیا۔ قریش سرداروں کے نام یہ مکتوب حضرت حاطبؓ کا تھا (عزیزِ مصر مقوقس کے پاس دعوتِ اسلام لے جانے والے) جس میں مکّے پر رازدارانہ چڑھائی سے انھیں آگاہ کیا گیا تھا۔ اس وقت آپ (صلّی اللہ علیہ وسلم) حیران تھے اور صحابہؓ کرام کا غصّے سے بُرا حال تھا۔ اکثر کی آرزو تھی کہ راز فاش کر دینے والے کا سرتن سے جدا کر دیا جائے، لیکن انھیں دربارِ رسالت سے فیصلے کا انتظار تھا۔

معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حاطبؓ کو طلب کیا اور دریافت فرمایا تو انھوں نے کہا: "یا رسول اللہ! آپ میرے معاملے میں عجلت نہ فرمائیے۔ بہ خدا میں مسلمان ہوں، خدا اور خدا کے رسولؐ سے محبت کرتا ہوں، لیکن بات صرف اس قدر ہے کہ میں قبیلۂ قریش کا فرد نہیں بلکہ ان کی سرپرستی میں رہا کرتا تھا۔ میں خود ہجرت کر کے یہاں آ گیا، لیکن میرے اہل و عیال اور والدہ انھی لوگوں میں ہیں۔ میں سمجھا تھا کہ بہ وقتِ جنگ دیگر تمام صحابہؓ کے اہل و عیال کو ان کے قبیلے بچا لیں گے کیوں کہ یہ سب قریش سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن میرے اہل و عیال کا کوئی سرپرست نہ ہوگا۔ ایسے میں میں نے یہ اطلاع دے کر محض قریش پر ایک احسان کرنا چاہا تاکہ وہ اس کے بدلے میرے بچوں اور والدہ کو نہ ستائیں۔"

یہ عذر معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے قبول فرما لیا اور حضرت حاطبؓ بن بلتعہ کو کوئی سزا نہ دی گئی، لیکن اس وقت ایسے اور تمام مسلمانوں کے لیے تنبیہہ ضروری تھی لہٰذا ان کے مقدّمے کے ساتھ سب کو ہدایت دی گئی اور ارشادِ ربّانی ہوا۔

"اے ایمان والو! تم اگر میری راہ میں جہاد کرنے اور میری خاطر ہجرت کرنے نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان کے ساتھ دوستی کس طرح ڈالتے ہو حالانکہ وہ اس حق سے انکار کرتے ہیں جو تمھارے پاس آیا ہے (قرآن) ان کی روش تو یہ ہے کہ وہ رسولؐ کو اور تمھیں صرف اس قصور میں جلاوطن کرتے ہیں کہ تم ایک اللہ پر ایمان لائے ہو۔ تم چھپ چھپ کر ان کو دوستی کے پیغام بھیجتے

ہو۔ تم جو کچھ پوشیدہ کرتے یا ظاہر کرتے ہو، اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ تم میں سے جو کوئی ایسا کرے، وہ یقیناً راہِ راست سے بھٹک گیا۔ ان کا رویہ تو یہ ہے کہ اگر وہ تم پر قابو پالیں تو تمھارے ساتھ دشمنی کریں۔ ہاتھ اور زبان سے تمھیں اذیت پہنچائیں۔ ان کا مقصد تو یہ ہے کہ تم کفر کرو۔ قیامت کے دن نہ تمھاری رشتے داریاں کام آئیں گی نہ تمھاری اولاد۔ اس دن تو خدا تمھارے درمیان جدائی ڈال دے گا۔ (دنیاوی تعلق ٹوٹ جائیں گے اور انفرادی طور پر سب کا حساب لیا جائے گا)

حضرت حاطبؓ بن بلتعہ کا مقدمہ کھلی عدالت میں طے کرنے، ان کی سنگین غلطی کے باوجود فیصلے کے وقت مجرم کو صفائی کا پورا موقع عطا کرنا اور کوئی فیصلہ کرنے سے قبل اس کے معاملات اور دلائل پر غور کرنا گویا منصفین کے لیے ایک خوب صورت مثال تھی۔ اس فیصلے کے بعد اللہ کے نبی ﷺ دس ہزار مجاہدین کے ساتھ اپنے وطن کی طرف روانہ ہو گئے۔

# فتحِ مکہ

رمضان المبارک ۸ھ (۲۰ جنوری ۶۳۰ء)

مسلمان مدینۂ منورہ سے مکۂ مکرمہ کی جانب روانہ ہوئے تو ان کی کیفیات ہی عجیب تھیں۔ کچھ بیت اللہ کی دید کی آرزو لیے یہ مقدس سفر طے کر رہے تھے، کچھ برسوں کے بعد اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ جن کے اہل و عیال کسی سبب نہ آ سکے تھے، وہ یہ سفر جلد از جلد طے کر لینا چاہتے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جنھیں چند برس قبل کا وہ زمانہ یاد تھا جب وہ خدا کی بندگی بھی چھپ چھپ کر کیا کرتے تھے اور حق کا نام لینا تو گویا ناقابلِ معافی جرم تھا جس کی سزا کم و بیش ان سبھی نے بھگتی تھی۔ آج وہی سب اسی سرزمین اور انھی لوگوں میں جا رہے تھے، مگر ایک عجیب شان سے۔ وقت کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اکڑ کر چلتے، جس قدر بھی فخر کرتے کم تھا، لیکن اس عظیم فاتح اور عظیم فوج کی شان ہی کچھ اور تھی۔ ان کے ہر انداز سے اعترافِ بندگی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔

یہ سفر اب بھی رازدارانہ طور پر کیا جا رہا تھا۔ دس ہزار مجاہدین کا لشکر غیر معروف راستوں سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ابھی یہ نواحِ مکہ تک پہنچے تھے کہ حضرت عباس بن عبدالمطلب، جو ہجرت کر کے مدینۂ منورہ کی طرف جا رہے تھے، معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے آن ملے۔ جب لشکرِ اسلامی مقامِ قدید تک پہنچا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مختلف قبائل کے جھنڈے مختلف صحابۂ کرام کو عطا کیے

اور سفر مکمل کر کے مقام مرالظہران پر پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ مسلمانوں نے تعمیلِ حکم میں یہاں ٹھہر کر وسیع علاقے میں خیمے نصب کیے اور جگہ جگہ آگ روشن کی۔ اس زمانے میں مشرکینِ مکہ ابو سفیان کی ناکام واپسی کے بعد ہر دم مسلمانوں کے حملے سے خوف زدہ رہا کرتے تھے۔ جوانوں کی ٹولی ہی نہیں بلکہ معمّر سردار بھی دُور دُور گشت کرتے اور ہر شور پر چونک جاتے تھے۔ اس رات بھی ابو سفیان اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ نکلا تو طویل علاقے میں جگہ جگہ آگ روشن دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ اسی وقت حضرت عباسؓ بن عبد المطلب نے اسے دیکھ لیا۔ وہ ان تینوں آدمیوں کو لے کر دربارِ نبویؐ میں حاضر ہوئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ ایک شب گزارنے کے بعد اگلی صبح خدمتِ اقدس میں پہنچے اور کہا: "یا رسول اللہ کفر کے استیصال کا وقت آگیا ہے۔"

معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا، اسلام کا دیرینہ دشمن ان کے سامنے کھڑا تھا، ابو سفیان بن حرب! وہی ابو سفیان جس نے نبوت کے اوّلین لمحے سے ہجرت کے آٹھویں برس تک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اذیتیں دیں، اسلام کو جھٹلانے کی کوشش کرتا رہا، غیروں کے ساتھ مل کر آپؐ کی تضحیک کی، پورے اکیس برس آپؐ کے مقابل فوجیں لے کر آتا رہا اور اپنے قول و عمل سے آپؐ کی نفی کرتا رہا۔ یہ دشمنی اس بات کی متقاضی تھی کہ دربارِ رسالت سے اس کے لیے بدترین سزا تجویز کی جاتی۔ اس وقت خود ابو سفیان بھی اپنے گناہوں کی طویل فہرست پر نظر ڈالتے ہوئے اسی بات کا منتظر تھا، لیکن اسے علم نہ تھا کہ وہ ہستی جو کُل عالم کے لیے سراپا رحمت تھی، جس نے ہر لمحے عفو و درگزر سے کام لیا تھا اور بدترین جانی دشمنوں کے ساتھ بھی رواداری برتی تھی، وہ ہستی جس کا ہر عمل قرآن کے مطابق، ہر فعل پاکیزہ اور مقدس تھا، جسے ایک نظر دیکھنے والے، سننے والے بڑے بڑے حکمراں مسند ہائے امامت چھوڑ کر غلامی پر فخر کیا کرتے تھے، اس وقت بھی وہ ہستی اپنے اس دیرینہ رقیب، اسلام کے بدترین دشمن کو رواداری کے انداز سے دیکھ رہی تھی۔ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مکے میں داخل ہونے سے قبل ہی عفو و درگزر کی ایسی انوکھی مثال پیش کی جس کی نظیر تاریخ میں کہیں نہیں

ملتی۔ آپؐ نے فرمایا، "ابوسفیان کے لیے معافی ہے۔"

اس وقت ابوسفیان بن حرب جھک گیا۔ اس کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے یا ممنونیت کے، کوئی نہ جان سکا، لیکن یہ سبھی کو معلوم ہے کہ اس دن اکیس برس کا پرانا دشمن اسلام کے دامن میں آ گیا تھا۔

اگلی صبح مجاہدینِ اسلام کا لشکر رہبرِ عالمؐ کی قیادت میں مکّے کی طرف رواں تھا۔ اس وقت حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے ابوسفیانؓ بن حرب کے ساتھ ایک پہاڑی سے عسکرِ اسلامی کا نظارہ کیا۔ آگے آگے غفار اور جہینہ قبائل کے بہادر تھے جو نعرے لگا رہے تھے، پھر انصار، نبیِ اللہؐ کے میزبان تھے جن کا علم سعدؓ بن عبادہ کو عنایت ہوا تھا، ان کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خود تھے۔ یہ منظر بھی عجیب تھا جب ادھر بلند ہوتا آفتاب مکّے کے پہاڑوں اور بلند عمارات پر اپنی زرّیں کرنیں نثار کر رہا تھا، اُدھر آفتابِ رسالتؐ ظلمت کدۂ مکہ کو منوّر کرنے کے لیے لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھ رہا تھا۔ مومنین ارد گرد جمع تھے اور اشارے کے منتظر نظر آتے تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے اونٹ پر سوار سورۃ الفتح کی تلاوت فرما رہے تھے۔ مہاجرین جوق در جوق آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ وہی سرزمین تھی، وہی خطۂ ارض تھا جہاں ان کی زندگی تنگ ہو گئی تھی، صرف اس لیے کہ وہ ایک خدا کو مانتے تھے۔ آج اسی سرزمین کے گوشے گوشے سے حق کی آوازیں گونج رہی تھیں اور دلوں میں ہلچل مچا رہی تھیں۔ معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے عساکرِ اسلامی کو مختلف راستوں سے مکّے میں داخل ہونے کا حکم فرمایا تو مجاہدین کے دستے تعمیلِ حکم کرنے لگے۔

یہ فتح عجیب فتح تھی۔ نہ قتل و خون ہوا نہ غارت گری، نہ آہ و بکا بلند ہوئی نہ شور مچا۔ مفتوحین تعجب سے دیکھتے رہے اور فاتحین شہر میں داخل ہو گئے۔ اس وقت ایک کے سوا کہیں مزاحمت نہ ہوئی۔ یہ الخندمہ کے چند شر پسند تھے جنھوں نے خالدؓ بن ولید کی راہ میں مداخلت کی۔ خالدؓ بن ولید نے مدافعت کے لیے ہتھیار اٹھا لیے۔

معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "میں نے قتال سے روکا تھا۔"

عرض کیا: "اہلِ مکہ مقابل آگئے تو تلوار چلانا پڑی۔"

فرمایا: "اللہ کا فیصلہ سب سے بہتر فیصلہ ہے۔"

## امنِ عام کا اعلان

معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اذاخر کی پہاڑی سے مکے کے اندر داخل ہوئے اور ۲۰ رمضان المبارک ۸ھ کو مکہ فتح ہو گیا۔ اس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہ ہدایات دیں، اپنی فوج کو وہ احکام دیے جو دنیا کے کسی جنرل، کسی فاتح نے اپنی فوج کو نہ دیے ہوں گے۔ تاریخِ عالم میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اتنے بڑے فاتح نے عین اس وقت جب اسے فتح کا کامل یقین ہو، اپنی سپاہ کو مفتوحین کے لیے ایسے احکام دیے ہوں اور عفو و درگزر کا ایسا مظاہرہ کیا ہو جس نے دشمن کو بھی چونکا دیا۔ امنِ عام کے لیے یہ ہدایات تاریخ میں اس طرح سے درج ہیں۔

۱۔ صرف ان سے جنگ کرنا جو تلوار اٹھائیں۔

۲۔ جو ہتھیار پھینک دے، اس کے لیے امن ہے۔

۳۔ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے، اس کے لیے امن ہے۔

۴۔ جو ابوسفیانؓ بن حرب کے گھر پناہ لے، اس کے لیے امن ہے۔

۵۔ جو خانہ کعبہ میں پناہ لے، اس کے لیے امن ہے۔

۶۔ بھاگنے والوں کو، اسیروں کو اور زخمیوں کو قتل نہ کیا جائے۔

اس وقت برسوں سے جنگ و جدل میں ملوث قتل و غارت گری کے عادی قریش چونک گئے اور ہتھیار پھینک پھینک کر اس عظیم فاتح کے روبرو سرِ تسلیم خم کرنے لگے۔ مقابل آنے کی بجائے آج کے دن دشمن بڑے اطمینان سے اس انوکھی سپاہ اور عظیم سپہ سالار کے داخلے کا نظارہ کر رہا تھا۔ یہ جلاوطن آج فاتح بن کر واپس آیا تھا، لیکن یہ کیسی فتح تھی، کیسی شان تھی کہ نہ سینہ تنا ہوا تھا نہ رُخ پر غرور کے آثار، نہ ہاتھ میں تلوار اور نہ آنکھوں میں قہر و غضب بلکہ یہ عرب کا آقا، دنیا کا سب سے بڑا انسان روئے اقدس پر شفقت لیے اونٹ پر سوار تھا۔ لبوں پر آیاتِ کلامِ الٰہی تھیں اور رُخِ انور پہ اعتراف و بندگی کے آثار۔ یہ تھا مکے کا وہ فاتح جس نے دنیا کو فتح و جنگ کے اصول سکھا دیے۔

معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم، کعبے میں داخل ہوئے جسے حضرت ابراہیمؑ نے خدائے واحد کی عبادت کے لیے تعمیر کیا تھا وہی کعبہ آج تین سو ساٹھ بتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ توحید کا اولین گھر بت پرستوں اور مشرکوں کا مرکز بنا ہوا تھا، لیکن اب پھر خداوند عالم نے جب اسے مسلمانوں کا قبلۂ اوّل قرار دیا تھا تو اس کی تطہیر لازمی تھی لہٰذا معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے خانۂ خدا میں داخل ہو کر فرمایا۔ جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔

بہ حکم تھا یا اشارہ کہ صحابۂ کرام نے ان بتوں کو توڑنا اور حرم شریف کو پاک کرنا شروع کر دیا۔ تب اللہ کے نبیؐ نے طواف کعبہ کیا اور نمازِ شکر ادا کی۔ ظہر کی نماز کا وقت آیا تو بموجب حکم حضرت بلالؓ نے کعبے کی چھت پر جا کر اذان دی۔ پھر اللہ کے نبیؐ نے نماز پڑھائی۔

ازاں بعد آپؐ نے ایک خطبہ دیا "اے لوگو! اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچا ثابت کر دیا کہ آج اپنے بندے کو فتح عطا فرمائی اور اس نے تنہا سارے لشکر کو شکستِ فاش دی۔ اے قریش! اللہ نے جہالت کا غرور اور نسل و نسب کا افتخار مٹا دیا۔ سن لو! جہالت کے تمام آثار، خون یا مال جس کا دعویٰ کیا گیا ہو، سب میرے ان قدموں کے نیچے پامال کر دیے گئے سوائے بیت اللہ کی نگہبانی اور حاجیوں کو پانی پلانے کے۔ اے لوگو! سن لو، قتل خطا یا کوڑے اور لاٹھی کے ذریعے (عمداً قتل) دیتِ مغلظہ واجب ہو گی۔ سو اونٹ یا اونٹنیاں دینا ہوں گی جن میں چالیس حاملہ ہوں۔۔ اے قریش! اللہ نے نخوت کو مٹا کر، آباء و اجداد پر فخر کرنے کے دستور کو ختم کر دیا۔ اللہ کے نزدیک سب انسان برابر ہیں۔ تمھارے قبیلے اور خاندان محض اس لیے بنائے گئے کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بلا شبہ اللہ کے نزدیک تم میں بزرگ اور پرہیزگار وہ ہے جو تم میں زیادہ متقی ہو۔ بلا شبہ اللہ خوب جاننے والا اور خوب باخبر ہے۔"

اس دوران میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جدھر بھی دیکھا، ان سب لوگوں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں جو کل تک اسلام کو مٹانے کے لیے سینہ تان کر چلتے اور

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف سرگرم عمل رہتے تھے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یکے بعد دیگرے ان سب کو دیکھا۔ ان میں سے بیشتر کے چہروں پر پشیمانی تھی، سر جھکے ہوئے تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: "تمھیں معلوم ہے کہ میں تم سب کے ساتھ کیا کرنے والا ہوں؟"

یہ سوال سن کر مجمع نے نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر شرمندہ ہو کر نظریں نیچی کر لیں۔ کچھ نے زور سے کہا: "آپ شریف ہیں، شریف زادے ہیں۔"

اللہ کے نبیؐ کے لبوں پر ایک اطمینان بخش مسکراہٹ آگئی۔ وہ کیوں مسکرائے یہ کسی کو علم نہ تھا۔ ہاں جھٹلانے والے، اذیتیں دینے والے اپنے ہی ضمیر کے احساس سے کچھ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ یہ سب وہی لوگ تو تھے جنھوں نے بتوں کی حمایت میں ان کی مخالفت کی تھی، لیکن آج پتھر کے بت، ہاتھ سے بنائی ہوئی تصاویر، خوب صورت کاغذی پیکر، مٹی کی مورتیاں، لکڑی کی گڑیاں اور بے شمار خود ساختہ معبود ان کے کسی بھی کام نہ آسکے تھے۔ آج شرک و بدعت کے مظاہرے تمام ہو چکے تھے اور توحید کی حقانیت دلوں کو تسخیر کر رہی تھی اور ایسے میں وہ سب آخری فیصلے کے منتظر تھے۔

اس وقت ہادیٔ برحق نے فیصلہ صادر فرمایا۔ یہ معافی کا عام اعلان تھا: "جاؤ تم سب آزاد ہو۔"

میدان انسانوں سے پٹا ہوا تھا۔ قریش کے سبھی قبائل جمع تھے۔ ان میں وہ کہنہ سال مرد بھی تھے جنھوں نے اس ہستی کا پاکیزہ بچپن بھی دیکھا تھا اور مقدس و مطہر شباب بھی، جو اُن کی پاک دامنی کی قسم کھایا کرتے تھے، لیکن انھوں نے محض دعویٔ نبوت جھٹلانے کے لیے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ آج اس عفوِ عام پر ان کے قلب جیسے ٹکڑے ہو ہو کر آنکھوں کے راستے نکل رہے تھے۔ اس ہجوم میں وہ جوان بھی تھے جنھوں نے اپنے بزرگوں کی تقلید میں دینِ حق کی مخالفت پر کمر باندھ لی تھی۔ آج وہ شرافت کے اس عظیم پیکر کو دیکھ رہے تھے جس کے لبوں کی ہر جنبش اس کی صداقت کی دلیل اور سچائی کی گواہ تھی۔ یہ جھکے ہوئے سر ایمان لے آنے کی گواہی دے رہے تھے۔

یہاں سے معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا کی جانب قدم بڑھائے۔ یہ وہی پہاڑی تھی جہاں کھڑے ہو کر اللہ کے نبیؐ نے پہلی بار اس قوم کو پکارا تھا اور ہدایت دی تھی جسے ان سب نے جھٹلا دیا تھا۔ آج ان میں سے بہت سے لوگ موجود نہ تھے۔ فنا ہونے والی ہر شئے فنا ہو گئی تھی اور باقی رہنے والی ذات باقی تھی جسے ہمیشہ رہنا تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان گلیوں اور بازاروں پر نظر ڈالی جہاں آپؐ پر سنگریزے برستے تھے، غلاظت پھینکی جاتی تھی، صرف اس جرم میں کہ آپؐ حق کی آواز بلند کیا کرتے تھے، لیکن حق کی فتح کا سب سے بڑا ثبوت خود وہی لوگ تھے جو اب انھی راہوں سے دوڑ دوڑ کر کوہِ صفا پر آ رہے تھے اور بیعت کر رہے تھے اور تمجید و تقدیس سے فضا گونج رہی تھی۔

اس موقع پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مکۂ مکرمہ میں پندرہ یوم قیام فرمایا۔ اس دوران میں آپؐ نے مکے اور قرب وجوار کے نومسلموں کی تعلیم وتربیت اور انتظام کے لیے کعبے کی تطہیر وصفائی کی اور مکۂ مکرمہ کے قرب وجوار کے بُت خانوں میں معبودانِ باطل کے انہدام کی خاطر سرایا روانہ فرمائے۔

اس دوران میں اللہ کے نبیؐ نے تمام نمازیں قصر ادا کیں۔ مخبرانِ صادق اردگرد کی خبروں سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو آگاہ کرتے رہے۔

## بنی ثقیف وہوازن۔ شوّال ۸ھ (۶۳۰ء)

فتحِ مکہ کے بعد عرب کے تمام قبائل اسلام کی طرف مائل ہونے لگے۔ کچھ نے ان تمام واقعات کے بعد دل سے حق کو پہچان لیا اور کچھ اطاعت میں آنے کے سبب اسے اپنا رہے تھے جنھیں بعد کے واقعات اور مسلمانوں کے اخلاق نے اس کا معترف کیا کہ یہی دینِ حق ہے۔ بہرکیف اس وقت باطل پوری طرح سے مٹتا گیا۔ وہی قبائل جو مسلمانوں کی بربادی کی تجاویز سوچا کرتے تھے، اب اسی پرچم تلے متحد و منظم ہو رہے تھے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قیادت وسیادت میں ایک ملت بن رہے تھے، وہ ملت جو دنیا پر اپنی عظمت و شجاعت کا سکہ بٹھانے والی تھی۔ ایسے میں کوئی فرد بھی حق کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت نہ کر سکا تھا۔ فتحِ مکہ نے سب کو متحد کر دیا تھا۔

اسی دوران میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو معتبر ذرائع سے اطلاع ملی کہ دو قبیلے نہ اطاعت کے لیے تیار ہیں اور نہ مسلمانوں کے ہاتھوں مکے کی عظیم فتح کو برداشت کر سکتے ہیں۔ وہ اسی لیے اجتماع کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ یہ دونوں قبیلے بنی ثقیف اور بنی ہوازن، مکے اور طائف کے درمیان ایک وسیع علاقے حُنین اور اس کے گرد و نواح میں دُور دُور تک آباد تھے۔ بنی ثقیف کی وسعت طائف تک تھی۔ اس قبیلے میں کئی مشہور ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے اسلامی تاریخ میں خاص شہرت پائی۔ جلیل القدر صحابی عروہؓ بن مسعود انھی میں سے تھے۔ دوسرا قبیلہ بنی ہوازن کا تھا۔ اس کی متعدد شاخیں تھیں، بنو سعد، بنو معاویہ اور بنو منبہ ان میں سے بنو سعد سے حضرت حلیمہ سعدیہ کا تعلق تھا۔ عام طور پر یہ دو قبیلے متحد نہ تھے، لیکن اب اسلام کی اس قدر کامیاب اشاعت اور عرب قبائل کے مرکز مکۂ مکرمہ کا ان کے قبضے میں چلا جانا اور جملہ قبائل کا اس کو تسلیم کر کے اطاعت کرنا، ان دونوں کو بے حد خوف زدہ کر رہا تھا۔ ایسے میں اتحاد لازمی تھا چنانچہ یہ دو قبیلے باہم مشورے کرنے لگے۔ یہ نیا دستور جو تیزی سے رائج ہو رہا تھا کہیں ان کے اقتدار کو نہ نگل لے، یہ سوچ کر وہ خود اس حکومت کا تختہ اُلٹنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ اس کے لیے انھوں نے ان قبیلوں کی ہر شاخ کو پورے زور و شور سے تیار کرنے کا حکم دے دیا اور دو شاخوں (کلاب اور کعب) کے سوا اس معرکے میں شرکت کا اعلان سبھی نے کیا۔ ان کے نزدیک اس اتحاد کے متعدد فائدے تھے۔ اوّل تو وہ اسلام کی بڑائی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے، اسی طرح سے ان کی اپنی بڑائی خطرے میں پڑ جاتی جسے اس مقابلے کے بعد وہ محفوظ کر لینا چاہتے تھے، دُوم یہ کہ طائف میں اہلِ مکہ کے جس قدر باغات اور جاگیریں تھیں، وہ اس کے مالک بن جاتے اور تیسری سب سے اہم بات یہ کہ مسلمانوں نے خانۂ کعبہ اور دیگر بُت خانوں کے بُتوں کو منہدم کر دیا تھا، وہ اس انہدام کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ اسی آخری سبب کے سہارے انھوں نے قرب و نواح کے تمام رئیسوں کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔ قبیلۂ ہوازن کے پُرجوش اور دلیر رئیس مالک بن عوف کو ان سب نے اپنا سردار تسلیم کیا۔ حکیمانہ مشورت کے لیے قبیلہ جشم کے معمر سردار اور

شاعر درید بن الصمہ کو منتخب کیا گیا جو ہمیشہ ہی مشورے دیا کرتا تھا۔ اس کی حکمت اور علم و دانش کے وہ سبھی معترف تھے۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی اعلان کیا گیا کہ اس جنگ میں زن و بچہ، لونڈی، غلام اور مال و اسباب سب ساتھ ہوں گے تاکہ میدان چھوڑ کر بھاگنے کی بجائے اپنے مال و دولت اور عورتوں کی حفاظت کے لیے سب دشمن کو پامال کر دینے کی فکر کریں۔

اس زبردست تیاری کی خبر اللہ کے نبیؐ کو ہوئی تو وہ حیران رہ گئے۔ انھوں نے ان دو قبیلوں سے کبھی تعرض نہ کیا تھا۔ ایسے وقت میں جب کہ عرب کی تمام قوتیں انھیں تسلیم کر چکی تھیں، ایک نیا محاذ حیران کُن بات تھی۔ اس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انکشافِ حال کے لیے چند صحابہؓ کرام کو مقرر فرمایا جو خفیہ طور پر بنی ہوازن اور بنی ثقیف میں گئے۔ وہ چند یوم اُن میں رہے اور واپس آ کر ان کی عظیم تیاری، تعداد، جوش و خروش اور جنگ کے اسباب کے بارے میں وضاحت گوش گزار کی۔ تصدیق ہو جانے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی فوج کو تیاری کا حکم صادر فرمایا اور مجاہدین نئے محاذ پہ جانے کی تیاری کرنے لگے۔

## کثرتِ تعداد کا گھمنڈ اور اس کی سزا

مسلمان مجاہدین میں دس ہزار تو وہی انصار و مہاجرین تھے جنھوں نے مکہ فتح کیا تھا اور جن کی عظمت یہ تھی کہ ایک عظیم فتح بغیر کسی مقابلے کے نصیب ہوئی تھی۔ اس کا معترف عرب کا بچہ بچہ تھا۔ اب ان دس ہزار میں مکۂ مکرمہ کے نومسلم پُرجوش جوان بھی شریک ہو گئے جن کی تعداد دو ہزار تھی۔ اس طرح بارہ ہزار دلیروں پر مشتمل یہ ایک بہت بڑی فوج تھی، لیکن ان کے لیے رسد اور سامانِ جنگ موجود نہ تھا۔ مکۂ مکرمہ کی پُرسکون فتح کا ایک بہت بڑا ثبوت یہ بھی تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مالی طور پہ کوئی فیض نہ اٹھایا تھا۔ اگرچہ وہاں دولت مندوں کی کمی نہ تھی جن سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) چاہتے تو دولت فراہم کر سکتے تھے، لیکن اس عظیم فاتح نے دلوں کو تسخیر کیا تھا، زمین اور علاقوں کو نہیں۔ یہی سبب تھا کہ اتنی بڑی فتح کے بعد دوسری جنگ کے لیے آپ

(صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ایسے میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کچھ رقم اور زرہیں بہ طور قرض لیں اور اس فوج کی ضروریات مکمل کیں۔ اب صورت حال یہ تھی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) حرم کی سرزمین میں کشت و خون کو حرام تصور کرتے تھے لہٰذا یہاں سے روانہ ہونے کا حکم صادر فرمایا اور بارہ ہزار کی فوج سفر کرتی ہوئی وادیٔ ہوازن (یا حنین) میں پہنچ گئی۔ اس فوج کی تعداد اور شان دیکھنے والوں کو متوجہ کر رہی تھی۔ خود مسلمان جو ہمیشہ قلّتِ نفوس کے باوجود فتح پاتے تھے، اب کثرتِ نفوس سے مطمئن فتح کا یقین رکھتے تھے۔ انھیں قوی امید تھی کہ اتنی بڑی فوج شکست نہیں کھا سکتی۔

کفّار کے مقابلے میں ایک بڑی فوج حرکت میں آئی تو نظارہ کرنے والوں کے دلوں میں عقیدت اور خود فوج میں سے اکثر کو فخر ہوا۔ یہ بشریّت کا تقاضا تھا کہ کفر کے مقابلے کے لیے جانے والی قوّت اسے پامال کر دینے کا یقین رکھتی تھی۔ خاص طور پر ایسے میں کہ اس سے قبل کسی بھی غزوے میں اتنی بڑی فوج جمع نہ ہوئی تھی اور کفّار کی تعداد ان سے کم تھی۔ تب کسی نے کہا "آج ہماری تعداد ناقابلِ تسخیر ہے۔"

اسی فاخرانہ طرزِ فکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "یاد کرو حُنین کا دن جب تم اپنی کثرتِ تعداد پر ناز کر رہے تھے، لیکن وہ (کثرت) تمھارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور ایسے لشکر (تمھاری مدد کے لیے) اتارے جو تمھیں نظر نہ آتے تھے اور منکرینِ حق کو سزا دی۔ منکرینِ حق کی یہی سزا ہے۔"

## سکینت

مومنین اپنی تعداد اور ظاہری اسباب پر اعتماد کیے میدان میں پہنچے تو قدرت کو یہ فخر پسند نہ آیا۔ انھیں علم نہ تھا کہ دشمن نے بہت پہلے مناسب مقامات پر قبضہ کر کے اپنے تیر اندازوں کو پہاڑوں کے درّوں اور گھاٹیوں میں اس طرح چھپا دیا ہے کہ نظر نہ آئیں۔

جونہی مسلمان دستے ان کی زد میں آئے انھوں نے تیر برسانے شروع کر دیے۔

مسلمان گھبرا کر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے اور اس طرح چھٹ گئے کہ میدان میں معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور کچھ جلیل القدر صحابۂ کرامؓ کے سوا کوئی نہ رہا۔ اس موقع کے لیے متعدد تاویلیں بیان کی گئی ہیں کہ فخر و غرور کا یہ جملہ ان نو مسلموں میں سے کسی نے کہا تھا جن میں اسلام کی وہ روح موجود نہ تھی جو سابقین الاوّلین میں تھی، نہ وہ نظم و نسق تھا اور نہ وہ ابھی تک ان اصولوں سے واقف تھے جنھوں نے مسلمانوں کو انسانیت کی اعلیٰ ترین معراج عطا کی تھی۔ ایسے میں وہ کمین گاہوں سے اچانک نکل کر جھپٹنے والے دشمنوں اور ہر جانب سے تیروں کی یلغار کا مقابلہ نہ کر سکے اور بھاگنے لگے، لیکن قرآنِ مجید نے ان سب سے ہٹ کر صرف یہ وضاحت فرمائی کہ قدرت کو تعداد پر غرّہ و اعتماد پسند نہ آیا لہٰذا مسلمان اس صورتِ حال سے دوچار ہوئے اور جب ان کے ذہن سے یہ بات نکل گئی تب فتح و نصرت پھر انھی کو نصیب ہوئی۔

بہر کیف معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دیکھا تو میدان میں چند مخصوص ہستیوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ تب آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "میں آخری نبی ہوں، اس میں ذرا بھی شک و شبہہ نہیں ہے۔ میں عبداللہ کا فرزند ہوں۔"

اس فرمان کے معنی تھے کہ میری سچائی، میری صداقت اور نبوّت کا معیار فوج کی شکست یا فتح نہیں ہے، وقتی شکست اسے جھٹلا نہیں سکتی۔

اس فرمان کے بعد منتشر ہونے والی فوج کو پکارا گیا۔ تھوڑی دیر کے اندر اندر وہ سبھی شرمندہ شرمندہ لوٹ آئے۔ ان میں تقریباً سبھی وہ تھے جو توبہ و استغفار کرتے ہوئے خدا سے تائید و توفیق طلب کر رہے تھے، اس اچانک اور وقتی پسپائی کے اسباب پر نظر کرتے ہوئے اپنے سابقہ تصوّرات و اطمینان پر بھی خفیت تھے۔ یہ کیفیت خدا کے بارے میں ان کے ایمان و یقین کو زیادہ مستحکم کر رہی تھی۔ وہ جہاں جہاں تھے، اس پکار کو سن کر لوٹتے اور دوسروں کو لوٹنے کی تلقین کرنے لگے جب وہ سب حُنین کے میدان میں جمع ہو گئے تو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے انھیں پھر ترتیب دیا۔ اب صورتِ حال مختلف تھی۔ پہلے کفّار ان کی قوّت کو زیادہ سمجھتے ہوئے محتاط انداز سے میدان میں آئے تھے اور مسلمان مطمئن تھے، اب مسلمان اپنی ایک چھوٹی سی بھول کی سزا پانے کے بعد محتاط ہو کر مقابلے کی سوچ رہے تھے۔ اب ان کے

لبوں پر آیاتِ کلامِ ربانی اور دلوں میں خوفِ الٰہی تھا اور وہ نبیؐ کے اشاروں کے منتظر تھے۔

اُدھر کفار جو اپنے اہل وعیال اور مال و دولت کے ساتھ میدان میں جمع تھے، اختلافِ رائے کا شکار ہونے لگے۔ مالک بن عوف جس کے تیر اندازوں نے پہلے حملے میں مسلمانوں کو منتشر کر دیا تھا، اپنی حکمتِ عملی پر ناز کر رہا تھا اور اپنے ساتھ جس صد سالہ عابد اور حکیم کو لایا تھا، اس سے اُلجھ رہا تھا۔

درید بن الصمہ نے دریافت کیا "کیا بنو کعب اور کلاب نے بھی اس جنگ میں شرکت کی ہے؟"

مالک بن عوف نے جواب دیا "نہیں۔ ان دو قبیلوں کا کوئی فرد ہمارے ساتھ نہیں آیا۔"

یہ سنتے ہی درید بن الصمہ افسوس کرنے لگا اور بولا "ہائے اگر آج شرف و کامیابی کا دن ہوتا تو کعب اور کلاب دونوں موجود ہوتے۔"

مالک بن عوف نے بڑی ناگواری سے دیکھا اور نخوت سے کہا "ابھی جو دشمن کے چھکے چھڑا دیے تھے، تیرے خیال میں وہ شرف و کامیابی کی علامت نہ تھی؟"

درید بن الصمہ نے اس طنز کا جواب نہ دیا بلکہ مشورہ دیا "تمھاری بھلائی اس میں ہے کہ میدان سے ہٹ کر فوجیں محفوظ مقام پر جمع ہوں اور دشمن کا مقابلہ کریں۔"

لیکن مالک بن عوف اس بوڑھے کی ہر بات سے انکار پر تل گیا تھا۔ اس نے کہا "اے صد سالہ شاعر! تم صرف شعر کہا کرو۔ نہ تمھارا جسم کام کے قابل ہے اور نہ عقل!"

اس زعم کے ساتھ وہ میدان میں آیا اور مقابلہ شروع ہو گیا جو اتنا سخت تھا کہ پوری مدافعتی تدابیر کے باوجود دشمن کے قدم اُکھڑ گئے۔ اگرچہ مالک بن عوف نے اپنی فوج کے ساتھ پوری پوری دلیری دکھائی لیکن مسلمانوں کے آگے پیش نہ گئی اور یہ فوج دو حصوں میں تقسیم ہو کر اوطاس اور طائف کی طرف فرار ہونے پر مجبور ہو گئی۔ دربارِ رسالت سے تعاقب کا حکم ملا تو اوطاس کی جانب ابو عامرؓ اشعری، ایک دستۂ فوج کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ طائف کی جانب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بہ نفسِ نفیس

پیش قدمی فرمائی اور کفار سے باقاعدہ مقابلہ کیا۔ کفر اور اسلام کے مقابلے کی جو کمی حُنین میں باقی رہ گئی تھی، وہاں پوری ہوگئی۔

## اوطاس

طائف کے شمال میں تیس میل کے فاصلے پر ایک گھاٹی ہے جہاں مالک بن عوف کی نصف تعداد بھاگ کر پناہ لینے گئی تھی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ابو عامرؓ اشعری کو کچھ فوج دے کر روانہ کیا تو درید بن الصمہ کا بیٹا ان کے مقابل آگیا اور مقابلے کے بعد ابو عامرؓ اشعری اس کے ہاتھ سے شہید ہوگئے۔ ان کے بھائی ابو موسیٰ اشعری نے آگے بڑھ کر علم سنبھال لیا اور شدید جنگ کے بعد اوطاس کی فوج کو شکست دے دی۔ اس مقابلے میں اسیرانِ جنگ کی تعداد چھ ہزار تھی اور مال و دولت میں چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں، چار ہزار اوقیہ چاندی اور قیدیوں میں معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن حضرت شیما بھی تھیں جنھیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بڑی عزت کے ساتھ رکھا اور جب انھوں نے پسند کیا تو ان کے وطن کی طرف واپس بھیج دیا۔

## طائف

طائف نہایت سرسبز و شاداب اور محفوظ مقام تھا۔ اس کا سب سے زیادہ معزز قبیلہ، بنو ثقیف تھا۔ جس وقت حُنین کی شکست خوردہ فوج طائف میں جمع ہوکر پھر سے مسلمانوں کے مقابلے کی تیاری کرنے لگی، انھوں نے ایک طویل مدت کے لیے سامانِ رسد جمع کیا، جنگی اسلحہ اور ہتھیاروں کا انتظام کیا پھر جب تک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچے تو اہلِ طائف قلعہ بند ہوچکے تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے بڑھ کر اس مضبوط قلعے کا حصار کر لیا۔ اس وقت مجاہدینِ اسلام کے لیے یہ جنگی تجربہ بڑا انوکھا اور جدید تھا۔ ابھی تک جن جن اصولوں کے مطابق انھوں نے جنگیں لڑی تھیں، اس مقام پر وہ سب بیکار ثابت ہوئے۔ اس محاذ پر تلوار اور ڈھال نہیں بلکہ منجنیق اور دبابے کی ضرورت تھی۔ یہ محاصرہ بیس یوم [illegible] رہا۔ اسی دوران میں خبر ملی کہ اوطاس میں مجاہدین غالب آگئے اور اللہ نے کفار کو شکست دے دی۔ یہ سن کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)

نے محصورینِ طائف کے لیے صحابۂ کرامؓ سے مشورہ طلب کیا اور طے پایا کہ یہ صرف مدافعتی مقابلہ ہے، اہلِ طائف میدان چھوڑ کر بھاگنے کے بعد محصور ہو چکے ہیں لہٰذا اتنا خطرہ نہیں۔ اس لیے محاصرہ اٹھا لینا بہتر ہے۔ اس فیصلے کے بعد اللہ کے نبیؐ نے محاصرہ اٹھا لیا اور مجاہدین کو جرش روانہ کیا تاکہ یہودیوں سے قلعہ شکن آلات کے استعمال کا طریقہ سیکھیں۔

اس وقت کچھ مسلمانوں نے کہا "یارسولؐ اللہ! بنو ثقیف کو بددعا دیجیے"۔

بددعا کی بجائے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعا دیتے ہوئے کہا "یا اللہ! بنو ثقیف کو آستانۂ اسلام پر لا"

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ دعا بہت جلد قبول ہوئی۔

ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روانہ بھی نہ ہوئے تھے کہ بنی حُنین کے چھ افراد رحم کی درخواست لے کر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اپنے اسیروں کی رہائی چاہتے ہیں۔ یہ سن کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چند لمحے توقف کیا، پھر فرمایا "میں اپنے حصے کے قیدیوں کو رہا کر سکتا ہوں۔ انصار اور مہاجرین کا معاملہ ہوتا تو پھر بھی مشکل نہ تھا، لیکن تم جانتے ہو کہ اس وقت میرے لشکر میں اکثریت ان کی ہے جو نئے مسلمان ہیں لہٰذا میں ان کے لیے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ کل تم لوگ مجمعِ عام میں آ کر اپنی یہ درخواست پیش کرنا"۔

یہ جواب سن کر بنی حُنین کے معززین لوٹ گئے۔ پھر وہ دوسرے دن مجمعِ عام میں آئے اور عرض کیا "یارسولؐ اللہ! ہم اپنے قیدیوں کے لیے آزادی کی گزارش کرتے ہیں۔ اگر قبول فرمائیں تو مہربانی ہو گی"۔

اتنا سننے کے بعد معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا "میں اپنے اور بنو مطلب کے قیدیوں کو بنا کسی معاوضے کے آزاد کرتا ہوں"۔

اس اعلان نے سب کو متوجہ کر لیا جسے سن کر مہاجرین اور انصار کھڑے ہوئے اور باری باری کہا "یارسولؐ اللہ! ہم بھی اپنے قیدیوں کو بغیر کسی معاوضے کے آزاد کرتے ہیں"۔

ان کے بعد بنو سلیم اور بنو خزاعہ رہ گئے تو ان کے لیے یہ بات بڑی عجیب

تھی کہ اللہ کے نبیؐ اور نبیؐ کے دوست اور مددگاروں نے اس طرح سے اپنے قیدیوں کو آزاد کر دیا تھا، لیکن انھوں نے کچھ نہ کہا اور خاموش بیٹھے رہے۔ اس سے معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی معاوضے کے بغیر قیدیوں کو رہا کرنا نہیں چاہتے۔ اس وقت آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے ان کے ہر قیدی کی قیمت چھ اونٹ مقرّر کی اور ان سب کی قیمت خود ادا کر کے ان سب کو آزاد کرا دیا۔ اس اخلاق نے ان کے قلوب کو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی عزت اور محبت سے بھر دیا۔ کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ بنو ثقیف کا تمام قبیلہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ یہ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی دعا کا اثر تھا ورنہ یہ وہ بنو ثقیف تھے جنھوں نے ہر دَور میں اسلام کی مخالفت کی تھی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد غنائم کی تقسیم کا مسئلہ درپیش تھا جو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے طائف کا محاصرہ اٹھا کر واپس آنے کے بعد طے کیا۔

## شکوہ اور جواب

تقسیم کے وقت آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے مالِ غنیمت کے پانچ حصے کیے۔ چار حصے حسبِ قاعدہ مجاہدین میں تقسیم فرمائے اور پانچواں حصہ بیت المال، مساکین اور ضرورت مندوں کے لیے رکھا۔ تقسیم کے وقت یہ خیال خاص طور پر رکھا گیا کہ مکّے کے اکثر رئیس اور معززین کے ساتھ جنھوں نے حال ہی میں اسلام قبول کیا تھا فیاضی برتی جائے۔ اس کی وجوہ کیا تھیں، وہ تو اللہ کے نبیؐ ہی جانتے تھے لیکن عین اس وقت جب جدید الاسلام قریش بخشش و عنایات سے فیض یاب ہو رہے تھے، انصار کے کچھ جوانوں نے رنج محسوس کیا۔ پھر دلی جذبات الفاظ میں ڈھلنے لگے۔

کسی نے کہا: "رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے قریش کو انعامات سے نوازا، ہمیں محروم رکھا۔"

کسی نے اپنے رنج کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "جنگ اور مشکلات میں ہماری یاد ہوتی ہے غنیمت اوروں کو دی جاتی ہے۔"

فوج میں یہ چرچے ہوئے تو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے انصار کو طلب کیا

اور اس سلسلے میں دریافت فرمایا۔
انصار دروغ گو اور مصلحت پسند نہ تھے، وہ حق بولنے پر مجبور ہو گئے۔ بولے۔
"یارسول اللہ! آپ نے جو سنا ہے درست ہے۔"
اتنا سننے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے باقاعدہ خیمہ لگایا، ان سب کو طلب کیا اور خدا کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا "اے انصار! کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے تمہیں صراطِ مستقیم سے آشنا کیا؟"
اس سوال کے جواب میں انصار نے ہم آواز ہو کر جواب دیا۔ "یارسول اللہ! یہ حقیقت ہے اور ہم پر اللہ اور اللہ کے رسول کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔"
"کیا یہ حقیقت نہیں کہ پہلے تم منتشر و کمزور تھے۔ خداوندِ عالم نے میرے ذریعے تمہیں اتحاد اور طاقت کی دولت سے نوازا؟"
"یارسول اللہ! یہ درست ہے اور ہم پر اللہ اور اللہ کے رسول کا احسان سب سے زیادہ ہے۔"
"کیا یہ سچ نہیں کہ تم مفلس و نادار تھے۔ خداوندِ عالم نے میرے ذریعے تمہیں دولت مند بنایا اور معزز کیا؟"
"یارسول اللہ! یہ حق ہے۔ بے شک ہم پر خدا اور خدا کے رسول کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔"
یہ وقت عجیب تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سوال کرتے جاتے اور انصار احسان تسلیم کرتے جاتے تھے۔ باقی سب لوگ دم بخود بیٹھے یہ سب سن رہے تھے۔ جب انصار آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تمام احسانات کو مان چکے تو آپ نے فرمایا "اب تم مجھ سے سوال کرو، میں تمہیں جواب دوں گا، مجھ سے پوچھو۔"
"اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) جب تجھے تیرے لوگوں نے جھٹلایا، ہم نے تیری تصدیق کی۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جب تجھے لوگوں نے چھوڑ دیا تب ہم نے تیرا ساتھ دیا۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو مفلس و نادار آیا تھا ہم نے تیری مدد کی!"
"اے انصار! تم مجھ سے یہ سوال کرتے جاؤ، میں جواب دیتا رہوں گا کہ تم

پر سچ کہتے ہو۔"

اس وقت مجمع پر سکوت چھا گیا تھا۔ مہاجرین سر جھکائے ہوئے بیٹھے تھے اور سسکیاں لے لے کر رو رہے تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سوال کرتے جاتے اور روتے جاتے تھے۔ اس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قدرے توقف کیا۔ انصار ہچکیاں لے لے کر گریہ کرتے رہے۔ ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں، سارے احسانات کرنے کے باوجود خود کو اللہ اور رسولؐ کا گنہگار تصوّر کر رہے تھے۔ مالِ غنیمت پر گلہ تو چند جذباتی جوانوں نے کیا تھا لیکن اس کا دُکھ اہلِ ایمان محسوس کر رہے تھے۔ جب تک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) گفتگو فرماتے رہے، ان کی حالت روتے روتے غیر ہوتی رہی۔ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خاموش ہو گئے تو بھی وہ مجرم بنے دربارِ رسالت میں سر جھکائے اشک بہاتے رہے۔

چند ساعت کے بعد اللہ کے نبیؐ نے دوبارہ سلسلۂ کلام شروع کیا اور فرمایا: "اے انصار! کیا تمھیں یہ بات پسند نہیں ہے کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے ساتھ لے جاؤ؟"

اس وقت انصار بے ساختہ پکارے: "یا رسولؐ اللہ! ہمیں کچھ نہیں چاہیے، ہمیں اللہ کا رسولؐ درکار ہے۔"

کچھ وقت یونہی گزر گیا، پھر اللہ کے نبیؐ نے انصار ہی کو مخاطب کرنے کے بعد فرمایا: "اہلِ مکّہ کو جو کچھ دیا گیا ہے، ان کے حق یا میری حمایت کی بنا پر نہیں دیا گیا بلکہ محض ان کی تالیفِ قلوب منظور تھی۔"

اس وقت وہی انصار جن سے گلہ کرنے کی یہ غلطی ہوئی تھی، فخر کر رہے تھے کیوں کہ وہ اہلِ مکّہ جو اب مسلمان ہوئے تھے، تالیفِ قلوب کے حق دار تھے۔ جنھوں نے اپنے مذہب کو ترک کیا تھا۔ ان دُنیوی انعامات کے مستحق تھے، لیکن وہ ہستیاں جو ایمان لائی تھیں، وہ دنیوی انعامات سے بالاتر تھیں، گویا اللہ کے نبیؐ کے آخری جملے نے فیاضی کی مصلحت کو آشکار کر کے مذہب ترک کرنے اور ایمان لے آنے کے فرق کو واضح کر دیا تھا۔

## خانگی معاملات

ان لاتعداد بیرونی مصروفیات اور کشمکش کے ساتھ ساتھ اس سال اللہ کے نبیؐ کو نجی زندگی میں خوشی اور غمی کے چند واقعات نے گھیر لیا۔ آپؐ کی بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بطن سے دو اولادیں تھیں، علی بن ابو العاص اور امامہؓ بنتِ ابو العاص۔ معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے انھیں اپنے سایۂ عافیت میں رکھا اور ان کی پرورش و تربیت خود فرمائی۔ حضرت زینبؓ کے پہلے فرزند کی عمر زیادہ نہ ہوئی لیکن حضرت امامہؓ نے طویل عمر پائی۔

اسی برس حضرت ماریہؓ قبطیہ کے بطن سے معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے فرزند ابراہیم پیدا ہوئے اور اسی برس چند ماہ کے بعد ان کی وفات ہوئی۔ ان دو اولادوں کا غم آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو بے حد تھا لیکن اللہ کے نبیؐ اللہ کی رضا میں راضی تھے اور پھر آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) تو فرما چکے تھے والفقر ردائی (صبر میری چادر ہے)، لہٰذا زندگی کے لاتعداد صبر آزما مواقع کی طرح اب بھی راضی بہ رضا رہے۔

اسی زمانے میں ایک دو نہیں، متعدد دیگر مسائل بھی درپیش تھے۔ غموں پر صبر کرنا اور مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا تو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے اختیار میں تھا لیکن کچھ مسائل جو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا سکون برباد کر رہے تھے، ان کا فیصلہ خود خداوندِ عالم نے فرمایا۔ ان واقعات کی دلچسپی ہونے کے باوجود آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی زندگی میں بہت اہمیت ہے۔

### ایلاء اور تخییر

ایلاء: شریعت کی اصطلاح میں وہ جدائی جو طلاق کے بنا پر شوہر اور بیوی کے درمیان آجائے یا طلاق سے قبل کی وہ مہلت جس میں رجوع کیا جاسکتا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے "جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں ان کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔ اگر انھوں نے رجوع کرلیا تو اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے اور اگر انھوں نے طلاق دینے کا فیصلہ کرلیا تو جان لیں

کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔

تخییر:۔ اسلامی اصطلاح میں بیوی کو اس بات کا اختیار دے دینا کہ وہ شوہر کے ساتھ رہنا پسند کرے یا طلاق لینے کا فیصلہ کرلے۔

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم دنیا اور اس کی زینت کی طلب گار ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ اور آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں جو نیکوکار ہیں، ان کے لیے اللہ نے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

## واقعات کی تفصیل

ان واقعات کی تفصیل اس طرح ہے کہ شروع میں معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم تنگ حال تھے۔ ادھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا اور نبوّت و رسالت کی عظیم ذمّے داریوں کی مصروفیت کے سبب ہو بھی نہ سکتا تھا۔ ایسے میں ازواجِ مطہرات کو عُسرت میں گزارا کرنا پڑتا تھا جن میں سے چند ایک سرداروں کی بیٹیاں بھی تھیں لہٰذا اکثر و بیشتر توسیعِ نفقہ کے لیے اصرار ہوتا اور آہستہ آہستہ یہ اصرار سبھی کی جانب سے ہونے لگا جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو بے سکون کرنے کا سبب بن جاتا تھا۔ توسیعِ نفقہ کا مطالبہ ایک دو کی جانب سے نہیں، سب کا متحدہ فیصلہ تھا اور محض اسی بنا پر شکر رنجی ہو جاتی تھی اور محض اسی سبب آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے گوشہ نشینی اختیار کی اور کامل ایک ماہ کے لیے سب سے علیحدہ رہے۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) توسیعِ نفقہ پر قادر نہ تھے بلکہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) چونکہ زندگی کے خاص مشن پہ مامور کیے گئے تھے اس لیے پاکیزہ زندگی لازمی تھی اور اہلِ بیت زندگی کا ایک اہم حصّہ تھے جنھیں خود بھی دنیاوی آلائشوں سے پاک رہ کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی تعلیمات پر سب سے پہلے عمل کرنا تھا۔

اسی لیے انھیں بار بار ہدایت دی جا رہی تھی" اے نبی کی بیویو! تقویٰ اختیار کرو، تم عام عورتوں کے مانند نہیں ہو"

جس طرح آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم کا دیگر انبیاءؑ سے مختلف مقصد تھا،

اسی طرح آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اہلِ بیت بھی دیگر تمام گھرانوں سے جُدا تھے۔ اطاعتِ الٰہی اور بندگی، دنیا بھر کے انسانوں سے پہلے خود انھیں کرنا تھی۔ یہ نہیں کہ دنیا کو زہد و تقویٰ کی تعلیم دی جا رہی ہے اور خود اپنے ہی گھر میں عیش و آرام اور نام و نمود کے انداز ہیں۔ اس سلسلے میں، سورۂ احزاب میں اہلِ بیت کے مشاغل، میل جول اور معاشرت میں ان کے مقام اور مقصد کے لیے احکام نازل ہو چکے تھے۔ اللہ، نبیؐ کے گھر کی تطہیر اور پاکیزگی چاہتا تھا۔ گھروں سے نکل کر عام عورتوں کی طرح پھرنا، لباس و انداز میں سج دھج کرنا، ان عظیم خواتین کے لیے اللہ کو پسند نہ تھا چنانچہ ان کا مقام متعیّن کر دینے اور متعدّد احکام کے بعد اب تنگی و عُسرت کی شکایت اور نان و نفقے میں وسعت کی طلب اس بات کی علامت تھی کہ ابھی انھیں مزید تنبیہہ کی ضرورت تھی جو لفظی بھی ہوتی اور عملی بھی۔ یہی وہ تنبیہہ تھی، بہ یک وقت اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی جانب سے وہ سرزنش تھی جسے ایلاء اور تخییر کہا گیا ہے۔ کامل ایک ماہ کی تنہائی اور تمام ازواجِ مطہرات سے ترکِ تعلق کے بارے میں مختلف الفاظ تاریخ کی زینت ہیں، لیکن اس کے بہترین راوی حضرت عمرؓ ابن الخطاب تصوّر کیے جاتے ہیں۔

**واقعۂ ایلاء، فاروقِؓ اعظم کی زبانی**

ہم قریش اپنی عورتوں پر غالب رہتے تھے (انھیں دبا کر رکھنے کے عادی تھے)، لیکن مدینۂ منورہ آئے تو دیکھا کہ انصار کی عورتیں اپنے مَردوں پر غالب تھیں۔ ان کی تقلید میں ہماری عورتوں نے بھی یہی انداز اختیار کر لیے۔ ایک دن میں نے اپنی بیوی کو کسی بات پر ڈانٹا تو اس نے پلٹ کر جواب دیا۔ میں نے استفسار کیا کہ تم میری بات کا جواب دیتی ہو!

وہ بولیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں بھی انھیں برابر کا دُو بہ دُو جواب دیتی ہیں یہاں تک کہ کوئی بات ناگوار ہوتی ہے تو دن بھر ان سے روٹھی رہتی ہیں۔"

میں نے دل ہی دل میں اندیشہ کیا اور اسی وقت حفصہؓ (اُمّ المومنین حضرت حفصہؓ حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں) کے پاس گیا اور اس سے دریافت کیا: "کیا تو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روٹھی رہتی ہے؟"
اس نے اقرار کیا تو میں نے کہا کہ کیا تو نہیں جانتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خفگی اللہ کی ناراضی ہے! انھیں میرا خیال ہے ورنہ اب تک تجھے طلاق دے چکے ہوتے۔
اس گفتگو کے بعد میں اُمّ المومنین اُمِّ سلمہ سے ملا اور یہی بات ان سے کی تو انھوں نے اعتراض کیا "عمرؓ تم اب ازواجِ مطہرات کے معاملے میں بھی دخل اندازی کرتے ہو!"
میں خاموش لوٹ آیا، لیکن دل میں خلش موجود تھی۔ ایک رات میرے ہمسائے اوس بن خولی نے دستک دے کر مجھے جگایا تو میں گھبرا گیا، اُٹھ کر دریافت کیا تو وہ بولے "غضب ہو گیا"۔
میں نے کہا "کیا غسانیوں نے مدینۂ منورہ پر حملہ کر دیا؟" (جنگِ موتہ کے بعد غسانی قبائل شکست کا انتقام لینے کے لیے متحد ہو رہے تھے)
وہ بولے "نہیں۔ اس خبر سے زیادہ ہَول ناک بات ہو گئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کو طلاق دے دی ہے"۔
میں صبح آیا اور رسولُ اللہ کے ساتھ نمازِ فجر ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو جانے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بالا خانے میں تنہا جا کر بیٹھ گئے۔ میں حفصہؓ کے پاس آیا تو دیکھا وہ رو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ میں نے تجھ سے پہلے ہی کہا تھا۔ وہاں سے اُٹھ کر میں پھر مسجد نبوی میں آیا تو دیکھا چند صحابہؓ منبر کے پاس بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں۔ کچھ دیر وہاں بیٹھا، لیکن دل مضطرب تھا لہٰذا بالا خانے پر جانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام سے کہا مگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسری بار بھی اندر سے سکوت رہا تب میں نے بلند آواز سے پکار کر غلام سے کہا "اے رباح! میرے لیے اجازت طلب کرو۔ اگر رسولُ اللہ کو یہ گمان ہو کہ میں حفصہؓ (اپنی بیٹی) کی سفارش کے لیے حاضر ہوا ہوں تو خدا کی قسم اگر دربارِ رسالت سے حکم ہو تو ابھی حفصہؓ کی گردن اُڑا دوں"۔
یہ سننے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے باریابی کی اجازت مرحمت

فرمائی۔ میں اندر گیا تو دیکھا کہ اللہ کے نبیؐ کھُرّی چار پائی پر لیٹے ہوئے تھے جس کے بانوں کے نشان جسم پر نمایاں ہو رہے تھے۔ ایک جانب کچھ جَو رکھے ہوئے تھے اور دیوار پر ایک جانور کی کھال آویزاں تھی۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ میں رونے لگا۔

اس وقت آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) میری طرف متوجہ ہوئے تو میں نے کہا۔ "یا رسولؐ اللہ! اس سے زیادہ گریے کا مقام اور کیا ہوگا کہ قیصر و کسریٰ تو زندگی کے عیش لُوٹ رہے ہیں اور آپ اس تکلیف کی حالت میں ہیں۔"

ارشاد ہوا۔ "کیا تم اس بات سے مطمئن نہیں ہو کہ قیصر و کسریٰ کے لیے دنیا ہے اور ہمارے لیے آخرت!"

میں نے دریافت کیا۔ "کیا آپ نے ازواج کو طلاق دے دی؟"

فرمایا۔ "نہیں، ایسا نہیں ہے۔"

میں نے اللہ اکبر کہا اور اجازت طلب کی کہ مسجد میں تمام صحابہؓ کرام مغموم و افسردہ ہیں اگر منشائے مبارک ہو تو ان سب کو خبر کر دوں کہ طلاق کی خبر غلط ہے؟

یہ تھا ایلاء کا واقعہ جسے فاروقِ اعظم حضرت عمرؓ بن خطاب کی زبانی سب نے پیش کیا ہے۔ اس کی مدت ایک ماہ تھی۔ یہ مدت تمام ہوئی تو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) بالاخانے سے نیچے اترے اور صحابہؓ کرام اور دیگر سب کو باریابی کا اذن مل گیا۔

اسی واقعے کے بعد آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے خدا کا حکم پا کر تمام ازواج کو دو چیزوں میں سے ایک کے انتخاب کرنے کی عام آزادی عطا فرمائی۔ یعنی دنیا کی لذّتوں اور عیش کی زندگی سے اپنے دلوں کو پاک کر کے نبیؐ کے ساتھ پاکیزہ زندگی گزاریں یا ان سے آزادی حاصل کر کے دنیاوی شان و شوکت اور نام و نمود اختیار کر لیں۔

انھیں اجازت دی گئی۔ "اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے کہ تم اگر دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو میں تمھیں تمھارے حقوق دے کر رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ اور آخرت کی طلب گار ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو کوئی نیکو کار ہے تو اللہ نے اس کے لیے بڑا اجر مہیا کیا ہوا ہے۔"

اس وقت معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا اور دین میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کی اجازت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا صدیقہ کو دی اور فرمایا: "عائشہ رض! ایک بات کہتا ہوں، فیصلہ کرنے میں عجلت مت کرنا اور اپنے والدین سے بھی مشورہ لے لینا"

پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد انھیں سنایا تو انھوں نے بے ساختہ کہا: "میں اس معاملے میں والدین سے کیوں پوچھوں! مجھے تو اللہ، اللہ کے رسول اور آخرت میں نجات کی طلب ہے"

ازاں بعد یہی جواب باقی ازواجِ مطہرات نے دیا۔ اس طرح آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خانگی زندگی کا یہ مسئلہ حل ہوا۔ اب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے قلب و ذہن کی صلاحیتوں اور طاقتوں کو بیرونی مسائل کے حل کرنے میں صرف کر سکتے تھے اور بیرونی مسائل بھی کچھ کم نہ تھے۔ اسلام کی قوت دُور دُور کی قوتوں کو متوجہ کر چکی تھی۔ کسی نے بہ ذریعۂ اطاعت خود کو پیش کیا اور کوئی ٹکرا کر اپنی قوت کو منوانا چاہتا تھا۔ اس بار غسانی قبائل کی طرف سے سفر کر کے مخبرین نے اطلاع دی کہ رومی خاص انداز سے مدینۂ منورہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

## غزوۂ تبوک ۹ھ اکتوبر ۶۳۰ء

اسلامی جاسوس تجارت بھی کرتے اور دُور دُور کی خبریں بھی لاتے تھے۔ اس بار بھی روغنِ زیتون کے بیوپاری واپس آئے تو انھوں نے تفصیل کے ساتھ وہاں کے تمام حالات گوش گزار کیے اور خبر دی کہ رومیوں نے ایک بہت بڑا لشکر جمع کیا ہے جس کے ساتھ متعدد قبیلے، مثلاً جذام، لخم اور غسان کے مسیحی عرب سب شامل ہیں۔ روم کی حکومت نے انھیں ایک برس کی پیشگی تنخواہیں اور اعزازات عطا کیے ہیں تاکہ بے فکر ہو کر جنگ کر سکیں۔

معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اطلاع ملتے ہی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو طلب کیا تاکہ باہمی مشورے کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے۔ اس وقت معاملہ بڑا ہی تشویش ناک تھا۔ اُدھر رومی تھے جو کچھ عرصے قبل ہی ایران ایسی سلطنت کو مغلوب کر چکے تھے۔ ان کی حربی طاقت، سیاسی قوت اور معاشی حالت مستحکم تھی۔ اس وقت کوئی قوم ان کی برابری نہ کر سکتی تھی۔ اِدھر مسلمان تھے جن کی آمدنی اوّل تو عام اخراجات بھی پورے

نہ کر سکتی تھی، مستزاد یہ کہ اسی زمانے میں قحط اور گرمی کا عالم تھا، لیکن یہ سب جانے کے باوجود بہرحال اسلام کے خلاف اٹھنے والی قوت کو دبانا مسلمانوں کا فرض تھا لہٰذا ہر کمزوری کو نظرانداز کرنے کے بعد طے پایا کہ دشمن کو اپنی سرزمین میں قدم رکھنے کا موقع نہ دیا جائے بلکہ خود آگے بڑھ کر اس کا استیصال کر دیا جائے۔ اس فیصلے پر سب رضامند ہو گئے۔ اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پہلا کام یہ کیا کہ تمام مسلمانوں سے اخراجاتِ جنگ کے لیے چندہ طلب کیا۔ اس وقت تمام مسلمانوں نے جذبۂ ایثار و قربانی کی عجیب مثال پیش کی۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ صدیق نے گھر کا تمام اثاثہ خدمتِ اقدس میں لا کر پیش کر دیا۔

ارشاد ہوا: "ابوبکرؓ! گھر والوں کے لیے کچھ چھوڑ آئے ہو؟"

عرض کیا: "یارسول اللہؐ! گھر والوں کے لیے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی رضا کافی ہے۔"

حضرت عمرؓ فاروق نے گھر کے تمام اثاثے اور جلس میں سے نصف نصف مجاہدینِ اسلام کے لیے لا کر پیش کیا۔ حضرت عثمانؓ غنی نے ۳سو گھوڑے اور ایک ہزار دینار رقم بہ طور چندہ خدمتِ اقدس میں لا کر پیش کی۔ ان کے علاوہ باقی سبھی صحابۂ کرام نے اپنی اپنی حیثیت سے بڑھ کر دیا۔ جو مفلس اور نادار تھے، انھوں نے بھی ہر ممکن کوشش کی اور اس کارِ خیر میں حصّہ کیا۔ اس وقت حضرت ابوعقیلؓ انصاری، مجاہدینِ اسلام کے لیے صرف دو سیر چھوارے ہی لا سکے۔ الغرض مہاجرین اور انصار میں بڑے جوش کا عالم تھا۔ چندہ جمع ہو جانے کے باوجود آثار کہہ رہے تھے کہ سامانِ سفر نہ ہونے کی صورت میں بہت سے پیچھے رہ جائیں گے لہٰذا سبھی زیادہ سے زیادہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر رہتے کہ اس کا نام نظرانداز نہ کر دیا جائے۔

اِدھر جب کہ مسلمان جان دینے کو تیار تھے، اس وقت منافقین بھی اپنا پورا پورا کردار ادا کر رہے تھے۔ ان کی محفلیں جمتیں تو گرمی اور قحط کا تذکرہ کر کے سفر کو بڑا ہَول ناک بناتے اور حتّی الوسع دوسروں کو بھی روکتے۔ ان باتوں کا اثر ان لوگوں پر خاطر خواہ ہوا جو صرف فتحِ مکّہ کے دن دین میں داخل ہو کر امن اور

عزّت کے طلب گار تھے۔ اب وہ لشکر کی خبر سن کر جی چرا رہے تھے۔ ان دنوں سب کا خیال یہی تھا کہ مسلمانوں کو یہ سفر زحمت کے سوا کچھ نہ دے گا کیوں کہ موتہ کے مقام پر صرف غسانی قبائل ہی مقابلے پر آئے تھے، لیکن اب تو باقاعدہ رومیوں سے مقابلہ تھا جنھوں نے ایران کا رُخ پھیر دیا تھا۔ بھلا یہ قوم (مسلمان) کس طرح ان کا مقابلہ کرے گی!

اِدھر لوگ یہ باتیں بناتے رہے، اُدھر تیس ہزار مجاہدین کی عظیم فوج تیار ہو گئی جن کے پاس سواری اور اسلحہ وافر نہ تھا۔ بہت سے پُرجوش مسلمان اس بنا پر شرکت سے رہ گئے۔

ان لوگوں کے جذبات کی اصل تصویر خود قرآن مجید نے اس طرح کھینچی ہے۔

نہ ضعیفوں پر الزام ہے نہ بیماروں پر۔ نہ اُن پر جن کے پاس سامانِ جنگ نہ ہو جب کہ وہ خدا اور اس کے رسولؐ کے خیر اندیش ہوں۔ ایسے نیکو کاروں پر کوئی الزام نہیں ہے۔ خدا بخشنے والا مہربان ہے۔ نہ ان (بے سر و سامان) لوگوں پر الزام ہے جو تمھارے پاس آئے کہ انھیں سواری دو اور تم نے کہا کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے۔ تب وہ لوٹ گئے اور اس غم سے کہ ان کے پاس خرچ موجود نہ تھا، ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

الغرض معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم سباؓ بن عرفطہ کو مدینہ منورہ میں اپنا قائم مقام بنا کر اور حضرت علیؓ کو اہلِ بیت کی نگہداشت کے لیے چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔

حسبِ دستور عبداللہ بن ابی ابنِ سلول کچھ دُور تک ساتھ دے کر لوٹ گیا اور صرف مومنین اور مجاہدین کی یہ جماعت معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم کی رہنمائی میں منزلیں طے کرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اِدھر مجاہدینِ اسلام سفر کر رہے تھے، اُدھر منافقوں کو انھیں دکھ دینے کا ایک موقع اور مل گیا۔

## حضرت علیؓ کی حیثیت

عبداللہ بن ابی ابنِ سلول انھیں شک میں ڈالنے کے لیے حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب کے پاس آیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس جنگ میں شرکت کے لیے خواتین اور بچّوں کو ساتھ نہیں لے جایا گیا اور حضرت علیؓ کو انھی کی حفاظت کے سبب چھوڑا

گیا ہے لہٰذا آتے ہی بغیر تمہید گفتگو شروع کی اور بولا: "ابنِ ابی طالب! کیا تم اِس جنگ کے قابل نہ تھے جو پیچھے چھوڑ دیے گئے؟"

اس وقت چند منافقین نے کچھ اور کہا۔ حضرت علیؓ نے انھیں تو کوئی جواب نہ دیا، مگر خود انھیں بہت غیرت آئی۔ وہ مجاہدینِ اسلام کے پیچھے روانہ ہو گئے اور بہ عجلت تمام سفر کرتے ہوئے اسلامی لشکر تک پہنچ گئے جو مدینۂ منوّرہ سے ایک منزل سفر کر چکا تھا اور اب دوسری منزل کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔ اس وقت مجاہدینِ اسلام اور خود حضرت علیؓ کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔ شدید گرمی سے چہرے سوج گئے تھے۔ بے آرامی ہلکان کر رہی تھی، لیکن شوقِ شہادت کھینچے لیے جا رہا تھا۔ ایسے میں حضرت علیؓ پہنچے تو اللہ کے نبیؐ نے احوال پُرسی کی اور مقصدِ آمد دریافت فرمایا۔

انھوں نے سببِ آمد صاف صاف بیان کرتے ہوئے گلہ کیا: "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ مجھے بچوں اور خواتین کی حفاظت کے لیے چھوڑے جاتے تھے؟ کیا میں (آپ کے نزدیک) اس جنگ کے قابل نہ تھا؟"

یہ گلہ سن کر اللہ کے نبیؐ سمجھ گئے کہ منافقوں کی چال ہے لہٰذا انھوں نے فرمایا: "علیؓ! کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہوتے کہ تم میرے لیے وہی حیثیت رکھتے ہو جو موسیٰؑ کے لیے ہارونؑ کی تھی!"

یہ جواب ان کی حیثیت متعیّن کرنے کے لیے بھی تھا اور انھیں ان کی ذمّے داریوں کا احساس دلانے کے لیے بھی! حضرت علیؓ مطمئن ہو گئے اور لوٹ آئے۔ اُدھر پڑاؤ اٹھا کر مجاہدینِ اسلام نے پھر اپنا سفر شروع کر دیا۔

## علاقۂ مغضوب

جس وقت مسلمان، اللہ کے نبیؐ کی قیادت میں سفر کر رہے تھے، اثنائے راہ میں وہ عبرت ناک مقام بھی آیا جہاں کبھی وہ جلیل القدر قوم آباد تھی جو فنِ تعمیر کی ماہر، دراز قامت اور دولت مند تھی جس نے پہاڑوں کو تراش کر قیام گاہیں تعمیر کیں، لیکن مسلسل نافرمانیوں کی پاداش میں مستحقِ عذاب قرار دی گئی۔ اس عذاب کی خبر معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو برسوں قبل قیامِ مکّہ کے دوران ہی میں

كَذَّبَتْ ثَمُودُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۝ فَأَمَّا ثَمُودُ فَأُهْلِكُوا بِالطَّاغِيَةِ ۝ وَأَمَّا

عَادٌ فَاَهلِکُوا بِرِیحٍ صَرصَرٍ عَاتِیَۃٍ ۔ ترجمہ: (ثمود اور عاد نے اس آنے والی آفت کو جھٹلایا تھا تو ثمود ایک شدید حادثے سے ہلاک کر دیے گئے اور عاد ایک شدید طوفانی آندھی سے تباہ کیے گئے) دے دی گئی تھی اور آج مسلمان بہ چشم خود ان تباہ شدہ مقامات کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ عبرت سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ کچھ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور خدا کی لامحدود قوّت کے تصوّر سے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ الغرض سب دل ہی دل میں اس کی عظمت کا اعتراف کر رہے تھے۔

معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم اس جگہ پہنچے تو ارشاد ہوا "تیزی سے گزر جاؤ۔ یہاں قیام کیا جائے نہ پانی پیا جائے، نہ کوئی کام کیا جائے۔"

یہاں سے لشکر قیام کے بغیر توبہ و استغفار کرتا ہوا گزر گیا، لیکن جب آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) تبوک پہنچے تو اہلِ شام جو حملوں کے منصوبے بنایا کرتے تھے، اب مقابل آنے کی جرأت نہ کر سکے، لیکن آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے یہاں قیام فرمایا۔ یہاں جو عیسائی قومیں آباد تھیں، ان میں آپؐ نے دینِ حق کی تبلیغ کی اور معاہدات بھی کیے۔ اب ان لوگوں کو نزدیک آنے اور گفتگو کرنے کا موقع ملا تو کچھ مسلمان ہو گئے اور کچھ نے اطاعت قبول کر لی۔ اس وقت جنگ کی نوبت نہ آئی لیکن مسلمانوں کے قیام کے سبب وہاں کے قبیلوں پر بہت اچھا اثر پڑا جس کے نتائج دوررس اور بڑے سود مند تھے۔ اس بیس روزہ قیام میں کئی علاقوں کے حکمرانوں نے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی سیادت کو قبول کیا۔

## دومتہ الجندل

یہ علاقہ عرب کے کاروانی راستوں کا مقامِ اتصال ہونے کے سبب سیاسی اور اقتصادی طور پر بہت اہم تھا۔ یہاں کا حاکم اکیدر بن عبد الملک تھا جس سے ایک بار پہلے مقابلہ ہو چکا تھا۔ اب پھر آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے خالدؓ بن ولید کو چار سو مسلمانوں کے دستے کے ساتھ روانہ کیا۔ انھوں نے اکیدر بن عبد الملک کو گرفتار کر لیا۔ اس نے صلح کرنا چاہی تو انھوں نے آزادی کی شرط رکھی کہ مدینۂ منوّرہ جا کر معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے معاہدہ کرے اور انھی کے سامنے شرائط پیش کرے۔ اکیدر نے یہ معاہدہ کر لیا۔ وہ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر مدینۂ منوّرہ پہنچا تو آپ (صلّی اللہ

علیہ وسلّم نے اس سے جزیے کی شرائط پر صلح کر لی اور دونوں کو حفاظت و عزت کے ساتھ آزادی کا پروانہ عطا کر دیا۔

## ایلہ (موجودہ عقبہ)

یہاں کا مسیحی حاکم یوحنا، اسلامی لشکر کے قیام کی خبر سن کر حاضرِ خدمت ہوا اور اعلیٰ نسل کا ایک سفید خچر خدمتِ اقدس میں پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی صلح کی پیشکش کی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے جزیے کی شرط پر اس سے بھی صلح کر لی اور یہ علاقہ مطیع ہو گیا۔

## جربا اور اذرح

اس قیام کے دوران میں جربا اور اذرح کے حکمرانوں اور عیسائی باشندوں نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ دربارِ رسالتؐ سے جزیے کی شرائط ہی پر انھیں مذہبی آزادی کے ساتھ ساتھ ان کے علاقوں میں آزادی مل گئی۔ ان تمام علاقوں کی باقاعدہ اطاعت اور جنگ کے بغیر مطیع ہو جانا گویا دینِ حق کی آواز اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی سیادت کو جزیرہ نما عرب کی آخری شمالی سرحد تک پہنچا دینے کے مترادف تھا۔ یہی وہ سفر تھا جس میں ہر چند کہ جنگ کی نوبت نہ آئی لیکن اس کی راہیں قیصر و کسریٰ تک جاتی تھیں۔

## عبداللہؓ ذوالبجادین

ابتدائے سفر میں جب لشکر، تبوک کی جانب روانہ ہو رہا تھا، تب حضرت ذوالبجادینؓ نے عرض کیا "یا رسولؐ اللہ، دعا کیجیے کہ میں راہِ خدا میں شہید ہو جاؤں۔"

معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم نے کہا: "الٰہی! میں کفار پر ذوالبجادینؓ کا خون حرام کرتا ہوں۔"

اس دعا پر حضرت عبداللہؓ ذوالبجادین آب دیدہ ہو گئے اور عرض کیا "یا رسولؐ اللہ! میں شہادت کا طالب ہوں۔"

فرمایا: "اگر تم گھر سے غزا کی نیت سے نکلو اور راستے میں تپ آ جائے اور مر جاؤ تب بھی شہید ہو۔"

اس وقت کسی کو اندازہ نہ ہوا کہ مرضیٔ مبارک کیا ہے اور یہ جملہ کس مقصد سے

فرمایا گیا ہے، لیکن قیام تبوک کے دوران میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک نماز کے بعد خطبہ دیا جسے ذوالبجادین سر جھکائے ہوئے سن رہے تھے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دریافت کیا۔ "ذوالبجادین کو کیا ہوا؟"

کسی نے جواب دیا۔ "یارسول اللہ! ذوالبجادؓ کو تپ چڑھا ہے۔"

حکم دیا۔ "انھیں لٹا دو۔"

جب انھیں چھوا گیا تو وہ سفرِ آخرت اختیار کر چکے تھے۔

## خطبۂ تبوک۔ رجب ۹ھ (۶۳۰ء)

مسلمانو! حمدِ باری تعالیٰ اور صلوٰۃ کے بعد بہترین کتابِ الٰہی اور بہترین عمل تقوے کا عمل ہے، بہترین ملت ابراہیمؑ کی ملت اور بہترین طرزِ زندگی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی ہے۔ سب سے اشرف بات اللہ کا ذکر ہے۔ سب سے اشرف قصہ قرآن ہے۔ بہترین کام وہ ہیں جو نفس سے ثابت ہوں اور بدترین کام بدعات ہیں۔

(مسلمانو!) سب سے بہتر طریقہ انبیاءؑ کا طریقہ اور سب سے زیادہ عزت کی موت شہداء کی موت ہے۔ بدترین بے بصارتی ہدایت کے بعد کی گمراہی ہے۔ بہترین عمل وہ ہے جو نفع بخش ہو اور بہترین ہدایت وہ ہے جس کی پیروی کی جائے۔ سب سے بُرا، اندھاپن دل کا اندھا ہونا ہے۔ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ تھوڑی چیز اس وافر سے بہتر ہے جو غافل نہ کر دے۔ بدترین توبہ وہ ہے جو موت آنے کے وقت کی جائے اور بدترین ندامت وہ ہے جو قیامت کے دن ہوگی۔

مسلمانو! بعض لوگ وہ ہیں جو جمعے میں دیر سے آتے ہیں اور بعض لوگ خدا کا ذکر چھوڑ کر دوسرے ذکر (شوق سے) کرتے ہیں۔ سب گناہوں سے بدترین گناہ جھوٹی زبان ہے۔ بہترین تونگری دل کی بے نیازی ہے۔ بہترین توشہ تقویٰ ہے۔ دانائی کی بنیاد خدا کا خوف ہے۔ بہترین یقین حق پر یقین کرنا ہے اور شکوک میں رہنا کفر کی ایک قسم ہے۔ نوحہ کرنا جاہلیت کا کام ہے۔ خیانت کرنا جہنم کے لیے تیار ہونا۔ شاعری (مبالغہ آمیز اور شرع کے منافی) شیطانی کام ہے۔ شراب گناہوں

کا مجموعہ ہے۔ عورتیں (بُری عورتیں) شیطان کا جال ہیں اور جوانی جنون کا شعبہ ہے۔
مسلمانو! بدترین کمائی سود کی اور بدترین غذا یتیم کا مال ہے۔ نیک بخت دوسروں سے نصیحت حاصل کرتا ہے اور بد بخت وہ ہے جو ماں کے پیٹ ہی سے شقی ہو۔ یاد رکھو، تم میں سے ہر فرد کو چار گز جگہ (لحد) میں جانا ہے جس کا معاملہ آخرت تک جائے گا۔ تمھارے انجام کا دارو مدار نیّت اور عمل پر ہے اور (اعمال میں) بدترین مزاج جھوٹ کا مزاج ہے۔
لوگو! ہر چیز جو آنے والی ہے، قریب ہے۔ یومِ حساب کو دُور سمجھ کر مطمئن مت ہو۔ مومن کو گالی دینا گناہ، مومن کے ساتھ قتال کرنا کفر اور مومن کا گوشت کھانا (چغلی) اللہ کی نافرمانی ہے۔ مومن کے مال کی حرمت اس کے خون کی طرح ہے۔ بلا ضرورت قَسم کھانے والے کو خدا جھوٹا ثابت کر دیتا ہے۔ ہاں جو توبہ کرتا ہے، اللہ اس سے (گناہوں سے) درگزر فرماتا ہے۔ جو مصیبت میں صبر کرتا ہے، اللہ اسے اجر دیتا ہے۔ جو شخص شہرت کی طلب کرتا ہے، اسے بدنامی نصیب ہوتی ہے۔ جو صبر کرتا ہے اس کا اجر دو چند کر دیتا ہے۔ جو شخص خدا کی نافرمانی کرتا ہے، خدا اسے عذاب دیتا ہے۔
اے خدا! مجھے اور میری تمام امّت کو معاف فرما۔ اے خدا! میری اور میری تمام امّت کی مغفرت فرما اور مجھے اور میری تمام امّت کو بخش دے۔
اے لوگو! کیا میں تمھیں نہ بتادوں کہ بہترین انسان کون ہے اور بدترین کون؟ سنو! بلاشبہ بہترین انسان وہ ہے جو گھوڑے پر سوار ہو کر یا اونٹ پر یا پیدل، خداوندِ عالم کی راہ میں جدّوجہد کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کی موت کا وقت آجاتا ہے۔ بدترین انسان وہ ہے جو اللہ کی کتاب پڑھتا ہے اور اس کی کسی ہدایت کی نگہداشت (عمل) نہیں کرتا۔

یہ تمام خطبہ دنیا کی بُرائیوں سے اجتناب کی ہدایت تھا جسے مسلمانوں نے پوری توجّہ سے اس طرح سنا کہ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ خطبہ تمام کرنے کے بعد آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے حضرت ذوالبجادین کی طرف توجّہ دی۔ یہ خطبہ سنتے سنتے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

اس شب صحابۂ کرام انھیں دفن کر رہے تھے اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) فرما رہے تھے:"اپنے بھائی کا ادب ملحوظ رکھو" لحد میں رکھنے کے بعد اللہ کے نبی نے دعا کی۔

اے اللہ! میں شام تک اس سے (ذوالبجادین) راضی تھا تو بھی راضی ہو جا"

اس وقت مجاہدین میں سے ہر نفس آرزو کر رہا تھا کہ کاش اس لحد میں ہم ہوتے۔

تبوک میں بیس یوم قیام کے بعد آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) مدینۂ منوّرہ لوٹ آئے۔ یہ سفر بڑا سخت تھا۔ بعض جگہ کھانا نہ ملا تو مجاہدینِ اسلام نے پتّے چبائے اور بعض جگہ پانی نہ مل سکا تو انھوں نے اونٹ کو ذبح کر کے ذخیرہ کیا ہوا پانی پیا، لیکن ان میں سے کسی کو ایک لمحے کے لیے بھی ان تکلیفوں کا خیال نہ آیا۔ وہ تو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی معیّت میں سفر کرنے پر فخر کرتے تھے۔

## مسجدِ ضرار

جس وقت معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم جنگ کے لیے تبوک کی طرف روانہ ہونے والے تھے، اس وقت منافقین حاضرِ خدمت ہوئے اور عرض کیا:"یارسول اللہ! ہم نے ضعیف، ناداروں اور اندھیری شب کے مسافروں کے لیے ایک مسجد بنائی ہے، اگر آپ وہاں تشریف لے جا کر ایک مرتبہ نماز پڑھا دیں تو وہ مقبول ہو جائے گی"

یہ سن کر اللہ کے نبیؐ نے جواب دیا:"میں اس وقت سفر پہ جا رہا ہوں۔ واپسی پر فیصلہ ہوگا"

یہ فرمانے کے بعد آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) روانہ ہو گئے۔ اس وقت اکثر مسلمان بھی یہی تصوّر کر رہے تھے کہ دیگر مسجدوں کی طرح یہ بھی ایک مسجد ہے، لیکن کسی کو علم نہ تھا کہ یہ جگہ وہ ہے جہاں جمع ہو کر منافقین مسلمانوں کے خلاف تدبیریں سوچتے ہیں اور یہ عبادت گاہ نہیں، کفّار کی کمین گاہ ہے۔ یہیں بیٹھ کر وہ دور دراز کی قوتوں سے مدد مانگ کر اسلام کو پامال کر دینا چاہتے ہیں۔ کفّار اس مسجد کو مقبول کرنے کے لیے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو مدعو کر رہے تھے اور اب جب کہ وہ مہم پر جا رہے تھے تو انھیں آپؐ کی واپسی کا انتظار تھا۔

معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم واپس تشریف لائے تو ابھی مدینۂ منوّرہ پہنچ نہ پائے تھے کہ اللہ نے انھیں اس مسجد کی حقیقت سے آگاہ فرما دیا۔ اس سفر کے دوران

میں مندرجہ ذیل آیاتِ ربانی نازل ہوئیں۔

وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجدِ ضرار پھوٹ ڈالنے اور کفر کے مقصد سے تیار کی اور اس مقصد سے کہ خدا اور خدا کے رسولؐ کے دشمنوں کے لیے ایک کمیں گاہ بن جائے۔ وہ لوگ قسم کھاتے ہیں کہ ہم نے صرف بھلائی کے لحاظ سے اسے بنایا ہے، لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ (مسجد) جھوٹ ہے۔ اے محمدؐ! آپ کبھی وہاں مت جائیے۔ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے وہی اس بات کی حق دار ہے کہ آپ وہاں نماز ادا کریں۔ وہاں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی پسند ہے اور خدا صفائی پسند کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

جس وقت یہ آیاتِ مبارکہ نازل ہوئیں، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مقام ذی آوان تک پہنچ چکے تھے، لیکن جونہی اس مسجد کی اصلیت کا علم ہوا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت مالکؓ بن خیشم اور معنؓ بن عدی کو حکم دیا کہ آگے بڑھ کر اس مسجد میں آگ لگا دیں۔ تعمیلِ حکم کی گئی اور اس طرح سے مسجدِ ضرار منہدم کر دی گئی۔

معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سفر مکمل کر کے مدینۂ منورہ پہنچ گئے جہاں ایک جانب مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور منافقین پر جیسے اوس پڑ گئی۔ وہ پشیمان پشیمان سے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عذر بہانے تلاش کرنے لگے۔ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو معاف کر دیا، لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھیں اللہ کے نبیؐ نے معاف نہیں کیا کیونکہ وہ منافق نہیں، مسلمان تھے اور قدرت کی جانب سے ان کی سزا مقرر ہو چکی تھی۔

## تین صحابۂؓ کرام کی توبہ

### کعبؓ بن مالک، ہلالؓ بن ربیع، مرارہؓ بن ربیع

یہ تین جلیل القدر صحابۂؓ کرام وہ تھے جن کے جنگ میں شرکت نہ کرنے کا سبب منافقت نہیں بلکہ ان کی سستی اور کاہلی تھی۔ انھیں قدرت کی جانب سے پچاس یوم قیدِ تنہائی کی سزا دی گئی۔ اس دوران میں ان سے کلام کرنے اور تعلق رکھنے کی اجازت کسی کو بھی نہ تھی۔ اس دوران میں قدرت نے انھیں عجیب

عجیب طریقوں سے آزمایا، یہاں تک کہ وہ زندگی پر مرجانے کو ترجیح دینے لگے۔ آخر خداوندِ عالم نے ان کی خطا بخش دی۔ تب ان کی قیدِ تنہائی ختم ہوئی۔ اس کے بعد مسلمانوں اور معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کلام شروع کیا تو دیگر مسلمانوں کو بھی اس کی اجازت ملی اور سزا کے دن تمام ہوئے۔

## سنتِ ابراہیمی پر حج، (ذی الحجہ ۹ھ ۶۳۰ء)

مشرک قوتیں زیر ہو چکی تھیں۔ مکہ مکرمہ فتح ہو چکا تھا اور اسلام کا مرکز مسلمانوں کے قبضے میں آجانے کے بعد اب ضرورت تھی طریقۂ ابراہیمی پر اہتمامِ حج کی۔ طوافِ کعبہ تو مشرکین بھی کرتے تھے اور محض چند رسموں کی ادائیگی کو حج تصور کر کے ادا کر دیتے تھے، لیکن سنتِ ابراہیمی کو فراموش کیے صدیاں بیت گئی تھیں۔ نہ طوافِ کعبہ کے آداب یاد تھے، نہ بیت اللہ کی حرمت کا احساس باقی تھا۔ اول تو ان طریقوں کی وضاحت ضروری تھی، دوسرے کعبۃ اللہ اہلِ ایمان کے لیے مخصوص ہے۔ یہ اعلان کر دینا تھا اسی کے لیے سورۂ برأت کی وہ آیات نازل ہوئیں جنھوں نے ان آداب اور طریقوں کی وضاحت کر دی۔

ارشاد ہوا: "اے ایمان والو! تم نے جن مشرکین سے معاہدہ کیا تھا (انھوں نے اس کی پابندی نہ کی اور وہ معاہدہ توڑ دیا) اب خدا اور خدا کے رسولؐ کی جانب سے کوئی ذمے داری نہیں ہے۔ (اے نبیؐ کہہ دیجیے ان معاہدہ شکن مشرکوں سے) چار ماہ کی مہلت ہے، اس میں تم ملک میں چلو پھرو اور خوب جان لو کہ تم خدا کو عاجز نہ کر سکو گے۔ حجِ اکبر کے دن یہ اعلان عام ہے کہ خدا اور خدا کا رسولؐ ان مشرکین کا ذمے دار نہیں ہے۔ ہاں اگر انھوں نے توبہ کر لی تو ان کے لیے بہتر اور اگر اب بھی پھرے رہے تو یقین کر لو کہ خدا کو نہ ہرا سکیں گے۔ اے نبیؐ! آپ ان کافروں کو دردناک عذاب کی خبر دیجیے، لیکن وہ مشرکین جن سے آپ نے معاہدہ کیا اور انھوں نے اسے پوری طرح ایفا کیا اور نہ آپ کے مقابلے میں آپ کے دشمنوں کی مدد کی تو آپ بھی معاہدے کی مدت پوری کیجیے کیوں کہ خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔"

اس فرمان کے معنی تھے کہ صلحِ حدیبیہ کے دن جو معاہدے مشرکین کے ساتھ کیے گئے تھے اور مشرکین ان پر قائم نہ رہے، اب نقضِ عہد کے بعد

مسلمانوں پر ان میں سے کسی کی پابندی لازم نہیں تھی اور حکم تھا کہ مشرکین میں اس کا عام اعلان کر دیا جائے اور مسلمانوں کو بھی باور کرا دیا جائے۔

اس کے ساتھ ہی اسی سورت کے آیندہ رکوع میں ارشادِ ربانی ہوا۔"اے مسلمانو! خوب جان لو کہ مشرکین ناپاک ہیں۔ اب اس برس کے بعد کعبۃ اللہ کے قریب نہ آئیں۔"

اس آیتِ مبارکہ کے واضح معنی تھے کہ کوئی مشرک، کوئی برہنہ یا کوئی مخبوط الحواس خانۂ کعبہ میں داخل نہ ہو سکے گا۔

انھی احکام کے بعد اس سال، یعنی ۹ھ میں ارکانِ حج انجام دینے کا اہتمام کیا گیا۔ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سو مسلمانوں کی جماعت صدیقِ اکبر حضرت ابوبکرؓ کی امارت میں مدینۂ منورہ سے حج کے لیے روانہ فرمائی۔ اس جماعت کے ساتھ نقیبِ اسلام کی حیثیت سے سورۂ برأت کی ان آیات کا اعلان کرنے کے لیے حضرت علیؓ تھے اور ان احکام کی منادی کرنے والوں میں حضرت ابوہریرہؓ، حضرت جابرؓ اور حضرت سعدؓ بن وقاص تھے۔

اُس وقت امیرِ مکہ حضرت عتابؓ بن اسید تھے۔ انھی کے ساتھ مسلمانوں نے فریضۂ حج ادا کیا جس میں سنّتِ ابراہیمی کے مطابق تمام رسوم ادا کی گئیں۔ اس حج کو قرآنِ مجید نے حجِ اکبر کہا ہے۔ اس کے بعد ان تاریخوں میں اسی انداز سے سنّتِ ابراہیمی کے مطابق ادا کرنے والے اس فریضے کو حجِ اکبر اور عام تاریخوں میں طوافِ کعبہ کو حجِ اصغر (عمرہ) کہا گیا، یعنی ہر حج، حجِ اکبر اور ہر عمرہ حجِ اصغر قرار پایا۔

اس حج کا مقصد احکامِ خداوندی کا اعلان کرتے ہوئے تمام اقوام کو یہ بتانا تھا کہ حکومتِ اسلام کا آغاز ہو گیا۔ اب کوئی من مانی نہ کر سکے گا۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ صدیق نے ان سب کو مناسکِ حج کی تعلیم دی اور مسائلِ حج کے بارے میں خطبہ دیا، پھر حضرت علیؓ نے سورۂ برأت کی وہ چالیس آیات تلاوت کر کے سنائیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مشرکین پر کعبۃ اللہ میں داخل ہونے کی پابندی لگا دی۔ ازاں بعد ان احکام کی منادی کی گئی جنھیں سن کر مکے کے قرب وجوار کے وہ لوگ جو ابھی متذبذب تھے، ایک فیصلہ کر کے مسلمان ہونے لگے اور دُور دُور کے

وفد آنے لگے۔

## عام وفود ۹ھ (۶۳۰ء)

اسلام کے لیے ہجرت کا نواں سال بہت اہم تھا۔ یہ وفود کا سال کہلاتا ہے۔ احکامِ خداوندی کے اس اعلان کے بعد مختلف قبائل نے مدینۂ منورہ میں اپنے وفد بھیج کر اسلام قبول کیا اور مملکتِ اسلامیہ کے وفادار رہنے کا اظہار کیا۔ اس سے قبل کئی قبائل بغیر کسی تحریک کے ایمان لا چکے تھے جن میں دوس، اشعر اور ہمدان بہت مشہور ہیں۔ یمن کے قبیلۂ دوس کے سردار طفیلؓ بن عمرو نے ہجرت سے قبل مکہ مکرمہ میں جا کر اسلام قبول کیا تھا اور ان سے متاثر ہو کر ان کے پورے قبیلے نے یہ دین قبول کر لیا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ اسی قبیلے کے مشہور صحابی ہوئے۔ قبیلۂ اشعر کے لوگ بھی بلا کسی تحریک و دعوت کے دینِ حق کی فطری کشش سے مجبور ہو کر مسلمان ہوئے تھے۔ ان میں ابو عامرؓ اشعری اور ابو موسیٰؓ اشعری مشہور ہوئے۔ پھر قبیلۂ ہمدان آتا ہے۔ انھوں نے نئے دین کی شہرت سنی تو اپنے قبیلے کے ایک معزز، عامرؓ بن شہر ہمدانی کو تصدیق کے لیے بھیجا۔ انھوں نے قلب کی گہرائیوں سے اس تعلیم کو سنا اور شیدائی ہو گئے، واپس گئے تو اس چرچے کے سوا کوئی بات ہی نہ تھی جو زبان پر آتی۔ اس طرح قبیلۂ ہمدان میں دین پہنچا۔ اب دینِ حق کی آواز قریہ قریہ اور گلی گلی پہنچ چکی تھی۔ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اب اسے گھر گھر پہنچانا چاہتے تھے لہٰذا اسی مقصد کی تکمیل کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمام قبائل کو روشناس کرانے کی خاطر ایک وفد تیار کیا جس کا کام ہی قبائل میں جا کر لوگوں کو باقاعدہ اسلام سے آگاہ کرنا تھا۔ ان جماعتوں کے سردار خالدؓ بن ولید، معاذؓ بن جبل اور ابو موسیٰؓ اشعری تھے۔ خالدؓ بن ولید نے کامل چھ ماہ تبلیغ کی لیکن ناکام رہے اور صفا کے سوا کہیں کے لوگوں نے ان کی ہدایات پر کان نہ دھرے۔ تب معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدمت کے لیے ان کی جگہ حضرت علیؓ کو مقرر فرمایا جن کی کاوشوں سے خدیمہ، مذحج اور ہمدان کے ہر گھر میں اسلام پہنچ گیا۔

ابو موسیٰؓ اشعری کی مساعی عدن اور زبید قبائل کے لیے بار آور ثابت

ہوئیں۔ یہ دونوں قبیلے مسلمان ہو گئے۔ معاذؓ بن جبل نے یمن میں اسلام کی تبلیغ کی جو خاصا مشکل کام تھا مگر قدرت نے انھیں کامیابی عطا فرمائی۔ علاوہ ازیں بحرین اور عمان میں بھی اسی زمانے میں مبلّغ بھیجے گئے جن کی مسلسل کاوشوں کی بدولت وہاں کے لوگوں نے دینِ حق قبول کیا اور اسلام کے دامن میں آ گئے۔ اس طرح اس برس بہت سے وفود حاضرِ خدمت ہوئے اور متعدد جگہوں پر بھیجے گئے اور اسلام کی روشنی سے عرب کا گوشہ گوشہ جگمگا اٹھا۔ اب مدینۂ منورہ، شہری مملکت سے قومی مملکت بن گیا۔ اس کی سیاسی اور مذہبی حیثیت تمام عرب نے تسلیم کر لی تھی جس کے سبب اب غیر مسلم اقوام کو باقاعدہ محاصل ادا کر کے وفاداری کی قسم کھانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ عرب میں ہر طرف اسلام کا بول بالا ہو چکا تھا دنیا کے کونے کونے میں اسلام کی آواز پہنچ چکی تھی، اللہ کے آخری نبیؐ نے گم کردہ راہ انسانوں کو خالقِ حقیقی سے ملا دیا تھا اور یہ بھٹکا ہوا انسان صراطِ مستقیم سے آشنا ہو چکا تھا۔ اس کے واضح معنی یہی تھے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مقصدِ حیات پورا کر چکے تھے جس کا اندازہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خود بھی تھا۔ آپ اپنے اس عظیم مقصد سے دست کش ہونے کی تیاریاں کرنا چاہتے تھے کہ اس برس چند اور کام عمل میں آئے۔

## زکوٰۃ، ۹ھ (۶۳۰ء)

چونکہ اب اسلامی مملکت بہت وسیع ہو گئی تھی اس لیے دولت کے مواقع بھی حاصل ہو گئے۔ متعدد مقتدر قبائل زیرِ اسلام آئے۔ پھر فتوحات میں مالِ غنیمت حاصل ہوئے۔ جنگوں سے فرصت ملی اور مسلمان اپنے آبائی پیشے تجارت کی طرف پھر سے دھیان دینے لگے تو ملک میں خوش حالی اور فراغت کا دور شروع ہوا۔ تب زکوٰۃ کا حکم نازل ہوا۔ معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے تحصیلِ زکوٰۃ کے لیے باقاعدہ عمّال مقرر کیے۔ ہر قبیلے میں ایک عامل ہوتا جو اپنے قبیلے سے زکوٰۃ کی وصولیابی کی خدمت انجام دیتا تھا۔ اگرچہ اس کی ابتدا اسلام کے ساتھ ہی ہوئی تھی، خیرات کی ترغیب اور باہمی امداد کا احساس اوّل دن سے ہی دلایا گیا، لیکن اس کی خاص مقدار اور وقت کا حساب فراغت پیدا ہونے کے بعد بہ تدریج قائم

کیا گیا اور حکم ہوا "اے نبیؐ! ان کے مال میں سے زکوٰۃ وصول کیجیے تاکہ آپ انھیں پاک صاف کر سکیں۔"

## جزیہ

فتوحات کے بعد اب اسلام کے سائے میں متعدد غیر مسلم اقوام بھی سانس لے رہی تھیں لہٰذا ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے جزیے کی آیات اتریں۔

ارشادِ ربانی ہوا "اہلِ کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جنگ کرو جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں لاتے، جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے۔ دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ مطیع و فرماں بردار ہو کر جزیہ دینے لگیں۔"

اس حکم نے بہت سی بدگمانیوں کی اصلاح کر دی۔ کچھ کم فہم قبائل سوچ رہے تھے کہ مسلمان اپنے دین کی اشاعت کے لیے جنگ کرتے ہیں، لیکن جزیے کے حکم نے بہ یک وقت اس گمان کی تردید و نفی بھی کی اور غیر مسلموں کو محفوظ بھی کر دیا۔ جزیہ وہ رقم ہو اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا سے وصول کر کے اس کے عوض انھیں مذہبی اور مجلسی آزادی دیتی ہے۔ جب اس رقم کی ادائیگی کے بعد تمام غیر مسلموں کو مذہبی اور مجلسی آزادی عطا ہوئی تو انھیں اندازہ ہوا کہ جنگ مذہب کی اشاعت کے لیے نہیں کی جاتی، امن قائم رکھنے کے لیے کی جاتی ہے۔

## نجاشی کی وفات

اسی سال نجاشی، شاہِ حبشہ نے وفات پائی۔ مسلمانوں نے کم و بیش تیرہ برس اس ملک میں امن و امان سے وقت گزارا تھا لہٰذا اس خبر نے انھیں افسردہ کیا اور خود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی رنج ہوا، فرمایا "مسلمانو! تمھارے برادرِ صالح اصحمہ نے وفات پائی، دعائے مغفرت کرو۔"

اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی اور مسلمانوں نے دعائے مغفرت کی۔ اس وفات کی خبر معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو خود ہی دی تھی۔

## حجۃ الوداع۔ ذی الحجہ ۱۰ھ (۶۳۱ء)

معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ ذاتِ باری کے سوا ہر شے فنا ہو جانے والی ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت کے مصداق اس عالمِ فانی میں آنے والے ہر ذی روح کو واپس جانا ہے اور خاص طور پر اس وقت جب کہ وہ مقدس فرض ادا ہو چکا تھا جس کی ادائیگی ہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مقصدِ حیات تھی۔ آدمؑ کی گم کردہ راہ اولاد کو صراطِ مستقیم سے آشنا کرنا، انسان کے اخلاق و اعمال کی تربیت کرنا اور قلب و روح کی صفائی و تطہیر کرنا مشکل ترین امر تھا جسے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسے جامع صفت انسان نے قلیل وقت میں انجام دیا تھا۔ اس کے بعد آپؐ جان گئے تھے کہ کوچ کی تیاری ہے لہٰذا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے رمضان المبارک دس ہجری میں بیس یوم کا اعتکاف فرمایا جب کہ ہر سال دس یوم کے لیے بیٹھا کرتے تھے۔ ہر بار حضرت جبریلؑ ایک مرتبہ قرآن مجید سناتے تھے۔ اس بار انھوں نے رمضان المبارک میں دو مرتبہ کلام الٰہی سنایا۔ یہ مبارک مہینا تمام ہوا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس برس حج کے لیے اعلان کرا دیا۔ اس زمانے میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طرزِ عمل، اندازِ گفتگو اور ہدایات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اب اپنا مقصد تمام کر دینے والے ہیں لہٰذا شیدائی اطراف واکنافِ عرب سے مکے میں جمع ہونے لگے اور اتنی ہی تعداد میں مدینۂ منورہ میں جمع ہوئے۔ ہر طبقے اور ہر قبیلے کے افراد دُور دراز کا سفر کر کے فریضۂ حج آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ادا کرنے کے لیے پہنچ رہے تھے۔ اس اعلان نے جیسے ایک جوش پیدا کر دیا تھا اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حج کا اعلان بھی وقت سے پہلے اسی لیے کرایا تھا کہ آخری گفتگو کو زیادہ سے زیادہ لوگ سن لیں۔ آخر یہ وقت گزرا اور اللہ کے آخری نبیؐ نے چھبیس ذی القعدہ کو مدینۂ منورہ سے اپنا سفر شروع کیا اور زیرِ لب تسبیح کرتے ہوئے مقامِ ذی الحلیفہ تک پہنچے جہاں احرام باندھا اور قدرے بلند آواز سے کہا۔ "لبیک اللّٰھم لا شریک لک لبیک، ان الحمد والنعمۃ لک والملک لا شریک لک۔"

آپ کہتے اور جاں نثار اسے دُہراتے۔ اس وقت مسلمانوں کی آنکھیں عقیدت و مسرت سے چھلک رہی تھیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جدھر جدھر سے گزرتے مسلمان

ساتھ ہوتے جاتے۔ جب بھی راہ میں کوئی بلند ٹیلا آتا، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تین بار تکبیر پڑھتے۔ مسلمان اسے دُہراتے اور فضا اس مبارک نام سے گونج جاتی۔ اس طرح یہ خوش نصیب کارواں ذی طویٰ سے گزرتے ہوئے ذی الحجہ کی پانچ تاریخ کو مکے میں داخل ہوگیا۔ اسی دن حضرت علیؓ جو تبلیغ دین کے لیے گئے ہوئے تھے، مسلمانوں کے ساتھ مکے پہنچ گئے۔ اس دن معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے ساتھ کعبتہ اللہ کا طواف کیا۔ پھر کوہِ صفا اور مروہ کی پہاڑیوں پر تشریف لے گئے اور سعی کی۔

ان چوٹیوں پر چڑھ کر، خانۂ کعبہ کی جانب روئے مبارک کر کے آپؐ نے توحید و تکبیر کے کلمات بلند آواز میں پڑھے اور فرمایا "کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی حکومت اس کی تعریف ہے۔ وہ ہر شئے پر قادر ہے۔ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، جس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندے کی مدد کی اور دشمن جتھوں کو اکیلے شکست دی۔ بے شک وہی ہے غالب۔"

بعد ازاں آٹھ ذی الحجہ کو معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم مکے سے روانہ ہو کر منیٰ میں ٹھہرے۔ یہاں ظہر، عصر، مغرب، عشا اور نو ذی الحجہ کی نمازِ فجر ادا کی۔ اس کے بعد سفر کر کے وادئ نمرہ میں تشریف لے گئے۔ اس وادی کی ایک جانب عرفات اور دوسری جانب مزدلفہ ہے۔ یہاں دوپہر تک قیام فرمایا اور دن ڈھلے چل کر عرفات میں پہنچ گئے جہاں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مسلمانوں سے الوداعی کلام کیا۔

خطبہ، ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ (۷ مارچ ۶۳۲ء)

عرفات کے میدان میں دیا جانے والا یہ آخری خطبہ اسلامی تعلیمات کا نچوڑ اور تیئس سالہ نبوی زندگی کی شبانہ روز تعلیم و تبلیغ کا خلاصہ ہے۔ اس وقت یہ میدان مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ چوالیس ہزار اور دوسری روایت کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمانوں کا اجتماع تھا۔ ہر نفس تکبیر و تحلیل میں مصروف رخِ انور کی طرف متوجہ تھا اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) قصوا پر سوار، ایک پہاڑی پر سے مصروفِ کلام تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دیگر سینکڑوں معجزات کی طرح شق القمر، حنینِ جذع، تنبیہہ جبل، تکثیرِ طعام، تکثیرِ حلیب، نبع الماء اور

بہت سے دوسرے) یہ بھی ایک معجزہ تھا کہ میدانِ عرفات میں موجود ہر شخص کو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی آواز یکساں سنائی دے رہی تھی۔ جو لوگ نزدیک تر تھے، جو میدان کی آخری حد پر تھے اور جو خواتین اور بچّے خیموں کے اندر تھے، وہ سب اللہ کے نبی کی آواز صاف سن رہے تھے۔

خطبہ مندرجہ ذیل ہے۔

سب تعریف خدائے بزرگ و برتر کے لیے ہے۔ ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں، اسی سے مدد چاہتے ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا ایک ہے، واحد و لا شریک ہے اور محمدؐ اس کا بندہ اور رسولؐ ہے۔

لوگو! میں تمھیں خدا سے ڈرنے کی وصیّت کرتا ہوں، اس کی اطاعت کا حکم دیتا ہوں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ آج کے بعد میں اور تم اس مجلس میں پھر کبھی اکٹھے نہ ہوں گے۔ سنو! تمھارے خون، تمھارے مال اور تمھاری عزّتیں ایک دوسرے پر حرام ہیں، بالکل اسی طرح جیسے تم لوگ آج کے دن اس شہر کی اور اس ماہ کی حرمت کرتے ہو۔ تمھیں عنقریب خدا کے حضور حاضر ہونا ہے۔ وہ تم سے تمھارے اعمال کی بابت سوال کرے گا۔ خبردار تم لوگ میرے بعد گم راہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔

لوگو! جاہلیّۃ کی ہر ایک بات کو آج میں اپنے قدموں کے نیچے پامال کرتا ہوں۔ جاہلیّۃ کے تمام خون کے جھگڑوں کو ملیامیٹ کرتا ہوں۔ پہلا خون جو میرے خاندان، یعنی ربیعہ بن حارث کا تھا (جو بنو سعد میں دودھ پیتا تھا اور ہذیل نے اسے مار ڈالا تھا)، میں اسے چھوڑتا ہوں۔ آج کے دن جاہلیّۃ کے زمانے کا تمام سود ملیامیٹ کر دیا گیا اور پہلا سود اپنے خاندان کا میں خود مٹاتا ہوں، یہ عباسؓ بن عبدالمطلب کا سود ہے، میں سب کا سب چھوڑتا ہوں۔

مسلمانو! اپنی بیویوں کے بارے میں خدا سے ڈرتے رہو۔ خدا کے نام کی ذمّے داری سے تم نے انھیں بیوی بنایا ہے اور خدا کے کلام سے تم نے ان کا جسم اپنے لیے حلال بنایا ہے۔ تمھارا حق عورتوں پر اتنا ہے کہ وہ تمھارے بستر پر کسی غیر کو (کہ تم کو اس کا آنا ناگوار ہو) نہ آنے دیں، لیکن اگر وہ ایسا کریں تو ان کو ایسی سزا دو کہ

جو نمایاں نہ ہو۔ عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ تم انھیں اچھی طرح کھلاؤ اچھی طرح پہناؤ، نرمی اختیار کرو اور مہربانی سے پیش آؤ۔

مسلمانو! میں تم میں وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم اسے مضبوطی سے پکڑو گے تو کبھی گم راہ نہ ہوگے۔ وہ چیز قرآن ہے، اللہ کی کتاب ہے۔

لوگو! نہ میرے بعد کوئی پیغمبر آئے گا اور نہ کوئی جدید امت پیدا ہونے والی ہے۔ (تلقین و ہدایت کا کام اب تمھیں ہی کرنا ہوگا)

خوب سُن لو کہ اپنے پروردگار کی عبادت کرو، پنجگانہ نماز ادا کرو، سال میں ایک ماہ رمضان المبارک کے روزے رکھو۔ مالوں کی زکوٰۃ خوش دلی سے ادا کرو، خانۂ خدا کا حج بجا لاؤ اور اپنے اولیائے امور (حکام کی اطاعت کرو جس کی جزا یہ ہے کہ پروردگارِ عالم تمھیں فردوس بریں میں داخل کرے گا۔

لوگو! غلام بھی خدا کے بندے ہیں، ان پر ظلم نہ کرو۔ ان کی خطاؤں پر درگزر کرو۔ انھیں وہی کھلاؤ جو خود کھاؤ، وہی پہناؤ جو خود پہنو۔

لوگو! مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، کسی کو کسی پر برتری نہیں۔ گورے کو کالے پر، عربی کو عجمی پر اور امیر کو غریب پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ (عظمت کا معیار تقویٰ ہے) تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ، مٹی سے بنے تھے۔

لوگو! قیامت کے دن تم لوگوں سے میری بابت دریافت کیا جائے گا۔ مجھے بتاؤ کہ اس وقت تم کیا جواب دو گے؟

مسلمانوں نے جواب دیا کہ یارسولؐ اللہ! ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپؐ نے اللہ کے احکام ہمیں پہنچا دیے۔ آپؐ نے رسالت و نبوت کا حق ادا کر دیا۔ آپؐ نے ہمیں کھرے اور کھوٹے کی پہچان بتا دی۔

یہ سننے کے بعد اللہ کے آخری نبیؐ نے آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا "خدایا! سن لے، تیرے بندے گواہی دے رہے ہیں، اقرار کر رہے ہیں"۔ پھر لوگوں سے کہا "لوگو! آج کے دن جو یہاں موجود ہیں، وہ ان لوگوں کو جو یہاں موجود نہیں، ان تمام امور کی تبلیغ کرتے رہیں۔ ممکن ہے کہ بعض سامعین سے وہ لوگ زیادہ بہتر طریقے پر اس کلام کو یاد رکھیں اور اس کی حفاظت کرنے والے ہوں"۔

یہ آخری خطبہ اسلامی تعلیمات کا خلاصہ اور نچوڑ ہے جس میں تمام حقوق واضح کرنے کے بعد ہر مسلمان کو قیامت تک کے لیے تبلیغ و اشاعتِ دین کا ذمے دار بنا دیا۔ اب کوئی نبی نہیں آئے گا، کوئی نجات دہندہ پیدا نہیں ہوگا، لیکن کرۂ ارض پر جب تک ایک مسلمان بھی زندہ ہے تو رُشد و ہدایت کا یہ فرض اسے ادا کرنا ہے۔ اس آخری فرمان کے یہی معنی ہیں۔

معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ تمام کیا تو وحی نازل ہوئی۔ ارشادِ ربانی ہوا "آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کا دین ہونا پسند کر لیا۔"

اس کے معنی تھے کہ قیامت تک آنے والے ہر انسان کے لیے اس دین کو پسند کر لیا گیا تھا اور ہر نبی نے اپنے اپنے وقت میں جس کی خبر دی تھی، آج وہ مکمل ہو گیا تھا۔ اب کسی تفسیر و اضافے کی گنجائش نہ تھی۔

اس خطبے اور ان آیاتِ مبارکہ کے اثر سے مومنوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ صدیقِ اکبر حضرت ابوبکرؓ رونے لگے۔ تکمیلِ دین کے معنی تھے کہ اب وحی کا سلسلہ بند ہو گیا تھا۔ اس بات کا احساس جسے بھی ہوا، وہ رنجیدہ ہو گیا۔ اس موقع پر تیرہ ذی الحجہ تک معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم مکے میں رہے۔ اس الوداعی حج سے مُراد صرف فریضۂ حج ادا کرنا ہی نہ تھا بلکہ اس کا مقصد حضرتِ ابراہیمؑ کے طریقوں کا احیاء، توحید کا اعلان اور تعلیمِ اسلام کو عام کرنے کا حکم دینا تھا اس لیے اس حج کو "حجۃ البلاغ" بھی کہتے ہیں۔

## خدا کا آخری پیغام ۱۱ھ (۶۳۲ء)

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ ۝ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۝ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَاسۡتَغۡفِرۡہُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ۝

ترجمہ: (جب اللہ کی مدد آ پہنچی اور فتح حاصل ہو گئی آپ نے (اے نبیؐ!) دیکھ لیا کہ لوگ غول کے غول خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ تو اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرو اور اسی سے مغفرت مانگو، بے شک وہ معاف کرنے والا ہے)

یہی آخری پیغام تھا جس کے بعد کوئی مکمل سورت نازل نہیں ہوئی۔ عظیم

کامیابیوں کے بعد تسبیح و توبہ کا حکم تھا، گویا فرضِ نبوّت کی تکمیل کا اندازہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا، اب باقاعدہ یہ پیغام تھا کہ اللہ کے آخری نبیؐ اس دارِ فانی کو خیرباد کہہ دیں۔

اُن دنوں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم)، اُحد کے قبرستان جاتے اور شہدائے اُحد کے لیے دعا کرتے۔ کبھی مدینۂ طیبّہ کے قبرستان جنّت البقیع تشریف لے جاتے اور اصحابِ قبور کے لیے دعائے مغفرت کیا کرتے۔

ایک دن آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) گنجِ شہیداں سے لوٹ کر آئے تو ممبر پر کھڑے ہو کر فرمایا "مسلمانو! میں تم سے دُور جانے والا ہوں، خداوندِ عالم کے رُو بہ رُو تمھارے ایمان اور عمل کی شہادت دینے والا ہوں۔ میں اپنے حوض (حوضِ کوثر) کو یہاں سے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے تمام عالم کے خزانوں کی کنجیاں دے دی گئی ہیں۔ مسلمانو! مجھے یہ ڈر نہیں کہ تم میرے بعد مشرک ہو جاؤ بلکہ ڈر یہ ہے کہ تم میرے بعد منافقت (ایک دوسرے سے بڑھ نکلنے کی غلط کوشش) نہ کرنے لگو۔"

اس وقت بہت سے مسلمان جمع تھے۔ کچھ اشکبار اور بہت سے توبہ و استغفار کر رہے تھے۔ ان میں سے ہر نفس کی آرزو تھی کہ شرک اور منافقت دونوں سے محفوظ رہ کر خدا کے حضور جائیں۔ اللہ کے نبیؐ نے مسلمانوں کے لیے دعا کی اور وہاں سے تشریف لے گئے۔

ان دنوں آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی یہ گفتگو سب مسلمانوں کا موضوع بنی رہی۔ یوں تو ہمیشہ ہی صحابۂ کرام حاضرِ خدمت ہوتے، مگر جو کسی سبب نہ ہوتے تو آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم)، لمحے لمحے کی باتیں انھیں بتاتے۔

ان دنوں کیفیت مختلف تھی۔ کوئی تھوڑی دیر کو بھی محفل سے جاتا تو آکر دریافت کرتا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کچھ فرمایا؟"

حضور (صلّی اللہ علیہ وسلّم) خود بھی ایسی ہی گفتگو فرما رہے تھے جیسی گفتگو بہ وقت رخصت کی جاتی ہے۔ ایک دن آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے فرمایا "مسلمانو! میں تمھیں اللہ کے تقوے کی وصیّت کرتا ہوں۔ اللہ کو تمھارا خلیفہ بناتا ہوں۔ تمھیں اسی سے ڈراتا ہوں کیوں کہ میں نذیر و مبین ہوں۔ دیکھنا تم لوگ اللہ کی

بستیوں میں اور اس کے بندوں میں رہتے ہوئے تکبّر اور برتری کو اختیار مت کرنا۔ مسلمانو!
میں تم پر اور ان پر سلام بھیجتا ہوں جو اسلام کے ذریعے میری بیعت میں داخل ہوں گے۔"
جب تک آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) گفتگو کرتے رہے، صحابہؓ کرام سر جھکائے بیٹھے رہے۔ ان کے دل اندیشوں سے بھرے ہوئے تھے۔ چند لمحوں کے لیے بھی وہ اس محفل سے اٹھنے کو آمادہ نہ ہوتے تھے، لیکن آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے آرام کے خیال سے جانا ہی پڑتا تھا۔

## آغازِ مرض، ۲۹ صفر المظفر ۱۱ھ (۶۳۲ء)

معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم ایک جنازے کے ساتھ تشریف لے گئے۔ واپسی میں گرمی محسوس ہوئی اور سر میں درد ہو گیا، اس کے ساتھ ہی بخار بھی۔ ابو سعید خدریؓ کا بیان ہے کہ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے شدّتِ درد کے سبب سر پر ایک رومال باندھ لیا تھا۔ میں نے اسے چھوا تو بخار کے سبب اس قدر گرم تھا کہ ناقابلِ برداشت محسوس ہوا۔ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔
آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے فرمایا: "انبیاءؑ سے بڑھ کر کسی کو تکلیف نہیں ہوتی اسی لیے اس کا اجر بھی سب سے زیادہ ہوتا ہے۔"
قبرستان سے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) گھر تشریف لائے تو خدمت میں آنے والوں کا سلسلہ بندھ گیا، مگر بخار اور دردِ سر کے باعث آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کم ہی گفتگو کر رہے تھے۔ چند دن یہی کیفیت رہی کہ بہ مشکل اٹھ سکتے اور نماز کے لیے مسجد میں تشریف لے جاتے ورنہ آرام کرتے رہتے۔

## حضرت عائشہؓ صدّیقہ کے حجرے میں منتقلی۔ ربیع الاوّل ۱۱ھ (۶۳۲ء)

ابتدا سے آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی عادت تھی کہ ازواجِ مطہرات میں سے باری باری سب کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ اب بھی حالتِ مرض میں بہ نفسِ نفیس مسجد میں جاکر نماز ادا کرتے اور ازواجِ مطہرات کے حجروں میں دستور کے مطابق باری باری آرام کرتے۔ اس وقت نو ازواجِ مطہرات حیات تھیں۔ مرض کے گیارہ یوم آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے ان سب کے ساتھ گزارے، لیکن پھر حالت بگڑتی گئی تو ان سب سے اجازت طلب کی اور حضرت عائشہؓ صدیقہ کے حجرے میں منتقل ہو گئے۔

اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ حضرت عائشہ رضؓ صدیقہ کا حجرہ مسجد سے متصل بلکہ اس کا دروازہ صحن میں کھلتا تھا لہٰذا جب تک چلنے کی قوت باقی رہی، یہاں سے جاکر نماز پڑھائی۔

## حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ کو امامت کا حکم، ۸ ربیع الاول سنہ ۱۱ھ (سنہ ۶۳۲ء)

اس دن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پانی کی ناند میں بیٹھ کر سات مشک پانی سے غسل کیا۔ اس سے آپؐ کی طبیعت کو قدرے سکون ملا۔ حسبِ معمول صحابہؓ کرام عیادت کو حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا: "وفود کی عزت و مہمانی ہمیشہ ایسے کرنا جیسے معمولِ نبوی تھا (دوم یہ کہ) یہود کو عرب سے نکال دینا۔"

اس دن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طبیعت قدرے بحال رہی اور تمام نمازیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی امامت میں پڑھائیں اور درمیانی نماز کے بعد منبر پر اجلاس کیا۔

خدائے واحد کی حمد و ثنا کے بعد آپؐ نے فرمایا: "لوگو! عبادت کے قابل وہی ذاتِ یکتا ہے۔ تم سے پہلے کی وہ اقوام برباد ہوگئیں جو اپنے انبیاءؑ و صلحا کی قبور کو سجدہ گاہ بناتی تھیں۔ تم ایسا مت کرنا۔ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ لعنت بھیجے جنھوں نے قبور کو سجدہ گاہ بنایا۔ (جب کہ انھیں عبادت کرنے کے طریقے سکھا دیے گئے تھے) وہ قوم خدا کے عذاب کی مستحق ہے جو انبیاءؑ کی قبور کو سجدہ گاہ بناتی ہے۔ میں تمھیں اس امر سے منع کرتا ہوں۔ میری قبر کو ایسا مت بنانا کہ اس کی پرستش کی جائے۔ (لوگ منتیں اور مرادیں مانگیں) میں تمھیں اس امر سے منع کرتا ہوں۔ میں تمھیں تبلیغ کر چکا ہوں۔ الٰہی! تو گواہ رہنا!... الٰہی! تو گواہ رہنا!" قدرے توقف کے بعد آپؐ نے پھر سلسلۂ کلام شروع کیا اور فرمایا: "میں تمھیں انصار کے حق میں وصیت کرتا ہوں۔ یہ لوگ میرے جسم کا پیرہن ہیں، زادِ راہ ہیں۔ دیکھو انھوں نے اپنے فرائض پورے کر دیے، اب ان کے جو حقوق باقی ہیں، ادا کرنا۔ تم اچھے کام کرنے والوں کی قدر و منزلت اور غلطاؤں سے درگزر کرنا۔"

اس وقت مجمع سر جھکائے ہوئے گوش برآواز تھا۔ انصار اور مہاجرین سبھی جمع تھے جو اس گفتگو کی باریکی کو سمجھ رہے تھے اور اشکبار تھے۔ [illegible] چلتا

تھا کہ اپنا سب کچھ نثار کر دیتے۔

آپؐ کے سانس کے زیر و بم نے سلسلۂ کلام منقطع کر دیا تھا لہٰذا لمحہ بھر سکوت کے بعد گفتگو تمام کرتے ہوئے فرمایا ''لوگو! اللہ نے اپنے ایک بندے کے سامنے دنیا اور آخرت دونوں کو پیش کیا تو اس بندے نے آخرت کو اختیار کر لیا!''

اس گفتگو کے بعد آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے اجلاس تمام کیا۔ یہ مسجدِ نبوی میں آپؐ کی آخری تقریر تھی۔ پھر آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) یہاں تشریف تو لائے لیکن اتنی مفصّل گفتگو نہ فرمائی۔

اس دن کی تمام نمازیں آپؐ نے اپنی امامت میں پڑھائیں، لیکن عشاء کے وقت طبیعت بگڑ گئی۔ تین یا اس سے زیادہ مرتبہ کوشش کی لیکن آپؐ اُٹھ نہ پائے، غشی سی طاری ہوتی رہی۔ ادھر مسجد میں مسلمانوں کی جماعت تیار اور منتظر تھی۔ ایسے میں اللہ کے نبیؐ نے اپنے اوّلین دوست کو طلب کیا تو مشتاقین میں امّید کی لہر دوڑ گئی کہ شاید آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) سہارا لے کر باہر آنا چاہتے ہوں، لیکن جب حضرت ابوبکرؓ صدّیق حاضر ہوئے تو نقاہت حد درجہ تھی۔ اس وقت آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے امامت کا حکم انھیں دیا اور پھر غشی طاری ہو گئی۔ نو ربیع الاوّل بھی اسی طرح گزرا۔

## ۱۰ ربیع الاوّل ۱۱ھ (۶۳۲ء)

اس دن غشی کم اور نقاہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے منشائے مبارک ظاہر کیا تو حضرت عبّاسؓ بن عبدالمطّلب اور حضرت علیؓ بن ابی طالب سہارا دے کر مسجد میں لے گئے جہاں حضرت ابوبکرؓ صدّیق کی امامت میں نمازِ ظہر کے لیے مسلمانوں کی جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی آہٹ پاکر انھوں نے چاہا کہ پیچھے ہٹ جائیں، لیکن اللہ کے نبیؐ نے انھیں اشارے سے روک دیا اور ان کے برابر بیٹھ کر نماز شروع کر دی، اس طرح کہ اب حضرت ابوبکرؓ صدّیق آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی اقتدا کر رہے تھے اور تمام حضرت ابوبکرؓ صدّیق کی اقتدا کر رہے تھے۔ بعد نماز آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) پھر حضرت عائشہؓ صدّیقہ کے حجرے میں واپس آ گئے۔

## ۱۱ ربیع الاوّل ۱۱ھ

طبیعت بہ دستور ناساز رہی۔ نقاہت اس قدر تھی کہ جاں نثار عیادت کو حاضر ہوتے، چند لمحے رُخِ انور کا دیدار کرتے اور جگہ کی تنگی کے خیال سے لوٹ جاتے کہ یہ موقع دوسرے بھی حاصل کر سکیں۔ حضرت فاطمۃ الزہرا تشریف لائیں اور دیر تک بیٹھی رہیں کہ شاید کچھ فرمائیں۔ اس وقت اولاد میں صرف وہی زندہ تھیں۔ باقی تمام اولاد، تین بیٹیاں اور تین فرزند آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات ہی میں وفات پا چکی تھی اور ازواجِ مطہرات میں صرف دو نے وفات پائی تھی (خدیجۃ الکبریٰ اور زینبؓ ہلالیہ) اس دن بڑے اضطراب کا عالم رہا۔ حجرہ تنگ تھا لہٰذا اقربا، احباب کا اور احباب اقربا کا خیال کر کے ہجوم نہ کر سکتے تھے، لیکن ان سب کے دل یہیں دھڑک رہے تھے۔

**وصالِ سرورِ عالم،** ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ (۷ جون ۶۳۲ء)

یہ تمام شب بے آرام گزری۔ صبح قدرے سکون ہوا تو حجرے کا پردہ سرکا کر مسجد میں جھانک کر دیکھا۔ اس وقت نمازِ فجر کے لیے جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) دیر تک دیکھتے رہے۔ رُخ پر اطمینان کے آثار ہویدا تھے۔ صدیوں سے بھٹکا ہوا انسان مالکِ حقیقی کے آگے جھک گیا تھا۔ آنکھوں میں خوشی کا انداز تھا۔ دروازے کے اِدھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جلوہ محسوس کر کے حضرت ابوبکرؓ صدیق سمجھے کہ شاید طبیعت بہتر ہے اور مسجد میں تشریف لانا چاہتے ہیں لہٰذا وہ پیچھے ہٹنے لگے، لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا البتہ دیکھتے رہے۔ بعد فریضۂ فجر مسلمانوں نے خدمت میں حاضری دی اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بے آرامی کے خیال سے جلد لوٹ گئے۔ اس وقت حضرت فاطمۃ الزہرا کو یاد فرمایا جو مع فرزندگان تشریف لائیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انھیں کچھ نصیحتیں فرمائیں۔ اس موقع کے لیے حضرت عائشہؓ صدیقہ سے روایت ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت فاطمہؓ الزہرا سے فرمایا "میں دنیا چھوڑنے والا ہوں۔"

یہ سن کر وہ رونے لگیں۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "اہلِ بیت میں سے تم ہی میرے پاس

سب سے پہلے پہنچنے والی ہو۔"

یہ سن کر حضرت فاطمۃ الزہرا رضؓ قدرے مطمئن ہوئیں، لیکن اس وقت کی یہ جدائی بھی معمولی بات نہ تھی۔ سبھی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمام ازواجِ مطہرات کو ہدایات دیں۔

حضرت انس رضؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آخری وصیت نماز کے بارے میں تھی۔ فرمایا "اَلصَّلٰوۃ اَلصَّلٰوۃ وما ملکت ایمانکم۔"

اس دن طبیعت بار بار بگڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیٹھنے کا منشا ظاہر فرمایا تو اُم المومنین حضرت عائشہ رضؓ صدیقہ نے پشت کی جانب سے سہارا دے کر بٹھایا۔ اب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نیم دراز تھے اور سر مبارک حضرت عائشہ رضؓ صدیقہ کے سینے پر تھا اور پیچھے وہ سہارا دیے ہوئے بیٹھی تھیں۔

رُخِ مبارک زرد اور ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے باوجود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سرہانے رکھے ہوئے پیالے میں ہاتھ ڈبو کر بار بار چہرۂ مبارک پر پھیرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہہ رہے تھے "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور موت میں تلخی تو ضرور ہوتی ہے۔"

اس وقت سبھی نزدیک تر رہنے کے آرزومند تھے۔ حجرے کے باہر بھی صحابۂ کرام رضؓ کا ہجوم تھا۔ ان میں سے اکثر اشکبار تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضؓ بن ابوبکر صدیق خدمت میں پہنچے۔ یہ ابوبکر رضؓ صدیق کے وہی فرزند تھے جو غزوۂ اُحد کے بعد ایمان لائے تھے اور اس ندامت میں نظر نہ اٹھا سکتے تھے۔ اس وقت دل پھٹا جاتا تھا کہ اپنی کوتاہی سے بہت کم وقت حاصل کر سکا۔ وہ قدموں کی جانب آ کر کھڑے ہو گئے۔ اللہ کے نبیؐ نے دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں تازہ مسواک تھی۔ آپؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مسواک کے لیے منشائے مبارک ظاہر کیا تو حضرت عائشہ رضؓ صدیقہ نے ایک مسواک اپنے دانتوں سے نرم کر کے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دی۔ تاریخ سے یہ وضاحت نہیں ملتی کہ مسواک کی یا نہیں کی۔

اُم المومنین حضرت عائشہ رضؓ صدیقہ فرماتی ہیں کہ اُس وقت آپؐ کی زبانِ مبارک پر یہ تھا کہ اللہ سب سے بڑھ کر رفیق ہے۔

۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ چاشت کے وقت روحِ مبارک و مطاہر نے جسدِ اقدس کو چھوڑ کر عالمِ قدس کی راہ لی۔

## عمرِ مبارک

بہ وقتِ وفات عمر مبارک تریسٹھ برس (۶۳ برس) چار یوم تھی۔

## مسلمانوں کی حالتِ غم

مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی کیفیت کیا تھی، وہ خود بھی اندازہ نہ کر سکتے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے تیئس برس (۲۳ برس) کامل صرف اطاعت کی تھی اور حیاتِ مقدس کے ہر لمحے میں ساتھ دیا تھا۔ وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے ابتدا میں انکار کیا اور اس ازالے کے لیے عمر بھر اطاعت کرتے رہے۔ غرض کہ ہر لمحے کے یہ ساتھی آج تنہا رہ گئے تھے۔ ایسے میں شدتِ غم سے کوئی گر گیا، کوئی یہ الم ناک خبر سن کر بیاباں کی طرف بھاگا، کوئی حرکت کرنے کے قابل نہ رہا اور کسی نے تلوار کھینچ لی کہ یہ خبر اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی، یہاں تک کہ اس چھوٹی سی بستی کے اندر ایک کہرام مچ گیا۔ نہ جانے کب تک یہی کیفیت رہتی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی وہاں تشریف لائے اور وصالِ سرورِ عالم کا اعلان کرتے ہوئے بولے "اے لوگو! جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عبادت کرتے تھے سن لیں کہ وہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور جو اللہ واحد لاشریک کی عبادت کرتے تھے سن لیں کہ اللہ کی ذات قائم اور ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ اسے کبھی فنا نہیں اور اس نے فرمایا ہے کہ محمد رسول اللہ تو صرف خدا کے پیغمبر ہیں (ایسے ہی) جیسے ان سے پہلے بہت سے پیغمبر ہو گزرتے رہے۔ بھلا اگر یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) مر جائیں یا مارے جائیں تو کیا تم (دینِ حق سے) اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے (مرتد ہو جاؤ گے) اور جو کوئی الٹے پاؤں پھر جائے تو وہ خدا کا کچھ بھی نقصان نہیں کر سکے گا اور خدا شکر گزاروں کو بڑا ثواب دے گا اور کسی شخص میں طاقت نہیں کہ خدا کے حکم کے بغیر مر جائے اس نے موت کا وقت مقرر کر رکھا ہے"۔

کلامِ ربانی سے جیسے غمزدوں کو ہوش آ گیا اور انھوں نے خود میں اس عظیم غم کو برداشت کرنے کی ہمت پیدا کر لی۔ صدمہ تو بہت تھا لیکن صبر کا حوصلہ آ گیا

تھا۔ وہ زیرِ لب الٰہی آیاتِ ربانی کا ورد کرتے ہوئے آیندہ کے لیے مصروف ہو گئے۔

## غسل اور نمازِ جنازہ

غسل دینے والوں میں حضرت علی رضؓ کا اسم گرامی نمایاں ہے۔ غسل اور کفن کے بعد جسدِ مبارک کو اسی جگہ، یعنی حضرت عائشہ رضؓ صدّیقہ کے حجرے میں رہنے دیا اور نماز کا اہتمام اس طرح کیا گیا کہ پہلے اہلِ بیت (تمام کنبے والوں نے) پھر مہاجرین نے پھر انصار نے، پھر خواتین (مہاجرین وانصار کی) نے اور پھر تمام بچّوں نے نماز ادا کی۔ اس نماز کا کوئی امام نہ تھا بلکہ لوگ دس دس کی تعداد میں حجرۂ مبارک میں جاتے، نماز ادا کرتے اور واپس آجاتے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ حجرۂ مبارک میں اتنی کشادگی نہ تھی کہ تمام جمع ہو سکتے۔

## لحد اور تدفین

قبر حضرت ابو طلحہ رضؓ نے کھودی اور وصال سے بتّیس گھنٹے (۳۲) کے بعد جسدِ مبارک کو حضرت عائشہ رضؓ صدّیقہ کے حجرے کے اندر ہی دفن کر دیا گیا۔

اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون:

# حوالہ و حواشی

اس کتاب کی تیاری میں قرآنِ مجید کی ایک سو چودہ سورتوں کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

انجیلِ مقدس (لوقا کی انجیل)
صحیح بخاری
مسلم
تاریخِ ابنِ ہشام
تاریخِ ابنِ کثیر
تاریخِ طبری
تاریخِ ابنِ خلدون
سیرت النبیؐ
نقشِ سیرتؐ
خطباتِ مدارس
الطارق
رحمت اللعالمین
تفہیم القرآن
عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی

# حصّۂ سُوم

## حاصلِ کلام

# تعلیماتِ اسلام

معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انھیں جانا ہی تھا، کیوں کہ معرضِ وجود میں آنے والی ہر شَے کے لیے فنا ہے۔ بقا اور ہمیشگی صرف ایک ذاتِ واحد کے لیے ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ اس نے انسان کو فکری قولی اور عملی صلاحیتیں ودیعت فرما کر دنیا میں بھیجا اور افعال میں اعتدال کے لیے مسلسل ہدایت کا اہتمام کیا۔ وہ ہدایت جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نکھرتی اور واضح ہوتی گئی، یہاں تک کہ مکمل ہو گئی۔ انبیاءؑ آتے گئے اور اپنا اپنا مقصد پورا کرکے واپس جاتے رہے۔ چند صدیاں گزرتیں تو ایک کی جگہ دوسری ہستی آتی اور رشد و ہدایت کا فرض ادا کرتی۔ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) پر نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہونے والا تھا، اس تعلیم کی تکمیل ہونا تھی جو بنی نوعِ انسان کے لیے طریقۂ حیات تھی، اندازِ زندگی تھی اور جس کی تکمیل و اتمام کا اعلان حجۃ الوداع کے موقع پر ہو چکا تھا اور خود قادرِ مطلق نے فرما دیا تھا: "آج کے دن تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر میری نعمت پوری کر دی گئی۔" (سورۂ مائدہ)

مزید وضاحت کے لیے خود اس کے لانے والے نے فرمایا: "خوب جان لو کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں اور نہ میری امت کے بعد کوئی اور امت ہے۔"

(صحیح بخاری و مسلم باب رسالت)

صرف ایک بار ہی نہیں بلکہ مختلف اوقات میں، مختلف انداز میں اس امر کی تصریح بار بار فرمائی گئی کہ اب کوئی نبی نہیں آئے گا اور جو کوئی ایسا دعویٰ کرے، وہ دجّال اور کذّاب ہوگا یعنی جس طرح سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) آخری نبی ہیں اسی طرح یہ تعلیم بھی انسان کی اصلاح و ہدایت کے لیے آخری تعلیم ہے جس میں کسی قوم اور کسی زمانے کی تخصیص نہیں ہے بلکہ وہ کُل عالَم کے لیے سرچشمۂ ہدایت ہے جیسے عمر بھر کی تفسیر کے ساتھ زمانے کے سامنے پیش کرنے کے بعد آخری خطبے کے بعد فرمایا۔ "تم میں جو حاضر ہیں انھیں چاہیے کہ یہ سب (ہدایات) غائب تک پہنچا دیں۔" (صحیح بخاری)

گویا کہ اس حکم سے ہر مسلمان کو تبلیغ و ہدایت کا ذمّے دار بنا دیا۔

یہی نہیں بلکہ اس تعلیم کے لیے خود خالقِ کائنات نے فرمایا۔ "اے رسولؐ! جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل ہوا ہے (بندوں تک) پہنچا دیجیے اور اگر آپ ایسا نہ کر سکے تو (سمجھیے) آپ نے پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔" (سورۂ مائدہ)

سورۂ مائدہ کی یہ آیات دراصل اسی تعلیم کی طرف اشارہ ہیں جس کی وضاحت قرآن میں جگہ جگہ کی گئی ہے، جو قانونِ الٰہی ہے اور انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی ہے۔ عقائد ہوں یا اعمال، عبادات ہوں یا معاملات، ظاہر ہو یا باطن نجی زندگی ہو یا بیرونی، کیفیاتِ غم ہوں یا حالتِ انبساط، ہر لمحہ یہی رہنمائی کرتا ہے اور اسی پر عمل پیرا ہو کر ہم ایک فرد ہوں یا پوری قوم اپنے معاملات درست رکھ سکتے ہیں۔ یہی تعلیم ہے جس نے بنی نوعِ انسان کی ہر ضرورت کو پورا کیا۔ اس میں وہ تمام ہدایات موجود ہیں جن کی ضرورت دینی اور دنیوی ہر مرحلے میں پیش آتی ہے۔ اگرچہ اس کی وسعت و گہرائی لامحدود ہے لیکن خود قرآنِ پاک نے اسے اس طرح سہل کیا کہ انسانی حیات کے تمام شعبوں کو دو حصّوں میں تقسیم فرما دیا۔ "ایمان اور عمل" اور انھیں بھی ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح منسلک و مربوط کر کے ان کی دوئی کو ختم کر دیا اور آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (سورۂ بقرہ) کہہ کر وضاحت کر دی کہ ایمان کے بغیر عمل قبول نہ کیا جائے گا اور عمل کے بغیر ایمان بے فائدہ ہے بلکہ بعض مقامات پر ایمان کی پہچان ہی صالح عمل بتائی گئی چونکہ ایمان دل کے

نہاں خانے کی پاکیزہ کیفیت کا نام ہے جسے دوسروں کو دکھایا نہیں جاسکتا اور دوسروں پر عیاں کیے بغیر فرضِ تبلیغ ادا نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر اس تذکیرے کے ساتھ عمل کو لازم و ملزوم قرار دے دیا گیا۔ اس وقت ایمان کی پہچان عمل اور کہیں عمل کی عظمت ایمان رکھ دی گئی۔

ارشادِ ربانی ہے "بے شک وہ ایمان والے کامیاب ہوئے جو اپنی نماز میں خضوع و خشوع کرتے ہیں، بیکار باتوں پر دھیان نہیں دیتے، جو زکوٰۃ دیتے ہیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، جو اپنی امانتوں کی حفاظت اور وعدوں کا پاس کرتے ہیں اور اپنی تمام نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔ (سورہ آل عمران)

دوسری جگہ ایمان اور عمل کی تعریف اس طرح کی گئی "نیکی یہی نہیں ہے کہ تم نماز میں اپنا چہرہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو بلکہ اصل نیکی تو ان کی ہے جو خدا پر، قیامت پر، فرشتوں پر، کتاب پر، انبیاءؑ پر ایمان لائے اور دولت کی چاہت کے باوجود (محض خدا کی رضا کے لیے) اپنا مال رشتے داروں، یتیموں، مسافروں، حاجت مندوں اور غلاموں کو آزادی دلانے پر صرف کرتے ہیں۔ جو نماز ادا کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے، اپنے وعدوں کو پورا کرتے، مصیبت کے وقت ثابت قدم رہتے (ہیں)۔ بس یہی لوگ ہیں جو راست باز ہیں اور تقوے والے ہیں۔" (سورۂ بقرہ)

ان آیات سے ایمان اور عمل کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ اسلام میں ایمان سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں اور ایمان کی تکمیل عمل سے ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان تعلیمات کی روشنی میں یہ دونوں شعبے (ایمان اور عملِ صالح) کیا ہیں؟

## ایمان کی تعریف

ایمان کی تعریف یہ ہے کہ خداوندِ عالم کو اس کی تمام تر صفات کے ساتھ واحد و لاشریک مان لینے کے بعد غیب کی تمام حقیقتوں پر قلب کی گہرائیوں سے یقین کرنا، یعنی ملائک، کتابوں، رسولوں، قیامت، تقدیر اور مرنے کے بعد اٹھائے جانے پر! یہ سب غیبی حقیقتیں ہیں۔

## صفاتِ الٰہی

اس ضمن میں خدا کی تمام تر صفات سے مراد ہے کہ اسے کھلی طور پر

محیط و قادر سمجھنا۔ ان صفات کی وضاحت خود قرآن پاک نے اس طرح فرمائی ہے کہ ہر صفت نمایاں ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

۱۔ اللہ سارے جہان کا خالق ہے۔

"وہ ذاتِ پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمھارے فائدے کے لیے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب پھر توجہ فرمائی آسمان کی طرف، سو درست کر کے بنائے سات آسمان اور وہ سب چیزوں کا جاننے والا ہے۔"

(سورۂ بقرہ: ۲۹)

۲۔ اللہ سارے جہان کا مالک ہے۔

"اے اللہ، بادشاہی کے مالک! تُو جسے چاہتا ہے سلطنت عطا کرتا ہے جس سے چاہتا ہے سلطنت چھین لیتا ہے۔ تُو جسے چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ سب خوبی تیرے ہی قبضے میں ہے، بے شک تُو ہی ہر شئے پر قادر ہے۔" (سورہ آلِ عمران)

۳۔ نفع و نقصان اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔

"(وہ اللہ ہی ہے) اگر تمھیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے سوا اسے کوئی ہٹانے والا نہیں۔ اگر وہ تمھیں کوئی بھلائی پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا کوئی نہیں۔ وہ اپنے بندوں میں جسے چاہتا ہے اپنا فضل پہنچاتا ہے۔ وہی بخشنے والا مہربان ہے۔" (سورہ یونس)

۴۔ رزق میں تنگی و فراخی اللہ ہی کے قبضے میں ہے۔

"اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے روزی تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر اور ان کی ضرورتوں کو دیکھنے والا ہے۔" (سورۂ بنی اسرائیل)

۵۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

"(اے لوگو) تمھارا ایک ہی معبود ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بڑا ہی مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔" (سورہ بقرہ)

۶۔ علمِ غیب خدا ہی کو ہے۔

"اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ وہ جو کچھ بھی جنگل اور دریا میں ہے سب کچھ جانتا ہے۔ کوئی پتا بھی نہیں گرتا جو اس کے علم سے باہر ہو اور کوئی دانہ زمین کے تاریک حصوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز ہے (جو اس کے علم سے باہر ہو) اور یہ سب کچھ روشن مثالیں ہیں۔ (سورۂ مائدہ)

۷۔ علم عطا کرنے کی طاقت اسی کو ہے۔

"وہ غائب جاننے والا ہے۔ وہ اپنی غیب کی باتوں سے کسی کو واقف نہیں کرتا، لیکن اپنے محبوب رسولؐ کو (جتنا علم چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے) پھر اس کے آگے اور پیچھے محافظ مقرر کر دیتا ہے۔" (سورۂ مائدہ)

۸۔ اللہ ہی شفا عطا کرتا ہے۔

"(کہہ دے) جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی ہے جو مجھے شفا عطا کرتا ہے۔" (سورۂ بقرہ)

۹۔ اللہ ہی اولاد عطا کر سکتا ہے۔

"بے شک زمین اور آسمانوں میں اللہ ہی کی بادشاہی ہے وہ جسے چاہتا ہے لڑکیاں عطا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے عطا کرتا ہے، یا لڑکے اور لڑکیاں ملا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ بے شک وہ خبردار ہے اور قدرت والا ہے۔" (سورۂ شوریٰ)

۱۰۔ مصیبت میں خدا ہی کام آتا ہے۔

جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹے، بیٹھے اور کھڑے ہمیں پکارتا ہے اور جب ہم اس سے اس تکلیف کو دور کر دیتے ہیں تو اس طرح سے گزر جاتا ہے گویا اس نے کبھی ہمیں دکھ کے وقت پکارا ہی نہ تھا۔" (سورۂ یونس)

۱۱۔ مدد کرنے پر قادر صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔

"اے لوگو! اگر تم پر خدا کا عذاب آئے یا قیامت آ جائے تو کیا تم خدا کے سوا مدد کے لیے کسی اور کو پکارو گے۔ اگر تم سچے ہو تو اسی کو پکارو گے پھر اگر وہ چاہے تو تمھاری اس مصیبت کو دور کر دیتا ہے جس کے لیے تم اسے پکارتے

ہو۔ اور وہ جنھیں تم اللہ کا شریک بناتے ہو، اس وقت انھیں بھول جاتے ہو۔"
(سورۂ انبیاء)

۱۲۔ اللہ ہی دعاؤں کو قبول کرتا ہے۔

"بھلا وہ کون ہے جو بے قرار (مصیبت زدہ) کی دعاؤں کو قبول کرتا اور برائی سے نجات دیتا ہے؟" (سورۂ انعام)

۱۳۔ اللہ ہی ہے جو راہِ راست دکھاتا ہے۔

"اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا ان لوگوں کا جن پر تُو نے انعام فرمایا۔" (سورۃ الحمد)

۱۴۔ اللہ ہی معبودِ برحق اور مالکِ کُل ہے۔

"خدا ہی معبودِ برحق ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ زندہ ہمیشہ رہنے والا۔ اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اس کا ہے۔ (سورۂ بقرہ)

۱۵۔ اللہ ہی منتظمِ اعلیٰ ہے اور غیر فانی ہے، تمام تر اوصاف کا حامل۔

اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی ہے جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ وہ سوتا ہے نہ اسے اونگھ آتی ہے۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے، اس سے بھی واقف ہے۔ اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفت و ادراک میں نہیں آسکتی سوائے اس کے کہ وہ کسی چیز کا علم خود ہی ان کو دینا چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تکلیف دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی بزرگ و برتر ذات ہے۔"
(آیت الکرسی۔ البقرہ)

الغرض کہ خداوندِ عالم خالق و مالک ہے، معبودِ حقیقی ہے اور ساری کی ساری خدائی بلا شرکتِ غیرے اسی کی ہے۔ اس کی کوئی صفت، کوئی قوت کسی کی عطا کردہ نہیں بلکہ اپنی سلطنت میں وہ خود ہی جملہ اختیارات کا مالک اور

مختار ہے۔ اس یقین اور اخلاص کے ساتھ بندہ عمل کرتا ہے تو وہ قابلِ قبول ہے ورنہ تمام عمر بھی عمل کیا جائے اور یہ یقین نہ ہو تو ہر عمل بیکار و بے حقیقت ہے۔ جو لوگ اس یقین سے محروم ہیں یا خداوندِ عالم کی بزرگ و برتر ہستی کو فانی و ناقص قوتوں پر قیاس کر کے شرک کے مرتکب ہوتے ہیں، قرآن نے ان کے اعمال کو سراب سے تشبیہ دی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔ "جو لوگ خدا اور قیامت کو نہیں مانتے ان کے کام ایسے ہیں جیسے میدان میں (دور سے نظر آنے والی) ریت جسے پیاسا پانی سمجھ کر چلتا ہو اور جب وہاں پہنچے تو کچھ نہ پائے۔" (سورۂ نور)

دوسری جگہ ایمان سے محروم لوگوں کے اعمال کو راکھ سے مثال دی گئی ہے اور فرمایا ہے۔ "جنھوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا، ان کے کاموں کی مثال اس راکھ کے مانند ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی (جس کے سبب) وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔" (سورۂ ابراہیمؑ)

خداوندِ عالم پر کامل یقین رکھنا اس کی ہر صفت پر یقین کرنا اور دل سے اسی کی بادشاہی اور حکمرانی تسلیم کرنا ہی ایمان ہے۔ یہ خداوندِ عالم کی چند ایک صفات تھیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ پاک کی ہر ہدایت اس کی کسی نہ کسی صفت کا اظہار ہے۔ باقی جن چیزوں کے تذکرے ہیں، وہ اس کا علم اور مرتبہ نہیں ہو جاتیں بلکہ وہ سب اس کی مخلوقات، مملوک و غلام ہیں جن پر وہ پوری طرح سے قادر ہے۔ خداوندِ عالم کو اس کی تمام تر صفات کے ساتھ مان لینے کے بعد ایمان کی تکمیل کے لیے غیبی حقیقتوں کو مان لینا بھی شرط ہے اور ان غیبی حقیقتوں کا سلسلہ اس طرح ہے۔

## ملائکہ پر ایمان لانا

"سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور فرشتوں کو قاصد بنانے والا ہے جن کے دو دو تین تین اور چار چار شہپر ہیں۔ وہ اپنی مخلوقات میں جو چاہتا ہے بڑھاتا ہے۔ بے شک خدا ہر شے پر قادر ہے۔" (سورۂ فاطر)

سورۂ فاطر کی یہ آیات اسی غیبی مخلوق کے بارے میں ہیں جو اللہ کے

احکام کے مطابق کاروبارِ عالم میں مصروف ہیں۔ وہ بس تعمیلِ حکم کرنے والی مخلوق ہیں جو اطاعت و فرماں برداری کے لیے پیدا کی گئیں۔ قرآنِ پاک میں متعدد مقامات پر ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی خدمت کو واضح کیا گیا ہے اور اس طرح سے ان کی حیثیت کو روشن کیا گیا ہے۔

۱۔ وہ وحی لانے پر مامور ہیں۔

اس کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے "کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے، مگر الہام (کے ذریعہ سے) سے پوشیدہ رہ کر یا کسی فرشتے کے ذریعے سے۔ وہ (فرشتہ) خدا کے حکم سے جو چاہتا ہے القا کرے۔ بے شک وہ عالی مرتبہ اور حکمت والا ہے۔" (سورۂ شوریٰ)

"(اے نبیؐ!) ہم نے اس طرح سے اپنے حکم سے آپ کی جانب روح القدس کے ذریعے قرآن بھیجا۔ اس سے قبل نہ آپؐ کتاب کو جانتے تھے نہ ایمان کو" (سورۂ شوریٰ)

۲۔ فرشتے ہر انسانی عمل پر نگراں ہیں۔

"دو کاتب اس کے دائیں بائیں ہر چیز ثبت کر رہے ہیں۔ کوئی لفظ اس کی زبان سے ایسا نہیں نکلتا جسے محفوظ کر لینے کے لیے یہ حاضر باش موجود نہ ہوں" (سورۂ ق)

۳۔ فرشتے خدا کے سامنے درماندہ و عاجز ہیں۔

"فرشتوں نے عرض کیا۔ بے شک تو پاک ہے۔ ہم کو کوئی علم نہیں، لیکن جو تُو نے ہم کو سکھایا۔ بے شک تُو ہی جاننے والا اور حکمت والا ہے۔" (سورۂ بقرہ)

۵۔ فرشتے خدا کے حکم سے انتظامِ دُنیوی پر مامور ہیں۔

"یاد کرو اس وقت کو جب تمھارا پروردگار فرشتوں کو حکم دے رہا تھا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں پس تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو" (سورۂ انفال)

"روح الامین اور فرشتے ہر کام کے لیے (انتظام کے لیے) اپنے پروردگار کے حکم سے نیچے اترتے ہیں"

۶۔ فرشتے انسانوں کی روح قبض کرتے ہیں۔

"کہہ دیجیے کہ موت کا فرشتہ (جو تمھاری جان لینے کو مقرر ہے) تم پر موت طاری کرے گا۔" (سورۂ سجدہ)

" اگر تم دیکھ سکتے تو دیکھتے۔ جب گناہ گار موت کے سکرات میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوں کہ اپنی جان نکالو۔" (سورۂ انعام)

۷۔ فرشتے خدا کے حکم سے عذاب لاتے ہیں۔

"انھوں نے کہا، اے لوطؑ! ہم تیرے خدا کے بھیجے ہوئے ہیں۔" (سورۂ ہودؑ)

" تو جب ہمارا حکم ہوا تو اس (بستی) کے اوپر کو نیچے کر دیا اور اس پر تہ بہ تہ پتّھروں کی بارش کی۔" (سورۂ ہودؑ)

۸۔ فرشتے جنت میں استقبال کریں گے۔

نیکو کاروں کو اس دن (قیامت) گھبراہٹ نہ ہوگی نہ غم بلکہ فرشتے ان کا آگے بڑھ کر استقبال کریں گے اور کہیں گے، یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔" (سورۂ انبیاءؑ)

" جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار صرف اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے (قیامت کے دن) ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے اتریں گے نہ خوف زدہ ہو نہ غمگین ہو بلکہ اس جنّت کی خوش خبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم ہیں جو تمھاری پہلی اور دوسری زندگی میں رفیق ہیں۔ (سورۂ حٰم)

۹۔ فرشتے جنّت اور دوزخ میں کارندے ہیں۔

"بے شک جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں وہ گروہ در گروہ جنّت میں جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچ جائیں گے تب اس کے دروازے کھولے جائیں گے، اور اس کے پاسبان (فرشتے) کہیں گے، سلامتی ہو تم پر آؤ اور خوشی سے جنّت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔" (سورۂ زمر)

دوسری طرف دوزخ میں بھی فرشتے خدا کے حکم سے کاروبار میں مصروف ہیں جس کے بارے میں ارشاد ہے۔ "اور کفر کرنے والے گروہ در گروہ دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے تب اس

کے دروازے کھولے جائیں گے۔ اور اس کے پاسبان فرشتے کہیں گے کیا تمہارے پاس تمھی میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تمھیں تمھارے خدا کی آیات پڑھ پڑھ کر سناتے اور اس دن کے پیش آنے والے (حالات) سے ڈراتے؟ تب منکرین کہیں گے، کیوں نہیں، لیکن کافروں کے حق میں عذاب کا حکم تحقیق ہو چکا تھا لہٰذا وہ (فرشتے) کہیں گے، دوزخ کے دروازے میں داخل ہو جاؤ، ہمیشہ اس میں رہو گے۔ بے شک تکبّر کرنے والوں کا بُرا ٹھکانا ہے۔" (سورۂ زمر)

۱۰۔ فرشتے تسبیح خداوندی میں مصروف ہیں۔

"اور تم فرشتوں کو دیکھو کہ عرش خداوندی کے ارد گرد احاطہ کیے ہوئے پروردگارِ عالم کی ثناخوانی میں مصروف ہوں گے۔" (سورۂ زمر)

۱۱۔ فرشتے قیامت کے دن بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوں گے۔

"جب زمین ریزہ ریزہ کر دی جائے گی اور تمھارا رب جلوہ فرما ہوگا، اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے اور دوزخ حاضر کی جائے گی۔ تب یہ انسان متنبہ ہوگا، مگر اس دن انتباہ سے فائدہ (نہ مل سکے گا) بلکہ یہ (انسان) کہے گا، کاش میں اس زندگی کے لیے کچھ آگے بھیجتا۔" (سورۂ فجر)

۱۲۔ فرشتے انسان کے لیے بھلائی اور خیر طلب کرتے ہیں۔

"قریب ہے کہ آسمان اوپر سے پھٹ پڑے اور فرشتے اپنے پروردگار کی تسبیح و تعریف کے ساتھ ساتھ جو زمین میں ہیں (ان سب کے لیے) معافی مانگتے رہتے ہیں۔ پس جان لو کہ خدا بخشنے والا مہربان ہے۔ بہ جز ان لوگوں کے جنھوں نے خدا کے سوا دوسرے اور کارساز بنا رکھے ہیں۔" (سورۂ شوریٰ)

"جو فرشتے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے پاس ہیں، وہ سب اپنے پروردگار کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے لیے بخشش کی دعائیں کرتے ہیں۔" سورۂ مومن)

غرض کہ قرآن میں متعدد مقامات پر فرشتوں کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے۔ ایک جانب خدا خود انسان کے ہر فعل سے واقف ہے، کائنات کے گوشے گوشے میں ہونے والے امور پر اس کی نگاہ ہے۔ دوسری جانب ہر

کام کی انجام دہی، اعمالِ نیک و بد پر نگراں، جنّت و دوزخ کے داروغہ اور قیامت کے دن انسانوں کے چھوٹے بڑے، ادنیٰ و اعلیٰ ہر عمل کی گواہی دینے کے لیے فرشتے مقرّر ہیں جو اپنے ارادے اور فیصلے سے کچھ کر ہی نہیں سکتے بلکہ احکامِ خداوندی کے تابع ہیں اور ازل ہی سے ہیں۔ انسان سے پہلے خداوندِ عالم نے اس مخلوق کو پیدا کیا، پھر ہر قوم نے اسے ایک خاص انداز کے ساتھ تسلیم کیا۔ صابئی مذہب کے پیروکاروں نے انھیں ستاروں اور سیاروں کی صورت میں مانا، ہیکل بنائے۔ ان کے حضور قربانیاں کی جاتیں اور حاجتیں مانگی جاتی تھیں۔ پارسیوں نے انھیں ایک غیر فانی قوّت قرار دیا۔ ان میں یزداں اور اہرمن نیکی اور بدی کے دو خدا مانے جاتے۔ باقی لاتعداد فرشتے ان کے تحت تصوّر کیے جاتے جنھیں "امشاسپند" کا نام دیا گیا۔ ہندوؤں نے انھیں باقاعدہ دیوی اور دیویاں تسلیم کیا، یعنی نر اور مادہ بھی تھے۔ وہ انھیں باقاعدہ ایک قوّت سمجھتے اور ان کے مجسّمے بنا کر پرستش کرتے تھے۔ عربوں نے انھیں خدا کی بیٹیاں قرار دیا۔ ان کے مجسّمے بنانا اور پرستش کرنے کا رواج عربوں میں بھی تھا۔ ان اقوام کے علاوہ الہامی مذاہب عیسائیت اور یہودیت جب اپنی اصل تعلیم سے ہٹ گئے تو ان کے ماننے والوں میں بھی فرشتوں کا تصوّر خدائی میں شامل ایک لافانی قوّت بن گیا اور جوں جوں ان مذاہب کی صورت بدلتی گئی بلکہ مسخ ہوتی گئی، ان کے پیروکار فرشتوں کو خدا کے مقابل درجہ عطا کرتے گئے اور کبھی کبھی تو اس قدر عزّت دیتے کہ انھی میں سے کسی کو خدا مان لیتے تھے۔ یہودی ان فرشتوں کو "کروبیم" کہتے اور خاص خاص کے نام الگ الگ بھی لیے جاتے تھے۔ ان کی زبردست تقدیس کی جاتی جو انھیں معبود کے درجے تک لے جاتی۔ عیسائی روح القدس کو خدا کی قوّت کا ایک حصّہ سمجھتے تھے۔ ان میں عقائد کی بنا پر فرشتوں کے تصوّر نے شرک کی صورت اختیار کر لی تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شدّت اختیار کرتی جاتی تھی، یہاں تک کہ کم و بیش ان تمام اقوام میں خدا اور فرشتوں کا فرق مٹ چکا تھا۔ اسی کیفیّت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے وضاحت کی، "اور آسمانوں میں بڑے فرشتے ہیں جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں دیتی، مگر اس وقت کہ خدا جس کے لیے چاہے اجازت بخشے اور سفارش پسند کرے۔"

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ ان کو ان کی کچھ خبر نہیں وہ صرف ظن (شک) پر چلتے ہیں اور ظن یقین کے مقابلے میں کچھ کام نہیں آتا۔" (سورۂ نجم)

اس سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں، اوّل تو یہ کہ خدا کے حضور فرشتوں کو سفارش کی بھی جرأت نہیں جب تک کہ خدا اجازت نہ دے۔ دوسرے یہ کہ فرشتوں کے لیے ایسے خیالات رکھنا شک وظن کے سوا کچھ نہیں۔ غرض کہ اسلام نے تمام غلط عقائد کی اصلاح فرمائی اور کہہ دیا کہ فرشتے ربوبیت اور طاقت کی ہر صفت سے محروم اور خداوندِ عالم کے حضور سراپا مطیع وفرماں بردار ہیں۔ وہ محض ایک مخلوق ہیں، ایسی مخلوق جسے خدا نے خود انسان کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ اب اگر انسان انھیں قوّت گردانتا، ان کی پرستش کرتا ہے، انھیں خدائی اوصاف کے قابل تصور کرتا ہے تو یہ سب محض وہم ہے ورنہ انسان تو خود ہی مخلوقات میں افضل ترین اور اپنی خلقت کی ابتدا ہی سے مسجودِ ملائک ہے۔ انسان سے برتر ہونے کا دعویٰ کرنے اور سجدے سے انکار کرنے والا مردود قرار دے دیا گیا تھا۔ ان واقعات کو قرآن نے پوری طرح سے واضح کر کے انسان کو وہم وشک سے پاک کر دیا اور فرشتوں کی حقیقت بھی آشکار فرما دی کہ یہ نوری مخلوق فرمانروائے کائنات کا حکم بجا لانے کے لیے ہیں نہ کہ اس کی قوت میں شریک ان کی ایک بڑی تعداد ہر لمحہ اور ہر لحظہ خدا کی حمد وثنا میں مصروف ہے۔ ایک جماعت خالق ومخلوق کے درمیان پیغام رسانی کی خدمت پر مامور ہے۔ (وحی لانے کا ذریعہ) ایک جماعت احکامِ خداوندی کے مطابق نظامِ کائنات کو چلانے کی خدمت انجام دے رہی ہے اور بہت سے ایسے بھی ہیں، جو صدیوں سے دربارِ الٰہی سے عطا ہونے والے احکام کا انتظار کر رہے ہیں کہ کب کوئی حکم ملے اور تعمیل کریں۔ ان تمام میں کوئی ایک بھی ارادہ وعمل پر قادر نہیں ہے۔ ان حدود میں رکھ کر ان سب کا زبانی اور قلبی اقرار کرنا از حد ضروری ہے۔

## رسولوں پر ایمان لانا

خلقتِ انسانی کی ابتدا میں ہی مالکِ حقیقی کے واحد ولاشریک ہونے

کی بات پوری طرح سے انسان کے ذہن نشیں کر کے یہ چیز واضع کر دی گئی تھی کہ دنیا دار العمل ہے جہاں تمھیں مسلسل امتحان ایسی کیفیت سے گزرنا ہے، عمل کرنا ہے اور قیام کی مدت مکمل ہونے کے بعد واپس آنا ہے۔ پھر تم اپنے عمل میں کامیاب رہے یا ناکام اس کا فیصلہ مالکِ حقیقی ہی کو کرنا ہے، لیکن زمین کی خلافت عطا فرمانے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ تم خود اپنا راستہ منتخب کر سکو۔ انتخاب نہیں بلکہ تمھیں تو پیروی کرنا ہے، اس راستے کی جو خالق کائنات کا تجویز کردہ ہے، یعنی صراطِ مستقیم! جس کی وضاحت کر دی گئی تھی اور نوعِ انسانی کے اوّلین افراد (آدمؑ و حوّا) کو زمین پر اتارتے وقت انھیں اس راہ پر چلنے اور زمین پر عمل پیرا ہونے کے لیے وہ ہدایات دے دی گئی تھیں جو ان کے لیے قانونِ حیات بھی تھیں، طرزِ زندگی بھی اور ان ہدایات کو بار بار دُہرانے کا وعدہ بھی فرمایا گیا تھا۔ قرآن نے اسی کیفیت کی تصویر اس طرح کھینچی ہے۔ "ہم نے کہا، تم سب یہاں سے (زمین پر) اتر جاؤ۔ پھر جب بھی میری جانب سے کوئی ہدایت تمھارے پاس آئے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔" (سورۂ بقرہ)

یعنی انسان کو توحید کی روشنی میں زمین پر اتارتے اور یہ بتانے کے ساتھ ہی کہ حقیقت کیا ہے اور صحیح راستہ کون سا ہے، یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ اس حقیقت کو بار بار آشکار کیا جاتا رہے گا، یہ پیغام بار بار ملتا رہے گا۔ یہ پیغام تھا، دینِ حق! یہ ہدایت تھی، اسلام! جو انسان کے لیے ایک صحیح اور صالح طریقۂ زندگی تھا چونکہ ساری زمین خدا کی ہے اور انسان جہاں جس انداز میں ہے، اس کی مخلوق ہے۔ اس کی نظر میں سب یکساں و عزیز ہیں، عربی کو عجمی پر، گورے کو کالے پر اور امیر کو غریب پر کوئی فضیلت نہیں، ہاں فضیلت ہے تو اسے جو مالک کے احکام کی پیروی کرے لہٰذا سب کے سامنے ان احکام کو یکساں طور پر پیش کیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا، صرف نوعِ انسانی کے اوّلین افراد آدمؑ اور حوّا کو ہدایت دے دی جاتی تو یہ بات صریحاً خدا کے انصاف کے خلاف تھی اسی لیے اس منصفِ اعلیٰ نے جس سے بڑھ کر کوئی انصاف

نہیں کر سکتا، ہر دور میں ہر قوم کے لیے اس ہدایت و اس تعلیم کا اہتمام کیا۔ قرآن پاک میں ایک جگہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پر اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ "بے شک کوئی قوم بھی ایسی نہیں جہاں کہیں متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔" (سورۂ فاطر)

دوسری جگہ اسی بات کی وضاحت اس طرح کی جاتی ہے۔ "یقیناً ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا۔" (سورۂ روم)

ابتدا میں اولادِ آدمؑ ان ہدایات پر قائم رہی جو آدم علیہ السّلام کو عطا کی گئی تھیں اور آدم علیہ السّلام سے انھیں ملی تھیں۔ عرصۂ دراز تک یہ ایک جماعت اور ایک امّت بنے رہے۔ پھر آدم علیہ السّلام رخصت ہوئے۔ اولادِ آدمؑ پھیلی۔ وہ دور دراز بود و باش اختیار کرتے گئے تو زندگی کے نئے نئے انداز انھیں نئے نئے راستے دکھاتے گئے۔ کچھ ان احکام کو فراموش کر چکے تھے۔ کچھ اپنے حقوق سے زیادہ عزّت و وقار کے طلب گار تھے۔ ایسے میں خرابی کا آغاز ہوا۔ جو جہاں تھا، سرکش و ظلم پر آمادہ تھا اور بھول گیا تھا کہ یہ دارالعمل ہے جہاں سے واپس جا کر ہر عمل کا حساب دینا ہے۔ تب اس پیغام اور اس ہدایت کو دُہرانے کی ضرورت پیش آئی اور انبیائے کرام کو مبعوث کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس پوری کیفیت کو قرآن نے اس طرح سے بیان فرمایا ہے۔ "بے شک ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر قائم تھے۔ (پھر اختلاف رونما ہوئے) پھر اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے انجام سے ڈرانے والے تھے۔ ان کے ساتھ کتابِ برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے، ان کا فیصلہ کیا جا سکے۔ یہ اختلافات انھوں نے کیے جنھیں حقیقت کا علم عطا کیا جا چکا تھا۔ کھلے کھلے احکام آچکے تھے مگر یہ اختلاف انھوں نے ضد اور سرکشی کی بنا پر کیا۔ پھر خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو راہ دکھا دی۔ خدا جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔" (سورۂ بقرہ)

اس طرح دنیا کی خرابی کو دور کرنے اور انسان کو صراطِ مستقیم سے آشنا

کرنے کے لیے انبیاءؑ آتے رہے جن کا مقصد بھٹکے ہوئے انسان کو پھر سے راہِ حق پر لانا تھا اور منتشر لوگوں کو ایک امت بنانا تھا یا اس پیغام کی حفاظت کرنا تھی جو سینہ بہ سینہ چلتا تو محفوظ نہ رہتا۔ علاوہ ازیں انسانی ضروریات میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس دین میں نکھار اور وسعت پیدا کرنا بھی ضروری تھا۔ یہاں تک کہ وہ مکمل ہو جاتا لہٰذا دو چار صدیاں گزرتیں تو خداوندِ عالم کی جانب سے بھلائیوں کی ترغیب، پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کرنے کے لیے انھی میں سے کسی انسان کو مبعوث کیا جاتا۔ کسی ایسے انسان کو جس نے اس قوم میں ایک طویل زندگی گزاری ہو، لیکن کبھی کسی بُرائی میں ملوث نہ رہا ہو، جس کی زبان نے ہمیشہ سچ بولا ہو، حق کہا ہو۔ پھر اس قوم کی ہدایت کے لیے وہی بہترین اصول پیش کیے جاتے جو ان سے پہلی اقوام کے لیے کیے گئے تھے کیوں کہ پیغام بھیجنے والا بھی ایک ہی تھا اور پیغام بھی ایک ہی اور ہر بار اس کا بنیادی اصول بھی ایک ہی ہوتا، یعنی وحدانیت اور صالح عمل کی تلقین! اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشادِ ربانی ہے۔ "ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا اس کو یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ پس تم میری ہی بندگی کرو۔" (سورۂ انبیاءؑ)

اب یہ عقیدہ، وایمان کہ دنیا کی ہر قوم کے لیے ایک ہادی آیا اور توحید کا پیغام لایا، اسلام کا عطا کردہ ہے بلکہ ان سب پر ایمان لانا اسلام کا ایک جزو ہے۔ اسلام سے قبل اپنے وقت میں دنیا کی ہر قوم نے سب کو جھٹلا کر صرف خود کو خاص اور منتخب کردہ قوم تصور کیا۔ قوم یہود صرف اور صرف حضرت موسیٰؑ کو برحق تسلیم کرکے سب سے انکار کرتی ہے۔ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کے سوا سب پر کذب کا الزام لگاتے ہیں۔ اسلام کے وقت تو یہ دونوں جلیل القدر اور آسمانی کتابوں کی حامل قومیں باقاعدہ ایک دوسرے کو جھٹلاتی تھیں اور ایسا کرنا ان کے خیال میں کوئی بُرا نہ تھا۔ دوسرے کو جھٹلا کر وہ پوری طرح سے اپنے ایمان پر قائم رہ سکتی تھیں۔ ان کے علاوہ بھی تمام اقوام کا یہی عقیدہ تھا کہ بس وہی حق پر ہیں اور وہی راہِ راست پر ہیں۔ اس جاہلانہ عقیدے کی اصلاح اسلام نے کی اور وضاحت کر دی کہ روئے زمین کی ہر قوم، ہر آبادی کی اصلاح و ہدایت کے لیے

ایک ہی دین آیا جن کا بھیجنے والا ایک ہی خالق و مالک ہے اور اس کے بھیجے ہوئے تمام انبیاء برحق تھے اور حق لائے لہٰذا ان سب کو مان لینا حق کو مان لینا ہے۔ اس کے ساتھ قرآن نے تمام اقوام کے دوسروں پر لگائے گئے الزامات کی تردید کی۔ یہود حضرت مریم پر تہمت لگاتے تھے۔ حضرت سلیمانؑ کو جادو و عملیات کا موجد و ماہر گردانتے تھے اور حضرت لوطؑ کو بدکار اور بدفعل بتاتے تھے۔ حضرت یوسفؑ کے بارے میں عام خیال یہی تھا کہ وہ زلیخا کے بہکائے میں آگئے تھے اور حضرت عیسیٰؑ کے لیے خود (بعد کی وضع کردہ) انجیل میں بے عملی اور بے دینی کا الزام تھا۔ یہ تمام باتیں دلچسپ قصّوں کی طرح سے دہرائی جاتی تھیں، لیکن قرآن نے پہلے ان تمام جلیل القدر ہستیوں کی الگ الگ براءت کی، پھر جامع و مکمل طور پر ان کا تذکرہ کیا اور واضح الفاظ میں فرمادیا۔ "اے محمدؐ! ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی جس طرح کہ آپ سے پہلے نوحؑ اور ان کے بعد کے پیغمبروں کے پاس بھیجی تھی۔ ہم نے ابراہیمؑ کو، اسمٰعیلؑ کو، اسحٰقؑ کو، یعقوبؑ کو اور ان کے خاندان کو، پھر عیسیٰؑ کو، ایوبؑ کو، یونسؑ کو، ہارونؑ کو اور سلیمانؑ کو وحی بھیجیں اور داؤدؑ کو زبور عطا کی اور ان کے علاوہ دوسرے (بہت سے) رسولوں کو بھیجا جن کا حال ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔ ہم نے موسیٰؑ سے بات کی اور ان رسولوں کو خوش خبری سنانے والا اور تنبیہہ کرنے والا بنا کر بھیجا تاکہ ان رسولوں کے آجانے کے بعد (کسی قوم کے لیے) خدا کے آگے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ بے شک خدا غالب اور حکمت والا ہے۔" (سورۂ نساء)

ان مفصّل آیات کے علاوہ بھی قرآن نے متعدد مقامات پر ان انبیاءؑ کا ذکر کیا ہے، لیکن تمام کے اسمائے گرامی موجود نہیں، نہ ہی ان کی تعداد کی وضاحت کی گئی ہے۔ ہاں ان سب کے لیے مصلحین و صالحین، ہادی، تنبیہہ کرنے والا، خوش خبری سنانے والا وغیرہ وغیرہ کہا گیا ہے۔ غالباً مفصّل نام اور خاندانوں کا ذکر ان انبیاءؑ ہی کا کیا گیا ہے جن سے عرب زیادہ مانوس تھے یا ان انبیاءؑ کے حالات کی وضاحت کی گئی ہے جن کے بارے میں یہود دریافت کرتے اور معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو آزمایا کرتے تھے۔ بہرحال قرآن پاک میں جس قدر انبیاءؑ

کا بھی تذکرہ ہے، ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے اور کسی ایک سے بھی انکار کرنا تمام کو جھٹلانے اور انکار کرنے کے مترادف ہے کیوں کہ رسول کو جھٹلانے کے معنی ہیں، اس پیغام کو رد کرنا جو مالک حقیقی کی جانب سے انسان کو ملا جس میں ایک معبود کا اعلان، صالح زندگی گزارنے کے لیے بہترین ہدایات اور قیامت کے دن حساب کتاب کی خبر، ان تمام سے ہدایت ملنے کے بعد انکار کر دینا، صریحاً حق سے بغاوت کرنا ہے، سرکشی کرنا ہے جو ایمان کی علامت نہیں ہے بلکہ ایمان تو ان سب کو تسلیم کرنا، ان کی جلیل القدر ہستیوں کا اعتراف کرنا، ان کی تعلیمات کو ماننا اور عملی طور پر اس کا ثبوت دینا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی تسلیم کرتے وقت ان سے پہلے کے تمام انبیاءؑ کو مانے بلکہ خود معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "سب نبی برحق تھے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) برحق ہے۔"

(صحیح بخاری، باب التہجد)

غرض کہ اول سے آخر تک تمام پیغمبروں کی حقانیت، راست بازی، پاکیزگی اور صداقت کا اعتراف کیے بغیر کوئی شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہو ہی نہیں سکتا۔

اس کی وضاحت خود خداوندِ عالم نے اس طرح فرما دی ہے "بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے بعض کو نہیں مانیں گے اور اس کا درمیانی کوئی راستہ نکالیں تو حقیقت میں یہی لوگ کافر ہیں۔" (سورۂ نساء)

دوسری جگہ اسی موضوع کو اس طرح فرمایا گیا "اور جس نے خدا کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے رسولوں کا اور قیامت کا انکار کیا وہ سخت گمراہ ہوا۔" (سورۂ نساء)

اس کے بعد کتبِ الٰہی کا نمبر ہے۔

## کتابوں پر ایمان لانا

جس طرح سے خداوندِ عالم کی طرف سے رسولوں کا مبعوث کیا جانا عین تقاضائے فطرت ہے اسی طرح اس کی رہنمائی کے لیے کتابوں کا آنا بھی از بس ضروری ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا "رہنمائی کرنا ہماری ذمے داری ہے" (سورۂ نحل)

لہٰذا انسان کی تعلیم کے لیے کتابیں بھی نازل کی گئیں اور صحیفے بھی جن کا مقصد مخلوق کو صراطِ مستقیم سے آشنا کرنا اور لاتعداد ٹیڑھے راستوں کے ہوتے ہوئے سیدھا راستہ دکھانا تھا۔ ان تمام کتابوں پر ایمان لانے کے مطلب صرف یہی نہیں کہ اسے کتاب مان لیا بلکہ الرَّحْمٰن عَلَّمَ الْقُرْآن (رحمٰن نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے) (سورۂ رحمٰن) کہہ کر جس طرح خداوندِ عالم نے یہ وضاحت فرمائی کہ یہ قرآن کسی مصنف کی تخلیق یا یہ تعلیم کسی انسان کی طبع زاد تعلیم نہیں ہے بلکہ اسے نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے جو رحمٰن ہے اور اس کی دی ہوئی یہ تعلیم انسان کے لیے رحمت ہے۔ قرآن اوّل تا آخر رحمت اور راہِ نجات ہے اور خالق کی اپنی مخلوق پر مہربانی کا بیّن ثبوت ہے۔ استادوں کا مقرر کرنا، کتابوں کا مہیا کرنا سببِ تعلیم و ذریعۂ تعلیم ہی تو ہوتے ہیں جنھیں انسان کے لیے ازل سے مقرر کیا گیا تاکہ وہ سب کچھ جان کر ذی شعور مخلوق ہونے کا پورا پورا حق ادا کرسکے۔ انسان جو کرۂ ارض پر واحد ذی اختیار مخلوق ہے، اسے اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانے کے لیے جس عقل و شعور اور فہم و ادراک کی ضرورت تھی اسی کے لیے اس تعلیم کا انتظام ہوا اور شروع میں چھوٹے چھوٹے صحیفے پھر باقاعدہ کتابیں نازل ہوئیں۔ ان کتابوں کے لیے سب سے پہلے یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ یہ خدائے بزرگ و برتر کی جانب سے ہیں، کسی انسان کا کلام نہیں۔ اس کے بعد اس میں درج تمام صداقتوں و حکمتوں کو دل سے قبول کرنا اور جو کچھ ان میں درج ہے اسے مان لینا ہی ایمان لانا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر ایک مسلمان کے لیے قرآن پر ایمان لانے سے پہلے اس سے قبل نازل ہونے والی تمام کتابوں کی تصدیق کرنا ضروری ہے۔ قرآن میں اہلِ ایمان کی پہچان یہی بتائی گئی ہے "(اے محمدؐ اصحابِ ایمان وہی لوگ ہیں) جو کتاب ہم نے

آپ پر نازل کی اور جو کتابیں آپ سے پہلے کے پیغمبروں پر نازل کیں (یہ لوگ) ان سب پر ایمان لاتے اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔" (سورۂ بقرہ)

سابقہ تمام انبیائے کرام پر نازل ہونے والی کتبِ مقدسہ وحیٔ الٰہی تھیں۔ قرآن پاک میں ان چار الہامی کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، تورات، زبور انجیل اور قرآن پاک۔ ہاں ان کے نزول کے انداز جداگانہ تھے۔ ان چار کتب کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ایک جگہ آخرت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے "اور یہ باتیں گزشتہ صحیفوں میں بھی ہیں اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں موجود ہیں۔" (سورۂ اعلیٰ)

اگر تعلیمات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کتبِ سابقہ کی تصدیق اور آنے والے کی خبر دیتی نظر آتی ہیں۔ خود انجیل نے حضرت موسیٰؑ کی تصدیق کی اور اسلام کی بشارت دی جس کا حوالہ قرآنِ پاک نے دیا اور فرمایا "یاد کرو عیسیٰؑ ابنِ مریم کی وہ بات جو انھوں نے کہی کہ اے بنی اسرائیل! میں تمھاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں جو تصدیق کرتا ہوں اس تورات کی جو مجھ سے قبل آئی اور بشارت دیتا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئیں گے اور ان کا نام احمدؐ ہوگا۔" (سورۂ صف)

بعد کے مسیحی تورات کے احکام کے ماننے کو تیار نہ تھے بلکہ اسلام سے عین قبل یہ عالم تھا کہ ہر قوم صرف اپنی ہی کتاب کو مانتی اور دوسری تمام کتابوں سے انکار کرتی تھی۔ یہودی تورات کے سوا سب کتابوں سے منکر، عیسائی انجیل کے سوا سب کتابوں سے انکاری اور حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں کا تو کہیں ذکر ہی نہ کیا جاتا تھا۔ کسی مقدس کتاب میں بھی ان کا ذکر موجود نہیں ہے۔ محض قرآنِ پاک نے ہی دو مقامات پر ان کی وضاحت اس طرح کی ہے "کیا اسے (خدا کے منکر کو) ان باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰؑ کے صحیفوں اور ابراہیمؑ کے صحیفوں میں بیان کی گئی ہیں۔" (سورۂ نجم)

دوسری جگہ سورۂ اعلیٰ کی وہ آیات جو ابھی درج کی گئی ہیں، یعنی اسلام سے عین قبل ہر قوم دوسری قوم کی کتاب اور دوسری قوم کے نبی سے بڑے

تضحیک آمیز انداز میں انکار کر رہی تھی۔ اس وقت چھ صدیاں گزر گئی تھیں کہ یہودی حضرت مریم پر اتہام لگاتے تھے، حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کو جھٹلاتے تھے۔ مسیحیوں کے پاس اپنی حمایت کے لیے کچھ باقی نہ بچا تھا۔ ان کی تعلیمات ایجاد و اختراع کی نذر ہو چکی تھیں اور دوسروں کی تصدیق کرنے کے لیے وہ خود بھی تیار نہ تھے۔ ہر قوم کا مذہب صرف دوسروں کو جھٹلانے تک محدود تھا بلکہ عیسائیت میں متعدد فرقے بن گئے تھے جو ایک دوسرے کی تذلیل کرتے اور تعلیم کو رد کرتے تھے، جو جتنی بلند آواز سے دوسرے کو جھٹلاتا، وہ اتنا ہی دانا تصور کیا جاتا تھا۔ اسلام سے عین قبل حالات یہ تھے کہ جو لوگ اہلِ کتاب میں سے تھے یا کافروں میں سے باقاعدہ دوسروں کے دین، پیغمبروں اور کتابوں کی تضحیک کرتے تھے۔ ایسی لوگوں کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے: "جن لوگوں نے کتاب کو اور جو پیغام ہم نے اپنے پیغمبروں کو دے کر بھیجا اس کو جھٹلایا وہ عنقریب (دوزخ میں) جائیں گے جب ان کے گلوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی اور وہ کھینچے جائیں گے۔" (سورۂ مومن)

ان تمام حالات کے سدِّباب اور سابقہ تمام کتابوں کے احترام اور پیغمبروں کو ماننے کے لیے باقاعدہ ہدایت کی ضرورت تھی جو قرآن نے پوری کردی اور وضاحت فرمادی کہ اللہ کی جانب سے مختلف وقت، زبانوں اور زمانوں میں نازل شدہ کتابوں کا عقیدہ اور دعوت ایک ہی تھی۔ اس ضمن میں قرآن نے سب سے پہلے جنابِ نوحؑ کا اسمِ گرامی پیش کیا جو آدمِ ثانی تھے اور اوّلین صاحبِ شریعت نبی تھے۔ پھر حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں وضاحت کی گئی جو عربوں کے پیشوا اور انبیاءؑ کے لیے ابوالانبیاءؑ تھے۔ ان کے بعد جنابِ موسیٰؑ اور جنابِ عیسیٰؑ کی تعلیمات کا ذکر کیا گیا ہے جن کی قومیں باقاعدہ ایک دوسرے کی تکفیر کرتی تھیں۔ ان تمام انبیاءؑ کا تذکرہ قرآن نے بہ طور نمونہ کیا ہے جن کے ذریعے قبل از اسلام دنیا کو معروف شریعت بخشی گئی اور جو انبیاءؑ مرسلین کہے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ جہاں اور جب بھی پیغمبر تشریف لائے ان سب کی تعلیمات ایک ہی تھیں، یعنی ان سب نے ایک لاثانی طاقت کو حق قرار دیا،

ایک ہی سچائی پر ایمان لانے کی دعوت دی اور خیر و شر کا معیار ایک ہی بتایا۔ ان سب کے نزدیک اخلاق و تہذیب کے تمام تر اصول ایک ہی پیمانے پر وضع کیے گئے تھے۔ اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے "اس نے تمہارے لیے دین کا وہی راستہ مقرر کیا جس کے اختیار کرنے کا حکم نوحؑ کو دیا تھا، جس کی (اے محمدؐ!) ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی اور جس کا ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا گیا تھا۔ وہ یہ کہ دین کو قائم رکھنا، اس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔ جس چیز کی طرف تم مشرکوں کو بلاتے ہو (وہ چیز) انھیں بڑی دشوار گزرتی ہے۔" (سورۂ شوریٰ)

دوسری جگہ اسی مقصد کا ذکر کرتے اور پھر سابقہ تمام کتابوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا "ہاں سن لو! ہم نے موسیٰؑ کو کتاب (تورات) عنایت کی تاکہ نیکوکاروں پر اپنی نعمت پوری کریں۔ اس میں ہر چیز کا بیان ہے، ہدایت ہے، رحمت ہے تاکہ ان کی امت کے لوگ اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہونے کا یقین کریں اور (اے منکرو!) یہ کتاب بھی ہم نے اتاری ہے، برکت والی سو تم اس کی پیروی کرو۔ خدا سے ڈرو تاکہ تم پر مہربانی کی جائے اور تم یہ نہ کہو کہ ہم سے قبل تو بس دو ہی گروہوں پر کتابیں اتریں اور ہم انھیں پڑھنے سے معذور رہے یا تم یہ نہ کہو کہ اگر ہم پر یہ کتاب نازل ہوتی تو ہم ان لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ سیدھے راستے پر ہوتے۔ سو اب تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے دلیل، ہدایت اور رحمت آگئی۔" (سورۂ انعام)

اب جب کہ یہ بات واضح ہو چکی کہ تمام الہامی کتابوں کی تعلیمات اور مقصد ایک ہی ہے۔ انھیں نازل کرنے والا اور تمام پیغمبروں کو بہ غرض ہدایت بھیجنے والا ایک ہی ہے تو پھر ان میں سے کسی سے انکار کر دینا اور کسی کو مان لینا صریحاً خود سری و خود پسندی کی علامت ہے جس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا ان تمام کتب کو رسالتی و تبلیغی طور پر تسلیم کرنا اور قرآن کے مان لینے سے قبل ان تمام کتب و صحیفوں کو تسلیم کرنا اور دل سے ان کا احترام کرنا ازبس ضروری ہے بلکہ خود اسلام کا ایک جزو ہے۔ ان کتب سماوی

میں وہ بھی شامل ہیں جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے اور وہ صحیفے بھی جن کا تذکرہ ناموں کے ساتھ نہیں محض "صحف" کہہ کر کیا گیا ہے۔

دراصل تمام انبیائے کرام اور تمام الہامی کتابوں پر ایمان لانا ہی گویا اخوتِ انسانی اور بے تعصبی کی سب سے بڑی دلیل اور اسلام کے عالم گیر ہونے کی علامت ہے۔ ایک جانب یہی عقیدہ یعنی "عقیدۂ وحدت ادیان" ایک مالکِ حقیقی کے قائم و دائم ہونے کا اعلان کر کے تمام زمین کو اللہ کی زمین اور تمام مخلوق کو اللہ کی مخلوق ظاہر کرتا ہے تو دوسری جانب ثابت کر دیتا ہے کہ رواداری، بھائی چارے اور باہمی عزت و احترام کی تعلیم اگر کسی نے دی ہے تو محض قرآن نے اور اس کا عملی طور پر ثبوت جس ہستی نے دیا ہے، وہ معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس ہستی ہے لہٰذا اس دین اور اس ہستی کو مان لینے کے لیے یہ بات لازمی ہے کہ ان سے قبل کی تمام الہامی کتابوں کے من جانب اللہ ہونے کا اقرار بھی کیا جائے جس طرح ان سے قبل کے تمام انبیاء کی تصدیق کی گئی۔ جیسا کہ خود قرآن میں فرمایا گیا ہے "اے محمدؐ! ہم نے آپ کی طرف سچائی کے ساتھ یہ کتاب اتاری جو اپنے سے پہلی کتب کی تصدیق کرتی ہے اور اس پر شاہد و حاوی ہے۔" (سورۂ مائدہ)

## یومِ آخر

اس کے بعد اس عظیم دن کا ذکر آتا ہے جس کا تذکرہ بار بار کیا گیا ہے اور جو امتحان کے لیے مقرر ہے لیکن عجیب سی بات ہے اور بڑی ہی غور طلب بھی کہ قرآن میں جو بات سلسلۂ ایمان میں سب سے آخر میں کہی گئی ہے، وہ بات انسان کو زمین پر اتارتے وقت سب سے پہلے گوش گزار کر دی گئی تھی۔ آدمؑ کو دنیا میں بھیجتے وقت پہلے خبر یہی دی گئی تھی۔ وقلنا اھبطوا بعضکم لبعضٍ عدوٌ ولکم فی الارض مستقرٌ ومتاعٌ الیٰ حین (سورۂ بقرہ)

یہ کہنا کہ اب تم یہاں سے اتر جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین پر ٹھہرنا اور وہاں گزر بسر کرنا ہے۔ ایک خاص مدت تک رہنا، پھر اسی مالکِ حقیقی کے حضور لوٹ جانا گویا نسلِ انسانی

کے حق میں اللہ تعالیٰ کا پہلا اور مستقل فرمان ہے۔ اس دن اور اس وقت یعنی لوٹ کر جانے کا تذکرہ مختلف انداز سے بار بار کیا گیا ہے۔ کہیں ارشاد ہوتا ہے "اور ڈرو اس دن سے جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ نہ کسی کی جانب سے سفارش قبول کی جائے گی، نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ مجرموں کو کہیں سے کوئی مدد مل سکے گی۔" (سورۂ بقرہ)

کسی جگہ ان لوگوں کا جو انکار اور اقرار کی درمیانی کیفیت میں مبتلا خودسری پر آمادہ ہوں، ذکر کرتے ہوئے اس دن کی ہیبت کا تذکرہ اس انداز میں کیا گیا ہے۔ "بھلا ایسے لوگوں کی سزا اس کے سوا اور کیا ہوگی کہ دنیا کی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں بھی شدید ترین عذاب کی جانب پھیر دیے جائیں گے۔" (سورۂ بقرہ)

اس دن کی اہمیت اس قدر ہے اور قرآن پاک کی ایک سو چودہ سورتوں میں کم و بیش ایک سو تیرہ مرتبہ یوم آخر اور آخرت کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے کہ اس دن پر ایمان لانا ہی کامیابی کی پہلی علامت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس دن سے مراد کیا ہے؟ کیا انسان مرنے کے فوراً بعد اس دن سے دوچار ہو جاتا ہے؟ نہیں، بالکل نہیں! اس طرح تو ہر فرد کا یوم آخر الگ الگ ہوا جب کہ یہ تو ایک دن ہے، خالق کے رُو بہ رُو تمام مخلوق کے حاضر ہونے کا دن، عمر بھر کے حساب کتاب کا دن، قیامت کا دن، حشر نشر کا دن، فیصلے اور جزا و سزا کا دن۔

یہ دن اپنی جگہ اٹل ہے، لیکن موت کے وقت سے اس عظیم دن کے واقع ہونے تک درمیانی تمام عرصہ جو سینکڑوں بلکہ ہزاروں برسوں پر محیط ہے، وہ بھی آخرت کی زندگی کا ایک حصہ تصور کیا جاتا ہے اور وہ آخرت کی عظیم منزل ہے جسے "عالمِ برزخ" کہتے ہیں۔ پھر قیامت، جزا و سزا، جنّت اور دوزخ اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

## عالمِ برزخ

کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (سورۂ آلِ عمران) کے مصداق ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ آنے جانے کا سلسلہ جاری ہے، فرد ہی نہیں تو میں بھی! ایک نشا

ہوتی ہے، دوسری آجاتی ہے اور نظامِ حیات پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

نہ جانے کب تک یہی سلسلہ جاری رہے گا، یہاں تک کہ بساطِ ہستی الٹ جائے گی۔ ارشادِ ربانی ہے کہ آسمان پھٹ جائے گا۔ زمین ہموار کر دی جائے گی اور جو کچھ بھی زمین کے سینوں میں محفوظ ہے وہ خدا کے حکم سے اسے اگل دے گی۔ (سورۂ انشقاق) یہ اشارہ ان لاکھوں اربوں بلکہ لاتعداد انسانوں کی طرف ہے جو مرنے کے بعد سے قیامت کے بپا ہونے تک اس عظیم دن کا انتظار کر رہے ہیں اور عالمِ برزخ میں ہیں۔

قرآن کی اصطلاح میں آخرت کی زندگی سے صرف قیامت کا خاص دن اور حساب کتاب ہی مراد نہیں ہے بلکہ وہ تمام کیفیات ہیں جو روح پرواز کرنے سے لے کر قبر، سوال و جواب، حشر نشر اور قیامت کے دن فیصلہ ہونے تک انسان پر طاری رہتی ہیں۔ اسی عالم کو عالمِ برزخ اور اس زندگی کو برزخ کی زندگی کہا گیا ہے یعنی امتحان دینے اور نتیجہ معلوم ہونے کی درمیانی کیفیت کے لیے برزخ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ۔ (سورۂ رحمٰن)

یہاں برزخ سے مراد ایک آڑ ہے، پردہ ہے، دو دریاؤں کے درمیان وہ آڑ جو ان دونوں کو ملنے نہیں دیتی۔ دوسری جگہ اسی معنی کو اور طرح سے واضح کیا گیا ہے اور گناہ گاروں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے "یہ لوگ اسی غفلت میں پڑے رہیں گے۔ یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آ جائے گی تو وہ کہے گا کہ اے پروردگار مجھے پھر (دنیا میں) واپس بھیج دے تاکہ میں اس میں جسے چھوڑ آیا ہوں نیک کام کروں۔ ہرگز نہیں بلکہ یہ تو صرف ایک بات ہے جو وہ زبان سے کہہ رہا ہے اور اب تو اس کے پیچھے ایک برزخ ہے جہاں وہ (دوبارہ) اٹھائے جانے کے دن تک رہے گا۔"

غرض کہ مرنے والے کو قیامت تک اس عالم میں رہ کر انتظار کرنا

ہے۔ اس عالمِ برزخ کی کیفیات بندے کے اعمال کے مطابق خوش گوار بھی ہوں گی اور تکلیف دہ بھی۔ حدیث شریف میں ہے: "تم میں جو فرد بھی مرتا ہے، (خواہ جنتی ہو یا دوزخی) اسے صبح و شام اس کی آخری آرام گاہ دکھائی جاتی ہے۔"

پھر اس حدیث کی وضاحت ان آیات سے ہو جاتی ہے جو فرعون کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمائی گئیں۔ ارشادِ ربانی ہے: "اور فرعون کے ساتھی خود بدترین عذاب کے پھیرے میں آ گئے، دوزخ کی آگ کے جس کے سامنے صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں۔ جب قیامت کی گھڑی آئے گی تو حکم دیا جائے گا کہ آلِ فرعون کو شدید عذاب میں داخل کر دو۔" (سورۂ مومن)

گویا ابھی وہ عالمِ برزخ میں ہیں جب صبح و شام ان کا آخری ٹھکانا دکھایا جاتا ہے، یعنی گناہ گاروں کے لیے قدرے کم درجہ کے عذاب کی ابتدا موت کے لمحے سے ہی ہو گئی اور نیکوکاروں کے لیے سکون و راحت کی ابتدا موت کے لمحے سے ہی ہو گئی۔ اس سکون و راحت اور عذاب کی انتہا حساب کتاب کے بعد ہو گی۔ برزخ کی اس زندگی کا تصور جو اسلام نے پیش کیا ہے، ہر قوم، ہر مذہب کے ہر فرد کے لیے ہے، جس طرح ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے اسی طرح قبر اور قبر کی وہ کیفیات جو سانس ٹوٹنے کے وقت سے شروع ہو جاتی ہیں، وہ ہر مذہب، ہر قوم اور ہر فرد کے لیے ہیں۔ بہ الفاظِ دگر جس لمحے انسان پر فنا کی کیفیت طاری ہوتی ہے، وہ لمحہ دنیا کے حساب کے مطابق اس کا آخری لمحہ ہوتا ہے، لیکن آخرت کی زندگی کے حساب سے وہاں اس لمحے اس کی زندگی شروع ہوتی ہے اور اس زندگی کا اختتام قیامت کے دن، یعنی حساب کتاب کے دن پر ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک طالبِ علم امتحان کی تیاری کر کے امتحان دیتا ہے۔ یہ ایک مرحلہ ہے، پھر وہ نتائج کا بے چینی کے ساتھ انتظار کر کے ایک دن اپنی محنت کا یا غفلت کا ثمر پا لیتا ہے، یہ دوسرا مرحلہ ہے اور چونکہ یہاں انسان کی زندگی ایک امتحان ہے، مسلسل عمل ہے لہٰذا ان دو مرحلوں کی کیفیت ہر نفس کے لیے یکساں ہے۔ قرآن نے اس دوسری زندگی کو یعنی عالمِ برزخ ہی کو اوٹ یا آڑ سے تشبیہ

دی ہے۔ دنیا کی اور آخرت کی زندگی کے درمیان ایک اوٹ، آڑ یا پردہ جو ہر ایک کے لیے ہے، یہی نہیں کہ صرف اہلِ قبور ہی اس سے دوچار ہوں گے بلکہ جہاں مُردوں کو دفن نہیں کیا جاتا، نذرِ آتش کیا جاتا ہے یا غرقِ آب وہ بھی سانس کی ڈوری ٹوٹتے ہی عالمِ برزخ میں داخل ہوتے ہیں، جو حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں، درندوں کے حملے کا نشانہ ہو کر ان کی غذا بن جاتے ہیں یا ویرانوں میں پرند جن لاشوں کو اُدھیڑ ڈالتے ہیں، وہ بھی اسی عالم میں داخل کیے جاتے ہیں۔ غرض کہ موت کا مزہ چکھنے والے ہر ذی روح کے ساتھ وہی معاملات پیش آتے ہیں جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے "کہہ دیجیے کہ بے شک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو اس سے دوچار ہونا ہی ہے۔ پھر تم اسی (خدا) کی طرف لوٹ کر جاؤ گے جو حاضر و غائب کا جاننے والا ہے۔ وہی تمھیں تمھارے تمام کرتوت سے آگاہ فرمائے گا۔" (سورۂ جمعہ)

یہ بات ایک جگہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پر بار بار کہی گئی ہے کہ ہم سب خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ (سورۂ بقرہ) یا تم سب کو خدا کے پاس ہی لوٹ کر جانا ہے۔ (سورۂ مائدہ) یہاں ہر نفس ایک مسافر ہے جو مسافر خانے میں محض اپنی گاڑی کے روانہ ہونے کا انتظار کر رہا ہے اور اس کے ساتھ زادِ راہ کے طور پر اس کا عمل ہے اور کچھ بھی نہیں۔ اسی زادِ راہ، اسی عمل کو کسب اور کمائی سے تشبیہہ دی گئی ہے اور اسی کی بنا پر عالمِ برزخ میں اور پھر قیامت کے دن درجے عطا کیے جائیں گے۔ قرآن نے ان دو قسم کے اعمال کرنے والوں کی قسمیں بیان فرمائی ہیں، یعنی موت کے لمحے سے یومِ حساب تک انسانوں پر ان کے عمل کے تحت دو کیفیات طاری ہوں گی۔ آرام و راحت کی اور عذاب کی! ایک جماعت وہ ہو گی جن کی ساتھ معزز مہمانوں ایسا سلوک روا رکھا جائے گا۔ رہنے کے لیے آرام دہ جگہ، سامانِ آرائش اور کھانے کو نعمتیں بخشی جائیں گی، اور دوسرے گروہ کے ساتھ ان کے برعکس مجرموں ایسا سلوک کیا جاتے گا، نہ آرام دہ جگہ نصیب ہو گی نہ عزت و احترام کے انداز اور نہ کھانے پینے کے لیے نعمتیں! جس طرح قتل کے مجرم کو حراست میں

لینے کے وقت سے پھانسی کے تختے تک لے جانے کے درمیانی عرصے میں رکھا جاتا ہے، یہی سلوک گناہ گاروں کے ساتھ عالمِ برزخ میں روا رکھا جائے گا۔ گناہ گاروں کے لیے موت کے لمحے سے بعث بعد الموت کی پہلی کیفیت تک جو کچھ ہوگا قرآن پاک میں اس کی تصویر اس طرح کھینچی گئی ہے "بھلا اس وقت ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کی روح قبض کرنے کے لیے ان کے چہرے اور پشت پر مارے جائیں گے۔ اور کہیں گے یہ سب اس لیے ہے کہ خدا جس چیز سے ناخوش تھا یہ اسی کے پیچھے دوڑے تھے اور چونکہ خدا کی رضا جوئی کو بہتر نہ سمجھتے تھے لہٰذا ان کے تمام تر اعمال برباد کیے جاتے ہیں۔" (سورۂ محمدؐ)

اسی موت کے لمحے کا تذکرہ نیکوکاروں کے لیے بھی کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "بھلا اس وقت ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو پاک اور طیب ہوں گے اور فرشتے ان کی روح قبض کرتے ہوئے کہیں گے سلامٌ علیکم (پھر کہیں گے) جو نیک عمل تم کیا کرتے تھے، اس کے بدلے جنّت میں داخل ہو جاؤ۔" (سورۂ نحل)

غرض کہ میّت کی حالت بیکار پڑے ہوئے وجود ایسی نہیں ہوگی نہ ہی منوں مٹّی کے نیچے وہ گلی سڑی ہڈیوں میں بدل کر رہ جائے گا۔ یہ خیال عام ہے لیکن درست نہیں ہے کیوں کہ قرآن نے موت کے بعد سے دوبارہ جی اٹھنے تک کے حالات پیش کیے ہیں، باقاعدہ رحمت اور لعنت اور عذاب اور ثواب کی وضاحت فرمائی ہے اور عذاب و ثواب کی کیفیّت بے جانوں پر نہیں نہ مردہ ہڈیوں پر طاری ہوتی ہے بلکہ محسوس کرنے والے جسموں پر ہی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ عالمِ روح و نفس کا عالم ہے اور اس کی بہترین مثال خود قرآنِ پاک نے پیش کی ہے اور واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک علاقہ کے لوگ پیغمبروں کو جھٹلاتے تھے باقاعدہ شرک کیا کرتے تھے۔ انھی میں سے ایک شخص نے حق کو پہچان لیا اور تبلیغِ ہدایت دینے لگا۔ قرآن نے اس کی نصیحت و ہدایت کا ذکر اس طرح کیا ہے "اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا، اے میری قوم! پیغمبروں کے پیچھے چلو، ایسوں کی اطاعت کرو جو تم سے کچھ بھی صلہ نہیں مانگتے۔ وہ سیدھے رستے پر ہیں اور بھلا مجھے کیا کہ میں اس معبودِ برحق کی پرستش نہ کروں جس نے

مجھے پیدا کیا اسی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ کیا میں اسے چھوڑ کر دوسروں کو اپنا معبود بنالوں کہ اگر میرا خدا میرے حق میں نقصان کرنا چاہے تو ان کی سفارش مجھے کوئی فائدہ نہ دے سکے، نہ وہ مجھے چھڑا سکیں (اگر میں ایسوں کی عبادت کروں) تو صریحاً گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔ میں تمہارے پروردگار پر ایمان لاتا ہوں، میری بات سن رکھو۔" (سورۂ یٰسین)

یہی تبلیغ کرتے ہوئے یہ نیک نفس شہید ہو گیا۔ تب حکم خداوندی ہوا۔ "کہا گیا جنت میں داخل ہو جا۔ اس وقت وہ بڑی تمنا سے بولا، کوئی میری قوم کو خبر کر دے کہ خداوند عالم نے مجھے بخش دیا اور عزت والوں میں شامل کر دیا۔"
(سورۂ یٰسین)

قوم کو خبر کرنے اور عزت و مرتبے کو محسوس کرنے کی یہ آرزو مُردے کے دل میں تو نہیں آسکتی۔ قرآن کا یہ واقعہ عالم برزخ کی زندگی کی بیّن دلیل ہے۔ اس کے علاوہ شہیدوں کے لیے تو قرآن نے واضح طور پر فرمایا ہے "جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے انھیں مردہ نہ سمجھنا بلکہ خدا کے نزدیک وہ زندہ ہیں اور انھیں باقاعدہ رزق ملتا ہے۔ جو کچھ خدا نے انھیں عطا کیا ہے اس میں وہ خوش ہیں اور جو ابھی ان کے پیچھے سے ان تک نہیں پہنچے ان کی جانب سے بھی خوش ہیں کہ نہ انھیں کچھ خوف ہوگا نہ غم۔ وہ اللہ کے فضل و کرم سے مطمئن و مسرور ہیں۔ اللہ مومنین کے اجر ضائع نہیں کرتا۔ (سورۂ آلِ عمران)

ان تمام مثالوں اور قرآن میں موجودہ متعدد آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "عالمِ برزخ" روحوں کا مسکن اور موت اور قیامت کے درمیان وہ جگہ ہے جہاں سب کو جمع ہونا ہے، یہ یوم آخر کی طرف روانہ ہونے کے بعد انسان کی پہلی منزل ہے اور اسے والیوم الآخر سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ہے جیسے زندگی کا تصور پیدائش کے لمحے سے موت تک محیط ہے" اسی طرح یوم آخر کا تصور موت کے لمحے سے شروع ہو کر حساب کتاب اور فیصلے کے دن تک محیط ہے، گویا کیفیات کی ایک کڑی ہے جسے ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ عالم برزخ کے بعد قیامت کا نمبر ہے۔

# قیامت

نظامِ کائنات ابدی نہیں ہے بلکہ جس طرح اس کی ابتدا ہوئی اسی طرح انتہا بھی لازمی ہے۔ ازل اور ابد تو بس خداوندِ عالم کے لیے ہے ورنہ معرضِ وجود میں آنے والی ہر شئے کے لیے فنا ہے، ہاں موت ایک فرد کا معاملہ ہے اور قیامت کائنات کے درہم برہم ہونے کا۔ اس دن پر ہر مذہب اور ہر قوم کا ایمان ہے۔ توراۃ، زبور اور انجیل میں اسے یومِ عدالت، طویل دن، عظیم دن کہہ کر تصدیق کیا گیا۔ ہندو مت میں بھی اس کا پرلوگ یا پرلے کہہ کر ذکر ہے اور آج سائنس کی جدید تحقیق اس کی پیش گوئی کرتی ہے کہ فضا میں لاتعداد سیارے گردش کر رہے ہیں جن کا مکمل علم ہو جانا تو ناممکن بات ہے لیکن ان کا باہمی ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کرۂ ارض بھی کسی سیارے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے غرض کہ جو اقوام غیبی حقیقتوں کو تسلیم نہیں کرتیں ان میں بھی بساطِ ہستی کے نیست و نابود ہو جانے کا تصور ہی نہیں یقین موجود ہے کیوں کہ یہی فطرت ہے۔ وہ لوگ جو اپنی ہٹ دھرمی کے سبب حق سے انکار کرتے ہیں، فطرت کو انھیں بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خلاقِ عالم نے اس عالم کو اور یہاں کی ہر شئے کو متضاد عناصر و قویٰ سے قائم فرمایا ہے جس کی گواہی خود قرآن نے فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۔ (سورۂ نشرح) کہہ کر دی ہے۔ تنگی کے بعد فراخی، مشکل کے ساتھ آسانی ہی نہیں بلکہ غور کیجیے تو خیر و شر، نیکی اور بدی، صحت اور مرض، قوت اور ضعف، فنا اور بقا، ہر جگہ متضاد قوتیں کارفرما ہیں۔ انسان سے ہٹ کر بھی نباتات و جمادات، موسم اور وقت تک میں یہی تضاد نظر آئے گا۔ صبح و شام، روشنی اندھیرا، سردی گرمی، حرکت اور سکوت، ان سب کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں سے ایک قوت کا زوال شروع ہوتا ہے دوسری عروج پانے لگتی ہے گویا پوری کی پوری ہستی اسی اساس پر قائم ہے۔ انھی متضاد قویٰ کا نام حیات ہے اور اعتدال سے ہٹ جانے، ایک قوت کا دوسری پر غالب آ جانے کا نام فنا ہے ؎

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے، انھی اجزا کا پریشاں ہونا

اسی فطرت کی بدولت حق سے انکار کرنے والے بھی فنا پر یقین کرتے ہیں اور انّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُون (سورۂ معارج) کے مصداق کوئی نفس بھی اس سے محفوظ نہیں۔ ہاں فرق محض اتنا ہے کہ غیبی حقیقتوں سے انکار کر کے قیامت کی تصدیق کرنا ایسا ہی ہے جیسے اندھیرے میں ٹٹول کر راستے کا اندازہ کرنے والے لوگ آگے بڑھتے ہیں، اس کی صحیح وضاحت اور ناموں کے ساتھ اس کے اوصاف صرف قرآن نے بیان کیے ہیں اور اسے سینکڑوں نام دیے ہیں

يوم الدين، يوم القيامة، اليوم الحق، أمر الله، الواقعة، الوعده، النباء العظيم، الصاخة، يوم الحساب، يوم الحسرة، يوم الخروج، يوم الفصل، القارعة، الغاشية، الطامة الكبرى، الحاقة، يوم التناد، يوم الجمع، يوم التلاق، يوم البعث، يوم عصيب، يوم عظيم، يوم عسير، يوم الآزفة، اليوم الآخر، اليوم الموعود، الوقت المعلوم، اليوم الحق، اليوم القيامية، الساعة۔

یہ صرف چند ہیں ورنہ قرآن میں بے شمار نام ہیں جن میں ہر بار قیامت کی نئی صفت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس بارے میں متعدد سوالوں کے جواب ہیں۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں منکرین قیامت کے دن پر، دوبارہ جی اٹھنے پر، حساب کتاب اور جزا اور سزا پر یقین نہ رکھتے تھے اور معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے طنزاً طرح طرح سے سوالات کرتے تھے اور کہتے تھے۔

"قیامت کا دن کب آئے گا؟"

"اجی۔ وہ دن کب آئے گا جس سے آپ ڈراتے ہیں؟"

ان مضحکہ خیز سوالوں کا تذکرہ قرآن نے بھی کیا ہے، مثلاً "کیا ہم دوبارہ واپس لوٹائے جائیں گے۔ کیا جب ہم گلی سڑی ہڈی ہو جائیں گے؟" (سورۂ نازعات)

دوسری جگہ اسی تعجب خیز اور تمسخرانہ سوال کو اس طرح نقل کیا گیا ہے۔ "بھلا ان سڑی گلی ہڈیوں کو کون جلائے گا؟" (سورۂ یٰسین) "کیا جب ہم

ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو ہم نئے بنا کر نئے اٹھائے جائیں گے؟"
(سورۂ بنی اسرائیل)

غرض کہ یہ تمام مسخرانہ سوال منکرین کے انکار اور ہٹ دھرمی کی علامت تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس دنیا کے بعد کوئی دنیا نہیں، جو طاقت کے بل پر جی لے وہی دلیر اور عظیم ہے، اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی کیوں کہ جب تک سانس ہے وہ خود ہی سب کچھ ہے اور جب مر جائے گا تو خاک میں مل کر رہ جائے گا۔ اسی عقیدہ و ایمان کے ساتھ وہ جو کام بھی کرتے محض اپنی ذات کو مطمئن کرنے اور خوش کرنے کے لیے ہوتا۔ اپنی تعریف، اپنی شرافت و نجابت کے قصے اور بہادری کی داستانیں انھیں مسرور کرتیں لہٰذا اپنے جذبے کی تسکین کے لیے وہ ہر ذریعے، ہر انداز سے عزت و مرتبہ، دولت اور شہرت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسلام نے اسی طریقۂ زندگی کی نفی کر کے ایک مالک کے ہونے کا اعلان کیا اور بتایا کہ ہر ذی روح کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے جس کے لیے ایک خاص دن مقرر ہے۔ پھر جس نے جو کیا ہے، وہ دیکھ لے گا۔ معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کے بعد جس عقیدے پر سب سے زیادہ زور دیا وہ یہی تھا۔ اگرچہ اس کے واضح معنی انسان کی عظمت کو مزید آشکار کر دینا تھے کہ یہ انسان، یہ مشتِ خاک بے مقصد اور بیکار پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے ہر لمحے، ہر عمل پر جانچ پڑتال ہو رہی ہے۔ ذرہ برابر نیکی اور ذرہ برابر بدی مالکِ حقیقی کے علم میں ہے جس کا اجر بھی ملے گا اور سزا بھی، لیکن منکرین نے خدا کے اس انصاف کو شروع میں تمسخرانہ انداز میں لیا اور پھر شدت سے اس کی نفی کرنے لگے اور جوں جوں یہ مضمون موثر طریقوں سے نازل ہونے لگا جن کے دلوں میں کجی اور نفاق تھا وہ اپنی خودسری پر جمتے گئے، یہاں تک کہ جب نیکوکاروں کے لیے ابدی مسرتوں اور بہشت کا ذکر ہوتا وہ جب بھی مضحکہ اڑاتے اور جب منکرین کے لیے عذابِ الٰہی اور جہنم کی دہشت کی خبر دی جاتی؛ وہ جب بھی ہنستے۔ وہ آخرت یا قیامت کا یقین کرنے کو تیار ہی نہ تھے اور بجائے کائنات کی حیرت انگیز خلقت پر غور کرنے اور اللہ

کی لاتعداد نشانیوں سے اسے پہچان لینے کی بجائے از راہِ مذاق سوال کرتے تھے۔ انھی تمام سوالوں کے جواب قرآن نے دیے اور یہ واضح کر دینے کے ساتھ کہ قیامت کا انکار لوگ اس لیے نہیں کرتے کہ وہ سمجھ نہیں پاتے بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ دنیاوی خواہشات ان پر غالب آکر انھیں دوسری زندگی کے بارے میں سوچنے نہیں دیتیں۔ اس وضاحت کے ساتھ بار بار بڑے موثر انداز سے منکرین کو اس "خاص دن"، کی خبر دی گئی جس کے معنی محض نصیحت کرنا تھا جیسا کہ خود قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔"ہر متنفس اپنے کسب کے بدلے رہن ہے، دائیں بازو والوں کے سوا جو جنتیوں میں ہوں گے۔ وہاں وہ مجرموں سے دریافت کریں گے، تمھیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟ وہ کہیں گے، ہم نماز پڑھنے والوں میں نہ تھے نہ مسکین کو کھلاتے تھے اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں میں شامل ہو جاتے تھے، روزِ جزا کو جھوٹ قرار دیتے تھے یہاں تک کہ اس یقینی چیز (قیامت) سے سابقہ پیش آگیا۔" (سورۂ قیامت)

ان تمام برائیوں کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ آخرت کا ذکر کرنا ہدایت اور نصیحت ہی تھے جسے منکرین کسی طور بھی قبول کر لینے کے لیے تیار نہ تھے۔ سب کچھ اسی زندگی اور اسی دنیا کو سمجھنے والے آخرت سے بے خوف تھے۔ چنانچہ متعدد مقامات پر اس فیصلے کے دن اور اس کی تمام تر صفات اور کیفیات کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ خداوندِ عالم نے اس نام کی ایک خاص سورت بھی نازل فرمائی۔ یہ سورت القیٰمۃ ہے۔ یہی دن اس کا موضوع ہے اور یہی عنوان جس میں آخرت کا انکار کرنے والوں کو خطاب فرماتے ہوئے ان کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے اور عین اس وقت جب مکّے میں آخرت اور قیامت کے انکار پر زور و شور سے بحث چل رہی تھی اور منکرین از راہِ تذلیل تعجب کا اظہار کر رہے تھے کہ بھلا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خدا خاک میں مل جانے والوں کو دوبارہ کس طرح اٹھائے گا؟ چور چور ہو جانے والے مٹی وجود کو کیسے سمیٹ کر کھڑا کرے گا؟ تب ان عقل و خرد سے بیگانہ لوگوں کو سمجھانے کے لیے انسانی تدبیر اور

بشری کلام بیکار تھا ایسے میں ارشادِ ربانی ہوا "نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں روزِ قیامت کی اور نہیں میں قسم کھاتا ہوں نفسِ لوّامہ کی۔ کیا یہ انسان سمجھتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کے پور پور کو درست کر دینے پر قادر ہیں، لیکن انسان چاہتا یہ ہے کہ آگے بھی بداعمالیاں کرتا رہے۔ سوال کرتا ہے کہ آخر کب آنا ہے قیامت کا دن؟ (تو محمدؐ فرما دیجیے) کہ جب آنکھیں پھٹ جائیں گی (حیرت سے) چاند بے نور ہو جائے گا۔ چاند اور سورج ملا کر ایک کر دیے جائیں گے۔ اس وقت یہی انسان کہے گا کہ کہاں بھاگ کر جاؤں؟ لیکن وہاں کوئی جائے پناہ نہ ہوگی۔ اس دن سب کو پروردگارِ عالم کے سامنے ہی جا کر ٹھہرنا ہوگا۔ اس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتلایا جائے گا بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو جانتا ہے خواہ وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے۔"
(سورۂ قیامت)

اسی موضوع کو قدرے مختلف انداز میں منکرین کے ذہن نشین کراتے ہوئے قادرِ مطلق نے کائنات کے حیرت انگیز قیام اور اپنی قدرت و حکمت کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں یاد دلایا کہ قیامت کا محض ڈراوا نہیں نہ انھیں خوف زدہ کیا جا رہا ہے بلکہ وہ دن تو نوعِ انسانی کے فیصلے کا دن ہے۔ اگر عمل کی باز پرس نہ ہو، حساب کتاب کا کوئی دن نہ ہو تو عمل اور کارخانۂ عمل سب بیکار ہے۔ بھلا جس طالب علم کو نہ امتحان دینا ہو نہ کامیابی کی آس ہو نہ ناکام ہونے کا خوف ہو، وہ مسلسل امتحان کی تیاری کیوں کرے گا؟ لہٰذا اسے جھٹلانے والوں کو اس بار اس طرح مخاطب کیا جاتا ہے "قسم ہے ان (ہواؤں) کی جو مسلسل بھیجی جاتی ہیں پھر طوفانی رفتار سے چلتی ہیں اور (بادلوں کو) اٹھا کر پھیلاتی ہیں پھر ان کو پھاڑ کر الگ الگ کرتی ہیں پھر (دلوں میں خدائے واحد کی) حکمت، پشیمانی یا خوف کے انداز میں یاد دلاتی ہیں (اور خوب جان لو) کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور واقع ہونے والی ہے۔ پھر جب ستارے ماند پڑ جائیں گے، آسمان

ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے گا، پہاڑ (روئی کی طرح) دھنک دیے جائیں گے اور رسولوں کی حاضری کا وقت آجائے گا، اس روز وہ واقع ہو جائے گی۔ (جس کی تم طلب کرتے ہو، یعنی قیامت!) بھلا کس دن کے لیے یہ کام اٹھا رکھا گیا ہے؟ فیصلے کے دن۔ اور تمھیں (اے انسانو!) کیا خبر ہے کہ فیصلے کا دن کیا ہوگا؟ اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے (تم جو آخرت سے انکار کرتے ہو کیا پہلوں کا انجام بھول گئے؟) کیا ہم نے اگلوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر اس کے پیچھے ہم (ان کے) بعد والوں کو چلتا کریں گے اور مجرموں کے ساتھ ہم یہی کیا کرتے ہیں۔ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی۔ کیا ہم نے ایک حقیر پانی سے تمھیں پیدا نہیں کیا اور ایک مقررہ مدت تک اسے محفوظ جگہ ٹھہرائے رکھا۔ تو غور کرو کہ ہم اس پر قادر تھے (تو قیامت اور جزا سزا پر بھی قادر ہیں) بس ہم بہت اچھی قدرت رکھنے والے ہیں اور تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کی۔" (سورۂ قیامت)

یہ وضاحت بار بار کی گئی کہ وہ دن جب آئے گا تو پوری ہولناکیوں کے ساتھ آئے گا، یعنی نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے گا، نہ چاند سورج باقی رہیں گے، نہ پہاڑ اور دریا، بس خالق کے روبرو مخلوق ہوگی، وہ مخلوق جسے زندگی میں قول و عمل، ارادے اور فیصلے کی صلاحیت بخشی گئی تھی۔ اس کے لیے آخرت کا وقوع ناگزیر ہے بلکہ خود انسان کی پیدائش، اس کی زندگی، کمزوری سے قوت کی جانب ترقی اور قوت سے ضعف کی طرف تنزل اسی بات کا متقاضی ہے کہ اس کے لیے ایک دوسری زندگی ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو نہ صرف یہ حکمتِ خداوندی کے خلاف ہے بلکہ انسان کے لیے انصاف کے تقاضوں سے بعید ہے لہٰذا جو لوگ اس حقیقت کو جھٹلا رہے ہیں وہ گویا خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان تیار کر رہے ہیں کیوں کہ وہ نہیں سمجھتے کہ یہ زندگی اور اس کا تمام تر نظام قانونِ طبعی و اخلاقیات کے تابع ہے۔ ان قوانین کی کارفرمائی ہر لحظہ عمل اور مکافاتِ عمل کے سلسلے کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ عمل کی عمر انسان سے طویل ہے۔

انسان پیدائش سے فنا تک کے تمام مرحلوں سے گزر کر مر جاتا ہے لیکن عمل جاری رہتا ہے۔ اخلاقی قانون سے متعلق کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا لہٰذا اس فانی دنیا اور عارضی زندگی میں مکافاتِ عمل کا سلسلہ مکمل نہیں ہو پاتا۔ اسی تکمیل و اتمام کے لیے ایک دوسری زندگی درکار تھی جہاں انسان نیکی اور بدی کا بدل پاسکے۔ اس کا انتظام خالقِ کائنات نے فرما دیا اور اس کے لیے (جزا اور سزا کے لیے) ایک دن مقرر ہے۔ پھر اس سے انکار کر دینے والوں کو بار بار سمجھایا کہ کچھ اور نہیں تو اپنی ہی حقیقت پر غور کر لو، تمہاری ابتدا کیسے ہوئی۔ جو قادرِ مطلق تمھیں کچھ نہ ہونے سے وجود میں لایا، انسان بنایا، دیکھنے سننے، کھانے پینے اور زمین پر رہنے کے قابل بنایا، کیا وہ قادرِ مطلق تمھیں فنا کے بعد پھر سے زندگی نہیں بخش سکتا؟ ضرور وہ جب چاہے ایسا کر سکتا ہے۔ لیکن اِنَّ الانسان لربّہٖ لکنود (سورۂ عادیات) کے مصداق یہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ جانتا ہے لیکن سمجھتا نہیں اور غفلت کا یہ عالم محض کفّار اور مشرکین کے لیے ہی نہیں بلکہ بعض لوگ ایمان لانے کے بعد بھی غافل ہیں جیسا کہ خود قرآن نے گواہی دی: ”تم لوگوں کو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال دیا ہے، یہاں تک کہ اسی کی کوشش کرتے کرتے تم قبر کے کنارے پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں۔ عنقریب تم جان جاؤ گے، پھر ہرگز نہیں، بہت جلد تمھیں معلوم ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ اگر تم یقین کرتے جانتے (تو ایسا نہ کرتے) لیکن اب جان لو کہ تم دوزخ کو دیکھ کر رہو گے۔ بالکل یقین کے ساتھ اسے دیکھو گے۔ اس دن (قیامت کے دن) تم سے ضرور ان تمام نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا (جن کے حصول کے شوق میں تم نے اسے بھلا دیا)“

(سورۂ تکاثر)

قیامت وہ حقیقت ہے جس کا مختلف انداز اور صفتوں کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ہاں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ یہ کب واقع ہو گی، لیکن کیسے واقع ہو گی اور انسان کو کس طرح اس سے دوچار ہونا ہے

مثلاً "جس دن آسمان ابر کے ساتھ پھٹ جائے گا، فرشتے نازل کیے جائیں گے اس دن سچی بادشاہی خدا ہی کی ہوگی۔ وہ دن کافروں پر بہت سخت ہوگا۔" (سورۂ فرقان)

دوسری جگہ اسی دن کی تعریف اس طرح کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ دعا کرتے تھے "(اے میرے پروردگار!) جس دن لوگ اٹھا کھڑے کیے جائیں گے۔ مجھے رسوا نہ کیجیو جس دن نہ مال ہی کام آئے گا نہ اولاد۔" (سورۂ شعراء)

اس "دن" کی ہیبت کیا ہوگی، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "تو جب قیامت کا شور برپا ہوگا اس دن بھائی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا، اپنی ماں اور اپنے باپ سے، اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے۔ ہر شخص اس دن ایک ہی فکر میں ہوگا۔" (سورۂ عبس)

یہی نہیں کہ اس "دن" کی ہیبت سے انسان عذاب سے بچنے کے لیے دوسروں سے بیگانہ ہو جائے گا بلکہ اس کے اپنے عضو اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ "(قیامت کے روز) جس دن ان کی زبانیں ہاتھ اور پاؤں سب ان کے کاموں کی گواہی دیں گے۔ اس دن خدا ان کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔" (سورۂ نور)

غرض کہ قانونِ الٰہی کے مطابق فنائے کامل لازمی ہے۔ جس طرح سے ایک انسان زندگی کے تمام تر مراحل سے گزر کر فنا ہو جاتا ہے، قومیں وجود میں آتی ہیں۔ عروج و زوال کے مختلف دور دیکھتی اور مٹ جاتی ہیں اسی طرح پوری کائنات کے لیے بھی فنا کا ایک "دن" مقرر ہے۔ نہ بشر کو اپنی موت کے وقت کی خبر ہے نہ اقوام کو برباد ہونے کی گھڑی معلوم اور نہ ہی قیامت کے وقت کو واضح کیا گیا ہے، لیکن اس کا آنا یقینی ہے اور اس پر زبانی و قلبی طور پر یقین کرنا، اس کی تصدیق کرنا ایمان کی علامت ہی نہیں بلکہ عین ایمان ہے۔ اس "دن" کے ساتھ ہی جزا اور سزا کا تصور وابستہ ہے بلکہ اس پر ایمان لانے کا حقیقی منشا ہی نیک و

بداعمال کا بدلہ لے۔

## جزا اور سزا

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ مکافاتِ عمل کا سلسلہ جاری ہے چونکہ عمل کی عمر انسان سے زیادہ ہے اور ہر عمل کا بدلہ ضرور ہے لہٰذا دوسری دنیا اور دوسری زندگی کا اہتمام کیا گیا تاکہ ہر انسان اپنے عمل کا بدلہ پاسکے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا۔ ''جو کچھ تم کرتے رہے ہو آج تمھیں اس کا بدلہ دیا جائے گا۔'' (سورۂ جاثیہ)

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کیا نیک و بد کے اعمال کی جزا اور سزا ایک خاص دن ہی انسانوں کو جمع کرکے دی جائے گی؟

نہیں! جزا اور سزا سے وہی ایک دن مراد نہیں جسے بدلہ اور انصاف کا دن کہا گیا ہے بلکہ قرآن کی اصطلاح میں جزا اور سزا کا تصور بڑا ہی عجیب اور عین فطرت کے مطابق ہے۔ آج صدیاں گزر جانے کے بعد علم نفسیات نے یہ تحقیق کی کہ انسان کا مقصد اس سرزمین پر دکھوں سے خود کو بچانا اور خوشی وسکون حاصل کرنا ہے۔ پین اینڈ پلیثر اس کے مدِنظر ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اس کا کوئی عمل غرض وغایت سے پاک نہیں ہے۔ حکماء نے اس کی حقیقت سمجھانے کے لیے متعدد نظریے قائم کیے اور بعد کے آنے والوں نے ان کی نفی کی، لیکن اس حقیقت سے انکار کوئی بھی نہ کر سکا کہ جس طرح بھی ہو اور جیسے بھی انسان خود کو تکالیف سے بچا کر مسرتیں حاصل کرنا چاہتا ہے جس کے لیے اس میں مسلسل تین کیفیات کارفرما ہیں۔ اول یہ کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے پر آتا ہے تو درمیان میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ختم کرکے ہر جائز وناجائز طریقہ اختیار کرنے کو اپنا حق تصور کرتا ہے۔ یہ کیفیت نہ صرف اسے غلط راہوں پر لے جاتی ہے بلکہ چور، ڈاکو، اسمگلر، قاتل اور رہزنی قسم کے مجرم جو جرم بھی کرتے ہیں، اسی کیفیت کے تحت عمل میں آتا ہے۔ یہاں انسان کے مدِنظر محض اپنی ذات اپنا مفاد اور اپنی خوشی ہوتی ہے۔ دوسری کیفیت میں انسان خود اپنی خواہش کا بار بار محاسبہ کرنا ہے۔ بُرائی

کی جانب قدم بڑھاتے اور خواہش کے پیچھے اندھا دھند بھاگتے وقت اسے کوئی اندر سے ٹوکتا ہے۔ تیسری کیفیت وہ ہوتی ہے کہ ہر حالت میں وہ جائز اور ناجائز کا فرق محسوس کر کے صرف جائز ہی پر مطمئن ہوتا ہے اور اس اطمینانِ قلب کے مقابلے میں اسے دنیا کی کوئی شے بھی ہراساں نہیں کر سکتی۔

یہ تین کیفیات دورِ جدید میں علمِ نفسیات کی تحقیق تصور کی جا رہی ہیں اور اس دریافت کا سہرا حکمائے اخلاق کے سر باندھا جاتا ہے، لیکن قرآنِ پاک کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ صدیوں قبل قرآن نے انھی تین کیفیات کا ذکر کرتے ہوئے نفسِ انسانی کی تین قسمیں بیان کیں۔ ان کی تفصیل یوں ہے۔

## i نفسِ امّارہ

یہ نفس یا یہ کیفیت انسان کو خواہشات کی تکمیل اور مقصد کے حصول کے لیے برائی پر آمادہ کرتی ہے یہاں تک کہ انسان ہر جائز و ناجائز طریقہ استعمال کر کے اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے۔ جب یہی نفس یعنی نفسِ امّارہ کام کرتا ہے تو نہ صرف معمولی چور، ڈاکو، مجرم اور قاتل بھی جنم لیتے ہیں کہ اس نفس سے مغلوب ہو کر بڑے بڑے فاتحین تشدد اور ظلم کی بدولت زمانے پر چھاتے چلے گئے انھوں نے حکومت، دولت، شہرت اور عزت سب کچھ پایا اور ان کا مقصد محض اپنی ذات تھا۔

## ii نفسِ لوّامہ

یہ دوسری کیفیت یا نفس کی دوسری قسم ہے جس کے تحت انسان اپنی خواہشات کا خود محاسبہ کرتا ہے یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے اندر یہی وہ زندہ احساس ہے جو اسے برائی اور بھلائی میں فرق بتا کر برائی پر شرمندہ کرتا ہے۔ اسی کی بدولت انسان کے اپنے اندر سے نیکی کی آواز بلند ہوتی ہے۔ اسی نفس کو "ضمیر" کہتے ہیں جس پر توجہ دے کر انسان خود کو برائی سے بچا لیتا ہے۔ اور اسی آواز کو دبا کر کام کرے تو بہ تدریج گناہوں کا عادی ہو جاتا ہے۔ اسی نفس کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے: "قسم ہے اس ذات کی جس نے

انسان کے اعضا کو درست کیا کہ اسی نے انسان کو) بدکاری سے بچنے اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ عطا فرمائی ہے۔ پھر جس نے اپنے نفس کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔" (سورۂ شمس)

پس لوامہ سے مراد، ملامت کرنے، تنبیہہ کرنے والا نفس ہے۔ نفس کی تیسری قسم مطمئنہ ہے۔

(۳) نفسِ مطمئنہ

اس کی موجودگی انسان کو نیکی کی طرف لاتی ہے اور وہ برائیوں کو ترک کر کے ہی طمانیت اور خوشی محسوس کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اطمینانِ قلب اور نفسِ مطمئنہ ایک خالق پر ایمان لانے کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے کیوں کہ اسی کی موجودگی عمل کے مقصد اور غرض و غایت کو اپنی ذات اور اپنے مفاد سے ہٹا کر مالکِ حقیقی کی رضا و خوشنودی سے ملا دیتی ہے پھر نیک عمل کا مقصد نہ نام دری ہوتا ہے نہ اپنی خوشی بلکہ محض رضائے الٰہی ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کے سامنے جنت کی نعمتیں و راحتیں بھی ہیچ نظر آتی ہیں۔

نفسِ انسانی کی یہ تینوں قسمیں بڑی وضاحت طلب ہیں، لیکن اس وقت میرا اصل مقصد "جزا اور سزا" ہے۔ لہٰذا میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ "جزا اور سزا" سے ان تین کیفیات یا نفسِ انسانی کی ان تینوں قسموں کا بڑا گہرا تعلق ہے کیوں کہ ہر عمل کے پسِ پردہ یہی تین نفس کارفرما ہوتے ہیں اور سورۃ القیٰمۃ میں خداوند تعالیٰ نے اسی نفس کی قسم کھائی ہے جو برائیوں پر نادم کرنے والا اور سب سے پہلا محاسبہ کرنے والا ہے۔ اس سورت میں انسان کی بداعمالیوں اور قیامت کی ہول ناکیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

" لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝

(سورۃ القیامۃ)

فکرِ طلب بات ہے کہ جب یومِ حساب کا یقین دلایا جا رہا ہے اس پر خود احتساب کرنے والے نفس کی قسم کھائی جا رہی ہے جو انسان میں ازل سے موجود ہے۔ وہی نفس جس نے آدم علیہ السلام کو ان کی خطا کا احساس دلایا تھا جب

سے اب تک کوئی انسان ایسا پیدا نہیں ہوا جس میں نیکی اور بدی کا احساس نہ رکھا گیا ہو۔ شروع میں یہی احساس، یہی جذبہ اور ضمیر انسان کو اس کی برائی پر شرمندہ کرتا ہے۔ وہ جب بھی گناہ کرتا ہے، اس جذبے اور اس آرزو کو دبا کر کرتا ہے، یہاں تک کہ ضمیر مر جاتا ہے، اس کی آواز دب جاتی ہے۔ معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں داغ کا ایک سیاہ دھبا پڑ جاتا ہے۔ تو اگر اس نے آئندہ کے لیے اجتناب کیا، اپنے گناہ سے توبہ کی تو دل کا یہ سیاہ داغ صاف ہو جاتا ہے اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو دل کا وہی داغ بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے تمام دل پر چھا جاتا ہے۔" (صحیح بخاری)

دوسری جگہ حضرت وابصہ بن معبد کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا "اے وابصہؓ! نیکی اور بدی کے بارے میں اپنے دل سے پوچھا کرو اور اپنے نفس سے سوال کیا کرو۔ سنو! نیکی وہ ہے جس سے دل اور نفس میں طمانیت اور مسرت پیدا ہو اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور نفس کو ادھیڑبن (اَندیشے) میں ڈال دے۔ بے شک لوگ تجھے اس کے کرنے کو جائز ہی کیوں نہ بتائیں۔" (مسند ابنِ حنبل جلد: ۴)

غرض کہ نفسِ لوامہ ہے جو انسان پر نیکی اور بدی کے فرق کو آشکار کرتا رہتا ہے گویا کہ ہر لمحہ ایک رہبر اور رہنما انسان کے ساتھ ہے بلکہ انسان اور حیوان میں صرف "نطق" ہی سے فرق نہیں اصل فرق تو نفسِ لوامہ سے ہی ہے جس کی قسم خود قادرِ مطلق نے کھائی ہے اور جو اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اپنے نیک و بد اعمال کا ذمّے دار یہ انسان خود ہے جو گناہوں کی باتوں پر اپنے محتسب کی آواز کو دبا دیتا ہے۔ اسی لمحے سے جزا اور سزا کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ عمل کی ابتدا کے ساتھ ہی ندامت اور مسرت کی کیفیت گویا کہ ادنیٰ قسم کی جزا اور سزا کی صورت ہے۔ احساسِ گناہ، گناہ کی ایسی سزا ہے جس کا اندازہ خطا وار کے سوا کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح نیکی اور بھلائی کے کاموں پر کرنے والے کے قلب کو جو مسرت اور انبساط محسوس ہوتا ہے اس خوشی کو صرف وہی محسوس کر سکتا ہے۔ اسی کیفیت کو معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس طرح فرمایا۔ ”جب تمھاری نیکی تمھیں خوشی بخشے اور تمھاری بدی تمھیں غمگین کرے تو (سمجھو) تم مومن ہو۔“

یوں نیکی اور بدی کو محسوس کرنا خود انسان کی فطرت ہے۔ اسی کو پین اینڈ پلیژر کہا جاتا ہے یعنی جیسے بھی ممکن ہو پین سے بچنا اور پلیژر حاصل کرنا ہی انسان کا مقصد ہے، لیکن ان انسانوں کا جو دکھ اور سکھ کا سلسلہ صرف اسی زندگی تک محدود سمجھتے ہیں اور سب کچھ یہاں حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔ دراصل ان کی غرض وغایت محض ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ انھی کے لیے ارشادِ ربّانی ہے۔ ”جو دنیا کی زندگی اور اس کی رونق چاہتے ہیں، ہم دنیا ہی میں ان کا حصّہ پورا کر دیتے ہیں اور ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصّہ نہیں، مگر دوزخ۔ (ایسے لوگ جان لیں) اس دنیا میں انھوں نے جو کچھ بنایا، وہ مٹ گیا اور جو انھوں نے کیا وہ برباد ہو گیا۔“ (سورۂ ہودؑ)

اس سے مراد عمل نہیں بلکہ اجر اور صلہ ہے۔ عمل تو جاری ہے اور جاری رہے گا جب تک کسی نہ کسی صورت میں اس کا بدل نہ مل جائے۔ نہ بے انصافی ہی کی جائے گی اور نہ کوئی عمل ضائع کیا جائے گا بلکہ صحیفۂ عالم پر تو انسان کا ہر فعل اور ہر قول ثبت ہو جاتا ہے، گویا ہر حرکت اور ہر آواز ریکارڈ ہو گئی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن نے اس طرح اشارہ کیا ہے ”کیا یہ منکرین یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی سرگوشیاں اور ان کے راز کی باتوں کو نہیں سنتے! کیوں نہیں! بلکہ حق تو یہ ہے کہ ہمارے فرستادے ان کے پاس ان کے اعمال کو لکھتے ہیں۔“ (سورۂ زخرف)

دوسری جگہ انسان کے اعمال کے بارے میں قدرے مختلف انداز سے فرمایا گیا ہے۔ ”اس دن لوگ گروہ در گروہ ہو کر آئیں گے تاکہ انھیں ان کے اعمال دکھائے جائیں تو جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی، وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔“ (سورۂ زلزال)

دوسری جگہ ارشاد ہے ”ہم نے ہر انسان کا نتیجۂ عمل اس کے گلے میں ڈال دیا ہے۔ قیامت کے دن ہم دفتر کر کے نکالیں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے

کا کہ اپنا دفتر پڑھ لے کہ آج تیرا نفس خود ہی محاسب ہو تو کافی ہے "
(سورۃ بنی اسرائیل)

ان آیات ربانی کے یہی معنی ہیں کہ عمل میں آنے والی کوئی حرکت اور زبان سے ادا ہونے والا کوئی لفظ ضائع نہیں ہوتا بلکہ محفوظ کر لیا جاتا ہے تاکہ انسان کو اس کے کیے اور کیے ہوئے کا پورا پورا بدلہ مل جائے جس کے لیے اس دوسری زندگی اور فیصلے کے دن کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ نیک و بد اعمال پر جزا اور سزا کا وہ سلسلہ جس کی ابتدا اسی زندگی سے ہو چکی ہے، تکمیل پا جائے جس طرح یہ سلسلہ پوری حیات پر محیط ہے یعنی زندگی، برزخ اور روز قیامت، جنت اور دوزخ کا فیصلہ اس زمرے میں شامل ہے، اسی طرح جزا اور سزا کا تصور تھوڑے سے فرق کے ساتھ کم و بیش ہر قوم اور ہر مذہب میں پایا جاتا ہے۔ جن انبیاؑ کا تذکرہ قرآن پاک نے اسمائے گرامی کے ساتھ دیا ہے، ان کی تعلیمات کی تصدیق تو خود قرآن ہی سے ہوتی ہے، لیکن جن اقوام کے مذہب اور تعلیمات الہامی نہیں، ان میں بھی نیک و بد اعمال کے حساب اور جزا اور سزا کا یقین موجود ہے۔ ہندوستان میں آواگون اور دوسرے جنم میں اچھے برے قالب میں آنے کا تصور اسی یقین کا نتیجہ ہے، لیکن دیگر مذاہب میں جزا اور سزا کے تصور کو بڑے محدود انداز سے پیش کیا گیا ہے جس سے محض اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ وحدانیت ہی ہر مذہب کا بنیادی اصول ہے۔ اسی طرح جزا اور سزا اور ہر عمل کا حساب بھی ہر مذہب کی بنیاد ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ اسلام نے اسے پوری وضاحت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس سے زیادہ تفصیل اور وضاحت ممکن ہی نہیں۔ جزا اور سزا کا کوئی انداز، کوئی مقصد، کوئی طریقہ اور کوئی سبب ایسا نہیں جس کا ذکر قرآن میں نہ ہو اور جس قدر بھی ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے معنی کی باریکیاں اسی قدر واضح ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے ایک شاہانہ اقتدار کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا " نہایت بزرگ و برتر ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں کائنات کی سلطنت ہے۔ وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ آزما کر دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا

ہے۔" (سورۂ ملک)

یہاں زندگی اور موت کا سلسلہ شروع کرنے کا ذکر کرنے کے معنی یہی ہیں کہ جس طرح ان کے بارے میں بتایا جا رہا ہے وہ بے مقصد نہیں ہیں۔ نہ زندگی ہی بے مقصد و بے معنی ہے اور نہ موت بلکہ جس طرح زندگی ایک امتحان، ایک آزمائش اور ایک مہلت ہے اسی طرح موت اس کا نتیجہ کہ کون بہتر عمل کرنے والا ہے، کون بغاوت کی روش اختیار کرتا ہے، کون اطاعت کی۔ پھر جو جیسے انداز اختیار کرتا جاتا ہے، وہی عمل کرتا اور ویسے ہی اثرات اس کے سامنے آتے ہیں۔ انسان دنیا ہی میں اپنے سعی و عمل کا نتیجہ پاتا ہے اور آخرت میں بھی۔ جس طرح کامیابیوں کا انحصار بہت حد تک انسان کی محنت و صلاحیت پر گردانا جاتا ہے اسی طرح ناکامی بھی غفلت اور لاعلمی کا نتیجہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کی گواہی خود قرآن نے اس طرح دی "ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اسے الٹا پھیر کر پستیوں سے پست کر دیا۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، نیک عمل کرتے رہے۔ ایسے لوگوں کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ پس (اے نبی ﷺ!) اس کے بعد کون ہے جو جزا اور سزا کے مقابلے میں آپ کو جھٹلاتا ہے! کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے!" (سورۂ تین)

صرف یہی نہیں بلکہ قرآن نے جزا اور سزا کی تفصیل کے ساتھ اس کو ماننے اور جھٹلانے والوں کے انجام بھی واضح کر دیے اور بتا دیا کہ اس فیصلے کے دن صرف اعمال و افعال ہی نہیں بلکہ ان کے پیچھے جو جو اغراض و مقاصد، غرض و غایتیں اور نیتیں ہوں گی، انھیں بھی آشکار کر دیا جائے گا اور ظاہر و باطن کی کوئی حرکت، کوئی سوچ چھپی نہ رہے گی۔ فرمایا گیا: "جس روز پوشیدہ اسرار کی جانچ پڑتال ہوگی اس وقت اس انسان کے پاس نہ خود اپنا کوئی زور ہوگا نہ ہی کوئی اس کی مدد کرنے والا ہوگا۔" (سورۂ تین)

یہ وضاحت ایک دو جگہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پر کی گئی کہ انسان کی اصل اس کے عمل سے اور اس کی حیثیت عمل کے بعد کے مقام سے یا عمل کے بدل سے ہے جو لازمی ہے جسے قرآن نے جزا اور سزا سے تعبیر فرمایا ہے اور جو اتنی بڑی حقیقت

ہے جیسے خود انسان اور اس کے نیک و بد اعمال۔

یہ انسان شعور آنے کے وقت سے لے کر موت کے اوّلین لمحے تک عمر بھر ہزاروں لاکھوں کیفیات سے گزرتا اور بچپن، لڑکپن، جوانی، آدھیڑ عمر، بڑھاپا اور بدترین ضعیفی کے کئی دور دیکھتا ہے لیکن اس طویل عرصے میں قدرت کے نظام کے تحت اسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑا گیا بلکہ اسے عمر بھر ہر لمحہ ایک محتسب ایک ساتھی اور قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ ایک دوست پکار پکار کر حق کی طرف بلاتا اور نیکی کی طرف راغب کرتا اور بُرائی پر نادم کرتا رہتا ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں "نفسِ لوّامہ" اور عام زبان میں "ضمیر کی آواز" کہتے ہیں۔ گویا کہ انسان کو اس خرابے میں بھیجنے کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ نے ایک رہنما اور ایک رہبر بھی اس کے ساتھ بھیجا تھا جس کا کام ہی نیک و بد کے فرق کو اس پر واضح کرتے رہنا اور گناہ پر نادم کرنا تھا۔ اوّل تو اس رہنما کو نظر انداز کر دینا ہی بہ ذاتِ خود لائقِ احتساب عمل ہے، مستزاد یہ کہ اس آواز کو دبا کر خود کو گناہوں کا عادی بنا لینا، کیا قابلِ سزا حرکت نہیں ہے؟ یہی نہیں بلکہ ہدایت و رہنمائی کے اس اہتمام کے ساتھ ساتھ انسان کو اصلاح کے اور بھی متعدد مواقع نصیب ہوتے ہیں جنھیں وہ گنوا دیتا ہے۔ توبہ و کفّارے کا موقع بھی بخشا اور فرمایا گیا "جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اچھے کام کیے تو یہی وہ لوگ ہیں جن کی بُرائیوں کو اللہ بھلائیوں میں بدل دے گا اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔" (سورۂ فرقان)

دوسری جگہ گناہ گاروں کو توبہ کی بشارت اس طرح دی گئی "تو جس کسی نے خود پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور اپنے کو سدھارا تو بے شک اللہ اس کی طرف توجّہ فرمائے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔" (سورۂ مائدہ)

گناہوں کے کفّارے کی اجازت کے ساتھ یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ اس کی اجازت کس کے لیے ہے "بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی توبہ ضرور قبول کرتا ہے جو نادانی سے گناہ کر بیٹھتے ہیں، پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ تو یہی ہیں وہ جنھیں اللہ معاف فرماتا ہے۔ اللہ سب جانتا ہے اور

حکمت والا ہے، اور ان کی توبہ (قابلِ قبول) نہیں ہے جو بُرے کام کرتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے کسی کو جب موت آئی تو اس نے کہا کہ اب میں نے توبہ کی، اور نہ اس کی توبہ قابلِ قبول ہے جو کافر ہو کر مریں۔"
(سورۂ نساء)

غرض کہ اس دنیا میں اوّل تو ہر دم ایک تنبیہ کرنے والا ہر انسان کے ساتھ لگا دیا، اصلاح کے لیے مسلسل انبیاءؑ بھی بھیجے گئے جو برائی کے انجام سے ڈراتے رہے اور پھر مہربانی کی یہ انتہا بھی کی گئی کہ اگر گناہ سرزد ہو جائے تو توبہ کر کے اس کا ازالہ کر دیا جائے۔ جسے مالکِ حقیقی قبول فرمائے گا اور اس نظام واہتمام کے ساتھ ساتھ انسان کے ہر عمل کو محفوظ کر لینے کا انتظام بھی ہے تاکہ حساب کتاب اور جزا وسزا میں پورا پورا عدل کیا جا سکے۔ اس وقت بھی مہربانیوں کی انتہا ہے کہ حساب کتاب کے وقت بھی پہلا حساب انسان سے اس کی جوانی کا لیا جائے گا کیوں کہ بچپن بے خبری کا اور ضعیفی بے بسی کا دَور ہوتا ہے، لیکن یہ جوانی ہی کی عمر ہوتی ہے جب طاقت اور شعور دونوں جمع ہوتے ہیں۔ اسی عمر میں انسان بہترین عمل کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ اسلام میں ایمان اور عملِ صالح کی سب سے بڑی اہمیت ہے۔ انھی الفاظ میں دونوں جہاں کا سرمایہ سمٹ آیا ہے، لیکن ان لفظوں کی تعریف اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے راست بازی اور حوصلے کی ضرورت ہے، ضبطِ نفس اور ثابت قدمی کی ضرورت ہے۔

ایمان کے ساتھ عمل پیرا ہونا کتنا مشکل ہے اس کی گواہی خود قرآن نے دی، فرمایا: "ہم تم کو کسی قدر خوف، بھوک، مال وجان اور پیداوار کے نقصان سے آزمائیں گے اور ثابت قدم رہنے والوں کو (اے نبیؐ!) خوش خبری سنا دیجیے! وہ جنھیں کوئی مشکل پیش آتی ہے تو کہتے ہیں ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر پروردگار کی شاباشیں اور مہربانیاں ہیں۔ یہی راہِ حق پر ہیں۔" (سورۂ بقرہ)

ان مصائب کو سہنے کے لیے شعور اور طاقت کی ضرورت ہے۔

یہی نکتہ ہے جو جوانی کے دَور کو اہم ترین گردانا جاتا ہے۔ یہی عمر ہے جب ایک جوان اپنی قوم کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ وہ خود سوچ بھی سکتا ہے، فیصلہ بھی کر سکتا ہے اور زمانے سے ٹکرا کر اپنی بات منوا بھی سکتا ہے عام انسانوں سے ہٹ کر بھی دیکھا جائے تو نبوت کی مشکلات کے لیے بھی خداوندِ عالم نے باشعور ہی عمر کا انتخاب فرمایا کسی ضعیف پر نبوت نہیں اتری بلکہ چار کے علاوہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ پر تیس سے چالیس برس تک کے عرصے میں یہ فرض سونپا گیا کیوں کہ اسی عمر میں فکر و عمل کی تمام صلاحیتیں عروج پر ہوتی ہیں لہٰذا فطرت کا تقاضا ہے کہ اس حصۂ زندگی کو ایمان و عمل کے تمام تر معاملات کے لیے اہم گردانا جائے۔ اب جب کہ یہ دَور اس قدر مکمل ہے تو لازمی طور پر اس کا امتحان بھی اتنا ہی مکمل ہونا چاہیے، سو ہو گا۔ اس دن جزآء مِن ربّک عطآء حسابا کے مطابق نہ کمی ہو گی نہ زیادتی بلکہ انسان کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے گا۔ اس دن وہ ایک عدالت ہو گی۔ خداوندِ عالم خود منصفِ اعلیٰ ہو گا اور انسان کے ساتھ ہر عدالتی کارروائی پوری کی جائے گی۔ اس دن نہ صرف یہ کہ اعمال نامہ سامنے ہو گا بلکہ خود اس کے عضو تمام نیک و بد اعمال کی گواہی دیں گے۔ انسان کو یہ گِلہ نہیں ہو گا کہ فلاں نے میری شکایت کر دی، میرے خلاف سازش کر کے مجھے پھنسوا دیا کسی کی جھولی میں کسی کا جرم نہیں ڈالا جائے گا بلکہ وہی اعضائے جسمانی جنھیں وہ عمر بھر اپنا مددگار و معاون بنائے پھرتا رہا، اس کی گواہی دیں گے۔ وہی چہرہ جو عمر بھر اس کی پہچان بنا رہتا ہے اور جسم کے وہ تمام حصے جنھیں وہ اپنی طاقت گردانتا رہا ہے، وہی سب خداوندِ عالم کے حضور اس کے اعمال کی شہادت دیں گے اور وہ جھٹلا نہ سکے گا۔

یہ سب کیسے اور کس طرح ہو گا؟ اس کا جواب خود قرآنِ پاک میں موجود ہے۔ ارشاد ہوا "اے گناہ گارو! آج نیکوکاروں سے علیحدہ ہو کر پہچان میں آ جاؤ۔ آج ہم ان کے مُنہ پر مہر لگا دیں گے۔ اس دن ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے۔ ان کے پیر ان کے کرتوت کی گواہی دیں گے۔" (سورۂ یٰسین)

دوسری جگہ فرمایا گیا "اس دن گناہ گار اپنی پیشانی سے پہچان

لیے جائیں گے۔" (سورۂ قیامت)

گویا نیک و بد اعمال انسان کے چہرے سے ظاہر ہوں گے، لیکن خداوندِ عالم کی لامحدود قوت ہے یہ بات بھی بعید نہیں ہے کہ وہ ہر عضو کو گویائی عطا فرما دے اور انسان سے نطق کی طاقت چھین لے۔ بہر کیف صورتِ حال جو بھی ہو گی، اس غیبی حقیقت کی حقیقت تو خدا ہی کے علم میں ہے لیکن جزا اور سزا جو عقیدہ و مذہب کی روح اور مقصدِ اصل ہے، اس دن (یوم قیامت) محض عارضی نہیں ہوگی بلکہ ابدی ہوگی۔ انعام کی سعادت بھی اور گناہوں کی سزا بھی دائمی ہوگی۔ جزا اور سزا کی یہی آخری صورت ہے جسے جنت اور دوزخ کہا گیا ہے۔ یہی اس کی آخری منزل ہے۔

## جنّت اور دوزخ

انسان سفر کرتا ہے تو کہیں نہ کہیں اس کی منزل ضرور ہوتی ہے، کوئی نہ کوئی مقصدِ سفر ضرور ہوتا ہے۔ عام زندگی میں بھی یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ منزل کا تعین اور سفر کی مکمل تیاری کرنے والے راہ کی صعوبتوں سے محفوظ رہ کر اپنی منزل پا لیتے ہیں لیکن اندھا دھند دوڑنے اور کسی مقصد کے بغیر غلط راہوں پر چل پڑنے والے گم راہی اور ناکامی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انجام کار لوٹ کر آنا تو ممکن ہوتا ہی نہیں، وہ منزل بھی نہیں پا سکتے بلکہ بھٹک جاتے ہیں۔ پس یہی کیفیت سفرِ زیست کی ہے۔ یہاں صحیح اور غلط راستے کا نقشہ خود ہدایت کی صورت میں انسان کو سمجھایا گیا۔ رہبر و رہنما بھی، عقلِ سلیم اور نفسِ لوّامہ کی شکل میں قدم قدم پر ساتھ ہے۔ انبیاءؑ اور کتبِ الٰہی ہر دور میں اصلاح و ہدایت کے لیے آتے رہے اور ان سب کے علاوہ توبہ و کفارے کے انداز میں گناہوں کے ازالے کا موقع بھی عطا فرمایا گیا۔ اتنی مہربانیاں ہونے کے باوجود بھی اگر من مانی کرنے والے صراطِ مستقیم کا تعین نہ کر سکیں یا حق کو جھٹلاتے رہیں تو ایسے لوگوں کی منزل کیا ہونا چاہیے! ہدایتوں کے اتنے ذرائع ہونے کے بعد بھلا وہ کون سا ذریعہ ہے جو سرکشوں کو راہِ حق پر لے آئے گا؟ کوئی نہیں۔

یہی لوگ ہیں جن کے لیے قرآن نے فرمایا ہے۔ "(دوزخ) دراصل

ایک گھاٹ ہے، سرکشوں کا ٹھکانا ہے جہاں وہ مدّتوں پڑے رہیں گے۔"

(سورۂ انبیاء)

اگرچہ اس موقع پر "مدّتوں" کا لفظ استعمال کرنا بھی گویا کبھی نہ کبھی عفو و درگزر کا اعلان کر دینا ہے لیکن عمر بھر کی غفلت اور حق کو پوری طرح نظر انداز کر کے سرکشی کرنے والوں کے سفر کا اختتام بھی وہی ہونا چاہیے جو سفر ہو بلکہ اہلِ دوزخ کے لیے یہ خدا کا بہت بڑا کرم ہے کہ اس کے سزا اور سزا کا قانون نیکی اور بدی کے معاملے میں قطعاً مختلف ہے۔ یعنی "جو شخص نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے اس سے بہتر صلہ موجود ہے اور جو بُرائی لائے گا انھیں بدلہ بھی اسی طرح کا ملے گا جیسے انھوں نے کام کیے۔" (سورۂ قصص)

اس سے بڑی مہربانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ نیکوکاروں کو نیک عمل کے بدل کے سوا مزید انعام کا وعدہ ہے، لیکن گناہ گاروں کے لیے مزید عذاب کی خبر نہیں دی گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ مقصدِ الٰہی کسی پر ظلم کرنا نہیں بلکہ زندگی اور زندگی کے بعد کا ہر نظام ایک خاص اندازے کے مطابق ہے اور جنّت کا تصور تو خلقتِ انسانی سے بہت پہلے سے ہے جہاں دنیا میں بھیجنے سے قبل، آدمؑ کو رکھا گیا تھا اور آیندہ کے لیے وعدہ فرمایا گیا تھا۔ غرض کہ جنّت، انسان کے سفرِ زیست کی ابتدا بھی ہے، انتہا بھی اور آخری منزل و دائمی ٹھکانا بھی اور عمر بھر کے اعمالِ صالح کا انعام بھی۔ قرآن پاک میں جنّت اور دوزخ کا تذکرہ بار بار کیا گیا ہے۔ کہیں محض ذکر ہے، کہیں مومنین اور منکرین کے اعمال بیان کرتے ہوئے ان کے انجام کی وضاحت، کہیں جنّت کے بیش بہا عیش اور دوزخ کی ہولناکیاں۔ ہر جگہ، ہر مقام پر ان دو ابدی ٹھکانوں کا تذکرہ علیحدہ علیحدہ کیا گیا ہے۔ ان کے متعدد نام ہیں لہٰذا اس وقت ان کا الگ الگ ذکر کرنا ہی مناسب ہے۔

**جنّت:** دائمی راحت و آرام کا گھر جس کے لاتعداد اوصاف بیان فرمائے گئے اور اس کے مکینوں کے بیش بہا خصوصیات و کیفیات قرآن میں موجود ہیں۔

جنّت الخلد: "بقائے دوام کا وہ چمنستان جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا جو ان کے عمل کا صلہ ہوگا اور واپسی کی جگہ"۔ (سورۂ فرقان)

جنّت النعیم: "اے نبیؐ نیکوکاروں کو خوش خبری سنا دیجیے کہ ان کے لیے وہ باغ ہیں (جنت النعیم) جن میں کبھی نہ تمام ہونے والی راحتیں ہیں جس میں یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔" (سورۂ توبہ)

جنّتِ عالیہ: "کچھ چہرے اس دن بارونق ہوں گے، اپنی کارگزاری پر مسرور ہوں گے اور جنّتِ عالیہ میں ہوں گے جہاں کوئی بےہودہ بات نہیں سنیں گے۔" (سورۂ غاشیہ)

جنّت الماوی: "ایک مرتبہ پھر اس کے سورۂ منتہیٰ کے پاس اسے دیکھا جہاں پاس ہی جنت الماوی ہے۔" (سورۂ غاشیہ)

دارالاخرہ: "آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین پر اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ ہی فساد کرنا چاہتے ہیں اور بے شک انجام کی بھلائی تو متقیوں کے لیے ہے۔" (سورۂ قصص)

دارالسلام: "یہ راستہ تمھارے رب کا سیدھا راستہ ہے۔ اس کے نشانات ان لوگوں کے لیے واضح کر دیے گئے جو نصیحت قبول کرتے ہیں ان کے لیے ان کے رب کے پاس سلامتی کا گھر اور وہ ان کا سرپرست ہے، اس صحیح طرزِ عمل کی بدولت جو انھوں نے اختیار کیا۔" (سورۂ انعام)

علاوہ ازیں جنّت الفردوس، جنّتِ عدن، دارالمقام اور متعدد نام سب انھی معنوں کو آشکار کرتے ہیں کہ وہاں کی ہر نعمت و ہر لذت غیر فانی ہے۔ انسان فطرتاً راحت و آرام اور امن و سلامتی کا متلاشی ہے جس کے لیے عمر بھر ہر حربہ استعمال کرتا ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ زندگی میں بھی اور اس زندگی کے بعد ابد تک راحتیں و نعمتیں اور امن و سکون محض اس زندگی میں ہے جس کی شریعتِ محمدیؐ نے دعوت دی ہے۔ ایمان و عمل کا امتزاج، یہی اندازِ زیست ہر دو جہان میں باعثِ نجات و باعثِ آرام ہے۔ اس کی

گواہی ایک دو جگہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پر قرآن نے دی ہے۔ "جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے ہم انھیں باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی۔" (سورۂ مائدہ)

دوسری جگہ اہلِ جنت کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا۔ "تم کبھی نہ پاؤ گے، جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت رکھتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کی خواہ وہ اس کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے، بھائی ہوں یا اہلِ خاندان۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا اور انھیں اپنی جانب سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی۔ وہ انھیں ایسی جنتوں میں داخل (کرے گا) جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی وہ اللہ سے۔ وہ اللہ کی جماعت کے لوگ ہیں۔ خوب جان لو، اللہ کی جماعت والے ہی فلاح پائیں گے۔" (سورۃ المجادلہ)

پھر راہِ راست پر چلنے اور دائمی نجات حاصل کرنے کے لیے اعمال کی وضاحت اس طرح فرمائی گئی۔ "انھیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے بالکل یکسو ہو کر نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہی نہایت صحیح اور درست ترین دین ہے۔" (سورۂ بیّنات)

درست اور صحیح دین سے مراد صرف خدا کی عبادت کرنا ہے جس کے بغیر احکام کی بجا آوری کرنا اور عمر بھر عمل کرنا سب بے سود ہے کیوں کہ تمام عیبوں اور برائیوں کی جڑ بدعقیدگی ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے انّ اللہ لا یغفر ان یشرک بہ کہا۔ (سورۂ نساء)

شرک کرنے والوں کے لیے معاف نہ کیے جانے کا اعلان فرما دیا، گویا جنت جو امن و سلامتی و پاکیزگی و حسن کا گھر ہے وہاں گندگی کا داخلہ ممکن نہ ہوگا اور شرک سب سے بڑی گندگی ہے۔ یہ قہرِ الٰہی نہیں

بلکہ فطری قانون ہے کہ پرہیزگار لوگ ہی مقامِ امن میں ہوں گے۔ جنت تو حُسن و نور کا مقام ہے، وہاں نہ تاریکی ہوگی نہ غلاظت بلکہ وہ پرہیزگاروں کا آخری ٹھکانا ہوگی جہاں ان کے گرد روشنی کے ہالے ہوں گے اور عمر بھر صالح عمل کرنے والے اس دن عیش کریں گے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "آج جنتی لوگ مزہ کرنے میں مشغول ہوں گے، وہ اور ان کی بیویاں گھنے سائے میں مسندوں پر تکیے لگائے ہوں گے۔ ہر قسم کی لذیذ چیزیں ان کے کھانے پینے کے لیے موجود ہوں گی۔ وہ جو کچھ طلب کریں گے ان کے لیے حاضر ہوگا اور ربِ کریم کی طرف سے ان کے لیے سلام ہے۔" (سورۂ یٰسین)

جنت اور اہلِ جنت کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے تفصیلاً فرمایا گیا کہ وہ کن لوگوں کے لیے ہے! وہاں کا رہنا سہنا اہلِ جنت کے لباس و انداز، وہاں کی شراب کی کیفیت، خدمت گار لڑکے اور حسین حوریں اور ان گنت نعمتیں! غرض کہ اہلِ ایمان کا یہ آخری ٹھکانا گویا ایک عظیم الشان سلطنت ہوگی جہاں وہ عیش کریں گے۔ یہ تفصیل اس قدر ہے کہ اس کی وضاحت کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ یہ سب نعمتیں، ابدی راحتیں اس جہانِ فانی میں کیے گئے اعمال کا بدل ہوں گی اور ان تمام راحتوں اور نعمتوں کی انتہا خوشنودیٔ الٰہی اور دیدارِ الٰہی پر ہوگی۔ حدیث شریف میں ہے کہ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلم نے جنت اور اہلِ جنت کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا "خداوند تعالیٰ اہلِ جنت کو پکار کر کہے گا کہ اے اہلِ جنت! وہ جواب دیں گے۔ "پروردگارِ عالم! ہم حاضر ہیں اور سب بھلائیاں تیرے پاس ہیں۔" اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جنت کی نعمتیں پا کر تم خوش ہو؟ وہ عرض کریں گے "کیوں نہیں! اے ہمارے رب! آپ نے ہمیں وہ نعمتیں عطا کی ہیں جو کسی کو نہیں دیں۔" اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا ان تمام نعمتوں سے بڑھ کر جو کچھ ہے وہ تمھیں نہ دے دوں! وہ عرض کریں گے "پروردگار! بھلا اس سے بڑھ کر اور خوشی کیا ہوگی؟" ارشادِ ربانی ہوگا کہ وہ یہ کہ میں اپنی رضامندی

اور خوشی بھی تم پر اتار دوں۔ آج کے بعد میں کبھی بھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔" (صحیح بخاری، صفاتِ جنت)

جنّتیوں کے لیے رضائے الٰہی کی خوشی سب سے بڑھ کر ہوگی اور اس سے بڑھ کر جو چیز انھیں مسرور کرے گی وہ دیدارِ الٰہی ہوگا بلکہ اہلِ جنّت کے لیے یہ آخری نعمت ہوگی کہ وہ دیدار کریں گے، مسرّتوں اور خوشی سے بے قابو ہوں گے۔

ارشاد ہوتا ہے: "کتنے ہی چہرے اس دن تر و تازہ اور اپنے پروردگار کی سمت دیکھ رہے ہوں گے۔" (سورۂ قیامت)

جنّت اور اہلِ جنّت کے اوصاف کے ساتھ ساتھ گناہ گاروں کے لیے بھی مژدہ ہے: "اور جنھوں نے بُرے کام کیے پھر اس کے بعد باز آئے (توبہ کر لی) اور یقین کر لیا تو بے شک تیرا پروردگار اس کے بعد بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" (سورۂ اعراف)

گویا گناہ و معصیت دونوں دنیاوی آلودگیاں ہیں جن میں اتفاقاً کوئی ملوّث ہو جائے اور پھر خود کو پاک کر لے تو پاکیزہ مقام کا مستحق بن سکتا ہے اور اگر غیر اختیاری بُرائیوں کا شکار ہیں تو ان کے دیگر اچھے اعمال کے سبب خدا خود ہی ان بُرائیوں سے انھیں پاک کر دے گا جیسا کہ اس نے وعدہ فرمایا ہے۔

اہلِ جنّت کا حال بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ان کے دلوں میں جو ایک دوسرے کے لیے کدورتیں ہوں گی ہم انھیں نکال دیں گے۔ ان کے (محلوں) کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہ کہیں گے، سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا۔ اگر وہ ہماری رہنمائی نہ کرتا تو ہم کبھی (راہِ حق) نہ پا سکتے۔ بے شک ہمارے رب کے بھیجے ہوئے رسول واقعی حق لے کر آئے تھے۔ اس وقت ندا آئے گی کہ یہ جنّت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو تمھیں ان اعمال کے بدلے میں عطا کی گئی جو تم کرتے تھے۔" (سورۂ اعراف)

غرض کہ اس پاک و صاف جگہ میں نہ کدورتیں ہوں گی نہ یا ہمی حسد و رشک۔ نہ امراض ہوں گے نہ آزار بلکہ دکھوں اور غموں سے پاک کر کے اور چھوٹے گناہوں کو بخش کر یا ان کی سزا دینے کے بعد انھیں ہر غم اور دکھ سے بے نیاز کر کے ابدی راحت عطا کی جائے گی جس کے چھن جانے کا غم بھی نہ ہو گا اور یہ تصور بہ ذاتِ خود بہت بڑی راحت ہو گا۔ اب آخری ٹھکانوں میں دوسرا ٹھکانا دوزخ ہے۔

**دوزخ:** "اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے جس پر نہایت تند خو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انھیں دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں۔ (اس وقت جب وہ عذاب سے گھبرائیں گے تب کہا جائے گا) اے کافرو! آج معذرتیں پیش مت کرو۔ تمھیں اسی کا بدلہ دیا جار ہا ہے جو تم عمل کرتے تھے۔" (سورۂ تحریم)

دوزخ کے بارے میں یہ خبر دیتے وقت دو نکتے بیان کیے گئے۔

اوّل یہ کہ اس عذاب سے خود کو اور اپنے اہل و عیال کو بچانے کی کوشش کرو۔ اس کے واضح معنی یہی ہیں کہ انسان اس زندگی میں اپنے نیک و بد اعمال کا بہت حد تک خود ذمّے دار ہے۔ اگر خداوندِ عالم اسے مجبور کر دیتا تو یہ ہدایت کیوں کرتا کہ خود کو اس عذاب سے بچاؤ۔ جو جو چیزیں خدا تعالیٰ نے مقدّر فرما دی ہیں، یعنی مفلسی، بیماری اور موت، ان کے لیے کہیں یہ حکم نہیں دیا گیا کہ خود اور اہل و عیال کو ان سے بچاؤ، گویا عذابِ جہنّم خدا نے مقدّر نہیں فرمایا بلکہ ان گناہوں پر سزا رکھی گئی ہے جو بہت حد تک خودِ انسان کے اختیار میں ہیں اور جن سے دوسروں کو روکنا بھی اس کی ذمّے داری ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جو تم عمل کرتے تھے آج وہی بدل دیا جار ہا ہے۔ جس طرح صالح عمل کا بدل جنّت کی صورت میں ہے، اسی طرح گناہوں، شرک اور کفر کا بدلہ دوزخ ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ اس سوال کا واضح جواب بھی خود قرآن ہی نے دیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔ "اور تم کیا جانو کہ کیا چیز ہے وہ دوزخ! (وہ آگ جو) نہ باقی رہنے دے گی اور نہ چھوڑے گی، کھال جھلس دینے والی۔ اس پر انیس کارکن مقرر ہیں۔ ہم نے دوزخ کے یہ کارکن فرشتے بنائے ہیں اور ان کی تعداد کو کافروں کے لیے فتنہ بنا دیا۔" (سورۂ مدثر)

دوزخ مشرکین و منکرین کا آخری ٹھکانا ہوگا اور انھی لوگوں کے لیے ہوگا جو جان بوجھ کر ہدایت سے منہ موڑ کر اور حق کو جھٹلانے والے ہیں جنھوں نے چند یوم کی عارضی زندگی اور یہاں کے عیش و آرام ہی کو سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ دائمی راحتوں کے لیے معمولی سی عارضی تکلیف بھی برداشت نہ کر سکے۔ بھلا اسے دائمی راحت کیوں بخشی جائے گی! اتفاقاً گناہ اور خطا کی حیثیت دوسری ہے جس کے بعد توبہ کی اجازت اور بخشش کی خبر دی گئی ہے لیکن جس خالق نے پیدا کیا، انسان بنا کر عزت و وقار بخشا، جس کی دولت اور زمین پر جس کی پیداوار کی نعمتوں سے انسان عمر بھر فیض اٹھائے، جس کی دی ہوئی زندگی پر عیش کرتا رہے اور عطا کردہ رزق سے اپنے تن کی پرورش کرے، اسی کو واحد و لاشریک تسلیم کرنے سے انکار کر کے دوسروں کو معبود گردانتا پھرے تو بھلا اس خطا کی سزا کیا ہونا چاہیے! یہی نا کہ جس قادرِ مطلق کی بیش بہا نعمتوں سے عیش کر کے اسے جھٹلایا ہے، اس کے عذاب کا بھی مزہ چکھے۔ چنانچہ فرمایا گیا: "یہ عربی زبان کا قرآن، ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہے، لیکن ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے ہیں۔ کہتے ہیں جس چیز کی جانب تم ہمیں بلاتے ہو اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ ہمارے کان بہرے ہو گئے اور ہمارے اور تمھارے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا۔ اب تم اپنا کام کیے جاؤ ہم اپنا کام کیے جائیں گے۔ (سورۂ حٰم)

ان آیاتِ مبارکہ میں حق سے اظہار کرنے اور اپنی ضد پر اڑ جانے والوں کا ذکر کیا گیا ہے جو آنکھیں کان رکھتے ہوئے بھی معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلاتے تھے اور قرآنِ پاک کو ان کی تصنیف بتاتے تھے، گویا ایک بے مقصد

کی مخالفت اور ہٹ دھرمی کا عالم تھا۔ راہِ ہدایت پر لانے کی ہر کوشش آزمانے کے بعد پچھلی اقوام کے تذکرے سے انھیں عبرت دلائی گئی، ان کے انجام اور قیامت کی حشر سامانیوں سے ڈرایا گیا، لیکن ان عاقبت نااندیشوں کے پاس دعوتِ حق کا مسلسل ایک ہی جواب تھا اور وہ جواب تھا، انکار! تب ایسے لوگوں کے لیے دوزخ کی خبر دیتے ہوئے فرمایا گیا: "اور ذرا اس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف لے جانے کے لیے گھیر کر لائے جائیں گے۔ ان کے اگلوں کو پچھلوں کے آنے تک روک کر رکھا جائے گا۔ پھر جب وہ سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہے۔ تب وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ وہ کہیں گے، ہمیں اسی خدا نے گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے۔ اسی نے تمھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اب تم اسی کی طرف واپس لائے جا رہے ہو۔"
(سورۂ حٰم)

قرآن پاک میں اہلِ دوزخ کی ذلت و رسوائی کے عذاب سہنے کی بڑی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے جو محض حق کو جھٹلانے والوں کے لیے ہے۔ وہ غیبی حقیقتیں جو بتائی جاتی تھیں ان سے انکار کر کے من مانی کرنا، سرکشی کرنا، عمر بھر کا یہی عمل انھیں قعرِ مذلت تک لے جاتا ہے جس کے بعد وہ قولی و عملی طور پر اس دائمی راحت اور سکون کے قابل نہیں رہتے جس کے وارث بنائے گئے تھے بلکہ غلط راہ اختیار کرنے کی بدولت منزل سے بھٹک جاتے ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خسارے میں پڑ جاتے ہیں، یہاں تک کہ وقت گزر جاتا ہے اور وہ گھڑی آ جاتی ہے جس کے بعد صالح عمل اور حمایتِ حق کی کوئی آرزو قبول نہیں ہوتی۔ اسی موقع کے لیے ارشاد کیا گیا اور اہلِ دوزخ کی تمناؤں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا: "کاش تم دیکھو وہ وقت جب مجرم سر جھکائے اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے۔ (کہہ رہے ہوں گے کہ) اے ہمارے رب! ہم نے خوب دیکھ لیا، سن لیا، اب ہمیں دوبارہ دنیا میں واپس بھیج دے تا کہ ہم نیک عمل کریں۔ ہمیں آج

یقین آگیا۔ (کہ آخرت کا وعدہ صحیح تھا)" (سورۂ سجدہ)

وہ قبولیت کا وقت نہیں بلکہ حساب کتاب اور فیصلے کا وقت ہو گا اور یہی اللہ تعالیٰ کی مستقل سنت ہے کہ وہ اصلاح و ہدایت قبول کرنے کے پورے پورے مواقع عطا فرماتا ہے، اپنی لامحدود نشانیاں ظاہر فرما کر عقلِ سلیم سے پہچان لینے کی مہلت دیتا ہے، نیکی اور بدی کے فرق کو بار بار نمایاں کرکے نیکی کی دعوت دیتا ہے لیکن جو شخص ہر موقع پر اندھا بنا رہنا پسند کرتا ہو بار بار ہٹ دھرمی اور سرکشی کا مظاہرہ کرتا ہے اس کے کرتوت کے سبب ایک نہ ایک دن اس کی پکڑ سخت کی جاتی ہے۔

دوسری جگہ اہلِ دوزخ کی بابت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

"اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ بڑے ہی برے کرتوت ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھانپ رکھا ہے جس کی آڑ لے کر وہ اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ اس پر ان کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔ (اس دن) اللہ کے عذاب سے بچانے کے لیے نہ ان کے مال کچھ کام آئیں گے نہ ان کی اولاد۔ وہ جس دوزخ کے یار ہیں اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا، وہ اس کے سامنے بھی (اپنی بدعملیوں کو جھٹلانے کے لیے) اسی طرح قسمیں کھائیں گے جیسے تمھارے سامنے کھاتے ہیں (انھیں حق سے روکنے کے لیے) ایسا کرتے ہوئے وہ سمجھیں گے کہ ان کا کچھ کام بن جائے گا۔ خوب جان لو وہ پرلے درجے کے جھوٹے ہیں۔ شیطان ان پر مسلط ہو چکا ہے۔ اس نے انھیں خدا کی یاد سے غافل کر دیا۔ وہ شیطان کی جماعت کے لوگ ہیں اور خوب جان لو کہ شیطان کے ساتھی ہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔" (سورۂ مجادلہ)

شیطان کی جماعت اور شیطان کے ساتھیوں سے مراد وہی لوگ ہیں جو حق کو جھٹلاتے اور من مانی کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو بار بار متنبہ کرکے دوزخ کو ان کا ٹھکانا بتایا گیا۔ اب اگر وہ اس انجام سے اور اس کے بدترین عذاب سے خود کو بچانے کے لیے اپنی روش بدل کر حق کی طرف

آجائیں تو ٹھیک ہے، اللہ بخشنے والا مہربان ہے ورنہ تو اللہ نے کافروں اور مشرکوں پر لعنت فرمائی ہے۔ اس کے بعد ایک بھڑکتی ہوئی آگ ہے جہاں وہ صرف پچھتا سکیں گے اور کہیں گے "اے کاش ہم نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی ہوتی اور کہیں گے، اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی۔ انھوں نے ہی ہمیں راہِ راست سے بے راہ کر دیا اور اے رب! انھیں دُہرا عذاب دے ان پر سخت لعنت کر۔" (سورۂ احزاب)

غرض کہ جنت کی بے بہا نعمتوں اور دوزخ کی ہولناکیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انسان کو بار بار صالح عمل کی ہدایت کرکے غلط روش سے روکنا، ہر بُرائی کا استیصال کر کے معاشرے کا نظام خدائی شریعت پر قائم کرنا اور ایک دن ہر ادنیٰ و اعلیٰ عمل کا حساب لینے کا یقین دلانے کے معنی ہیں کہ انسان دنیا میں اپنی حقیقت و حیثیت کو پہچان لے اور جان جائے کہ نہ اس کی پیدائش بے مقصد ہے، نہ زندگی کھیل تماشا اور نہ موت بے معنی بلکہ قرآنِ پاک کی رُو سے اللہ تعالیٰ نے دیگر مخلوقات کی مخالفت کے باوجود پہلے اس انسان کو ارضی خلافت عطا کی۔ اسے عقلِ سلیم ایسی نعمت سے نواز کر ان سب پر برتری بخشی۔ چونکہ یہ جملہ نعمتیں انسان نے مالکِ حقیقی سے طلب نہیں کی تھیں نہ وہ ان سے واقف تھا بلکہ وہ سب خدا کی عطا کردہ تھیں لہٰذا دیتے وقت یہ وضاحت کر دی گئی کہ ان سب اختیارات کے استعمال پر اسے ایک دن اسی مالکِ حقیقی کو جواب دینا ہے۔ ان کے عمر بھر کے اعمال کو جانچا پرکھا جائے گا۔ اس کے بعد انھیں انعام پانے والوں اور معتوب ہونے والوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ جنھوں نے اپنی قوت و اختیارات کو رضائے الٰہی کے مطابق استعمال کیا، ان کے لیے ابدی راحتیں ہیں ورنہ مستحق سزا ہوں گے۔ اب اگر کوئی اس دائمی راحت و عیش و آرام سے انکار کرتا ہے جو ابھی صرف تصوراتی ہے تو یہ وہی لوگ ہیں جن کا تخیل اپنے قد سے اونچا نہیں جا سکتا اور یقین سے ان کا دل خالی ہے لہٰذا ان حقیقتوں سے منکر ہیں۔ ایسے لوگ جو غیب پر نہیں صرف ظاہر پر ایمان

رکھتے ہیں، ذرا کرۂ ارض کے حسن پر نظر ڈال لیں اور دیکھیں کہ یہ سب چیزیں کس بات کی نشان دہی کرتی ہیں! یہ زمین و آسمان اور اس کے درمیان کی تمام چیزیں کس بات کی علامت ہیں! یہی ناکہ یہ سب خلاقِ عالم کی کارفرمائی ہے جس کے علم کو یہ انسان کبھی بھی نہیں پہنچ سکتا۔ شب و روز تمام اشیا کا مشاہدہ کرنے کے باوجود وہ غور و فکر کا عادی نہیں ہے ورنہ جنّت کی حقیقت پر یقین کرنے کے لیے کیا یہی بات کافی نہیں ہے کہ اب تک جن جن سیاروں اور اجرامِ فلکی کے جغرافیائی حالات انسان کے علم میں آچکے ہیں ان میں کرۂ ارض ہی وہ واحد سیارہ ہے جس کا حُسن، آب و ہوا بے نظیر ہے۔ اس کا اہتمام انسان کے لیے کیا گیا۔ اب اگر اس شمسی نظام سے باہر نکل کر اس سے بھی زیادہ خوب صورتی، راحت و آرام اور سکون موجود ہے تو اس سے کیوں انکار کیا جائے۔ جو خالق اس شمسی نظام کو انسان کے مزاج کے مطابق بنا سکتا ہے۔ کیا وہ اس سے زیادہ روح افزا مقام کا انتظام نہیں کر سکتا؟ بلکہ اسی سلسلے میں بار بار دلائل دے کر قرآن نے خود انسان کو غور و فکر کی دعوت دی ہے اور واضح کیا ہے کہ کیا یہ ظاہرہ چیزیں جو ہر دم مشاہدے میں رہتی ہیں اس باطنی حقیقت کا یقین نہیں دلاتیں جو انسان کو بتائی جا رہی ہے! ہر چند کہ انسان نے زبردست ترقی کی ہے، خلاؤں میں پرواز کرنا اور چاند پر اپنی عظمت کا جھنڈا گاڑ دینا ترقی ہی کی نشانی ہے لیکن پھر بھی اس کی تحقیق ہنوز عالمِ طفولیت میں ہے۔ ابھی تو وہ یہی نہیں جان سکا کہ آخر بے جان زمین کے اندر سے نباتات کی پیدائش اور مسلسل حیات کیسے ممکن ہے؟ اس کے لیے خود قادرِ مطلق نے فرمایا: "(انکار کرنے والوں کے لیے) بے جان زمین ایک نشانی ہے۔ ہم نے اسے زندگی بخشی، اس سے غلہ نکالا جسے یہ کھاتے ہیں۔ ہم نے اس میں کھجور اور انگور کے باغ پیدا کیے اور اس میں سے چشمے جاری کیے تاکہ یہ اس کے پھل کھائیں۔ یہ سب کچھ ان کے (منکرین) اپنے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ پھر یہ شکر ادا کیوں نہیں

کرتے!" (سورۂ یٰسین)

یہ تو صرف ایک دلیل اور ایک مثال تھی ورنہ قرآن نے تو ان کا پے در پے ذکر کیا ہے اور کائنات کے متعدد آثار سے ان غیبی حقیقتوں کا یقین دلایا گیا ہے جن پر ایمان لانا ہی دراصل ایمان لانا ہے اور حق تو یہ ہے کہ ان پر یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

قیامت کے طویل سلسلے (موت، بعدِ موت، عالمِ برزخ، حساب کتاب، یومِ حشر، جنّت، دوزخ) کے ساتھ ساتھ قرآنِ حکیم نے جس چیز کا سب سے زیادہ تذکرہ کیا ہے، وہ قضاء و قدر ہے۔

## قضاء و قدر

یعنی کہ فیصلۂ خداوندی، منصوبہ بندی، کائنات کی تدبیر کے لیے ایک خاص ضابطہ ایک مقررہ اندازہ اور کائنات کی پیدائش سے لے کر اس کے انجام تک کچھ خاص اصول و قواعد۔ غرض کہ ہر شئے کے بارے میں قدرت کی جانب سے اندازہ و فیصلہ جس کے بنا کچھ نہ ہو پائے۔ قرآن نے اس کا ذکر بہت سے انداز سے کیا ہے، مثلاً "اللہ کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں جنھیں کوئی طاقت نہیں بدل سکتی۔"

"تم اللہ کے طریقوں میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔" (سورۂ احزاب)

"کوئی طاقت اللہ کے ضابطے کو نہیں بدل سکتی۔" (سورۂ فاطر)

"تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنّت کو اس کے مقرر کردہ راستوں سے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے۔" (سورۂ فاطر)

"رحمت کی تقسیم صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

"کسی کی عمر میں زیادتی ہوتی نہ کسی کی عمر میں کمی ہوتی، مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں درج ہے۔" (سورۂ فاطر) غرض کہ ہر طریقے اور ہر انداز سے اللہ ہی ہر شئے پر قادر ہے۔ کوئی اور ایسی ہستی نہیں جو دینے اور فیصلہ کرنے کی طاقت رکھتی ہو۔ انسان کی پیدائش، دوستی، اس کے لیے قدرت کی جانب سے مقرر کردہ حصہ اس میں کوئی

طاقت کمی بیشی نہیں کر سکتی۔ وہ کسی کو فراخی عطا فرماتا ہے کسی کو تنگی۔ کوئی کسی کو اس کے منشا کے خلاف نہ کچھ عطا کر سکتا ہے نہ چھین سکتا ہے۔ دنیا کی تمام طاقتیں یکجا ہو کر بھی کسی کی قسمت نہیں بدل سکتیں۔ روزِ اوّل سے آج تک اور آج سے قیامت تک جو کچھ ہوا اور ہوگا وہ اسی کے اذن سے ہوا۔ اسے قانونِ الٰہی بھی کہا جا سکتا ہے۔ معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسے تقدیر (حصّہ) قضاء (فیصلہ) اور قدر (اندازہ) سے تعبیر کیا ہے۔ غیبی حقیقتوں کے سلسلے میں یہ آخری حقیقت اور ایمانیات وعقیدے کے سلسلے میں آخری کڑی ہے۔ دیگر تمام حقیقتوں کی طرح اسے بھی ہر مذہب و ہر قوم نے تسلیم کیا ہے لیکن دیگر تمام کی طرح اسلام نے اس تعلیم کی بھی بڑی وسعت و تکمیل کے ساتھ وضاحت کی ہے اور پوری طرح سے یہ حقیقت واضح کر دی کہ اللہ ہی ہر شئے پر پوری طرح قادر ہے۔ زندگی و موت، کامیابی و ناکامی، عزت و ذلت، راحت و مصیبت، مصائب و آرام، یعنی اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے، اشرف المخلوقات ہو یا دیگر تمام مخلوقات، آسمان کے اوپر کے معاملات ہوں یا زمین کے اندر کے سب اسی کے تابع فرمان ہیں اور ان سب کے لیے اس کا ایک خاص اندازہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

"ہم نے ہر شئے کو ایک اندازے (حساب) سے پیدا کیا ہے"۔ (سورۂ قمر)

دوسری جگہ اسی بات کو قدرے وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے

"اور سورج اپنے ٹھکانے پر چل رہا ہے۔ یہ ہے غالب اور علم والے کی تقدیر (اندازہ) اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دیں یہاں تک کہ وہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پُرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔ تو نہ تو سورج ہی کے اختیار میں ہے کہ وہ چاند کو جا پالے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آسکتی ہے۔ پس یہ سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں"۔ (سورۂ یٰسین)

یہ کائنات کے بارے میں ہے جہاں کوئی شئے خدا کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتی بلکہ ہر شئے ایک مخصوص طریقے سے اس کے حکم کی تابعداری کر رہی ہے، لیکن قرآن میں کوئی موضوع ایسا نہیں جسے قدرت نے مخصوص

اندازنہ بخشا ہو۔ پیدائش سے پہلے سے لے کر موت، عالمِ قبر، یومِ حشر اور جنت دوزخ تک کے تمام معاملات قسّامِ ازل کی طرف سے ہی قسمت کیے گئے ہیں۔ کوئی صورتِ حال بھی پیش آئے خدا کے علم اور اس کے اذن ہی سے پیش آتی ہے۔

## منشائے قضا و قدر

عقیدۂ قضاء و قدر کا منشا انسان کو بے پناہ عزور اور مایوسی کے جذبات سے نجات دلا کر خوشی و کامیابی اور غموں کے مواقع پر اعتدال میں رکھنا ہے۔ ہم کامیابیوں اور محرومیوں کو حکمت و مصلحت تصور کر کے بہت سے بیکار احساسات و جذبات سے بچ جاتے ہیں۔ والی اللہ ترجع الامور پر یقین کرنے سے انسان پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ تمام امور کی طرف متوجہ ہے تو غم کیسا!

اس عقیدے کے مقصد کو قرآنِ کریم نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

"کوئی مصیبت نہیں آتی ملک پر اور خود ان پر (جو خدا کی طرف سے نہ ہو) یہ کہ وہ کتابِ الٰہی میں اپنی پیدائش سے پہلے درج نہ ہو۔ یہ سب کرنا اللہ کے لیے آسان ہے۔ اور یہ سب اس لیے کیا گیا تاکہ تم جانے والی چیز کا غم نہ کرو اور جو کچھ حاصل ہو اس پر نہ اترانے لگو۔ اللہ کسی اترانے والے شیخی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔" (سورۂ حدید)

اس فرمانِ الٰہی نے اس عقیدے کے مقصد کو پوری طرح سے عیاں کر دیا اور جتا دیا کہ "تقدیر" بے عملی و کم ہمتی نہیں کہ اس پر بھروسا کر کے سست و ناکارہ بن جاؤ بلکہ ایک مالکِ حقیقی پر ایمان اور اپنے تمام تر معاملات پر اس کی پوری توجہ کا یقین انسان میں بلند ہمتی، استقلال اور ناقابلِ ہزیمت جذبۂ صبر و شکر پیدا کر دیتا ہے۔ پھر نہ تو بے پایاں مسرتیں اسے بے تابو کر سکتی ہیں، نہ ناکامی دل گرفتہ و پست حوصلہ بناتی ہے بلکہ اپنے معاملات کو ایک جلیل القدر ہستی کے سپرد کر کے وہ معاشرے میں ایک اعلیٰ ظرف اور باحوصلہ انسان کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ ہم

دیکھتے ہیں کہ یہ عقیدۂ قضاء و قدر ہی تھا کہ بلند ترین مقامات پر فائز ہو کر اور لامحدود کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد بھی قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے سر بارگاہِ خداوندی میں جھکے رہتے تھے۔ ان کے انداز میں نہ فخر و غرور آتا تھا نہ اظہارِ شان کے لیے وہ ان کا تذکرہ کرتے تھے۔ دوسری طرف ناکامی، مفلسی اور غموں کے پہاڑ بھی سر سے گزرتے تو وہ پورے ضبط و تحمل کا ثبوت دیتے تھے۔ نجی زندگی کے غم ہوں، بیرونی زندگی کی ناکامیاں یا سیاسی مصائب ہوں نہ تو وہ مایوس ہو کر بیٹھتے تھے نہ ان کا الزام دوسروں کو دے کر مخالفانہ فضا پیدا کرتے تھے کیوں کہ وہ ہر صورتِ حال میں منشائے خداوندی اور حکمت تلاش کرتے تھے۔ انھیں یقین ہوتا تھا کہ مددِ الٰہی شامل ہوئی تو وہ ناممکن کام بھی کر سکتے ہیں یہی عقیدہ اور یہی ایمان تھا جو وہ طوفانوں کے رخ پھیر دیتے تھے، لیکن ایسے افراد کی بھی کمی نہ تھی جنھوں نے اسی عقیدۂ قضاء و قدر کو غلط معنوں میں لیا اور سمجھنے لگے کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ یہ تصور اسے اپنی کوتاہیوں اور بے عملیوں سے غافل کر کے قسمت کو بہانہ بنا کر بیٹھ رہنے کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اسلام کی پوری تعلیم اور معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تمام حیاتِ مقدس نے انسان کو بے عملی کا نہیں بلکہ بھروسے اور یقین کا سبق دیا ہے۔ بے عملی سے تو خود خدا تعالیٰ کو نفرت ہے اس لیے ایمان کے بعد بلکہ ایمان کے ساتھ ساتھ ہر جگہ عمل کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر تمام انبیاءؑ اور معلّم اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم نے سعی و عمل ہی کی ہدایت کی اور اس طرح قضاء و قدر کا مسئلہ جسے دنیا نے ایک گمراہ کن خیال بنا دیا تھا اسے حل کر دیا اور بتا دیا کہ یہی عقیدہ ہے جس سے انسان کو قلبِ مطمئنہ حاصل ہوتا ہے اور یہی اسے اعتدال میں رکھ کر معاشرے کے لیے معزز انسان بناتا ہے۔

یہ بہت بڑی بلکہ سب سے بڑی حقیقت ہے کہ خدا ہر شئے پر پوری طرح قادر ہے۔ انسان کے ظاہر و باطن اور عمل پر بھی جو اس کے وحدہ لاشریک ہونے کا تقاضا ہے لیکن اس صداقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس مالکِ حقیقی نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر ایک مسلسل جدوجہد

کی ذمّے داری بخشی۔ یہ جدّوجہد اور سعی وعمل کی یہ تمام کاوشیں محض روزی کمانے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے نہ تھیں بلکہ اپنے نفس سے آفاق کے ادھر تک اسے باطل کی ہر قوت سے برسرپیکار رہنا اور لڑنا ہے۔ اپنے نفس سے آفاق تک کوئی ایک میدان اور کوئی ایک شعبہ نہیں ہے۔ یہ تو بے شمار محاذ ہیں، لاتعداد مقابلے ہیں اور ان سب مقامات پر نبرد آزما ہونے کے لیے ارادے، فیصلے، عمل اور حوصلوں کی ضرورت تھی جو سب کے سب انسان کو بخشے گئے، اسے مہلتِ عمل دی گئی۔ زندگی کو آزمائش وامتحان کے طور پر بنا کر اسے اس میدان میں اتارا گیا۔ اس طرح اسلام نے خدا کا واحد ولاشریک ہونا، ہر شئے پر محیط وقادر ہونا اور اس کی سب سے برتر مخلوق انسان کا عمل وفیصلے کی قوتوں سے آراستہ ہو کر دنیا میں آنا' ان دونوں باتوں کو اپنی اپنی جگہ درست قرار دیا اور لاتعداد مثالوں سے اس کی وضاحت کر دی۔

**قضاء وقدر پر اعتراض:** بعد ازاں ان دونوں حقیقتوں کو خلط ملط کر کے اعتراضات کیے گئے۔ خصوصاً ایرانی فلسفۂ تقدیر نے اس میں نئے نئے نکتے پیدا کر کے اسے الجھا ہوا مسئلہ بنا دیا اور سوال کیا جانے لگا کہ اگر خدا ہر شئے پر پوری طرح قادر ہے تو انسان سے اس کے اعمال کا حساب کیسا؟ پھر تو گناہ کرانے پر بھی وہی قادر ہے۔

**جواب:** یہ سوال کرنے والے یہ بھول گئے کہ خدا تعالیٰ کے ہر شئے پر قادر ومحیط ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اس نے عقلِ سلیم اور قوتِ عمل عطا فرمانے کے بعد بھی انسان سے (دیگر مخلوقات پر سے اس کی) برتری سلب کر لی۔ اگر ایسا کرنا ہوتا تو وہ یہ سب عطا ہی کیوں کرتا! لیکن خلقت انسانی کی ابتدا میں یہ فرما دینا کہ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا۔ (سورۂ ہودؑ) اس بات کا اعلان کرنا ہے کہ ہر شئے پر محیط طاقت والی ہستی نے انسان کو کچھ ذمّے داریاں سونپی ہیں جن کا جواب دینا ضروری ہے۔ پھر اسے عقلِ سلیم عطا کی گئی کہ وہ خدا کی لاتعداد نشانیوں کو پہچانے اور دوسروں کو ان سے روشناس کرائے۔ اگر خدا تعالیٰ کو اپنی عبادت واطاعت کرانا

ہوتی تو یہ خدمت ملائک سے بہتر کون انجام دے سکتا ہے! لیکن انسان کے لیے عبادت کے معنی ذرا مختلف رکھ دیے گئے کہ خالق کو پہچانو اور دنیا کو روشناس کراؤ۔ عقلِ سلیم عطا فرمانے کا مطلب ہی یہ تھا کہ کائنات کا مشاہدہ کر کے اس واحد و لاشریک ہستی کو مانا جائے۔ چنانچہ ارشاد ہے "ان سے کہو زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھیں"۔ (سورۂ یونسؑ)

دوسری جگہ یہی حکم قدرے مختلف انداز میں دیا گیا "زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں، یقین لانے والوں کے لیے اور خود تمھارے اپنے وجود میں بھی موجود ہیں۔ کیا تمھیں سوجھتا نہیں! تمھارا رزق بھی آسمان میں ہے اور وہ بھی چیزیں جن کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے۔ پس قسم ہے آسمان و زمین کے مالک کی۔ یہ بات حق ہے اور ایسے ہی یقینی ہے جیسے کہ تم بول رہے ہو"۔

یہ فرمانِ الٰہی انسان کے اندر اور باہر کی کتنی لا محدود قوتوں پر اللہ کے محیط و قادر ہونے کا اعلان کر رہا ہے! اگر ذرا بھی عقل سے کام لیا جائے تو کائنات کا ذرہ ذرہ جان دار و بے جان ہر شے اور خالقِ حقیقی کی پیدا کردہ ہر مخلوق اس کی قدرت کی نشانی ہے۔ تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں! بلکہ خدا تعالیٰ نے خود کو پوشیدہ رکھ کر اپنی ہر صفت کو عیاں کر دیا اور انسان کو جستجو و تلاش کا مادّہ ودیعت فرما دیا۔ اب اگر انسان دیکھے تو زمین و آسمان کا قیام، اس کی ساخت و انداز، چاند اور سورج کی خدمات، بے جان و مردہ زمین سے ضروریاتِ حیات کا فراہم کرنا، لاکھوں انداز کی مخلوق پیدا کرنا، ایک کی فنا کو دوسرے کی بقا قرار دے دینا، (ہر تحت اپنے فوق کی غذا ہے کہ مٹی سے نباتات، نباتات سے حیوانات اور حیوانات سے انسان غذا لیتا ہے) پھر دن اور رات میں آرام کے سلسلے اور موسم کے تغیرات و تبدیلی کو انسان کے لیے راحت کا سبب بنانا، یہ سب کس قدر حیران کن ہے اور خدا کے لیے آسان تر! ان سب سے قطع نظر انسان کی اپنی ذات، اس کی تخلیق اور ولادت سے موت تک لمحے لمحے کے معاملات اس کا ضعف سے قوت اور قوت سے ناداری و ضعف کی جانب آنا

جانا، کیا یہ سب کچھ تعجب خیز نہیں ہے! انسان کی ابتدا ایک خوردبینی کیڑے اسپرماٹ زدا اور خوردبینی انڈے اودم سے ہوئی۔ پھر رحم مادر میں اس کی پرورش اور ولادت کا تعجب انگیز طریقہ اختیار کرتے ہوئے خالقِ حقیقی نے اسے محیر العقل صلاحیتیں عطا فرمائیں۔ اس کے پور پور کو قوت سے بھر کر اسے ایک خود کار مشین بنا دیا اور وہ صفتیں عطا کیں کہ وہ خود بھی نہیں پہچان سکتا کہ وہ کیا ہے! وہ اپنی نصف صلاحیتیں بھی استعمال نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی جن صلاحیتوں کو استعمال میں لے آیا ہے، ان کے نتیجے میں اس کی اپنی ایجادات، اپنے کارنامے دنیا کو حیران کر رہے ہیں، مگر وہ اس بات پر غور نہیں کرتا کہ قدرت کی سب سے بڑی نشانی تو وہ خود ہے کہ اس کا سئہ سر میں جو دماغ ہے اس سے بہتر کوئی کمپیوٹر ایجاد نہیں ہو سکتا۔ اس کے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل سے بہتر کوئی پمپ نہیں اور اس کی اپنی نظر سے بہتر کوئی دوربین نہیں ہو سکتی۔ اس کے ساتھ حواسِ خمسہ ایسے ذرائع حصولِ علم اسے ودیعت فرما کر حکم دیا گیا: "زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھیں۔" (سورۂ یونس ع)

گویا نظارے بخش دیے اور نظر بخش دی۔ اب ناظر کیا اثر قبول کرتا ہے یہ اس کے قلب ذہن پر منحصر ہے۔ بالکل یہی کیفیت ہر شئے پر خدا تعالیٰ کے قادر و محیط ہونے اور انسان کی ذمے داری کی ہے کہ ارد گرد بے شمار نشانیاں بھی ہیں اور دیکھنے اور سمجھنے کا اختیار بھی! اس کے باوجود یقین نہ کریں تو پھر قبولِ حق کے جذبے کا فقدان ہے، سرکشی و ہٹ دھرمی ہے جس کا لازمی نتیجہ حساب ہے۔ غرض کہ ان دو اختیارات کے معنی محض اتنے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی قوت ازل سے ابد تک ہے، لامحدود و لافانی ہے اور انسان کی قوت ایک مخصوص وقت کے لیے اور کسی کی عطا کردہ ہے۔ اس قوت کو واپس لینے کے بعد وہ ان اعمال کا محاسبہ تو ضرور کرے گا جو اس دوران میں ارادتاً سرزد ہوئے۔ یہ محاسبہ کیوں

کیا جائے گا؟ اس کا جواب بھی خود قرآن نے دیا ہے۔ فرمایا: "اے اولادِ آدمؑ! کیا تم سے عہد نہیں لیا گیا تھا کہ شیطان کی بندگی نہ کروگے! وہ تمہارا اکیلا دشمن ہے، اور میری ہی بندگی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے لیکن اس کے باوجود اس نے تم میں سے ایک گروہِ کثیر کو گمراہ کر دیا۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے؟" (سورۂ یٰسین)

اس طرح خدا کے واحد و لاشریک اور اس کے مالک و خالق ہونے کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن نے بندے اور خالق کے تعلق اور اس کائنات میں انسان کی اہمیت و ذمّے داریوں کی وضاحت کرتے ہوئے مسئلۂ قضاء و قدر اور اس کے منشا و معنی سبھی کو آشکار فرما دیا ہے۔ اب اگر کوئی قلب کی گہرائیوں سے اسے سمجھنا نہ چاہے تو اسے سمجھایا نہیں جاسکتا۔ جبر اور زبردستی خدا کی عادت نہیں ہے۔ وہاں تو قوتِ فیصلہ، علم و عقل، فکر و ارادہ اور سعی و عمل کی تمام تر قوتیں عطا فرما کر اعلان فرما دیا گیا ہے۔ "یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے، سو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف (پہنچنے کا) راستہ اختیار کرلے۔" (سورۂ مزمّل)

یہ صاف اور سیدھی سی بات ہے کہ خدا تعالیٰ جب انسان کے قلب سے نیکی کی طلب و آرزو کی کوئی تحریک محسوس کرتا ہے تو توفیق عطا فرماتا ہے ورنہ جس راہ پر بندہ چل پڑتا ہے۔ وہ اس کی مہلت کا زمانہ پورا کرتا اور مقررہ وقت پر ہی حساب لیتا ہے البتہ قرآنِ پاک ہی کی کچھ آیات ایسی ہیں جن کا سہارا لے کر شبہات و شکوک کو تقویت دی گئی، مثلاً "اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت دے دیتا۔" (سورۂ انعام)

"وہ نہیں ہیں کہ ایمان لائیں اِلّا یہ کہ خدا چاہے۔" (سورۂ انعام)

"پھر جب انھوں نے ٹیڑھ اختیار کی تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیے۔ اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔" (سورۂ صف)

"(اے نبیؐ!) اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو روئے زمین پر جتنے لوگ ہیں سب کے سب ہی ایمان لے آتے تو کیا تم زبردستی کر کے

ان لوگوں کو مومن بنانا چاہتے ہو؟" (سورۂ صف)

یہ اور قرآنِ پاک کی ایسی متعدد آیات اور ہیں جن سے یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو سبھی ایمان لے آتے۔ کچھ لوگ اس سے یہ مفہوم لے لیتے ہیں کہ خدا نے نہیں چاہا۔ ان آیاتِ مبارکہ سے مراد یہ نہیں کہ خدا نے انھیں صراطِ مستقیم پر چلانا نہیں چاہا بلکہ معنی یہ ہیں کہ خدا اگر چاہتا تو ذریعۂ نبوت و رسالت کے بغیر بھی لوگ اسے تسلیم کرتے۔ دنیا میں کوئی ہادی و رہبر نہ آتا اور لوگ ہدایت پاتے۔ کوئی نبی اور کوئی رسول پیغامِ حق لے کر نہ آتا جب بھی لوگ خدا کو پہچانتے کیوں کہ اس کی حقیقت کسی چیز کی محتاج نہیں۔ اس کی واحدانیت کو آشکار کرنے کے لیے کسی انسان کی ضرورت نہ تھی۔ دنیا کسی روشناس کرانے والے کے بغیر بھی اسے مانتی، لیکن یہ سب اہتمام یعنی انسان کو بے شمار صلاحیتوں سے آراستہ بنا کر اس کے سامنے متعدد راستے پیش کر کے وہ اس کے عمل اور عقل کی آزمائش کرنا چاہتا تھا تاکہ اندازہ ہوسکے کہ ان میں بہتر عمل کرنے والا کون ہے!
اس ضمن میں ایک بات بڑی غور طلب ہے کہ قرآنِ پاک نے جس قدر اس کا (قضاء و قدر) اعادہ فرمایا ہے، معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موضوع پر بحث و تکرار کرنے سے اتنی ہی شدت سے منع فرمایا ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی ہے کہ ایمان لانا ہی مومن کی اوّلین صفت اور آخری کامیابی ہے۔ دین کے بنیادی اصولوں پر یقین کرنے کے معنی ایمان ہیں اس کے ساتھ ساتھ ہی دوسری چیز عمل ہے۔

## عمل

لفظ عمل تمام تر امور کا جامع ہے۔ اس میں کام کی کوئی قسم باقی نہیں رہ جاتی۔ فکر و خیال، گفتگو و سلوک اور جسمانی و عضوی سبھی امور خواہ کبھی بھی انجام دیے جائیں اور کہیں انجام دیے جائیں، عمل ہی کی تعریف میں آتے ہیں، لیکن ان کی بھی دو قسمیں ہیں، عمل بہ اندازِ عبادات، عمل بہ اندازِ معاملات! انھیں حقوق اللہ اور حقوق العباد بھی کہتے ہیں۔ ایمان

اور عمل! بہر حال عبادات سے وہ خاص اعمال تصور میں آتے ہیں جنھیں ایک مقررہ وقت پر ادا کرنے، خدا کی عظمت اور اپنی بندگی کے اعتراف کے لیے بجالانے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان احکام نے یقیناً اللہ تعالیٰ کی عبادت کے طریقے مقرر فرمائے اور عبادت کی غرض و غایت سمجھائی۔ مسلمانوں کے لیے ہر اندازِ عبادت میں اجتماع کا اہتمام کیا گیا اور گزشتہ تمام ناقص طریقوں کو باطل قرار دے دیا گیا۔ یہ سب وہ ارکانِ اسلام ہیں قرآن نے جن کی باقاعدہ وضاحت فرمائی ہے۔ یہاں میں مختصراً ہی ان کا ذکر کروں گی۔

## عمل بہ اندازِ عبادات (ارکانِ اسلام)

ان میں پہلا درجہ کلمے کو حاصل ہے، یعنی دل اور زبان سے خدا کی وحدانیت اور معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرنا۔ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ یہ مختصر سا کلمہ انسان کو کفر سے اسلام کی طرف لاتا ہے۔ یہ سابقہ گناہوں کی توبہ بھی ہے اور اطاعت کا اقرار و عزم بھی۔ اس کی تعریف خود خدا تعالیٰ نے اس طرح فرما کر کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ (سورۂ ابراہیم) گویا حقیقت و فراست کو کُل عالم پر محیط قرار دے دیا اور واضح فرما دیا کہ زمین کے اندر سے آسمان کے پرے تک ذرّہ برابر بھی کوئی شئے اس سے باہر نہیں ہے۔ اس کلمے کا اقرار کرنا، تمام بنیادی صداقتوں کا اقرار کرنا ہے۔

دوسرا درجہ نماز کا ہے۔ وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (سورۂ بقرہ) کہہ کر اس کی اہمیت واضح کی گئی۔ یہ عبادت دین کا ستون ہے۔ یہ ہر مشکل اور مصیبت میں انسان کو حوصلہ بخشتی ہے۔ یہ وہ واحد عبادت ہے جس کا حکم معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان پر بُلا کر دیا گیا ورنہ ہر عبادت کا حکم نازل کیا گیا، زمین پر اتارا گیا، لیکن واحد عبادت نماز ہے کہ معراج میں فرض کی گئی، نماز تمام انبیاء کی امتوں پر فرض کی گئی جنھوں نے وقت کے ساتھ ساتھ معبود بھی بدل لیے اور نماز کے انداز بھی، یہاں تک کہ یہ مسلمانوں پر فرض کی گئی۔ نماز کی اس قدر تاکید فرمائی گئی کہ کسی اور عبادت کی نہیں فرمائی گئی۔ یہی بندگی کا وہ خاص انداز ہے جو ملائک کو دیکھ کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پسند فرمایا تو امت کے

لیے خدا نے اسی طریقے کا حکم دے دیا۔ نماز کی پابندی اور پاکیزگی کا اہتمام بُرائیوں اور فحش باتوں سے پاک کر دیتا ہے۔ یہ ایمان لانے کے بعد پہلا فرض ہے اور باقاعدہ مستقل حکمِ خداوندی ہے جس کی پابندی خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل ہے۔

تیسرا رکن روزہ ہے۔ فرمایا۔ "اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلے انبیاءؑ کے پیروکاروں پر فرض کیے گئے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقوے کی صفت پیدا ہو جائے۔" (سورۂ بقرہ)

روزے سے تقویٰ یعنی تمام بُرائیوں سے روکنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ رمضان کے روزے ہر جوان، بالغ، صحّت مند مرد اور عورت پر فرض کیے گئے۔ چونکہ اسلام کے احکام انسانی طبیعت کی آسانی کے لیے بہ تدریج نازل کیے گئے لہٰذا روزہ بھی بہ تدریج فرض کیا گیا۔ ابتدا میں معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم ہر ماہ صرف تین روزے رکھا کرتے تھے یعنی تاریخ کی پابندی کے ساتھ (ورنہ تو اپنی مرضی سے جب چاہتے رکھ لیتے تھے) پھر ہجرت کے دوسرے سال خاص طور پر رمضان المبارک کو روزوں کے لیے مخصوص کیا گیا اور اس میں انسان کے لیے ہر طرح کی رعایت رکھی گئی، یعنی سفر کے دوران میں، حالتِ مرض اور حالتِ حمل میں سہولت بخشی گئی۔ اس کے کئی انداز ہیں۔ یہ بہ طور فدیہ بہ طور کفّارہ اور بہ طور شکرانہ بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ ان سب امور اور اس کے اوقات کے بارے میں خود قرآن نے وضاحت فرمائی ہے۔

ارکانِ دین میں چوتھا درجہ زکوٰۃ کا ہے۔ "نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور جو لوگ میرے آگے جھکتے ہیں ان کے ساتھ جھک جاؤ۔" (سورۂ بقرہ)

قرآن میں جہاں جہاں نماز کا ذکر ہے وہاں زکوٰۃ کا ذکر بھی ہے۔ جس طرح نماز ہر بالغ اور تندرست پر فرض ہے اسی طرح زکوٰۃ ہر عاقل بالغ مال دار پر فرض کی گئی ہے۔ اس سے مراد ہے کہ اپنے مال کا چالیسواں حصّہ بہ طور زکوٰۃ دیا جائے۔ اس کے بہت سے مقصد ہیں۔ امیر و غریب کے درمیان ہمدردی کا تعلق، امداد، معاونت، جماعت کے نظام کا قائم کرنا اور

بہ یک وقت خالق اور مخلوق سے بہ طریقِ احسن تعلق! چنانچہ ارشاد ہے۔
"نماز کھڑی کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو قرض دو اور جو کچھ تم اپنے آگے بھیجو گے، اپنے واسطے اس خدا کے پاس، بہتر اور ثواب میں زیادہ پاؤ گے"۔ (سورۂ مزمل)

غرض کہ بہ یک وقت حقوق الٰہی اور حقوق العباد کی ادائیگی کا نام زکوٰۃ ہے جس کی بڑی وضاحت بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد حج ہے "اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنا تابع دار بنا اور ہماری اولاد میں سے کچھ کو اپنا فرماں بردار بنا۔ ہمیں حج کے دستور بتا اور معاف کر بے شک تو معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے"۔ (سورۂ بقرہ)

یہ وہ دعا ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے تعمیرِ کعبہ کے وقت کی اور خدا کے حضور مقبول ہوئی اور انھیں عبادت کے قدیم طریقے سے خدا کی عبادت کرنے کے انداز سکھائے گئے۔ پھر یہی مقدس گھر اہلِ ایمان کا مرکز و مرجع قرار دیا گیا۔ ہر مسلمان پر قیامت تک زیارتِ کعبہ فرض کر دی گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس نے کئی انداز بدلے اور اہلِ عرب نے اس عبادت کو محض نام و نمود اور میلے کا سا انداز بخش دیا۔ شور و شغف ہوتا، قربانی ہوتی، خون کی چھینٹیں اڑائی جاتیں، خواتین اور مردوں میں چھیڑ چھاڑ ہوتی! اس طرح ایک بڑا تماشا ہوتا اور حج کا زمانہ گزر جاتا۔ اسلام نے اسے پھر سے تقدس بخشا، گناہوں اور برائیوں سے پاک کرنے کا ذریعہ بنایا۔ اس کی پوری تفصیل قرآن میں موجود ہے۔

آخری درجہ جہاد کا ہے جس کے لیے حکم دیا گیا کہ تم اللہ کی راہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ مگر زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

جہاد کے معنی بڑے وسیع ہیں۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس سے مراد قتال فی سبیل اللہ ہے، لیکن جہاد کے بے شمار انداز ہیں۔ برائی کے خاتمے اور نیکی کی اشاعت کے لیے ہر جدوجہد جہاد کہلاتی ہے۔ یہی تعریف راہِ حق میں ہر مصیبت برداشت کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔ بہرحال یہاں میں نے مختصراً ان اعمال کا ذکر کیا تھا جو عبادت کے تصور سے انجام دیے جاتے ہیں ورنہ

حقیقت تو یہ ہے کہ اگر عمل کی بنیاد ایمان پر ہو اور وہ خدا کی رضا جوئی کے لیے انجام دیے جائیں تو ہر عمل عبادت ہے۔ اسی لیے خدا نے مسلمان کے ہر عمل کو پاکیزہ و مقدس کرنے کی خاطر ایمان کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اور فرمایا "ایمان لاؤ اور نیک عمل کرو"۔ پھر یہ کہ قرآنِ پاک نے کہیں بھی ان دو (ایمان اور عمل) کو علیحدہ علیحدہ مکمل قرار نہیں دیا بلکہ عمل کے بغیر ایمان ایک جھوٹا دعویٰ اور ایمان کے بغیر عمل کو بے اجر کہا ہے۔ اس طرح ایمان اور عمل لازم و ملزوم ہیں کیوں کہ ایمان انسان کے قلب کی پاکیزہ کیفیت کا نام ہے جب تک عمل سے اس کی صداقت آشکار نہ کی جائے، اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ بہ الفاظِ دگر ایمان دکھایا اور سمجھایا نہیں جا سکتا جب تک کہ عمل میں ڈھال کر پیش نہ کیا جائے جو دوسروں کی اصلاح و ہدایت کے لیے ضروری ہے۔ اسی بنا پر قرآن نے دونوں کو ہر جگہ ساتھ ساتھ بیان فرماتے ہوئے انسان کی نجات کامیابی اور فلاح و بہبود سب کا دار و مدار دونوں پر رکھا ہے۔ اس بات کو ایک جگہ نہیں بلکہ سیکڑوں جگہ فرمایا گیا ہے "بے شک جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کی مہمانی کے لیے باغ فردوس میں ہیں"۔ (سورۂ کہف)

دوسری جگہ اسی بات کو قدرے مختلف انداز سے کہا گیا "زمانے کی قسم کہ انسان خسارے میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے، نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرتے رہے، صبر کی تاکید کرتے ہیں"۔ (سورۂ عصر)

ان آیاتِ مبارکہ میں گویا کامیابی اور آخری کامیابی کے لیے چار اصول بیان فرمائے گئے ہیں، ایمان، عمل، تلقینِ حق، تاکیدِ صبر، یعنی انسان ایمان اور عمل سے خود کو مضبوط کرے اور حق بات کی ہدایت اور صبر و حوصلے کی نصیحت کر کے دوسروں کی مدد بھی کرتا رہے کیوں کہ نیکی محض اپنی ذات تک ہی محدود نہیں ہے۔ یہ اصول کسی خاص جماعت یا طبقے کے لیے ہی مخصوص نہیں کر دیے گئے بلکہ جو کوئی بھی ان کی پابندی کرے گا، خدا کے نزدیک

پسندیدہ قرار دیا جائے گا اور فلاح و کامیابی کے دروازے اس پر کھول دیے جائیں گے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ "بے شک جو مسلمان ہیں، جو یہود ہیں، صابئین اور نصاریٰ ہیں۔ پس جو کوئی بھی اللہ پر، پچھلے دن پر، ایمان لائے اور نیک کام کیے نہ تو ان پر ڈر ہے، نہ وہ غم کھائیں گے۔" (سورۂ مائدہ)

ان ارشادات سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کی پوری تعلیم دو چیزوں پر منحصر ہے، ایمان اور عمل! جنھیں سینکڑوں انداز سے بیان کیا گیا ہے اور بنیادی اصولوں پر یقین کر کے ان کے مطابق کام کرنے کو بھی فردِ واحد کی اور پوری قوم کی فلاح کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ انھی کے لیے عارضی کامیابی بھی ہے اور دائمی اجر بھی اور انھی سے دنیاوی حکومت، عزت اور ملکیت کے وعدے بھی کیے گئے ہیں۔ فرمایا "تم میں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین کا مالک بنائے گا جیسے کہ ان سے پہلے (اہلِ ایمان) کے لوگوں کو حاکم بنایا تھا، اور ان کے دین کو مستحکم کرے گا اور خوف کے بعد امن بخشے گا، اگر وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے۔" (سورۂ نور)

غرض کہ ان دونوں کی شمولیت ہی عملِ صالح ہے جس سے مراد اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کام کرنا ہے، خواہ یہ کام فکری ہوں، لسانی ہوں یا عضوی ہوں۔

## فکری عمل

فکری عمل میں انسان کے ارادے، خیالات، تصورات اور فیصلے سب خدا کے منشاء و ہدایت کے مطابق ہوتے ہیں۔ برے کاموں کا خیال آتا بھی ہے تو رضائے خداوندی کے خیال سے مومن اسے دل میں جگہ نہیں دیتا۔ ایسے لوگوں کے لیے فرمایا گیا "ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔" (سورۂ بقرہ)

فکری عمل میں انسان خدا سے تابع فرمان ہوگا، تب ہی باقی انداز سے اطاعت کا اظہار کر سکے گا۔ ورنہ تو ایمان کے بغیر عمل والی بات ہو جائے گی

جو بے فیض دبے فائدہ ہے۔ فکری عمل کی مکمل تعریف اگر ہم مختصر ترین الفاظ میں کرنا چاہیں تو محبتِ الٰہی کہہ سکتے ہیں۔ جو تمام اعمال کی اساس ہوتی ہے اور جس کی بدولت ہی ایمان کا بے بہا خزانہ حاصل ہوتا ہے۔ ہم اسے تقویٰ بھی کہہ سکتے ہیں جس کی بدولت ہی انسان خدا کے نزدیک مکرم قرار دیا جا سکتا ہے۔

مسلم کی ایک حدیث شریف میں ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے وہ اس پر کوئی ظلم و زیادتی نہ کرے، اسے بے یار و مددگار نہ چھوڑے، اسے حقیر نہ جانے، اس کے ساتھ حقارت آمیز برتاؤ نہ کرے۔ (پھر اپنے سینۂ مبارک پر ہاتھ رکھ کر فرمایا) لوگو! تقویٰ یہاں ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے تم جسے اس کے ظاہر حال سے معمولی انسان سمجھتے ہو وہ اپنے دل کے تقوے کی بدولت خدا کی نظر وں میں محترم ہو۔ (اور تم اسے ذلیل تصور کرنے کی بدولت خود ذلیل ہو جاؤ) آدمی کے بُرا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کے لیے قابلِ احترام ہے، خون، مال اور آبرو!

اسی فکری عمل کی تعریف دوسری جگہ اس طرح فرمائی گئی کہ تمھارے اعمال کا انحصار تمھاری نیتوں پر ہے۔ یوں ہر کام پہلے تصور میں، پھر فیصلے اور ارادے میں، اس کے بعد عمل میں آتا ہے۔ اب اگر خیالات، تصورات اور نیت درست ہو تب ہی عمل درست ہو سکتا ہے ورنہ ہر عمل دکھاوا، ریا اور دو رُخا پن قرار دیا جاتا ہے۔ ان تمام بُرائیوں کی مذہب نے شدید مذمت کی ہے۔ اس فکری عمل کے بعد دوسرا درجہ لسانی یا قولی عمل کا ہے۔

## لسانی عمل

بُرائیوں اور بیہودہ گوئی سے گریز کرتے ہوئے مومن ہمیشہ حق بات کہتا ہے اور پاکیزہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ مذہب نے بدزبانی، بدگوئی، غیبت اور دل آزاری کی سخت مذمت فرمائی ہے۔

معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غیبت زنا سے زیادہ سنگین اور سخت گناہ ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کرام نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ایسا کیوں ہے؟"

فرمایا۔ "اگر انسان بدبختی سے زنا کر لیتا ہے تو توبہ کرنے سے معافی اور مغفرت اللہ کی جانب سے ہو سکتی ہے، لیکن غیبت کرنے والے کو جب تک وہ شخص خود معاف نہ کرے (جس کی غیبت کی گئی ہو) اس وقت تک خدا کی جانب سے اسے بخشش اور معافی نہیں ملے گی۔"

یہ لسانی عمل ہے جو معاشرے کو خراب کرتا ہے۔ اسی طرح دل آزاری کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے۔ بہتان تراشی کے لیے قرآن نے لعنت فرمائی ہے۔ فرمایا گیا۔

"جب تم اپنی زبانوں سے ایک دوسرے کے ساتھ اس کا تذکرہ کرتے تھے اور اپنے منہ سے وہ بات کہتے تھے جس کا تمھیں کچھ علم نہ تھا اور تم اسے ایک ہلکی بات سمجھتے تھے، لیکن خدا کے نزدیک وہ بڑی بھاری بات تھی۔" (سورۂ نور)

بدگمانی، غیبت، لگائی بجھائی اور الزام سے نفرت کرتے ہوئے فرمایا گیا۔ "اے ایمان والو! بہت گمانوں سے احتراز کرو کہ بعض گمان گناہ ہیں اور تم ایک دوسرے کے حال کا تجسس نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے۔ کیا تم اس بات کو پسند کرو گے کہ (کوئی) اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ یقیناً تم اس (گوشت کھانے سے) نفرت کرو گے تو خدا کا ڈر رکھو اور بے شک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔" (سورۂ حجرات)

اخلاق کا سب سے بڑا تعلق زبان سے ہے۔ نیکی بدی کی ہر بات زبان سے کی جاتی ہے۔ یہی وہ عمل ہے جو کسی انسان کے پورے کردار کو چند جملوں ہی میں محفل میں عیاں کر دیتا ہے۔ جب تک کوئی شخص بات نہ کرے اندر کا حال معلوم نہیں ہو سکتا لیکن اہلیت، ذہنیت، مقصد، ارادے، فیصلے، احساسات اور جذبات سب کے اظہار کا ذریعہ محض گفتگو ہے جو نظروں سے گرا بھی دیتی ہے اور عزت بھی عطا کر دیتی ہے۔ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ میں نے دس برس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں گزارے مگر ان دس برسوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی (جو بات مجھ سے سرزد ہوئی) مجھے ملامت نہیں کی۔

عملی طور پر نہیں بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عیب جوئی، دو رخے پن سے ملاقات کرنے، جھگڑا کرنے اور چغلیاں کھانے سے منع فرماتے ہوئے کہا "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے سب سے کم حیثیت اس شخص کی ہو گی جس کی فحش گوئی اور بد زبانی کے ڈر سے لوگوں نے اسے چھوڑ دیا ہو" (مسلم و بخاری)

زبانی عمل یا گفتگو کے بعد عضوی یا جسمانی عمل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

**عضوی عمل** (جسمانی عمل)

جب اور جہاں جو بات بھی یا جو حرکت بھی کی جائے مومن کے لیے لازم ہے کہ خدا کی منشا و رضا کے مطابق ہی ہو۔ ان میں تمام وہ عمل آ جاتے ہیں جو انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ انجام دیتا ہے۔ یہ فکری عمل کے بغیر انجام نہیں دیے جاتے۔ گناہوں کا ارادہ و فیصلہ کر کے ہی انسان گناہ کرتا ہے اور نیکیوں کا ارادہ اور فیصلہ کر کے ہی انسان نیکیاں کرتا ہے، چوری، ڈکیتی، قتل و غارت مار پیٹ، جھگڑے اور نماز، جہاد، حج اور دیگر تمام اچھے کاموں میں فکر و عمل دونوں ہی شامل ہوتے ہیں، گویا عمل کرنے کے لیے خیالات، تصورات، فیصلے ارادے اور حرکت، سب کی ضرورت ہے۔ کامیابی و آخری کامیابی کے لیے خدا نے خود چار اصول مقرر فرما دیے ہیں جو فکری، لسانی اور عضوی تمام اعمال کی گواہی دیتے ہیں۔ فرمایا "قسم ہے زمانے کی کہ انسان نقصان میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے، نیک عمل کرتے رہے، آپس میں حق کی بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔" (سورۂ عصر)

یہاں ایمان، عمل، تلقینِ حق اور تاکیدِ صبر، ان چار اصولوں کا بیان فرما دینا فکری، قولی اور عضوی ہر عمل کا تقاضا کرتے ہیں۔ نہ صرف خود ایمان لاؤ اور نیک عمل کرو بلکہ دوسروں کو بھی حق و صبر کی ہدایت کرتے رہو۔

دوسری جگہ ان تمام امور کی تشریح قدرے مختلف انداز سے کی گئی۔ اور فرمایا گیا "کیا (انسان) خیال کرتا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہ پائے گا! کہتا ہے میں نے بہت سامال برباد کیا۔ کیا اسے گمان ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا! بھلا ہم نے اسے دو آنکھیں نہیں دیں؟ اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے!

اور (خیر وشر کے) دونوں راستے بھی دیے، مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گزرا اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؟ کسی کی گردن چھڑانا (غلامی سے نجات دلانا) یا بھوکے کو کھانا کھلانا، یتیم رشتے دار یا فقیر، خاکسار کو۔ پھر ان لوگوں میں (داخل) ہوا جو ایمان لائے۔ صبر کی نصیحت اور لوگوں پر شفقت کرنے کی وصیت کرتے رہے۔ یہی لوگ صاحب سعادت ہیں اور جنھوں نے ہماری آیتوں کو نہ مانا، بدبخت ہیں۔ یہی لوگ آگ میں بند کردیے جائیں گے۔" (سورۂ بلد)

ان ہدایات میں نیکی کے ہر عمل کی ہدایت موجود ہے۔ دراصل نیت قول اور عمل سب مل کر ہی جو عمل ظہور میں آتے ہیں انھی کے کرنے والے اصحاب المیمنۃ میں شمار ہوتے ہیں اور یہی صالح عمل کہلاتے ہیں۔

## صالح عمل

خدا کی تمام تر صفات پر ایمان لانے، غیبی حقیقتوں کو ماننے اور تہہ دل سے یقین کرنے کے بعد مسلمان کام کرتا ہے۔ وہ کام جن میں نیت، ارادہ فیصلہ اور عمل سب میں خلوص اور خوشنودئ الٰہی کا تصور ہو وہی عمل صالح کہے جاتے ہیں جن کا قرآن نے بار بار حکم دیا ہے اور خود معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کا حکم دیا ہے۔

۱۔ ظاہر اور باطن میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا۔
۲۔ غصہ اور رضا دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کرنا۔
۳۔ محتاجی اور مالداری میں میانہ روی اختیار کرنا۔
۴۔ جو مجھ سے تعلق توڑے، اس کے ساتھ جوڑنا جو بے مروتی برتے، اس سے مروت برتنا۔
۵۔ جو مجھے محروم کرے اس کو دینا۔
۶۔ جو ظلم کرے اسے معاف کردینا۔
۷۔ خاموشی غور و فکر کے لیے ہو۔
۸۔ کلام ذکرِ الٰہی کے لیے ہو۔
۹۔ میں نیکی کے حکم دیتا رہوں۔

۱۰۔ دیکھنا عبرت کے لیے ہو۔

غرض کہ انسان پر ہر وقت کوئی نہ کوئی کیفیت طاری رہتی ہے جو اس کے حالات، معاملات اور احساسات کے مطابق ہوتی ہے کبھی طبیعت کے موافق اور کبھی اس کے خلاف۔ وہ کسی نہ کسی کیفیت سے دوچار رہتا ہے۔ ایسے میں اگر ہر دم محاسبہ کرنے والی ایک قوت کا یقین ہو تو انسان اپنے مخالفانہ خیالات پر قابو پا کر اس (قوت) کی رضا اور خوشی کا تصور کرتا ہے۔ ایسے میں وہ خوشی میں شکر اور دکھ میں لامحالہ صبر کی کوشش کرتا ہے۔ یہ دو کیفیات (شکر اور صبر) اسے راحت اور سکون بخشنے کے لیے کافی ہیں۔ اس کے بعد اس کے ہر فعل میں اعتدال آجاتا ہے اور وہ بہت سے دکھوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ پھر اس سے اعمالِ صالح کے سوا کوئی عمل سرزد نہیں ہوتا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں نیکی کے کام یا صالح عمل سے کیا مراد ہے۔ یہاں اہلِ ایمان کی دعا کا ذکر کیا گیا ہے۔ "اے میرے رب! مجھے توفیق عطا کر کہ تیری نعمتوں کا شکریہ ادا کروں جو تُو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں۔ میں ایسا عمل کروں جس سے تو راضی ہو۔ میری اولاد کو نیک بنا کر مجھے سُکھ دے۔ میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور تابعِ فرمان بندوں میں سے ہوں۔ اس طرح ہم لوگوں سے ان کے بہترین اعمال قبول کرتے ہیں۔ ان کی بُرائیوں سے درگزر کرتے ہیں۔ یہی ہیں جو جنّتی لوگوں میں شامل ہوں گے۔" (سورۂ احقاف)

گویا بہترین اعمال کی پوری تشریح ان آیاتِ مبارکہ میں موجود ہے جو اس طرح ہے۔

خدا کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا: قول و عمل سے اس کے احکام کی پیروی کرنا کیوں کہ اطاعت کرنا ہی شکریہ ادا کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔

۱۔ والدین کو عطا کردہ نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا: والدین کی جانب سے ان کی ذمّے داری ادا کر کے ان کی خدمت کرنا اور خدمت و ذمّے داریوں کا سلسلہ صرف زبان تک محدود نہیں ہوتا۔ والدین کی اطاعت و دل جوئی کے انداز ہزاروں ہیں جنھیں خود قرآن نے اور احادیث شریف میں وضاحت

کے ساتھ فرمایا ہے۔

۲- میں وہ عمل کروں جس سے تُو راضی ہو: خدا کی رضامندی اُس کی عبادت اور مخلوق کی خدمت دونوں میں پوشیدہ ہے، یعنی یہ عبادات اور معاملات کی درستی کا ایک طویل سلسلہ ہے جو تمام زندگی پر محیط ہے۔

۳- میری اولاد کو نیک بنا کر مجھے سُکھ دے: اولاد کے لیے نیکی کی توفیق طلب کرنے کے معنی ہیں کہ آئندہ نسلوں کی اصلاح و ہدایت کی ذمہ داری بھی انسان پر عائد ہوتی ہے۔ ان سب کے بعد اپنی کوتاہیوں سے توبہ کرتے ہوئے خود کو تابعِ فرمان بندوں میں شامل رکھنا۔

اس طرح یہ تین دعائیہ جملے ایک مومن کی تمام زندگی کی ذمہ داریوں کو آشکار کر دیتے ہیں، گویا صرف اپنی ذات تک محدود بیٹھ رہنا اس کی شان ہے نہ صرف خدا کے ہو کر رہ جانا خیر اور بھلائی ہے بلکہ مومن کو ہر جگہ، ہر محاذ پر برسرِ پیکار رہنا اور حوصلہ ہارنے والوں کو سہارا دے کر سفرِ حق پر آمادہ کرنا ہی زندگی کی معراج ہے۔ اس طرح عمل کا دائرہ چند لوگوں تک محدود نہیں ہے بلکہ انسان پر اپنی ذات اور گھر سے لے کر خاندان، محلے، ہمسائے، شہر، پورے معاشرے، ملک اور تمام قوم، پھر کُل عالم کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ ایسے میں اس کا تعلق ہر قسم کے افراد سے قائم ہوتا ہے، قریبی، دُور کے، اچھے بُرے، دکھ دینے والے، دوست اور مخالف۔ ان سب کے معاملات کی ادائیگی رضائے الٰہی کے مطابق ہو تو عین عبادت ہے ورنہ حساب کی خبر سنا دی گئی ہے، گویا مومن کی پوری زندگی ایک جہاد ہے، میدانِ جنگ میں جائے بغیر ہتھیار لگائے بغیر وہ ہر لحظہ و ہر آن مصروفِ جہاد ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ شہید ہوتا ہے یا غازی یا پھر میدانِ جنگ سے بھاگنے والوں میں شامل ہو جاتا ہے؟ بس اسی فیصلے پر کامیابی اور ناکامی کا دارو مدار ہے۔

جہادِ زندگانی کی بات ہی نہیں بلکہ ہر جہاد میں کامیابی کا سبب عقیدہ و مقصد کا امتزاج ہوتا ہے۔ کام کسی خاص مقصد کے لیے ہو اور اسے (مقصد کو) ایمان اور یقین کے ساتھ حوصلہ دیا جائے تو پھر

ناکامی کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور یوں بھی روزمرہ زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی فطرت یہی ہے کہ وہ محنت کسی نہ کسی چیز کے لیے ہی کرتا ہے کہیں حصولِ زر، عزت و شہرت مراد ہوتی ہے تو کہیں خود اپنی ذات کو مطمئن کرنے کے لیے کام کیا جاتا ہے۔ کہیں نام و نمود ہے تو کہیں ذاتی مفاد۔ غرض کہ ہر کام کا محرک غرض و غایت ہی ہوتی ہے۔ اسی غرض و غایت کو خدا تعالیٰ نے اپنی فطرت منسوب فرما کر انسان کو عبادت کا نیا طریقہ بھی بخش دیا اور اس کی فطرت کے سکون کا اہتمام بھی فرما دیا، یعنی اب رضائے الٰہی کی غرض سے جو کام بھی ہو، عبادت ہے، یعنی نبوت کی اعلیٰ قدر! فتنے داریوں سے لے کر کسی کو چند گھونٹ پانی پلا دینے تک اگر خدا کے لیے کوئی عمل کیا جائے تو باعثِ ثواب ہے لہٰذا اِلّا ابتغاءَ وجہِ ربّہِ الاعلیٰ (سورۃ لیل) کی بنیاد پر عمل کیے جانے کا حکم صادر فرما کر خود ہی (قرآن نے) ان تمام امور کی وضاحت بھی فرما دی کہ کون کون سے اعمال خدا کے نزدیک لائقِ تحسین ہیں اور کن کن برائیوں سے معاشرہ خراب ہوتا ہے! حقوق العباد (والدین رشتے دار، ہمسائے، یتیم، مسکین، اولاد، میاں، بیوی، بہن، بھائی، لونڈی غلام، مسلم اور غیر مسلم) میں کوئی حق باقی نہیں جس کی پوری تفسیر موجود نہ ہو اور ان سب کا عملی ثبوت معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کی صورت میں ہمارے سامنے نہ ہو۔ ایسے میں یقین کر لینا چاہیے کہ ان پر عمل کرنا ہی باعثِ نجات ہے۔ اس کے سوا آخری کامیابی اور نجات کا راستہ ہی کوئی نہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ تمام تر غیبی حقیقتوں، خدا کی تمام تر صفات اور اس کی تعلیمات پر یقین کرنے کے لیے کسی بحث و تکرار کی ضرورت نہیں ہے جب کہ ہر شئے اس کی واحدانیت کی نشان دہی کرتی ہے۔ ساری کائنات کو ایک اصول پر بنانا ہی خالق کے واحد و لاشریک ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے جس طرح کہ بلاک یا اینٹوں کی مختلف ترتیب انھیں مختلف انداز و متعدد شکلوں کی عمارت میں تو ڈھال سکتی ہے، یعنی دیواریں ستون، چھت، فرش کی صورت میں بنائی جا سکتی ہیں، لیکن بہ غور

دیکھنے سے ان سب کی تخلیق میں اصل چیز بلاک یا اینٹ ہی نظر آتی ہے۔ اسی طرح یہی کیفیت ساری کائنات میں ایٹم کی ہے کہ اس کی مختلف تعداد و ترتیب سے متعدد شکلیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ جو واحدانیت کی گواہی دیتی ہیں۔ اب تو خود انسان نے اپنے سائنسی اصولوں سے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ ایٹم کا مجموعہ ہے اور ایک ہی اصول پر کارفرما ہے۔ اس کے گرد گردش کرنے والے الیکٹرون بے پناہ طاقت سے مربوط ہیں جنھیں انسان نے تسخیر کر کے ہی جنگ میں قیامت ایسی ہلاکت کا مظاہرہ کیا ہے اور انھی سے تعمیری کام بھی لیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد انسان اپنی عقل سے یہ خوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ جب آنکھ سے نظر نہ آنے والا ایٹم اتنی بڑی طاقت کا حامل ہے تو بھلا اس کا خالق کیا طاقت رکھتا ہوگا! لہٰذا خود عقل کا سب سے بڑا تقاضا یہی ہے کہ خالقِ واحد پر ایمان لایا جائے اور ان تمام غیبی حقیقتوں کو تسلیم کیا جائے جو ابھی تک انسان کے مشاہدے میں نہیں آئیں۔ کیا مشاہدہ کرنے اور محسوس کرنے کے لیے یہی کافی نہیں ہے کہ کائنات کی ہر چیز ایک خاص اصول اور اندازے پر عمل پیرا ہے! وقت، موسم، دن، رات، چاند، سورج، بے جان اور جان دار ہر شے اور ایک ایک لمحہ ذرہ برابر بھی اپنے اصولوں سے انحراف نہیں کر سکتا۔ ازل سے ابد تک انسان کے سوا ہر شے تابعِ فرمانِ الٰہی ہے۔ محض یہ انسان ہے جسے فکر و عمل اور ارادہ و فیصلے کی آزادی عطا فرما کر مالکِ حقیقی نے خلافتِ ارضی بخشی تھی جس کی بدولت اس نے کارنامے انجام دیئے محیرالعقل ایجادات کیں اور اپنی ہمت اور بساط سے بڑھ کر وسخر لکم ما فی السمٰوٰت والارض (سورۂ بقرہ) کو صحیح ثابت کر دکھایا۔ یہی آزادئ عمل اور قوتِ عمل جہاں اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا سبب ہے وہاں آخرت میں باعثِ حساب بھی بن گئی لیکن اس وقت مقصدِ بیان صرف اس قدر ہے کہ جب کائنات کی ہر شے ایک خاص اصول پر کاربند ہے تو انسانی عمل کے لیے

بھی آزادی عطا فرمانے کے باوجود ایک ہدایت نامے کی اشد ضرورت تھی تاکہ اس کی کارکردگی بہ طریقِ احسن عمل پذیر ہو یا جس طرح سے کسی بھی مشین کے بہترین طریقۂ کار کے لیے اس کے بنانے والے کی طرف سے اس کے کیٹیلاگ کا مطالعہ انسان کے لیے اس مشین کے استعمال میں مددگار، معاون اور رہنما ہوتا ہے، اسی طرح انسانی زندگی کے ہر شعبے میں خالقِ حقیقی کا بنایا ہوا کیٹیلاگ ہی اس کے لیے صحیح ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ اس کا اپنا نہیں کیوں کہ اس مشین (انسان) کا خالق انسان نہیں، خدا ہے۔ ایسے میں پیدائش کے لمحے سے لے کر موت تک اسے ہدایت بھی وہی دے سکتا ہے۔ پس کائنات کی ابتدا سے اس کی انتہا تک اس مشین (انسان) کے بہتر عمل کے لیے وہی ایک کیٹیلاگ (اسلامی تعلیمات) ہی ضروری اور مفید ہے۔ اس کے مطابق جو عمل بھی ہوگا وہی صالح عمل ہوگا جو اسی وقت ممکن ہے کہ جب خالقِ حقیقی پر ایمان لا کر اس کے اصولوں پر عمل پیرا ہوں۔ یہ تمام تر اصول، یہ ہدایات اسی کیٹیلاگ (قرآن) میں درج ہیں جن کا عملی ثبوت اور بہترین نمونہ حیاتِ طیبہ سے ملتا ہے۔ قرآن پاک میں تو صرف احکام درج ہیں، ان کا طریقۂ ادائیگی معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی وضع کیا۔ قرآن نے حکم دیا کہ نماز قائم کرو، لیکن کس طرح قائم کرو اور کس انداز سے کرو؟ یہ جاننے کے لیے ہم سیرتِ طیبہ کے محتاج ہیں۔ اس لحاظ سے قرآن اور حیاتِ مقدس لازم و ملزوم ہیں۔ انھیں عملی نمونہ بنانے سے مراد محض اس قدر ہے کہ ملتِ اسلامیہ میں یگانگت اور واحدانیت کا اصول کارفرما ہیں۔ جو لوگ ان دونوں پر عمل نہیں کرتے وہی تفرقے کا سبب ہیں۔ خدا ہم سب کو اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

## قرآن، ابدی معجزہ

معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی ترسیٹھ سالہ حیاتِ مقدس کی الہامی، اخلاقی اور عملی تعلیمات جو پندرہ سو سال سے دنیا کے بے شمار عالم و فاضل ہستیوں کی تحقیق و تقاریر پر محیط ہیں، کسی بھی نئی ہیئت میں مکمل طور

پر نہیں سموئی جا سکتیں اور میری یہ کوشش تو سمندر میں سے ایک قطرے کے مترادف ہے جس کا مقصد محض اظہارِ عقیدت و محبت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ذاتِ اقدس کے محامد و محاسن کا حق تو کوئی فرد ادا کر ہی نہیں سکتا۔ یہ شعبہ تو وہ ہے جس میں رہتی دنیا تک پوشیدہ اور آشکار ہوتے رہیں گے۔ زمانہ سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی عقل کی میزان پر پرکھ کر اپنے عقیدے اور ایمان کو مضبوط اور قابلِ یقین بناتا رہے گا اور معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اپنے آفاقی و قابلِ عمل ہونے کا ثبوت پیش کرتی رہیں گی اور اس کے آفاقی ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو اسرار و رموز صدیوں قبل عقل و خرد سے بعید نظر آتے تھے اب آشکار ہو کر عقلِ انسانی کو متحیر کیے دے رہے ہیں۔ وہی انسان جس نے کبھی نبوت کی صداقت کو تسلیم کرنے کے لیے نشانیاں طلب کی تھیں، ثبوت مانگے تھے، آج جدید علوم کے سہارے اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو سر دھن کر رہ جاتا ہے۔ سائنٹفک ادارے جو اس عظیم کتاب پر ریسرچ کر رہے ہیں، تسلیم کر لینے پر مجبور ہیں کہ یہ نہ صرف انسانی قدرت و ہمت سے بالاتر ہے بلکہ ریاضی کے اصول اور حسابی نظام میں بھی ایک مکمل اور محیر العقل کتاب ہے جسے ۶۲۶ × ۱۰^۲۴ انسان متحد ہو کر بھی عمر بھر کاوشیں کرتے رہیں تو تصنیف نہیں کر سکتے۔ غیر مسلم اسکالرز، ماہرینِ علوم جو کل تک سائنس کو مذہب کا حریف و مخالف گردانتے تھے اب خود قرآن پاک کو کمپیوٹرائز کر کے حیران کن انکشافات کے ساتھ اس بات کی تصدیق کر رہے ہیں کہ عرب کے امّی پر نازل ہونے والی یہ کتاب ایک لازوال معجزہ ہے جو نہ صرف بنی نوعِ انسان کے لیے طریقۂ حیات و تعلیمات ہے، حق کی طرف رہنما ہے بلکہ اس کا ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ ایک خاص نظام ریاضی سے مربوط ہے اور حرکات و سکنات و نقاط میں سے بھی کوئی نقطہ اپنی جگہ بے مقصد و بے حکمت نہیں ہے۔

آج علم ریاضی کی روشنی میں کہا جاتا ہے کہ انیس کا ہندسہ ایک ایسا حسابی ہندسہ ہے جو ایک (۱) اور نو (۹) سے مرکب و جمع

ہے۔ عدد ایک (۱) خدا تعالیٰ کی وحدانیت دازلی ہونے کا آئینہ دار ہے
اور نو (۹) کا عدد آخری منفرد عدد ہے۔ بہ الفاظِ دگر کہا جاسکتا ہے کہ نہ
ایک (۱) سے قبل کچھ ہے اور نہ نو (۹) کے بعد کوئی منفرد عدد موجود ہے اور اسی
انیس (۱۹) کے ہندسے پر قرآنِ پاک کے حسابی نظام کی اساس ہے، مثلاً
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں انیس (۱۹) حروف ہیں اس میں جس قدر
الفاظ ہیں وہ تمام قرآنِ پاک میں (۱۹) پر تقسیم ہوسکتے ہیں۔ اس تقسیم کی بہترین
وضاحت "القرآن دی الٹی میٹ میریکل" میں موجود ہے، نیز یہ کہ قرآنِ
پاک کی ابتدا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے ہوتی ہے جو انیس (۱۹)
حروف پر مبنی ہے اور قرآنِ پاک کی ایک سو چودہ (۱۱۴) سورتوں کی تعداد
بھی انیس (۱۹) سے تقسیم ہوتی ہے اور اس کا ہر ہر لفظ جتنی بار قرآنِ پاک میں
استعمال کیا گیا ہے، انیس پر ہی تقسیم ہوتا ہے، مثلاً اِسم۔ انیس مرتبہ آیا ہے۔
(۱۹) اَللّٰهُ۔ دو ہزار چھ سو اٹھانوے۔ (۲۶۹۸) الرّحمٰن۔ستاون بار (۵۷)
الرَّحیم۔ ایک سو چودہ مرتبہ۔ (۱۱۴)

ان تمام الفاظ کی تعداد انیس (۱۹) پر تقسیم ہوتی ہے۔ اس حسابی نظام
کی درستی کے لیے مصلحتِ خداوندی یہ ہے کہ سورۃ النمل میں بسم اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحیم
کو دو مرتبہ استعمال کیا گیا ہے تو سورۃ التوبہ کی ابتدا میں اس کو حذف کردیا گیا تاکہ
تعداد میں تنظیم برقرار رہے اور قرآنِ پاک میں اس سورۃ یعنی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
کی تعداد ایک سو چودہ (۱۱۴) سے بڑھ نہ جائے۔

اب حروفِ مقطعات کی طرف آئیے جو کبھی عرب زبان کا ایک عام
دستور تصور کیے جاتے تھے، لیکن آج یہ حروف بھی خاص مطالب کے ساتھ ذہن
میں آتے ہیں۔ قرآن پاک میں انتیس (۲۹) سورتوں کی ابتدا حروف مقطعات سے
ہوتی ہے، مثلاً الم، طٰہٰ، یٰسٓ، حٰمٓ۔ الرا۔ طٰسمٓ۔ عٓسٓقٓ۔ المرا، المص
کھیٰعٓصٓ۔ قٓ۔ یہ تمام حروف وہ ہیں جن کی حکمت و مصلحت اس وقت آشکار
نہ کی گئی تھی، لیکن آج کہا جاتا ہے کہ دراصل ان حروف کا علیحدہ علیحدہ استعمال
قرآن پاک کے حسابی نظام کی ترتیب و تنظیم ہے جن کا مجموعہ انتیس پر تقسیم ہوتا ہے۔

ان کی وضاحت بھی "القرآن دی الٹی میٹ میریکل" میں موجود ہے۔ اس نظام کی جس قدر بھی وضاحت علم میں آتی ہے یقین و ایمان اتنا ہی پختہ ہو جاتا ہے لہٰذا یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ محض فصاحت و بلاغت ہی اس عظیم کتاب کی صفت نہیں ہے نہ یہ صرف ہدایات ہیں جو مالکِ حقیقی نے مخلوق کو دیں بلکہ یہاں تو ایک مکمل و منظم حسابی نظام کارفرما ہے اور آج صدیاں گزر جانے کے بعد جو سوال انسان نے کمپیوٹر سے کیا کہ آیا انسان قرآن ایسی کتاب تصنیف کر سکتا ہے؟ صدیوں قبل خود قرآن نے اس کا جواب اس طرح دیا تھا۔ "اے نبیؐ! کہہ دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جن اس بات پر متحد ہو جائیں کہ ایسی کتاب بنا لائیں تو وہ اس جیسی (کتاب) نہ لا سکیں گے ہر چند کہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہو جائیں"۔

آج کمپیوٹر نے اس سوال کا جواب اس طرح کیا کہ انسان کو ایسی کتاب تصنیف کرنے کے لیے ......... ۶۲۶ مرتبہ کوشش کرنا ہو گی۔ گویا کسی طور بھی یہ ممکن نہیں ہے۔ قرآن پاک کا جواب اور آج کمپیوٹر کا یہ انکشاف منکرین و ملحدین کے لیے غور طلب بات ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ قرآن پاک کی ہر آیت معنی کے بحرِ بیکراں سمیٹے نظر آتی ہے جو علم کی انتہا پر پہنچنے کے بعد تلبِ انسانی پر آشکار ہوتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے "یَخْرُجُ مِنْ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ" (سورۃ الطارق:۷)

پسلی سے پیدا کرنے کی یہ مصلحت و حکمت آج ڈاکٹری تحقیق کے بعد اس طرح ثابت ہوئی ہے کہ مادۂ تولید جن اعضا سے پیدا ہوتا ہے وہ اعضا رحم مادر میں پسلی کے درمیان ہی نشوونما پاتے ہیں جو عین پیدائش کے وقت اپنے اصل مقام سے منتقل ہو کر موجودہ مقام پر آ جاتے ہیں اور پھر "وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ" (ہم نے پانی سے ہر زندہ شے پیدا کی) (سورۃ الانبیاء:۳۰) کی شہادت تو خود دورِ حاضر کے سائنسدان اور ماہرینِ حیاتیات دے رہے ہیں جو سمندری مادے میں امیبا کو زندگی کی ابتدا قرار دیتے ہیں۔ پھر اور آگے دیکھیے تو عصرِ جدید کے ماہرین نباتات و جمادات ہر شے میں مذکر و مؤنث کے وجود کو اصولِ تخلیق کا راز بتا رہے ہیں جب کہ قرآن نے چودہ سو صدی قبل ہی خلق الازواج کلّھا سے ان کی مصلحت سمجھا دی تھی اور پھر "وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ" سے انسان کی کم فہمی کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ یہ اور ایسی لاتعداد مثالیں موجود ہیں جن میں ہر اصول کی حکمت، وقت اور حصولِ علم

کے بعد ہی انسان پر آشکار ہو گی۔ جوں جوں علم میں اضافہ ہوگا قدرت کی تمام نشانیاں ظاہر ہوتی رہیں گی کیوں کہ یہ سب دانش مندوں کے لیے ہی ہیں۔ خود قادرِ مطلق نے فرمایا: "یقیناً ان میں بہت سی نشانیاں ہیں دانش مندوں کے لیے۔" (سورۂ روم)

میں نے اس سلسلے میں مقدور بھر کوشش کی ہے کہ ہر موضوع کو قرآن پاک سے پیش کر سکوں اور دیگر جن جن کتب سے سہارا لیا ہے حتی الوسع صحیح روایات (حوالے کے ساتھ) شامل کی ہیں، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تحریر بس اظہارِ عقیدت و شیفتگیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کا ایک ذریعہ ہے، ہاں اگر اس سے کوئی ایک فرد بھی فیض پا سکے تو یہی میری محنت کا بہت بڑا اجر ہوگا۔ آخر میں خداوندِ عالم سے گزارش ہے کہ اسے قبول فرمائے اور اس کا ثواب میرے والدِ مرحوم قاضی صغیر احمد صدیقی کے نامۂ اعمال میں ثبت فرمائے۔ آمین۔

قرآنِ پاک کی ایک سَو چودہ سورتوں کے علاوہ اس مقالے کی تکمیل میں مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔


۱۔ سیرتِ ابنِ ہشام۔ مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی۔
۲۔ رحمتہ اللعالمین۔ (جلد اوّل) قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان
۳۔ داستانِ اسلام۔ (جلد اوّل) شیخ محمد اقبال
۴۔ زاد المعاد (حصہ اوّل) علامہ حافظ ابن قیّم (رئیس احمد جعفری)
۵۔ الجہاد فی الاسلام۔ مولانا مودودی
۶۔ اصطلاحاتِ کبریٰ۔ مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری
۷۔ تاریخ اسلام۔ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی
۸۔ تاریخ ابنِ خلدون (حصہ اوّل رسولؐ اور خلفائے رسولؐ)
۹۔ تاریخِ اسلام (حصہ اوّل) پروفیسر سید عبدالقادر اور پروفیسر محمد شجاع
۱۰۔ سیرت النبیؐ۔ مولانا شبلی نعمانیؒ
۱۱۔ نقشِ سیرت (مؤلف و مرتبہ) نثار احمد
۱۲۔ رسولِ رحمت۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مقالات۔ بہ ترتیب و اضافہ مطالب۔ مولانا غلام رسول مہر
۱۳۔ پیغمبر الأعظم و آخر۔ جناب نصیر الدین ناصر
۱۴۔ دی الٹی میٹ میریکل (علامہ احمد دیدات)